برہانپور کے سندھی اولیاء

مع

تعلیقات

تالیف

سید محمد مطیع اللہ راشد برہانپوری

تعلیقات

مخدوم سلیم اللہ صدیقی

سندھی ادبی بورڈ

برہانپور کے سندھی اولیاء

مع

تعلیقات

تالیف:

سید محمد مطیع اللہ راشد برہانپوری

تعلیقات:

مخدوم سلیم اللہ صدیقی

سندھی ادبی بورڈ

جامشورو سندھ

۲۰۰۶ء

طباعت اوّل	سال 1957ء	تعداد ایک ہزار
طباعت دوئم	سال 1987ء	تعداد دو ہزار
طباعت سوئم	سال 2006ء	تعداد ایک ہزار

قیمت: دو سوٗ پچاس روپے
[Price Rs. 250-00]

خریداری کیلئے رابطہ:

سندھی ادبی بورڈ کتاب گھر
تلک چاڑھی، حیدرآباد سندھ
(Ph: 022-2633679, Fax: 022-2771602)
Email Address: sindhiab@yahoo.com
Website: www.sindhiab.com

یہ کتاب سندھیکا اکیڈمی، کراچی میں چھپی اور اعجاز احمد منگی سیکریٹری سندھی ادبی بورڈ، نے اسے شایع کیا۔

پبلشر نوٹ

دسویں صدی ہجری میں اہلِ سندھ کے احمد آباد اور گجرات کے دیگر شہروں کے ساتھ علمی ادبی اور تجارتی روابط اتنے پائدار تھے کہ ان کے آثار آج تک نمایاں ہیں۔ سندھ سے ملحقہ ان ہندستانی علائقوں سے علمی تعلقات کی ابتدا میں توپاٹ (سندھ) کے علمی خانوادے کے کچھ افراد کا احمد آباد (گجرات) اور براراریج پور میں علم وعرفان کی تشفی اور جستجو میں سفر کا اندیا ملتا ہے، لیکن حضرت مسیح الاولیاء کا حضرت مخدوم عباس ہنگورجائی کی وفات 998ھ کے بعد مستقلاً برہانپور میں مقیم ہوجانے سے وہاں پر سندھی علماء کا ایک محلّہ آباد ہونے لگا۔ کیونکہ آپ کے بعد چند دیگر متعلقین بھی گاھے بہ گاھے آکر وہاں آباد ہوتے گئے۔ جن کا تعلق نہ صرف آپ کے وطن عزیز پاٹ شریف سے تھا، بلکہ ٹھٹھہ، بوبک، بکھر وغیرہ کے علماء بھی اس سلسلے میں پیش پیش رہے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ علائقہ سندھیوں کا محلّہ سندھی پورہ کے نام سے مشہور ہوگیا۔ حضرت مسیح الاولیاء کے مستقلاً یہاں آکر مقیم ہونے کے چند اہم اسباب یہ نظر آتے ہیں۔

1. آپ کے عم مکرم اور سسر مخدوم عباس کا ہنگورجہ میں وفات پاجانا۔

2. آپ کی عم مکرم شیخ طاہر محدث سے عقیدت، جن کے پاس آپ ایام طفلی میں سندھ سے آکر رہے تھے، اور اغلب یہی ہے کہ مدرسہ ایرج پور میں ان ہی کے پاس ابتدائی علوم کا تکملہ کیا۔ لیکن اس سے پہلے ابتدائی تعلیم، حفظ قرآن سندھ میں، ہی ملا اسماعیل سومرہ کے ہاں مکمل کیا۔

3. آپ برہانپور میں حضرت لشکر محمد عارفؒ کے مرید ہوئے اور خلافت کے اعزاز سے سرفراز ہوئے۔

4. آپ کے عقد ثانی کو برہانپور میں اقامت کا ایک اور بڑا سبب سمجھنا چاہئے۔

ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ، ڈاکٹر حبیب اللہ صدیقی، ڈاکٹر عبدالغفار سومرو اور بندہ نے ایک مجلس کے دوران بورڈ کی چھپی ہوئی کتاب ''برہانپور کے سندھی اولیاء'' کو دوبارہ شایع کرنے کا فیصلہ کیا، لیکن اس کی اشاعت سے قبل چند حقائق کو بھی زیر بحث لایا گیا کہ:

اس بات میں شک نہیں کہ مطیع اللہ راشد برہانپوری نے اس کتاب کو بڑی جانفشانی اور محنت سے تحریر کیا، لیکن وہ ناتوان صحت اور ناقدری روزگار کی وجہ سے گھر تک محدود سے ہوکر رہ گئے تھے۔ پھر بستر پر پڑے پڑے آپ نے برہانپور سے متعلق کچھ مواد بذریعہ خط منگوایا، جو کہ اس وقت کے سجادہ نشین صاحب نے نقل کرواکے اُن کو بھیجا۔ لیکن محسوس ہوتا ہے کہ کاتب کی طرف سے کتابت کی غلطیوں کے علاوہ موضوع کے تسلسل کا بھی احتیاط نہ کرسکے تھے۔ اس ضمن میں وہ کئی ایک غلطیوں کے مرتکب بھی

ہوئے ہیں، جنہیں راشد برہانپوری من وعن نقل کر گئے ہیں۔ پھر راشد برہانپوری صاحب اس ضمن میں سندھ میں موجود تذکرات، شجرات اور دیگر حوالوں کے مطالعہ سے مستفیض ہونے کا بھی وقت نہ نکال سکے۔

ان کمزوریوں کی وجہ سے ''برہانپور کے سندھی اولیاء'' کے پُرانے ایڈیشن میں کہیں کہیں تو یہ شبہ بھی ہوتا ہے کہ اہل برہانپور کے پاس حضرت مسیح الاولیاء کے نہ شجرات موجود ہیں اور نہ ہی ان کے پاس متعلقہ تصنیفات باقی رہی ہیں۔ اگر چند ایک ہیں بھی تو بہت بعد کے زمانے کی کتابت شدہ ہیں۔ ان میں بھی تحریف وتخفیف کا قوی امکان موجود ہے۔

یہی وجہ ہے کہ پیر حسام الدین راشدی مرحوم نے تذکرہ مشاہیر سندھ کے حواشیہ میں جو شجرہ مسیح الاولیاء شیخ عیسیٰ دیا ہے، وہ راشد برہانپوری کے شجرہ سے مطابقت نہیں رکھتا۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ پیر صاحب بھی برہانپور کے سندھی اولیاء میں دیئے گئے مواد سے سو فیصد متفق نہیں تھے۔ سندھ کے دانشور حضرات ایک عرصہ سے ''برہانپور کے سندھی اولیاء'' پر تنقیدی نوٹ بھی لکھتے رہے ہیں۔ ان حقائق کے پیش نظر مذکورہ مجلس میں اس کتاب کے ہر باب کے ساتھ تعلیقات لکھ کر اس کمی کو ایک حد تک پورا کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس عظیم کام کے تکملہ کے لیئے متعلقہ خانوادہ مسیح الاولیاء کے فرد فرید مخدوم سلیم اللہ صدیقی کا نام چنا گیا۔ جنہوں نے خاندانی دستاویزات کی مدد سے قلیل مدت میں اس اہم کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اور اپنی ذاتی محنت ولگن سے ایک شاندار علمی کام مکمل کیا۔ ادارہ ان سارے احباب اور خصوصی طور پر مخدوم سلیم اللہ صدیقی کا تہہ دل سے مشکور ہے۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ اہل علم وذوق کو یہ محنت وعرق ریزی کئی ایک حقائق کے بارے میں مستند معلومات فراہم کرنے کا سبب بنے گی۔

اعجاز احمد منگی
سیکریٹری
سندھی ادبی بورڈ

جام شورو، سندھ
منگل ۴-رجب المرجب ۱۴۲۷ھ
بمطابق 8- آگست 2006ء

فہرست مضامین

(دور سوم)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

دسویں صدی ہجری سندھ کے لئے بہت ہی نامبارک اور غیر مسعود دور تھا، اِسی صدی کے ابتدائی چوتھائی حصے میں سندھ کی آزادی و خودمختاری کچھ اس طرح ختم ہوئی کہ تقریباً اس کے بعد اڑھائی سو سال تک سندھ اپنے آپ کو دوسروں کی غلامانہ زنجیروں سے نہ چھڑا سکا۔

سندھ کا وہ عہد جسے تاریخی نقطۂ نظر سے زرین دور سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ سمہ عہد ہے، سمہ کے دورِ حکمرانی میں کئی صدیوں تک سندھ نے امن، خوشحالی اور سکون کے وہ دن دیکھے کہ جس کی نظیر سندھ کی تاریخ کے پُورے ادوار میں ملنا مشکل ہے، حقیقت یہ ہے کہ سمہ حکمرانوں نے سندھ کو ترقی و کمال کے انتہائی عروج پر پہنچایا، خوش بختی و کامرانی سمہ فرمانرواؤں کے قدم چومتی تھی اور سمہ فرمانروا ملک کی فلاح و بہبود کی شاہراہ پر بڑی تیزی سے گامزن تھے کہ اچانک جام نظام الدین (متوفی ۹۱۴ھ) کے بعد سندھ کے سکون و امن کا شیرازہ بکھرا، اقتدار کے حصول اور باہمی خانہ جنگی کی وجہ سے سموں کا آفتاب اقبال زوال پذیر ہوا۔ چنانچہ ۹۲۸ھ میں سندھ پر غلامی کی وہ اُداس شام مسلط ہوئی کہ جس کی تاریکیوں نے آزادی و خودمختاری کے سورج کو صدیوں تک ابھرنے نہ دیا۔

ارغون جو شاہ اسماعیل، بابر اور محمد خان شیبانی کے دباؤ سے کابل اور قندھار چھوڑنے پر مجبور تھے اور اپنی پریشانیوں سے ایک نئے وطن کی تلاش میں تھے، وہ سمہ خاندان کی خانہ جنگی سے فائدہ اُٹھا کر سندھ پر بلائے بے درمان کی طرح ٹوٹ پڑے اور مسلط ہوگئے، ان کے خاتمہ کے بعد ان کے قائم مقام ترخان ہوئے، ارغون اور ترخانوں کی حکومت تقریباً سو سال رہی، لیکن ان کی حکومت کا ہر دن اس امن و عافیت کے گہوارہ کو تباہی و بربادی، قتل و غارت گری کی آماجگاہ بناتا رہا، یہاں تک کہ وہ خطہ ارضی جسے سمہ فرمانرواؤں نے امن وسکون کے اعتبار سے جنت بنایا تھا، ارغون اور ترخان کے دور میں اہل سندھ کے لئے اضطراب اور بے چینی کا دہکتا ہوا دوزخ بن کر رہ گیا۔ جس کا ایندھن اہلِ سندھ کو مدتوں بننا پڑا۔

ارغون ہی کے دور میں ہمایوں شیر شاہ سے شکست کھا کر یہاں آیا، چار سال تک ارغون اور ہمایوں میں آویزش ہوتی رہی، خود شاہ حسین ارغون کی پوری زندگی لڑائیوں اور معرکوں میں گذری، اس نے سندھ سے لے کر ملتان تک خونریزی کی جو ایک بساط بچھائی، اس سے تاریخ کے اوراق آج تک رنگین نظر آتے ہیں۔ سندھ ان مصیبتوں سے سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ عیسیٰ ترخان اور محمود بھکری کی طویل معرکہ آرائیوں اور خونریزیوں نے اس کی تباہی و بربادی پر ایک نئی مہر لگائی، سندھ کو اس دوسری مصیبت سے پوری طرح نجات بھی نہ ملنے پائی تھی کہ میرزا باقی اور جان بابا کی آویزشوں نے اسے پھر تباہی و بربادی کے عمیق غار کی طرف ڈھکیل دیا۔ میرزا باقی کی خودکشی کے بعد خانخانان اور میرزا جانی بیگ کے درمیان جنگ کی جو بساط بچھی اُس نے تو اِس مریض جان بلب کو موت کے منھ تک پہنچادیا۔

غرض یہ کہ ۹۱۴ھ سے ۱۰۰۰ھ تک پوری ایک صدی سندھ کے لئے قیامتِ صغریٰ سے کم نہ تھی کہ جس میں سندھ علمی و مادی حیثیت سے بالکل تباہ و برباد ہوگیا، سمہ حکمرانوں نے جو مسرتیں و شادابیاں، آراستگی و پیراستگی، اِس مُلک کو بخشی تھیں، وہ اس سے چھین لی گئیں، اُن کی بنائی ہوئی سربفلک عمارتیں اور ان کی بخشی ہوئی رعنائیاں، آگ، خاک، آندھیوں اور طوفان میں ہمیشہ کے لئے مٹ گئیں۔

اِن ہنگامہ خیزیوں میں سندھ کا وہ نقصانِ عظیم جس کی تلافی ہزاروں گردشوں کے بعد آج تک زمانہ نہ کرسکا، یہ تھا کہ علم و ادب کی وہ بساطیں جو صدیوں سے بچھی ہوئی تھیں، اُلٹ گئیں، روحانی فیض و ارشاد کی وہ مسندیں جن سے عرفان و تصوف کے چشمے اُبلتے تھے خالی ہوگئیں، اور وہ خانقاہیں جن میں معرفت اور عظمت الٰہی کے نغمے گونجتے تھے، ویران ہوگئیں، مدرسے جن سے علم و فضل کے دریا بہتے تھے سونے ہوگئے۔

علماء وصوفیائے کرام یہاں کے غیر محفوظ حالات دیکھ کر ترکِ وطن پر مجبور ہوئے، اور اِس طرح گئے کہ پھر کسی نے سندھ کا رُخ نہ کیا، انہیں مہاجروں میں سے دربیلہ کے علماء اور پاٹ کے صوفیاء بھی تھے،(۱) جنھوں نے اس دور انتشار و پریشانی میں یہاں سے نکل کر مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کا رُخ کیا اور بعض نے گجرات اور دکن کی طرف اپنے لئے نئی خانقاہیں آراستہ کیں۔

حضرت مسیح الاولیاءؒ کا خاندان اور متعلقین جن کا تذکرہ اس کتاب کی زیب و زینت ہے، اس دورِ ابتلاء میں ترکِ وطن کرکے بُرہان پور(۲) میں آباد ہوا اور وہاں رُشد و ہدایت تعلیم و تربیت کی وہ مسند آراستہ کی کہ جن کی فیوض و برکات ہندوستان کے ہر حصے میں پہنچے، یہاں تک کہ صدیاں گذرنے کے بعد آج بھی برہان پور میں ''سندھی پورہ'' ان بزرگوں کی یاد دلاتا ہے۔

سندھ کے اس زمانے کے پریشان کن حالات نے ان بزرگوں کا وطن کی طرف سے کچھ ایسا دل توڑا کہ نہ پھر وہ سندھ آئے اور نہ سندھ والوں کو ان کا کچھ پتہ چلا، یہی وجہ ہے کہ سندھ کے تذکرے اِن بزرگوں کے حالات سے خالی نظر آتے ہیں،(۳) اگر کہیں کچھ حالات ملتے ہیں تو وہ اتنے تشنہ اور نامکمل کہ ان پر وثوق نہیں کیا جاسکتا۔ مثال کے طور پر حضرت مسیح الاولیاء کے حالات ہی کو لے لیجئے۔ صاحبِ تحفہ الکرام نے سندھ کے ایک بزرگ شیخ عیسیٰ لنگوٹی کو شیخ عیسیٰ لنگوٹی سندھی برہانپوری لکھا ہے اور ان کا مدفن مکلی بتایا ہے۔ حالانکہ یہ دونوں شخصیتیں جدا جدا ہیں، شیخ عیسیٰ لنگوٹی شیخ حالی کے مقبرے کے قریب مکلی میں دفن ہیں اور مسیح الاولیاء شیخ عیسیٰ سندھی برہانپوری برہانپور میں محوِ خواب ہیں، ان بزرگوں کے سلسلے میں اس قسم کی بہت سی غلطیاں ان تذکروں میں ملتی ہیں جو سندھ میں لکھے گئے۔

☆☆☆

حضرت مسیح الاولیاء اور ان کے اجداد و احفاد کے حالات کے متعلق مجھے کئی سال سے تلاش و جستجو تھی، لیکن نہ کبھی بُرہان پور جانا ہوا اور نہ برہان پور کی کوئی ایسی علمی شخصیت ملی کہ جن سے یہ تاریخی عقدہ حاصل کیا جاتا، زمانہ گزرتا گیا، یہاں تک کہ پاکستان بننے کے بعد جب ہندوستان کے مختلف شہروں سے لوگ ہجرت کرکے پاکستان آئے تو برہانپور کے کچھ خاندان بھی اس سلسلے میں کراچی پہنچے، انہیں میں مجھے وہ نعمتِ غیر مترقبہ ملی، جنہیں حضرت راشد برہانپوری سے موسوم کیا جاتا ہے اور جو اس تذکرے کے مولف و مصنف ہیں، حضرت راشد برہانپوری نے سندھ کی تاریخ کے گم شدہ اوراق کو میری گذارش پر نہایت محنت و کاوش سے مرتب کرکے سندھ کی تاریخ کے اس باب کو مکمل کیا ہے جس کے بغیر سندھ کے صوفیاء کرام کی تاریخ میں ایک بڑا خلا محسوس ہوتا تھا۔

اُنھوں نے اپنی خرابیِ صحت کے باوجود جب کہ اُن کو دیکھ کر اُن کے وجود پر عدم کا گمان ہوتا ہے، اس تذکرے کی ترتیب میں جو محنت شاقہ برداشت کی ہے، اہلِ نظر اس کتاب کے مطالعہ سے اس کا بخوبی اندازہ کرسکیں گے۔ اس تذکرے میں واقعات کی چھان بین، روایات کی تحقیق و تدقیق، حالات کی ترتیب و انتخاب، پھر اس کتاب کی ادبیت و معنویت یہ سب خصوصیات سامنے آتی ہیں اور پڑھنے والے کے قلب پر اُن کے عملی عظمت کا ایک نقش مرتسم کردیتی ہیں۔

راشد صاحب نے جن نامساعد حالات، غریب الوطنی کی غیر مطمئن زندگی خرابی صحت کے باوجود یہ گراں بہا علمی خدمت انجام دی ہے میں اہل سندھ کی طرف سے ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اس کی قدر و قیمت میری نظر میں اس لئے بھی زیادہ ہے کہ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ راشد صاحب کو اپنی اس تصنیف کے دوران میں صعوبتوں کی کون کون سی منزلوں سے گذرنا پڑا، علاوہ ناقدری روزگار کے جو ہمیشہ اہلِ کمال کے ساتھ چولی دامن کی طرح رہی ہے۔ راشد صاحب کو اس عرصہ میں بڑی سخت اور طویل بیماریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بعض دفعہ تو ان کی صحت نے قطعی جواب دے دیا نہ فقط میں بلکہ وہ خود بھی اپنی زندگی مستعار سے مایوس سے ہوگئے صحت کچھ ٹھیک ہوئی تو ناتوانی اور کمزوری نے اس طرح گھیرا کہ

تنم از ضعت چناں شد کہ اجل جُست نیافت
نالہ ہر چند نشاں داد کہ در پیرہن است

اس ناتوانی کے عالم میں ان کی قوتِ ارادی کے کرشمے کی داد دینی پڑتی ہے کہ انہوں نے مُشتِ استخوان ہونے پر بھی بستر پر پڑے پڑے اس کتاب کو مکمل کردیا اور ان کی اس علمی کاوش کی بدولت سندھ کی تاریخ کا وہ اہم حصہ ہمارے سامنے آ گیا، جس کے بغیر سندھ کے اولیاء کرام کی تاریخ نامکمل رہتی۔

(سیّد) حسام الدین راشدی
۱۲ اگست ۱۹۵۵ء

تعلیقات

تعلیق (۱): پیر حسام الدین راشدی نے مسیح الاولیاء کے زمانے میں سندھ کے عمومی واقعات کا نقشہ کھینچتے ہوئے دسویں صدی ہجری میں اِس ملک کے نامبارک اور غیر مسعود حالات کا ذکر کیا ہے۔ نیز سمہ حکمرانوں کے کامیاب دور اور ارغون و ترخان کی سندھ میں آمد کا مختصر مگر جامع نقشہ کھینچتے ہوئے شیخ طاہر محدث اور ان کے متعلقین کی اپنے وطن مالوف پاٹ سے ہجرت کا ذکر کیا ہے۔ راشد برہانپوری نے اس ہجرت کی بنیاد ''آئندہ خراب حالات کا کشف ہونے'' پر رکھی۔ جسے سندھ کے حالات و واقعات کو سطحی تسلسل دینے کی حد تک تو درست قرار دیا جاسکتا ہے، لیکن اس کے برعکس خانوادہ مسیح الاولیاء کی تاریخ انفرادی اہمیت کی حامل رہی ہے۔ اس خانوادہ کا کئی ایک پشتوں سے ہندستان میں موجود مختلف خانقاہوں اور مدارس سے روابط اور مختلف اوقات میں اختیار کئے گئے کئی ایک سفر کے حالات موجود ہیں۔ شیخ طاہر اور احفاد کی کشف کے تحت آئندہ وقوع پذیر ہونے والے واقعات کے خوف سے اچانک ہجرت اختیار کرنے کا بیان کسی تحریر یا مضمون میں ربط پیدا کرنے اور مطلوبہ نتائج اخذ کرنے کے لئے اتفاقی وجوہات جیسے ''ہمایوں کی سندھ میں آمد'' کو غیر ضروری وزن دینے کے مترادف ہے۔

خانوادہ مسیح الاولیاء کے کچھ افراد کا پاٹ سندھ سے ہندستان کی طرف سفر اور برہان پور میں مقیم ہونے کے اسباب کو سمجھنے کے لئے اسلاف مسیح الاولیاء کے پشت بہ پشت تاریخی پہلو کا اجمالی خاکہ اپنے ذہن میں رکھنا بے حد ضروری ہے:

اس خاندان کی تاریخ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے لیکر اپنی خصوصیات کی بنا پر ہر دور میں نمایاں رہی ہے۔ علم و عرفان کی شمع لیے یہ خانوادہ جہاں جہاں بھی رہا، ہر جگہ عزت و تکریم کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کے ساتھ دین اسلام کی خاطر مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت فرمائی۔ ان کے چھوٹے فرزند (جد مسیح الاولیاء) سیدنا محمد رضی اللہ عنہ (۱۰ھ-۳۸ھ/۶۳۲-۶۵۸ء) نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیتے ہوئے مصر میں جام شہادت نوش فرمایا، (نہج البلاغہ)۔ ان کے فرزند سیدنا قاسم رضی اللہ عنہ نے

(۳۸-۱۰۸ھ/ ۶۵۸-۷۲۶ء) جو کہ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے نانا تھے، مدینہ منورہ میں ہی اقامت اختیار کی۔ غیر معمولی فقہی مہارت کی وجہ سے مدینہ منورہ کے چند فقہاء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ آپ کی تعلیم و تربیت ام المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے زیر سایہ ہوئی۔ ابن سعد لکھتے ہیں کہ، ''سیدنا قاسم بلند مرتبہ کے فقیہ، امام التفسیر، حافظ الحدیث، پرہیزگار اور جلیل القدر تابعی تھے۔ آپ کی امامت اور معرفت متفق علیہ ہے۔''

آپ کے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے ساتھ دوستانہ مراسم تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ ''کاش! خلافت قاسم کے لئے ہوتی۔'' آپ کے فرزند سیدنا عبدالرحمٰن ''من افضل قریش'' تھے۔

ابن قتیبہ المعارف میں فرماتے ہیں: ''واما عبدالرحمٰن فکان من افضل قریش، ویکنی: ابا محمد، وله عقب بالمدينة ليسوا بالكثير.'' سیدنا عبدالرحمٰن کی اولاد کا تذکرہ ''وفيات الاعيان لابن خلكان'' میں موجود ہے۔ جس میں شیخ الشیوخ ابو نجیب عبدالقاہر عم مکرم شیخ الشیوخ سیدنا عمر بن محمد شہاب الدین السہر وردی البغدادی کا نسب نامہ خود ان کے دست مبارک کا لکھا ہوا اور ابن النجار کی تاریخ بغداد سے نقل کیا ہوا موجود ہے:

سيدنا شيخ ابو نجيب عبدالقاهر بن سيدنا عبدالله بن سيدنا محمد بن سيدنا عمويه واسمه عبدالله بن سيدنا سعد بن سيدنا الحسين بن سيدنا القاسم بن سيدنا النضر بن سيدنا القاسم بن سيدنا النضر بن سيدنا عبدالرحمن بن سيدنا القاسم بن سيدنا محمد بن سيدنا ابوبكر صديق رضى الله عنه.

سیدنا عبدالرحمٰن کی اولاد اہل بیت سے قریب تر ہونے کی وجہ سے وقت کے حکمرانوں کی معاندانہ نظر سے نہ بچ سکی۔ پھر یہ خانوادہ اپنی روایات اور امانت تصوف کو لیے دور سرحدی علاقہ ''سہرورد'' (زنجان ایران) میں جا بسا۔ جہاں یہ چھوٹوں بڑوں کے مرشد و مربی ہوگئے۔ تصوف کے ساتھ ساتھ علمی خدمات بھی بدستور جاری رہیں۔ ریاضی کے موضوع پر ''التفیر فی العدد الھندی'' مصنف ابوحفص محمد بن عبداللہ المعروف بعمویہ السہر وردی التیمی البکری کا ایک نسخہ بندہ کے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے۔ روحانی اور علمی مشاغل پشت در پشت جاری تھے۔ یہاں تک کہ ۵۳۹ھ میں شیخ الشیوخ سیدنا عمر بن محمد شہاب الدین السہر وردی پیدا ہوئے۔ آپ بچپن میں اپنے عم مکرم شیخ ابو نجیب عبدالقاہر کے پاس بغداد منتقل ہوگئے۔ تاکہ علم وعرفان کی تحصیل کر سکیں۔ حضرت مسیح الاولیاء بھی بچپن میں اپنے عم مکرم شیخ طاہر محدث کے پاس ایرچ پور اس ہی نیک مقصد کے حصول کے لئے آ کر ٹھہرے تھے۔ سیدنا شہاب الدین السہر وردی آسمان تصوف پر شہاب ثاقب کی طرح نمودار ہوئے۔ انہوں نے اپنے عم اور مرشد و مربی کے قائم کردہ سہروردیہ سلسلے کو

بہتر اصولوں پر استوار کیا۔ اور ''عوارف المعارف'' جیسی معرکتہ الآرا کتاب لکھ کر اسلامی تصوف کے لئے ''ٹیکسٹ بک'' فراہم کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ہی کی ذات مبارک کو سلسلہ سہروردیہ کا بانی سمجھا جاتا ہے۔

آپ کے والد سیدنا محمد کی وفات اور مدفن کے متعلق مختلف آراء موجود ہیں۔ کچھ آپ کے بغداد سے سہرورد واپس آنے کا عندیہ دیتے ہیں، جبکہ بعض آپ کا مدفن بغداد سے ٦٦ کلومیٹر دور بعقوبہ کے قریب بہرز میں بتاتے ہیں۔ شیخ الشیوخ سیدنا عمر شہاب الدین السہر وردی نے ٦٣٢ھ میں وفات پائی۔ آپ کا مزار بغداد کے علاقہ ''شیخ عمر'' میں مرجع خلائق ہے۔ یہ علاقہ آپ ہی کے نام سے منسوب ہے۔

حضرت مسیح الاولیاء نے عین المعانی میں اپنے شجرہ نسب کا اختتام شیخ شہاب الدین السہر وردی (ثانی) پاٹائی (٨٩٢-٨٠٢) پر ختم کرتے ہوئے پہلا لفظ شہابی لکھا ہے۔ یعنی اولاد شیخ الشیوخ عمر بن محمد شہاب الدین السہر وردی بغدادی۔ حضرت شیخ الشیوخ کی وفات کے بعد تاتاریوں نے شہر بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ جہاں تصوف کی نہریں جاری تھیں، وہاں ہر سو ویرانی ہی ویرانی دندنانے لگی۔ شیخ الشیوخ کی اولاد میں سے کچھ نے بغداد ثانی ''ملتان'' کا رخ کیا۔ بعض پشتوں میں ایسے فرید الدہر افراد بھی پیدا ہوئے، جن کے نام مقامی روایات کے مطابق جنگ لاہور اور قلعہ ٹونک کی فتح میں آتے ہیں۔ سفینۃ النوح اور دلیل الذاکرین (قلمی) اس ضمن میں کچھ وضاحتیں فراہم کرتی ہیں۔ ان کے قلمی نسخے آج بھی کتب خانہ ذاتی محترم قاضی شوکت علی قریشی ہالا پرانہ سندھ میں موجود ہیں۔ حضرت شیخ الشیوخ عمر بن محمد شہاب الدین السہر وردی کی دختر بی بی فاطمہ سید محمد مکی بکھری سے بیاہی گئیں۔ دونوں کی مزارین پرانی کلیکٹری بکھر سندھ میں موجود ہیں۔ بکھر کے سادات سید صدر الدین اور سید بدر الدین انہیں کی اولاد ہیں۔

شیخ الشیوخ سیدنا عمر بن محمد شہاب الدین السہر وردی بغدادی اور شیخ شہاب الدین سہروردی ثانی پاٹائی کی درمیانی پشتوں کے نام گرامی یہ ہیں:

١- سیدنا عمر بن محمد شہاب الدین سہروردی بغدادی (٥٣٩ھ-٦٣٢ھ)
٢- شیخ محمد وہو المعروف شیخ احمد عماد الدین سہروردی (٥٥٨ھ ولادت-١١٦٣ء)
٣- شیخ قاسم (٥٨٩-٦٥٢ھ/١١٩٣-١٢٥٤ء)
٤- شیخ رضی الدین (٦٣٢-٦٩٥ھ/١٢٣٤-١٢٩٥ء)
٥- شیخ مسعود (٦٧٩-٧٤٨ھ/١٢٨٠-١٣٤٧ء)
٦- شیخ وجہ الدین (٦٩٩-٧٨٠ھ/١٢٩٩-١٣٧٨ء)

۷- شیخ سراج الدین (۷۳۶-۸۱۱ھ/۱۳۳۶-۱۴۰۸ء)
۸- شیخ نور الدین محمد (۷۸۶-۸۴۹ھ/۱۳۸۴-۱۴۴۵ء)
۹- شیخ شہاب الدین سہروردی ثانی پاٹائی (۸۰۲-۸۹۴ھ/۱۳۹۹ء-۱۴۸۹ء)

شیخ شہاب الدین سہروردی ثانی پاٹائی وہ پہلے بزرگ ہیں، جنہیں سمہ حکمرانوں نے پاٹ کا علاقہ بطور جاگیر مدد معاش کے طور پر دیا اور آپ آکر سندھ میں مقیم ہوئے۔ آپ کی اولاد اس ہی علاقہ میں پھلی پھولی اور بڑے نامور بزرگ پیدا ہوئے۔ حتّٰی کہ پاٹ، پاٹ شریف اور قبۃ الاسلام کہلانے لگا۔ جسے فارسی کتب میں ''ٹ'' کا تلفظ نہ ہونے کی وجہ سے ''پاتر'' لکھا گیا۔

حضرت شیخ شہاب الدین سندھی سہروردی ثانی کے فرزند کلان شیخ معروف تھے۔ جن کے نام معروفانی جھیل پاٹ شریف سندھ میں مشہور ہے۔ ان کے ایک بھائی مخدوم و قاضی برہان الدین کو علاقہ لکگر کا قاضی و مفتی بنا کر بھیجا گیا۔ آپ کا مزار وہیں مرجع خلائق ہے۔ یہ علاقہ پاٹ کے قریب ہی ہے۔

شیخ معروف کے فرزند کلان شیخ رکن الدین نے ابتدائی زندگی پاٹ شریف میں گذارنے کے بعد ٹھٹہ میں مدرسہ قائم کیا۔ اتفاقاً وہیں وفات پائی اور کوہ مکلی پر دفن ہوئے۔ میر محمد معصوم بکھری تاریخ معصومی میں رقم طراز ہیں:

> ''مخدوم رکن الدین عرف متو یہ مخدوم بلاول کے خلفا اور حضرت ابوبکر صدیق (رضی اللہ عنہ) کی اولاد میں سے تھے۔ ان کی بلند پرواز ہمت اور ان کی رفعت پرواز حوصلے ہمیشہ وظائف، طاعات و عبادات میں صرف ہوا کرتے تھے۔ زہد و تقویٰ کے سالک اور ہدایت و ارشاد کے طالب ان سے انتہائی عقیدت اور ان کے سلوک پر اعتماد رکھتے تھے۔ علم حدیث میں وہ اپنے دور میں یگانہ تھے۔ ان کی تصنیفات میں شرح اربعین، شرح کیدانی اور بعض دوسرے رسائل مشہور ہیں، ان کی وفات ۹۴۹ھ میں جنت آشیانی کے عین فتراہ کے زمانہ میں ٹھٹہ میں ہوئی۔'' (تاریخ معصومی)

آپ کی شرح کیدانی اور شرح الاربعین کے نسخے آج بھی کتب خانہ والہار چوٹیاری میں موجود ہیں۔ جن کا ذکر سرتاج العلماء ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ نے فہارست مخطوطات میں کیا ہے۔

آپ کے دو فرزند ہوئے۔ شیخ عیسیٰ کبیر اور شیخ یوسف سندھی ان دونوں بزرگوں نے خاندان کی اقامت اور جاگیر پاٹ میں ہونے کے باوجود اسلاف کی روایات کو قائم رکھتے ہوئے،

اپنے علاقہ کے علاوہ حدود شہر سے باہر بھی علم و عرفان کی شمع کو جلائے رکھا۔ فرزند کلان شیخ عیسیٰ کبیر نے اپنے دو فرزندوں شیخ معروف ثانی اور شیخ عثمان کے ہمراہ سیت پور مظفر گڑھ (موجودہ پنجاب) میں مدرسہ قائم کیا۔ وہاں چھوٹوں بڑوں سب ہی کے مرشد و مربی بنے۔ ملا غوثی نے ''گلزار ابرار' میں شیخ معروف و عثمان کو ''علم و عرفان'' کی کان سے تشبیہ دی ہے۔

ان ہی ایام میں اس خانوادہ کے ایک اور فرد فرید مخدوم عباس پاٹ سے قریبی علاقہ ہنگورجہ منتقل ہوگئے۔ آپ کا ذکر خیر ہمعصر تاریخ معصومی میں موجود ہے۔ سندھ کی تاریخوں میں بلحاظ قدامت چچ نامہ کے بعد تاریخ معصومی پہلی تالیف ہے، جس میں فاتح سندھ محمد بن قاسم سے لیکر اکبر اعظم کے سندھ پر تسلط ہونے (۱۰۰۱ھ) تک کے حالات جمع کئے گئے ہیں۔ مصنف کی تحریر اس حیثیت سے بھی اہم ہے کہ اس کا مؤلف مرزا عبدالرحیم خانخانان کے ہمراہ تھا۔ مخدوم عباس پاٹائی ثم ہنگورجائی کے متعلق اس میں لکھا ہے:

> ''مخدوم صاحب کا اصل وطن قصبہ پاتر (پاٹ) تھا ۹۴۷ھ میں وہ تشریف لا کر ہنگورجہ میں مقیم ہوئے، علم تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علوم میں کمال مہارت رکھتے تھے۔ مسائل کی تحقیق و تدقیق بڑی اچھی طرح اور مکمل طور پر کیا کرتے تھے۔ زہد و تقویٰ میں یہ خود اپنی نظیر آپ تھے۔ دن اور رات کے جملہ اوقات میں وہ طرح طرح کی عبادتوں میں مشغول رہا کرتے تھے۔ تلاوت حدیث کے موقع پر وہ بڑے عجز و انکساری سے کام لیا کرتے۔ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے وقت بے اختیار ہو جاتے اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات ہونے لگ جاتی۔ جس کی وجہ سے سننے والے کو احادیث سننے کی تاب نہ رہتی۔ مولانا بلند مرتبہ پر فائز تھے۔ وہ شعبان ۹۹۸ھ کو عالم آخرت کی طرف سدھارے ان کی عمر ۹۶ سال تھی۔'' (تاریخ معصومی)

غوثی نے آپ کی ہنگورجا منتقلی اور وفات کا سن نہیں دیا، البتہ وہ آخر میں لکھتے ہیں:

> ''دین دیانت، دانش، بینش طبیعت میں نرمی اور اختلاط میں گرمی یہ اوصاف یقیناً مخدوم کی سرشت میں داخل تھے۔ آغاز ہوش سے واپسین دم تک طلب کے واسطے کسی کے گھر اور کسی کے سامنے آمد و رفت میں اپنے قدم گرد آلود نہیں کیا۔ اب باستحقاق جانشین اُس مسجد میں اور حال کے مدرسہ میں مسیح القلوب شیخ حبیب اللہ (شیخ عیسیٰ جنداللہ) ہیں۔ جو ظاہری فضیلت میں سب سے زیادہ کامیاب اور سرسبز اور پرہیزگاری میں وہاں کے جملہ فضلاء سے زیادہ مشہور اور با استحکام ہیں۔''

غوثی کے اس بیان سے ان حقائق کی تصدیق ہوتی ہے کہ حضرت مسیح الاولیاء و مسیح القلوب شیخ عیسیٰ جنداللہ وحبیب اللہ السندی ثم برہانپوری کا اپنے آبائی وطن سے مستقل تعلق تھا۔ ۹۹۸ھ میں سندھ میں موجود تھے اور جانشین مقرر ہوئے۔ ان کی موجودگی سے سندھ کی تمام فضلاء میں ان کی افضلیت ظاہر ہوئی۔ غوثی کے اس بیان سے پیر حسام الدین راشدی کے پیش لفظ میں دیئے گئے اس تاثر کی نفی ہوتی ہے کہ خانوادہ مسیح الاولیاء ۹۵۰ھ میں سندھ سے کچھ اس طرح گیا کہ مڑ کر تک نہیں دیکھا اور ان کا اپنے وطن سے کوئی تعلق باقی نہ رہا۔

غوثی کے بیان سے اُس مقامی روایت کو تقویت ملتی ہے کہ پاٹ کے ٹیلہ پر موجود قدیم مسجد کی بنیاد خود مسیح القلوب شیخ عیسیٰ نے رکھی تھی۔ جس کی توسیع ان کے پوتے مخدوم حسن قاری نے کی۔ مخدوم حبیب اللہ سیوہانی (ولادت ۱۲۶۴ھ) نے کتاب گلزار ابرار سے بزرگان سندھ کی "فہرست" بنا کر ان کا تعارف تحریر کیا ہے، اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ سیوہن شریف میں آج بھی موجود ہے۔ مخدوم عباس کے متعلق لکھا ہے:

> "بڑے علامہ اور محدث سندھ مشہور و معروف تھے۔ پاٹ میں پیدا ہوئے، پھر ہنگورجہ میں اقامت اختیار کی۔ ان کے والد یوسف کو یوسف جمال اور جلال علی کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ مخدوم عباس محدث، شیخ طاہر محدث کے بھائی تھے۔"

عام طرح کتابوں میں شیخ یوسف کے تین فرزندوں طاہر، طیب اور قاسم کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن غوثی نے مسیح القلوب کو بسبب رشتہ داری مخدوم عباس کا جانشین دکھایا ہے۔ جس سے قریبی رشتہ داری ثابت ہوتی ہے۔ ممکن ہے مخدوم عباس شیخ طاہر کے چچازاد بھائی ہوں۔ لیکن مقامی روایات اور قلمی مواد میں بھائی کا لفظ لکھا ہے۔

تاریخ معصومی میں مسیح الاولیا کے جد کا نام مخدوم رکن الدین عرف "مخدوم متو" لکھا ہے۔ واضح رہے کہ "متو" لفظ دراصل ایک رائے کے مطابق سندھی لفظ "مٺو" ہے، جسے اردو میں "مٹھو" لکھا جائے گا۔ یعنی "میٹھا"۔ مخدوم رکن الدین کو عرف عام میں مخدوم "میٹھا" یا "مٹھو" یا "متو" کہا جاتا تھا۔ سندھی زبان کے پرانے قلمی نسخوں میں موجود زمانے کے سندھی لفظ "مٺو" کو "متو" کے طرز پر لکھا دیکھا گیا ہے۔ اسلئے اغلب یہی ہے کہ "متو" اصل میں "مٺو" یا "میٹھا" ہے۔ اگر لفظ "متو" کو متو ہی پڑھا جائے تو جلال یا جلالی کے معنیٰ میں سمجھا جائے گا۔

برہانپور میں جلال متو کا مزار مرجع خلائق ہے۔ آپ شیخ شرف الدین شاہ شہباز رحمۃ اللہ علیہ کے ممتاز خلیفہ تھے، یہ بزرگ احمد آباد گجرات کے رہنے والے تھے۔

اگر ہم اس بات کو تسلیم کریں کہ شیخ جلال متو یا ''میٹھا'' اور بزبان سندھی ''مٹھو''، اوپر بیان کئے گئے مخدوم رکن الدین عرف مخدوم متو کے فرزند ہیں تو انہیں شیخ یوسف سندھی (جد مسیح القلوب شیخ عیسیٰ جنداللہ) کا بھائی سمجھنا چاہئے۔ اس ضمن میں ہمیں مندرجہ ذیل حقائق سے فیصلہ کرنے میں مدد ملے گی:

اولاً: متو سندھی لفظ ہے۔ سندھ میں مخدوم رکن الدین اس لقب سے عرف عام میں مشہور تھے اور شیخ جلال بھی ''متو'' اپنے والد کے حوالے سے کہلائے۔

ثانیاً: شیخ جلال متو گجرات میں رہے اور وہاں سے برہانپور آئے۔ شیخ یوسف سندھی ابن شیخ رکن الدین عرف مخدوم متو بھی گجرات میں رہے۔ احمد آباد ہی میں شیخ جلال، شاہ شہباز کے مرید ہوئے۔

ثالثاً: غوثی کا بیان کہ مخدوم عباس، شیخ جلال کے فرزند تھے۔

رابعاً: شیخ جلال متو کی سندھ کی نسبت ہونے کی وجہ سے شیخ ابراہیم بکھری السندی کا ان سے تعلق پیدا ہوا اور ان کے مرید ہوئے۔

خامساً: شیخ جلال متو برہانپور میں آ کر رہے اور وہیں ان کا مزار ہے۔ ان کے مرید شیخ ابراہیم بکھری ۹۹۸ھ میں واصل بالحق ہوئے۔ جس سے شیخ جلال متو کے زمانہ حیات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

حبیب اللہ سہوہانی کا یہ کہنا کہ مخدوم عباس کے والد جلال اور شیخ یوسف ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں، سہو نظر ہی ہوسکتا ہے۔ بلکہ یہ دو بھائی ہیں جو شیخ رکن الدین یا مخدوم متو کے فرزند ہیں۔ اس رشتہ سے مخدوم عباس بن جلال، شیخ طاہر طیب اور قاسم کے چچازاد بھائی ہوئے۔ اگر ہمیں جلال متو کو شیخ یوسف کے بھائی تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ خانوادہ مسیح الاولیاء کے بزرگ ہمایوں کی سندھ آمد سے کافی عرصہ پہلے گجرات اور برہانپور آتے رہتے تھے۔ مولوی خلیل الرحمٰن برہانپوری تاریخ برہانپور میں حضرت مولانا شیخ قاسم (سندھی) رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر میں تاریخ اولیاء کے حوالے سے لکھا ہے:

''وہ (شیخ قاسم) فرزند مولانا سندھی برہانپوری (شیخ یوسف سندھی) کے اور بھائی شیخ محمد پٹنی (پاٹائی) صاحب مجمع البحار (تفسیر) حضرت شاہ عیسیٰ جنداللہ خلف الصدق حضرت شیخ محمد قاسم کے ہیں۔ (تاریخ برہانپور ص ۱۲۶ طبع ثانی مطبوعہ کوثر پریس برہانپور) تاریخ برہانپور کے اس بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ خانوادہ راشد برہانپوری کے بیان کردہ ۹۵۰ھ کی ہجرت سے ایک زمانہ پہلے برہانپور سے وابستہ تھا۔ بلکہ دیگر بزرگان سندھ بھی ۹۵۰ھ سے پہلے برہانپور سے وابستہ رہے جن میں شیخ ابراہیم کلہوڑا اور شیخ وھبان سندھی کے نام سرفہرست ہیں۔ مقامی روایات اور حبیب

اللہ سہوانی کی غیر مطبوعہ تحریریں مسیح القلوب شیخ عیسیٰ کی منکوحہ اول مخدوم عباس کی دختر بتاتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ غوثی نے مخدوم کی وفات کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:

''اب با استحقاق جانشین اس مسجد اور حال کے مدرسہ میں مسیح القلوب شیخ حبیب اللہ ہیں جو ظاہری فضیلت میں سب سے زیادہ کامیاب اور سرسبز اور پرہیزگاری میں وہاں کے جملہ فضلاء سے زیادہ مشہور اور با استحکام ہیں۔'' (گلزار ابرار)

واضح رہے کہ 'مسیح القلوب' اور 'حبیب اللہ' شیخ عیسیٰ کے القاب ہیں۔ مخدوم حبیب اللہ سہوانی، مخدوم عباسؒ کی اولاد کے متعلق ''فہرست'' میں رقم طراز ہیں:

''ان کی اولاد سے مخدوم جنید اللہ قریبی شہر ہالانی میں جابسے، جن کے فرزند مخدوم اسماعیل جن کے فرزند مخدوم عثمان اور جن کے فرزند مخدوم داؤد تھے، یہ وہی مخدوم داؤد ہیں، جن کی اولاد میں سے مخدوم نور محمد مشہور تھے۔ انہی کی اولاد تادم زمانہ تھریچانی (سکھر کے نواح) میں مقیم ہے۔''

بندہ زمانہ حال میں ایک بزرگ الشیخ محمد حسن یحیٰی القریشی الصدیقی تھریچانوی سے بہ خوبی واقف ہے، جو عالم و فاضل ہونے کے ساتھ عالم باعمل ہیں۔ عربی اور فارسی پر خاصا عبور رکھتے ہیں اور مخدوم عباس کی اولاد سے حال حیات ہیں۔

سندھالاجی جامشورہ میں ایک قلمی نسخہ ''انساب مشائخ سیوستان'' محفوظ ہے۔ جو افقہ الفقہ فی السند مخدوم حسن اللہ شاہ صدیقی پاٹائی المتوفی ۱۹۲۰ء نے تحریر کیا تھا۔ اس فارسی نسخہ کا سندھی ترجمہ ان کے نواسے مخدوم علی گوہر صدیقی (المتوفی ۱۹۷۲ء) نے کیا۔ اس نسخہ میں شیخ یوسف سندھی کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

''شیخ الاسلام محمد یوسف سندھی شہابی کہ جد حقیقی مسیح الاولیاء مذکور است (اولادش) کثیر التعداد در ملک ہندستان...... مریدان بسیار داشت کہ یکے ازاں میاں میر بالا پیر سیوستانی لاہوری سلسلہ مرشدی خود از واسطہ شیخ خضر سیوستانی (سہوان) با یوسف داشت و ابوالفضل وفیضی کہ نامداران دیار ہندستان اند سلسلۂ مرشدی از واسطہ جد خود شیخ خضر سیوستانی در شیخ یوسف طور موصول دارند......''

یعنی میاں میر اصلاً سہوانی آخراً لاہوری بن قاضی سائیں دنہ بن قاضی قلندر فاروقی (ولادت ۹۳۸ھ-۱۵۳۱ء، وفات ۱۷ ربیع الاول سن ۱۰۴۵ھ-۱۶۳۵ء بحوالہ سکینۃ الاولیاء) شیخ خضر کے توسط سے آپ (شیخ یوسف) کے مرید تھے، یہ وہی شیخ خضر ہیں جن کے حوالے سے

ابوالفضل اور ملا فیضی بھی آپ کی مریدی میں شامل تھے۔ میاں میر اپنے مرشد شیخ خضر کے حکم سے ہی لاہور منتقل ہوئے اور خانقاہ قادریہ کی بنیاد رکھی۔ شیخ خضر نے ناگور میں شیخ یوسف سندھی کی ارادت میں مستقل سکونت اختیار کی۔ جہاں سن ۹۱۱ھ میں ابوالفضل اور ملا فیضی کے والد شیخ مبارک نے جنم لیا۔ یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ شیخ طاہر کے گجرات کی طرف سفر سے بہت پہلے شیخ یوسف ناگور اور ہندستان کے دیگر مقامات کی طرف سفر کر چکے تھے۔ شیخ یوسف اور ان کے دو فرزندوں شیخ طاہر اور طیب کے جس سفر کا ذکر غوثی نے کیا ہے، وہ ہندستان کی طرف کئی ایک اختیار کئے گئے سفر میں سے کسی ایک کا ذکر ہے۔

شیخ مبارک بن خضر اپنے فرزند ملا فیضی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''پدرم شیخ خضر عنایت وشفقت بسیار داشتہ اند رفتہ داد خواہی کرد ہمچنین بخدام شیخ یوسف سندھی کہ سیاہ ہفت اقلیم است و بیست حج گزاشتہ بودند، براحوال پدراں اطلاع داشت'' (بیاض رقعات قاضی عبدالرسول سیوستانی تالیف و کتابت سن ۱۱۲۳ھ-۱۷۱۱ء موجود سینٹرل لائبریری جامشورو)۔

یعنی شیخ مبارک کے والد شیخ خضر پر شیخ یوسف سندھی کی بہت زیادہ شفقت اور عنایت ہے۔ اور ہم سب شیخ یوسف سندھی کے خادم ہیں۔ جو ہفت اقلیم کے سیاح ہیں اور انہوں نے بیس حج کئے ہیں اور ہمارے بزرگوں کے حال سے واقف ہیں۔

ابوالفضل آئین اکبری میں رقمطراز ہیں: ''شیخ یوسف سندھی جو صورت اور معنیٰ کا سیر کر چکے تھے، اور بیشمار کمالات حقیقی دکھا کر مخلوق کو ہدایت کی راہ پر چلانے اور رہنمائی کرنے میں اپنی حیات بسر کرتے تھے۔ اور ایک دنیا کو آپ کی ہدایت سے آخرت کا ذخیرہ فراہم ہو رہا تھا۔''

زمانہ حال میں الشیخ محمد حسن یحییٰ تھریچانی جن کا ذکر مخدوم عباس کے حوالے سے ہو چکا اور کئی حج وعمرے کر چکے ہیں، مکہ مکرمہ سے ایک عرب جن کا اسم زید مطر قرشی الصدیقی ہے کا خط لائے۔ جس میں انہوں نے دیار سندھ میں موجود ''صدیقی القریشی'' خاندانوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ مزید لکھا ہے کہ وہ شیخ رکن الدین اور شیخ یوسف سندھی کے زمانہ سے وہیں مقیم ہیں۔ جن کی وہ اولاد ہیں۔ عزیزیہ میں ان کا مکان ہے، ان کی خاندانی روایت کے مطابق یہ بزرگان سندھ میں سیوستان (سہون) کے قریب رہتے تھے۔ جن کے مدارس و جاگیرات وہیں تھیں۔ زید مطر قرشی مکی کو اس خانوادہ کے متعلق مزید معلومات کا بہت ذوق دامنگیر تھا، جو مختصراً لکھ کر بھیج دیا گیا۔ قدرت کے اس عجیب اتفاق سے دو اہم باتوں کا منظر پر آنا لازم ہو گیا۔ اولاً شیخ یوسف بن شیخ رکن الدین کا تعلق خانوادہ صدیقان و قریشان سے تھا کہ ایک دور دراز علاقہ

میں مقیم ہونے والی شاخ اس حوالہ سے آج تک جانی جاتی ہے۔ دوم شیخ یوسف سندھی جن کے لئے مشہور ہے کہ بیس حج کئے اور ان کے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں ایک عرصہ مقیم رہنے اور کچھ اولاد کے منتقل یا وہیں پیدا ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ شیخ طاہر محدث کا اپنی دختراں کا عقد عرب میں کرنا اور بابا فتح محمد کا مدینہ میں آخر عمر بتانے کا جواز بھی واضح ہوجاتا ہے۔ سبحان اللہ۔ اللہ جل شانہ ہی اپنے راز مناسب وقت پر ظاہر کرتا ہے۔

غوثی گلزار ابرار میں ''یاد مخدوم نوح'' کے باب میں لکھتے ہیں کہ شیخ یوسف رسمی علوم کے آغاز تحصیل میں مخدوم نوح کے ہم درس تھے۔ جبکہ مقامی قلمی ذرائع ان کی قرابت کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ شیخ یوسف کی منکوحہ بی بی کزبانو حضرت مخدوم نوحؒ کی قریبی عزیزہ تھیں۔

شیخ یوسف سندھی نے ناگور میں قیام کیا اور اُچ کے مخدوم جہانیاں کے جانشین شیخ یحیٰی بخاری اور شیخ عبدالرزاق قادری کی شمولیت سے درس و تدریس اور تلقین کا مرکز قائم کیا۔ اپنے والدگرامی کی طرح شیخ طاہر یوسف نے بھی ''علم و عرفان'' کی جستجو میں قصبہ پاٹ کی حدود سے نکل کر سندھ اور سندھ سے باہر سفر کیے۔

''فقہائے ہند'' میں مرقوم ہے:

> ''علامہ طاہر سندھی برہانپوری سن ۹۵۰ھ میں عازم گجرات ہوئے۔ شیخ عبدالاول بن علی حسینی جونپوری دہلوی (متوفی سن ۹۶۸ھ دہلی) سے علم حدیث حاصل کیا۔ کافی عرصہ آپ کے ساتھ گذارا اور آپ سے حدیث کی سند حاصل کی۔ طریقت اور تصوف میں شیخ محمد غوث گوالیاری سے فیضیاب ہوئے۔ بعد میں احمد آباد اور دکن کا عزم کیا۔ وہاں شیخ ابراہیم بن محمد ملتانی سے علم حاصل کیا۔ پھر ایرج پور آئے۔ وہاں سے برہانپور وارد ہوئے۔''

(فقہائے ہند محمد اسحاق بھٹی ادارہ ثقافت اسلامیہ)

جبکہ آپ کے متعلق 'انساب مشائخ سیوستان' میں لکھا ہے: ''اصل وے در سندھ است کہ از مطولات ظاہر است و اکثر حال او کہ در تاریخ ہند مرقوم است باین سبب کہ اولیاء از متقدمین در خورد سالی در ملک عرب و ہندستان و گجرات گزار یندہ اند۔ پس در ہر جا کہ بعزازت وخویشی پیوند گرویدہ اند۔ ازان نشان متاخرین قلمبند کردہ اند۔ میدان حاشیہ تنگ است، ورنہ حال وی از روئے کتب خصوصاً گلزار ابرار للشیخ محمد غوثی و کتاب ''کشف الحق'' تفصیل میران بوبکانی مفصل می نوشتم۔'' ترجمہ: وہ اصل سندھ کے رہنے والے تھے۔ جیسا کہ بڑی کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ ان کا اکثر احوال جو تاریخ ہند میں لکھا ہے، اس وجہ سے کہ ان کے پہلے بزرگان بچپن میں عرب،

ہندستان اور گجرات میں رہتے تھے۔ اس لئے ہر جگہ ان کی رشتہ داری قائم تھی۔ اس بات کی متاخرین نے نشاندہی کی ہے۔ حاشیہ تنگ ہے ورنہ ان کے حالات جیسا کہ گلزار ابرار میں شیخ غوثی اور کشف الحق میں میران بوبکانی نے دیئے ہیں، تفصیل سے بیان کیے جاتے۔

ہندستانی تذکروں میں سے ایک ''تذکرہ اولیاء دکن'' میں مولانا صوفی رقمطراز ہیں: ''شیخ طاہر محدث مدت دراز تک مکہ و مدینہ میں سکونت پذیر رہے ہیں، خاص آپ نے اپنی صاحبزادیوں کی شادیاں مکہ میں اہل عرب سے کردیں تھیں۔''

خانوادہ مسیح الاولیاء کے اسلاف کا پشت در پشت ذکر خیر اس لئے کیا گیا کہ ہم پیر حسام الدین راشدی کے اس بیان کا جائزہ لے سکیں کہ آیا علماء وفضلاء پاٹ یہاں کے غیر محفوظ حالات دیکھ کر برہانپور تشریف لے گئے یا اس خانوادہ کے افراد اپنے خاندانی روایات کے پیش نظر مختلف اوقات میں متعدد مقامات پر خانقاہیں اور مدارس قائم کرتے رہتے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ پیر حسام الدین راشدی کا یہ تاثر سہو نظر یا اس خانوادہ کی تاریخ کا محض سطحی جائزہ لینے کا نتیجہ ہے۔ وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ شاید سمہ حکمرانوں کے زوال کے بعد پیش آنے والے عمومی حالات کا نتیجہ تھا کہ شیخ طاہر مع بعض عزیزان اپنا وطن، خاندان کے باقی افراد، مدارس اور جاگیرات چھوڑ کر اچانک چل پڑے۔ ہم آگے چل کر اس سفر (جو ۹۵۰ھ میں اختیار کیا گیا) کی تفصیلات اور حقائق کو ہمعصر تاریخ کو مدنظر رکھتے ہوئے جائزہ لیں گے کہ کس طرح ''علم وعرفان'' کی شمع کو روشن رکھنے کے لئے ''مختلف سفر'' اختیار کئے گئے اور ۹۵۰ھ کا سفر محض کسی ایک سفر کی تفصیل ہے جو تاریخ کے اوراق پر محفوظ ہوگئی، اس سفر کے بیان کردہ واقعات اور وقوع پذیر حالات آپس میں خلط ملط ہوگئے ہیں۔ جن کا جائزہ بھی مناسب وقت پر لیا گیا ہے۔ پیر صاحب کا پیش لفظ لکھتے ہوئے یہ تحریر کرنا کہ پاٹ کے علماء وفضلاء اور صوفیاء (خصوصاً خانوادہ مسیح الاولیاء) اس طرح گئے کہ پھر کسی نے سندھ کا رخ نہ کیا، اپنے آپ ختم ہوجاتا ہے، موصوف کے اس مغالطے کا آئندہ صفحات میں حقائق کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے۔

تعلیق (۲): برہانپور مدھیا پردیش (ہند) کا شہر جو ۱۱-۱۸ عرض البلد شمال اور ۶-۷۲ طول البلد مشرق پر دریائے تاپتی کے شمالی کنارہ پر واقع ہے۔ ۱۱۴۱ھ/ ۱۷۲۸ء میں نظام الملک آصف جاہ اول نے دریا کا طرف چھوڑ کر باقی اطراف میں ایک فصیل بنوائی تھی۔ فصیل کے اندر علاقہ کا رقبہ ڈھائی مربع میل ہے۔ جبکہ پرانے شہر کے آثار فصیل سے باہر بھی ایک بڑے رقبہ پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اس شہر کا نام ایک بزرگ برہان الدین غریب کے نام پر رکھا گیا۔ اس کی بنیاد خاندیش کے فاروقی خاندان کے بانی نصیر خان الفاروقی نے ۸۰۱ھ یا اس کے قریب کسی سال

میں رکھی۔ برہانپور کی قدیم قابل ذکر عمارات میں مبارک شاہ فاروقی اور راجے علی خان ملقب عادل شاہ فاروقی کے مقبرے بہت شہرت رکھتے ہیں۔ مؤخر الذکر کی ۹۹۷ھ میں تعمیر کردہ جامع مسجد اور دریائے تاپتی کے کنارے واقع پرانا قلعہ اب بھی اپنے آثار نمایاں کیے ہوئے ہے۔

پاٹ کی طرح برہانپور کی عظمت اس حقیقت میں پنہاں ہے کہ صوفیا، بزرگان دین اور علماء وفضلاء نے دور دراز کا سفر کر کے اس کو اپنے لئے جائے سکون قرار دیا۔ جن میں مسیح الاولیاء اور ان کے چند رفقاء نے جو سندھ سے آ کر یہاں آباد ہوئے، اس کی شہرت کو چار چاند لگائے۔ ان میں حضرت شیخ برہان الدین غریب خلیفہ حضرت نظام الدین اولیاء، حضرت شاہ ابوالعلا اکبر آبادی، میر معصوم بکھری سندھی وغیرہ جیسی بے شمار ہستیوں کے نام سامنے آئے ہیں۔ جنھوں نے برہانپور سے تعلق رکھا۔ شاہان وقت پر نظر ڈالی جائے تو اکبر گیارہ ماہ تک برہانپور کی فتح کے لئے مصروف عمل نظر آتا ہے۔ اکبر کے مقرر کردہ گورنر خانخانان عبدالرحیم خان نے بائیس سال برہانپور میں بسر کئے۔ شہزادہ خرم دکن کی مہم پر اپنے والد بادشاہ جہانگیر کے حکم سے برہانپور پہنچا تو بس یہیں کا ہو رہا اور کئی سال یہاں سے دکن کی فوج کشی کی نگرانی کرتا رہا۔ یہاں کی عمارات میں آہوخانہ، شہزادی نیلم کا مقبرہ، خرم محل، محل گوہر آدرا اور بے شمار باغات و آثار ماضی کی عظمت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ شاہجہان نے برہانپور کو ''باب دکن'' اور ''دارالعلوم'' کا نام دیا۔ بلکہ ممتاز محل نے جب برہانپور میں وفات کی تو اسے دریائے تاپتی کے کنارے شاہی باغ میں بطور امانت دفن کیا گیا۔ پھر اس امانت کو تاج محل منتقل کیا گیا۔

عظیم مغل شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر نے اپنی عمر عزیز کا ایک حصہ برہانپور ہی میں گذارا۔ یہیں اپنی خالہ زاد بہن سے شادی کی۔ حضرت مسیح الاولیاء شیخ عیسیٰ جنداللہ پاٹائی ثم برہانپوریؒ کی درگاہ پر ان کا نام نہ صرف حاضری دینے والوں میں شامل ہے، بلکہ وہ حضرت مسیح کے خلیفہ برہان الدین راز الٰہی کے پاس دعا کے لئے آتے رہے۔ یہ شہر کئی قسم کی صنعتوں کا بھی مرکز رہا ہے۔ یہاں اونی، سوتی اور ریشمی پارچہ جات خصوصاً نفیس قسم کی ململ کے کارخانے مغلیہ دور میں بھی بڑی شہرت رکھتے تھے۔ برار کا شیرازہ بکھرنے کے بعد والئ برہانپور محمد شاہ فاروقی نے شیخ طاہر کو برہانپور آ کر رہنے کی دعوت دی۔ اسی زمانہ میں حضرت شیخ عیسیٰ سندھی یہاں عشق مجازی سے دوچار ہوئے۔ پہلا عقد دیار سندھ میں کرنے کے بعد عقد ثانی کیا۔ لیکن حضرت شیخ لشکر محمد عارف کی صحبت نے آپ کو مستقلاً یہیں اقامت اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ سن ۹۹۸ھ میں حضرت مخدوم عباس کی وفات کے بعد پھر آپ کا سندھ کی طرف کسی سفر کا اشارہ نہیں ملتا۔ بجز اس کے کہ آپ کے فرزندان، رفقا اور احباب کا آنا جانا بدستور جاری رہا۔

اس کا ثبوت اہل سندھ کے پاس موجود وہ نادر قلمی نسخہ ہے جو ۱۰۳۵ھ میں کتابت ہوا۔ اس کا نام "غایۃ التحقیق شرح الکافیہ" ہے۔ اس کے کاتب نصیر الدین روح اللہ بن بابوجی بن موسیٰ سندھی ہیں۔ خود کو شاہ عیسیٰ جنداللہ کا غلام ظاہر کیا ہے۔ آخر میں حضرت مسیح الاولیاء کے شان میں وہ شعر تحریر کیا ہے جسے راشد برہانپوری نے سوانح حضرت شیخ عیسیٰ بیان کرتے ہوئے اسے محمد قاسم فرشتہ سے منسوب کیا ہے۔ لیکن اس ضمن میں وہ تاریخ سے ٹھوس حوالہ دیئے بغیر رقمطراز ہیں:

"محمد قاسم فرشتہ فرطِ ارادت سے کہہ اٹھا کہ:

دو عیسیٰ است فرخندہ در نسل آدم
یکے ابن قاسم یکے ابن مریم"

جبکہ شیخ عیسیٰ کی وفات حسرت آیات ۱۰۳۱ھ کے چند سال بعد ۱۰۳۵ھ کی مذکورہ تصنیف کے ورق آخر پر کاتب جو خود کو غلامان حضرت شاہ عیسیٰ لکھ رہا ہے، یہی شعر قلمبند کیا ہے:

دو عیسیٰ است جان بخش در نسل آدم
یکے عیسیٰ است بن قاسم دگر عیسیٰ است بن مریم

وضاحت کے ساتھ یہ تو نہیں لکھا کہ کاتب شیخ عیسیٰ کا مرید دیار سندھ میں ہوا تھا یا برہانپور جا کر غلامی کا شرف حاصل کیا۔ لیکن اغلب یہی ہے کہ یہ علم دوست سندھ میں ہی رہا اور یہیں مستفیض ہوا ہوگا۔ وگرنہ راشد برہانپوری ان کا ذکر ضرور کرتے۔

بیان کردہ شعر کے متعلق راشد برہانپوری کی رائے ہے کہ یہ محمد قاسم فرشتہ کا ہے، لیکن اس ضمن میں وہ کوئی مستند حوالہ دینے سے قاصر ہیں۔ ممکن ہے یہ شعر اسی علم دوست نصیر الدین کا ہو، جس نے شرح کافیہ کے اختتام پر فرط عقیدت سے خود کو غلام شاہ عیسیٰ ظاہر کرتے ہوئے یہ شعر بھی کہا ہو کیونکہ شعر کے الفاظ نے بمع تغیر و ترمیم کے تاریخ کے صفحات پر اپنا نقش چھوڑا ہے۔

بعض علماء اور صوفیاء بعد میں بھی سندھ سے برہانپور آتے رہے اور آپ کے فیض صحبت سے مستفیض ہوتے رہے۔ بلکہ بہت سارے سندھی بیوپاریوں نے آپ کی ذات کی وجہ سے برہانپور سے تجارتی روابط قائم کئے۔ جس محلّہ میں آپ نے اقامت اختیار کی وہاں گاہے بہ گاہے مزید اہل سندھ کے آ کر آباد ہونے سے اس محلّہ کا نام "سندھی پورہ" پڑ گیا۔ اس خانوادہ کی ہند اور سندھ میں شہرت کی وجہ سے غیر سندھی افراد بھی ہندستان سے آ کر یہاں آباد ہونے لگے۔ یہ لوگ علم، ادب اور تصوف کی روشنی سے اپنے اندر موجود اندھیرے کو ختم کرنے کی سعادت حاصل کرتے رہے۔ یہی اس خانوادہ کا مقصود تھا کہ سندھ سے آ کر یہاں "علم و عرفان" کی شمع روشن کی جائے۔ ان کے اسلاف "پاٹ شریف" مرکز ہونے کے باوجود مختلف مقامات پر جا کر یہ فرض

ادا کرتے رہے۔ جس طرح برہانپور میں رشد و ہدایت کی مسند آراستہ کی جن کی فیوض و برکات ہندستان کے ہر گوشہ میں محسوس کیے گئے۔

جب محلّہ سندھی پورہ دیکھتے ہی دیکھتے گنجان آباد ہونے لگا، تو اس کے قریب ''صحت کنواں'' کے نام سے ایک اور محلّہ آباد ہوا۔ جو بعد میں نواب ابوالخیر خان کی نسبت سے خیر خانی کہلایا۔ یہاں ٹھٹھ سندھ کے مہاجر آباد ہوئے۔ یہ لوگ کپڑے پر چھپائی کے کام کے ماہر تھے۔ آج بھی ٹھٹھ سے سفر کر کے آنے والے لوگ یہاں آباد ہیں۔ اور ان کی دست کاری کو قبولیت عامہ حاصل ہے۔

تعلیق (۳): پیر حسام الدین راشدی کا یہ بیان کہ: ''سندھ کے اس زمانہ کے دگرگوں حالات نے ان بزرگوں کا وطن کی طرف سے کچھ ایسا دل توڑا کہ نہ پھر وہ سندھ آئے اور نہ سندھ والوں کو ان کا کچھ پتہ چلا......'' ایک ایسا مفروضہ ہے، جس کے لئے یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ سندھ کے عمومی حالات دگرگوں تھے، لیکن حضرت مسیح الاولیاء کے سندھ سے برہانپور جانے اور ان کے بعد کے روابط پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اس دور میں بھی تاریخ معصومی جیسی قابل قدر کتاب تحریر کی گئی۔ جس میں خانوادہ مسیح الاولیاء کے دو اہم فرد مخدوم عباس اور مخدوم رکن الدین کا تعارف سنہری حروف میں مختصر مگر جامع انداز میں موجود ہے۔ ان کے علاوہ بھی کئی ایک شہروں، قصبوں اور علماء و فضلاء کا ذکر اس کتاب میں موجود ہے، جن کا تعلق اس زمانہ کی سندھ سے تھا۔ تاریخ میں خواہ سندھ میں قلمبند کی گئی ہو یا ہندستان میں بادشاہوں اور جنگوں کے علاوہ، علماء و فضلا کا ذکر یوں ہی مختصر پڑھنے کو ملتا ہے۔ ملا غوثی کے گلزار ابرار کو لے لیجیے، جس میں شیخ یوسف، شیخ قاسم اور شیخ جلال متو کا ذکر کسی طور سوانح کے حوالے سے کافی نہیں۔ دیگر اولاد مسیح الاولیاء کا احوال تو کجا اس ہمعصر تحریر میں تو شیخ عبدالستار کی جائے پیدائش سے بھی آگاہی حاصل نہیں ہوتی۔

صاحب تحفۃ الکرام ٹھٹھ میں مدفون ایک بزرگ شیخ عیسیٰ لنگوٹی کے آگے برہانپوری کا لفظ مغالطے میں آکر لکھ گئے ہیں، اس قسم کی غلطیاں اس کتاب میں عام ہیں۔ علی شیر قانع کی تحقیق کا معیار اہل علم سے مخفی نہیں۔ لیکن وہ شیخ عیسیٰ جنداللہ سندھی کا صحیح نام معہ مختصر تعارف دیگر صفحات پر لکھ کر اپنی غلطی کا ازالہ کر چکے۔ بلکہ مذکورہ مصنف اپنی ایک اور کتاب ''معیار سالکان طریقت'' میں بھی حضرت مسیح الاولیاء کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''شیخ عیسیٰ سندی: جنداللہ لقب، مرید شیخ محمد لشکر داد خلیفہ شیخ محمد غوث کو امری [کذا] از تصانیفش تفسیر انوار الاسرار مشہور از خلفائش شیخ برہان شطاری برہانپوری معروف فوتش ۱۰۳۱ھ''

پھر آگے لکھتے ہیں:

''شیخ عبدالستار: ولد شیخ عیسیٰ سندھی، بجانشینی پدر در برہانپور بکرامات و مقامات عالیہ اظہر انام و معتقد علیہ خاص و عام زیستہ'' (معیار یازدہم- کتاب معیار سالکان طریقت)

پیر حسام الدین راشدی اپنے ہی بیان کہ ''نہ پھر وہ سندھ آئے اور نہ سندھ والوں کو ان کا کچھ پتہ چلا'' کی تردید ''تذکرہ مشاہیر سندھ'' کا حواشیہ لکھ کر کر رہے ہیں۔ وہ اس کتاب میں ذکر کیے گئے ''مفتی عبدالواحد کبیر پاٹائی'' کا حواشیہ لکھتے ہوئے حضرت شیخ عیسیٰ جنداللہ پاٹائی ثم برہانپوری کا مفصل شجرہ اور دیار سندھ میں رہنے والی اولاد کا ذکر مع پیدائش اور وفات کے سال کے ساتھ کر رہے ہیں۔ بابا فتح محمد عربستان منتقل ہونے سے پہلے سندھ میں آکر اپنے بھائی کے بیٹے شیخ حسن قاری کے پاس رہے۔ ان کی تصنیف ''مفتاح الصلواۃ'' ابتدا ہی سے سندھ کے مدارس میں پڑھائی جاتی رہی۔ ان کے دست مبارک سے لکھی گئی ''مفتاح الصلواۃ'' سے متعدد نسخے سندھ کے علماء نے تیار کیے، جن میں سے کئی نسخے سندھ کے قدیم علمی خاندانوں کے پاس آج بھی محفوظ ہیں۔ بابا فتح محمد نے سندھ میں رہ کر سیوستان (سہوان)، پاٹ اور سن کے علاقوں میں نماز پڑھنے کے اوقات سایۂ کے حساب سے مقرر کیے۔ بلکہ پاٹ اور سہون کے خانوادہ مسیح الاولیا کے پاس جو بعد کے زمانے میں مختلف موضوعات پر کتب لکھی گئیں، ان میں جو معلومات حواشیہ میں درج ہیں وہ ہندستانی تذکروں میں بھی نہیں ملتی۔ ان کے علاوہ تجلیات اسرار معانی، کحل الجواہر، المکتوب الحبیب، انساب مشائخ سیوستان، خطوط، مختلف حاکمان کے فرمان اور گزیٹیرس اس موضوع پر تحقیق کے لئے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

☆

تحمید و تمہید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بعد حمد و سپاس بیقاس خالقِ ارض و سما خداوند جل و علا و درود نامحدود شایستہ حضرت احمد مجتبیٰ محمد ﷺ ومناقب ومحامد شایانِ آل ازکیا و اصحابِ مقتدا رضوان اللہ تعالیٰ علیہم واوصاف ومدائح سزاوار اولیاء و مشائخ قدس اللہ اسرارہم۔ نیازمند سید محمد مطیع اللہ راشد برہانپوری اپنی کوتاہی علم و استعداد کے باوجود تذکرہ اولیائے سندھ پیش کرتے ہوئے اپنے برہانپوری ہونے پر اس لئے فخر کرتا ہے کہ

اس اولیاء خیز سرزمین کی عرفانی شادابیوں نے اپنے ایک گوشۂ چمن سے ولایت ومعرفت کی اس قدر اور ایسے گلہائے رنگارنگ وعطر افشاں عطا فرمادیے، جنہیں ترتیب میں لاکر میں اس شاداب گلدستہ کی شکل میں تذکرہ اولیائے سندھ کے نام سے دانشورانِ سندھ کو پیش کرسکا۔

برہانپور کو میں نے اولیاء خیز شہر لکھا ہے یہ صرف میری خوش نظری نہیں ہے بلکہ قدما بھی اس کو اولیاء خیز شہر ہی لکھتے آئے ہیں۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے برہان پور کو دیکھا تو بطور نذر ارادت وخراجِ عقیدت یہ اشعار پیش کئے تھے۔

فزود نورِ بصیرت لقائے بُرہانپور — ومید روح بقالب ہوائے برہانپور
دماغِ عالمیاں راچہ تازگی بخشید — طراوتِ چمن دلکشائے برہانپور
سوادِ اعظم او بسکہ نور افشاں است — ز آفتاب زغد دم سُہائے برہانپور
بنام اشرف بربہان دین غریب نمود — نصیر والیٔ کشور بنائے برہانپور
زہے مقام مقدس کہ اولیا خیز است — کند سپہر طوافِ فضائے برہانپور
فتادبسکہ گذر لشکر محمدؐ را — غبار خیربود کو چھائے برہانپور

بسرزمین ورق ابر خامۂ آزاد
نمود سبز نہالے ثنائے برہانپور

مورخ معروف محمد قاسم فرشتہ نے راجے علی خان عادل شاہ فاروقی کے مدح میں جو نیاز مندانہ پیشکش کی تھی، اس مدح کے اِس شعر کا اطلاق تو پورے خانوادۂ فاروقیہ کے عہدِ معدلت مہد پر ہوتا ہے۔

چو نسبت دارِ فاروقی است بادا جاودان عدلش
بلاہل خوردگانِ ظلم را تریاقِ فاروقی

مستند تاریخی شواہد ثابت کرتے ہیں کہ موجودہ شہر برہانپور برگزیدہ اولیائے کرام کی پیشین گوئی اور دعاؤں کی برکت سے آباد ہوا ہے۔ یہ پیشنگوئی عارف باللہ حضرت شیخ برہان الدین غریب قدس اللہ سرہٗ کی تھی جن کے نام سے منسوب ہوکر اس کا نام برہانپور ہوا۔ نیز یہ پیشین گوئی بنائے آبادی سے تقریباً ایک صدی قبل ۷۰۲ھ میں واقع ہوئی تھی، اور لطف یہ ہے کہ اس وقت بھی یعنی ۷۰۲ھ میں اس غیر مقام آباد پر صدیوں پہلے سے ایک حضرت پیر بنان قدس سرہٗ کا مزار موجود و معروف تھا۔ ان اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سنہ مذکور میں جب حضرت شیخ برہان الدین غریب نے دولت آباد جاتے ہوئے اس مقام پر قیام کیا تھا تو یہاں کے چند غیر مسلم دیہاتیوں نے آپ کو یہ بتایا تھا کہ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، جس کا نام بسانا ہے۔ اور یہاں ایک پیر صاحب کا مزار ہے جن کو ہمارے باپ دادا اور ان کے باپ دادا پیر بنان کہتے رہے ہیں۔ یہ معلوم کرکے آپ نے فرمایا کہ جب اس گاؤں کا نام بسانا اور یہاں کے پیر پیر بنان ہیں تو انشاء اللہ تعالیٰ یہاں ایک عظیم الشان اسلامی شہر آباد ہوکر رہے گا۔

حضرت پیر بنان کے متعلق بُرہانپور کے قدما میں سینہ بسینہ یہ روایت سنی گئی ہے کہ آپ بہت قدیم زمانہ کے بزرگ ہیں اور آپ کا شمار تبع تابعین میں ہے۔ یہ روایت میں نے بھی سُنی ہے لیکن بمصداق العلم حجاب الاکبر تاریخ بنائے برہانپور ۸۱۰-۲۱ کا علم ہونے کے باعث مجھے اس روایت کی صحت سے انکار ہی رہا۔ بعد میں بعض ایسی چیزیں مطالعہ میں آئیں کہ یہ حجاب اُٹھتا ہی نظر آتا ہے۔ میری تحقیقات جاری ہے۔ اگر حیاتِ مستعار نے مہلت دی اور حالات نے اجازت دی تو حضرت پیر بنان کے متعلق تحقیقی مضمون جداگانہ طور پر پیش کروں گا۔

یہاں بانیانِ برہانپور فاروقی سلاطین کے بابت یہ ظاہر کردینا ضروری خیال کرتا ہوں کہ بانی سلطنت سے لیکر خاتم سلطنت تک اس سلسلہ کے تمام بادشاہ راسخ العقیدہ سُنی ہونے کے ساتھ ساتھ خود بھی عالم و فاضل درویش دوست اور صوفیانہ ذوق سے بہرہ ور تھے اور علماء صلحاء و صوفیاء کی سرپرستی اور معارف نوازی میں ایک دوسرے پر تفوق رکھتے تھے۔ نیز ہر بادشاہ اپنے زمانہ کے

کسی نہ کسی خدا رسیدہ بزرگ کی بیعت و خلافت سے شرف یاب تھا۔ اور ہر ایک نے اپنے عہد کے مشاہیر علماء اور اہل اللہ کو بمنت و تضرع بلاکر برہانپور میں آباد کیا۔ نصیر خان فاروقی حضرت زین الدین داؤد شیرازیؒ کا مرید تھا۔ زین پور یا زین آباد انہیں کے نام سے موسوم ہے۔ آپ حضرت بُرہان الدین غریب کے خلیفہ تھے۔ عینا عادل خان حضرت شاہ بھکاریؒ کا مُرید تھا۔ اُسی کے عہد میں حضرت شاہ شہباز کے والد حضرت شیخ عبدالقدوس برہانپور تشریف لائے۔ مبارک شاہ فاروقی حضرت شاہ شاہباز کا مرید تھا۔ اعظم ہمایوں فاروقی حضرت شاہ باجن کا مرید تھا۔ محمد شاہ فاروقی حضرت شاہ آبا ابراہیم قدس سرہٗ کا مرید تھا۔ اس بادشاہ کی پیر پرستی کی مثال اور کہیں نگاہ سے نہیں گذری۔ محمد شاہ نے اپنے مرشد سے التجا کی تھی کہ جس طرح دنیا میں آپ کے سایہ عاطفت سے مالامال ہوں، چاہتا ہوں کہ قبر سے اُٹھتے ہی مجھے آپ کا دیدار اور آپ کے دامانِ کرم کا سایہ حاصل ہو۔ آپ نے منظور فرمالیا تھا کہ میری قبر بھی تمہاری قبر کے پہلو میں ہوگی، چنانچہ پہلے محمد شاہ کا انتقال ہوا اور وہ اپنے آبائی شاہی قبرستان کے عظیم الشان گنبد میں دفن کیے گئے۔ بعد وصال شیخ آبا ابراہیم کی قبر بھی شاہی مقبرہ کے اندر بادشاہ کی قبر کے برابر بنائی گئی۔ اس طرح بادشاہ کی قبروں کے پہلو بہ پہلو اس مرتاض درویش شیخ آبا ابراہیم کی قبر شاہ و گدا کے ایک صف میں ہونے کا ثبوت پیش کر رہی ہے۔ راجہ علی خان عادل شاہ فاروقی حضرت شیخ عبدالرحیم کپرونجی کا مرید تھا، جو شیخ ابراہیم قاری سندھی کے خلیفہ تھے۔ عادل شاہ نے پیر کے احترام میں ان کے قیام گاہ سے متصل ایک نئی بستی بسادی، جس کو انہوں نے بادشاہ کے نام سے عادل پورہ نامزد کیا۔ آپ بعد وصال اپنے حجرہ عبادت میں دفن ہوئے۔ عادل شاہ کو بھی خانخانان نے اُن کی خواہش و وصیت کے مطابق بجائے آبائی قبرستان مبارک پورہ کے، عادل پورہ میں ان کے مرشد کے مزار سے متصل دفن کیا۔

غرض کہ فاروقی خانوادہ کے تمام بادشاہ اپنی معارف پروری اور درویش دوستی و صلحا نوازی میں بڑے دریا دل واقع ہوئے تھے اور ہر ایک بادشاہ نے اپنے عہد کے علماء و اہل اللہ کو بمنت وتضرع برہانپور لانے میں سعی بلیغ کی۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ رفتہ رفتہ یہاں نہ صرف چاردانگ ہندوستان بلکہ عرب وعجم کے مشاہیر علماء و مشائخ تشریف لاتے اور خاص و عام کو اپنے علم وفضل کی برکتوں سے مستفید فرماتے رہے۔ چنانچہ آج برہانپور میں اندرونِ شہر اور نواح برہانپور میں دور دور تک بے حد وشمار عظیم الشان مقابر اس دعوے کی مُستند دلیل کی حیثیت سے موجود و نمودار ہیں۔

چونکہ تذکرہ ہذا میں مخصوص بزرگان سندھ اور ان کی اولاد و احفاء و بعض خلفا ہی کا ذکر کیا گیا ہے جس کو دفتر اولیائے برہانپور کا ایک باب یا ایک گلزار ہمیشہ بہار کے مخصوص تختۂ چمن سے

صرف ایک نوع کے مہکتے ہوئے پھولوں کا تر و تازہ و شاداب گلدستہ سمجھنا چاہیے، ایسا گلدستہ جس کے عطر افشاں پھولوں کی روح پرور نکہتیں دماغ اہلِ عالم کو مُعطر کرتی رہی ہیں اور معطر کرتی رہیں گی۔ انشاء اللہ تعالٰی۔

دعا ہے کہ اللہ تعالٰی ان بزرگوں کی ارواح طیبات کی برکتوں سے ارباب اشاعت، مطالعہ کنندگان اور راقم آثم کو دین و دنیا کی سرخروئی اور ایمان کی سلامتی پر خاتمہ کا موقعہ عطا فرمائے۔ آمین۔

نیازمند
سید محمد مطیع اللہ راشد بُرہانپوری

مورخہ ۲۱ ربیع الثانی ۱۳۷۴ھ
مطابق ۱۹ دسمبر ۱۹۵۴ء

ایک اہم سوال کا جواب

تاریخی پس منظر اور ملکی ماحول کے آئینہ میں

اس تذکرے میں سندھ کے ان مقتدر علمائے محدثین وصوفیائے صالحین کے حالات درج ہیں جو دسویں صدی ہجری میں اپنے آبائی وطن سے ہجرت کر کے برہانپور میں متوطن ہوئے۔ جو بزرگ براہ راست نہ آئے وہ بھی مختلف بلاد و امصار کی سیر سے سیر ہو کر بالآخر برہانپور آئے اور یہیں کے ہوئے۔

اطرافِ ملک سے برہانپور آنے والوں میں زبردست اکثریت تو علماء وصلحائے سندھ ہی کی ہے لیکن ان کے علاوہ مالوہ، گجرات، پنجاب، کشمیر، بنگال وغیرہ کے علما، صوفیا اور صلحا بھی جب یہاں آئے تو پھر واپس نہ گئے جن کے آثار و اذکار بڑی فراوانی سے آج بھی برہانپور میں موجود ہیں۔

اس صورت میں لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے برہانپور جیسے گمنان گوشہ میں کیا جاذبیت تھی کہ اس قدر دور و دراز کے برگزیدہ خصائل بزرگوں نے اس شہر کو اپنے وطن عزیز کا بدل تجویز کیا جبکہ مالوہ، گجرات، دکن وممالک شرقی نسبتاً قریب، زیادہ وسیع، کافی خوشحال اور مسلم حکمرانوں کے زیر نگین تھے؟

سوال اپنی جگہ برمحل اور معقول ہے۔ تاہم ہم مذکورۃ الصدر بزرگوں کے مسالک افتادِ طبع۔ مشاغل اور اس عہد کے ملکی ماحول پر بہ غور و تامل نظر ڈالی جائے تو واضح جواب خود سامنے آجاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ مشائخ و علماء صوفیانہ مذاق کے ساتھ ساتھ دینی علوم کی ترویج و تبلیغ میں عشق کے درجہ کا شغف رکھتے تھے۔ اپنی خانقاہوں اور دینی درس گاہوں میں تفسیر۔ حدیث فقہ، تصوف وغیرہ اعلیٰ علوم کی درس تدریس اور عارفانہ تعلیمات میں اطمینان خاطر اور ذہن و دماغ کی کاملِ یکسوئی کے ساتھ مصروف عمل تھے اور اس یکسوئی ویکجہتی میں ذرا بھی خلل برداشت نہ کر سکتے

تھے۔ چہ جائیکہ طوائف الملوکی کے لرزہ خیز ہنگامے۔ انتزاع سلطنت کے خونی انقلابات۔ ان بزرگوں نے جام نظام الدین المعروف جام نندا کا وہ پرامن اور شعائر اسلام پر عامل (۸۶۶ تا ۹۱۴) عہد دیکھا تھا جس کے متعلق مولانا محمد معصوم نامی لکھتے ہیں:

"جام نظام الدین ہر ہفتہ بہ اصطبلِ خودمی رسید و دست بر پیشانی اسپاں میکشدہ ومیگفتہ کہ اے دولت منداں غیر غزا نمی خواہم کہ سواری برشما واقع شود۔ چراکہ در حدود اربعہ حکام اسلام اند۔ دعا کنید کہ بے سب شرعی بجائے نروم وکسے نیز اینجا نیاید۔ مبادا خون مسلمانانِ بیگناہ ریختہ شود وعنداللہ سبحانہ شرمسار گردم۔ در زمانِ دولت او احیائے سُنن بنوعے شیوع یافتہ بود کہ مافوق آن تصور نہ تواں کرد۔" (تاریخ سندھ معصومی ص۷۴-۷۵)

برخلاف اس کے بابر کے خروج اور سعی ملک گیری نے اطرافِ ملک میں فتنہ وفساد اور شورش و بدامنی کا ماحول پیدا کردیا اور سب سے پہلے سندھ ہی اِس ماحول سے متاثر ہوا۔

کہا جاسکتا ہے کہ بابر نے سندھ کی طرف پیش قدمی نہیں کی اور یہ درست بھی ہے کہ وہ سندھ کی طرف توجہ کرنے کا موقعہ ہی نہ پاسکا۔ لیکن اس کے خروج کا دباؤ وہی تھا جس سے ہر طرف تباہی خیز بدامنیوں کا بازار گرم ہوگیا۔ اِن اجمال کی تفصیل یہ ہے:

بابر غزنین کابل وغیرہ علاقہ جات مفتوحہ کے استحکام کا حسبِ دلخواہ انتظام کرکے قندھار کو مسخر کرنے کے ارادہ سے کثیر التعداد فوج اور قلعہ کشائی کے وافر سامان کے ساتھ یورش کرکے حدود قندھار میں آ پہنچا۔ یہاں شاہ بیگ ارغون حکمران تھا جو ایک مرتبہ پہلے بھی بابر سے مقابلہ کرکے شکست کھا چکا تھا۔ اس نے قلعہ بند ہوکر جنگ کی تیاری کی۔ اتفاق سے بابر سخت بیمار ہوگیا۔ رفقاء نے مشورہ دیا کہ اس وقت جنگ شروع نہ کی جائے مناسب یہ ہے کہ واپس ہوجائیں اور بابر اس پر رضامند بھی ہوگیا۔ یہ خبر سن کر شاہ بیگ نے بیش قیمت تحائف اور دلجوئی کا پیغام بھیجکر دوستی اور رفاقت کا یقین دلایا۔ بابر نے اس تقریب کو غنیمت جانا اور کابل واپس چلاگیا۔ اور جواب میں شاہ بیگ کے لئے تحفے بھیجے۔

شاہ بیگ ارغون نہایت مدبر اور دانا شخص تھا وقتی طور پر قندھار سے جنگ کا خطرہ ٹل جانے سے اس کا دل مطمئن نہ ہوا، اس نے اپنی مخلص بہی خواہوں کی ایک مجلسِ مشاورت منعقد کی اور اپنے اندیشے صاف ظاہر کئے کہ اس مرتبہ تو بابر صرف قندھار کو دیکھ کر واپس چلا گیا ہے۔ لیکن آثار بتاتے ہیں کہ وہ جب تک ہمیں یہاں سے بے دخل نہ کردے، چین سے نہیں بیٹھے گا۔ اور اگر بفرضِ محال وہ اور کسی طرف مصروف ہوکر کچھ عرصہ تک یہ اقدام نہ کرے تب بھی بہت سے

شہزادے جو ملک گیری کے عزائم تو رکھتے ہیں لیکن قزلباش واز بک سلطنتوں کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی قدرت نہیں رکھتے، ہم پر ہی چڑھائیاں کریں گے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ ہم اپنا کوئی اور انتظام کرنے میں تغافل سے کام نہ لیں۔ تاریخ معصومی کے الفاظ ہیں:

"(شاہ بیگ) بہ امراء ولشکریانِ خود گفت، حضرت ظہیر السلطنت دریں مرتبہ تشریف آوردہ قندہار رادید مدوسالِ دیگر لوائے تسخیر خواہندا فراخت۔ وتا مارا ازینجا بیجا نسازند آرام نخواہند گرفت۔ ودیگر آن کہ بادشاہزادہ باسیار مجتمع شدہ دستِ ایشان بہ ازبک وقزلباش نمی رسد ومیخواہند کہ قندہار را در تصرفِ خود در آورند- مارا فکر خود باید کرد۔" (ص۱۱۰)

چنانچہ شاہ بیگ نے اپنے لئے یہ انتظام کیا کہ ابتدائے موسمِ سرما ۹۲۱ھ میں ایک ہزار منتخب سواروں کی جمعیت سندھ میں بھیجدی۔ ان سورماؤں نے موضع کاہان و باغبان کو تاراج کرڈالا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنے بیگناہ قتل ہوئے اور کس مقدار میں نقد وجنس لوٹ لے گئے۔ حضرت مخدوم جعفر نے جو سندھ کے بلند پایہ عالم تھے، میرزا عیسیٰ ترخان سے بیان کیا تھا کہ اس دار وگیر میں صرف ایک ہزار وہ اونٹ مالِ غنیمت میں لے جائے گئے جو رات کو باغوں میں کنوؤں کی چرخیاں چلاتے تھے۔ اسی سے ان مواضع کی آبادی اور خوش حالی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ تاریخ معصومی میں لکھا ہے کہ:

"در اوّل زمستان ہزار سوار را مستعد ساختہ از سیوی در ولایت سندھ فرستادند۔ آن جماعۃ در ہفدہم شہر ذیقعدہ ۹۲۱ھ احدی وعشرین تسعماۃ کاہان و باغبانان ر آمدہ تا ختند۔ مخدوم جعفر کہ یکے از علماء سندھ بوداز میرزا عیسیٰ ترخان نقل میکردند کہ درین تاخت ہزار شتر از چرخہائے باغات کہ شب کار میکروند بروند و قیاس باید کرد بریں چیز ہائے دیکر را معموری آن دیاررا۔" (ص۱۲)

یہ جام فیروز کا عہد تھا۔ سندھ کا یہ عیش پسند بادشاہ اپنے نامور والد جام نندا کی وسیع و مضبوط سلطنت کو سنبھالنے کی صلاحیتوں سے بیگانہ تھا، اسی کے عہد میں سندھ کے بڑے بڑے شہر برباد ہوئے۔ قتل و غارت کی گرم بازاری، فتنہ وفساد کی شورشوں کے پیشِ نظر لوگ امن و عافیت سے مایوس ہوکر ترکِ وطن پر مجبور ہوئے۔ اسی شاہ بیگ ارغون نے ۹۲۶ھ میں شہر ٹھٹھہ پر یورش کی، جام فیروز نے مقابلہ بھی کیا، لیکن ہزیمت پائی۔ فاتح فوج وہ بھی مغلوں کی فوج۔ شہر میں قہر خدا بن کر داخل ہوئی۔ لوٹ مار، قتل، آتشزدگی کون سا عذاب تھا جو ٹھٹھہ کے باشندوں پر مسلط نہ ہوا۔ شرفاء و علماء تک کو بے انتہا سبک اور ذلیل کیا گیا۔ عمائدین شہر و مشاہیر عصر بھی قید و بند اور

ذلتوں سے بچ نہ سکے۔ قاضی قاضن کے اہل وعیال بھی امیر و دستگیر ہوئے۔ حالانکہ قاضی موصوف قریب و دور بڑی عزت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ اور خود شاہ بیگ بھی ان کا بڑا احترام کرتا تھا۔ آخر انہیں کے کہنے اور سفارش پر بہت سے شرفاء بعد میں رہا کئے گئے۔ اس موقعہ پر تاریخ معصومی مظہر ہے:

تا بیستم ماہ مذکورہ (محرم ۹۲۶ھ) شہر ٹھٹہ را تاراج نمودہ خاک مذلت بر فرق ساکنانش افشاندند و مضمون آیہ کریمہ اذا دخلو قریۃ افسد وھا بابلغ وجہے ظاہر گشت وبسیارے از اہل وعیال مرم۔ در بند افتاد۔ بلکہ فرزندانِ جام فیروز نیز در شہر ماندند۔

چوں شاہ بیگ را خبر شد مردم خوب را برائے محافظت بر در حویلی ایشان فرستادہ شرم آنہارا نگاہ داشت۔ بالآخر بسعی قاضی قاضن کہ یکے از فضلائے آن عصر بود آن نائرۂ غضب فرونشست زیراکہ اہل وعیالِ قاضی نیز بہ بند افتادہ بود و سراسیمہ دار در کوچہائے ٹھٹہ گم کردگانِ خودرامی جست تا آنکہ رقعہ انشاء نمودہ خرابی احوالِ مردم رادرج کرد۔ (ص۱۴ معصومی)

ایسی شکستِ فاش اور ملک و مال کی تباہی سے مزید اندیشہ مند ہوکر جام فیروز نے شاہ بیگ سے عاجزانہ طور پر صلح کی درخواست کی۔ شاہ بیگ کو اندازہ ہوچکا تھا کہ سندھ جیسی وسیع مملکت کو تسخیر تو آسانی سے کیا جاسکتا ہے، لیکن معدودے چند معتمد کا مستقلا اس پر مسلط رہنا مشکل ہوگا۔ بہتر ہے کہ نصف ملک سہوان سے ٹھٹھہ تک جام فیروز سے متعلق رہے اور باقی نصف کوہ لکی سے اوپر اپنے عمال کے قبضہ میں رکھا جائے۔ جام فیروز نے خوشی سے یہ شرط منظور کرلی اور صلح نامہ مرتب ہوکر اس پر عمل بھی شروع ہوگیا۔ اس مشورہ اور فیصلہ کے الفاظ یہ ہیں:

"مناسب آنست کہ نصف ولایت را بہ جام فیروز تفویض نمائیم ونصف دیگر بعہدۂ معتمدانِ خود گذاریم۔ ورائے ہمہ برین قرار گرفتہ مقرر گردانید ند کہ از کوہ لکی کہ قریب بہ سہوان است تا ٹھٹہ متعلق بہ جام فیروز داشتہ باشد واز لکی بالاتر تعلق بہ بندگانِ ایشان۔" (ص۱۱۶ معصومی)

اِس قرارداد کے مطابق شاہ بیگ نے جام فیروز کو مطمئن کرکے سندھ کے دیگر شہروں پر فوج کشی کی اور سیوستان، ٹلھٹی، بھکر، الور وغیرہ کو بزورِ شمشیر تسخیر کیا اور ہر جگہ قتل و غارت کا بازار گرم ہوا۔ امن وسکون کی بساط اُلٹ گئی۔ ان خونی انقلابات کی داروگیر کے پیہم اور مسلسل ہنگاموں نے نہ صرف سابق اربابِ حکومت کے اعزار واکرام کو خاک میں ملادیا، بلکہ عام کاروباری لوگ بھی

اپنی جان و مال و آبرو کو خطرے میں محسوس کرنے لگے، بالخصوص علمائے مدرسین وصلحائے صالحین کو اپنے مشاغل پر کاربند رہنے اور عافیت و اطمینان سے قطعی مایوسی ہوگئی اور اُنہوں نے دل برداشتہ ہوکر بجز اس کے چارہٗ کار نہ دیکھا کہ اپنے اسلاف کی روش کے مطابق وطن سے ہجرت کرجائیں۔ چنانچہ سر برآوردہ علماء و مشائخ جب موقع ملا یکے بعد دیگرے سندھ سے ہجرت کرنے لگے۔(۱)

مولانا محمد معصوم نے جستہ جستہ کئی بزرگوں کے سندھ چھوڑ جانے کا مجملا ذکر کیا ہے۔ قبل اس کے کہ ان اجمال کا اقتباس نقل کروں، اسی کتاب سے ایک عبارت نقل کرتا ہوں، جس میں ارغون فاتح حکمران کے متعلق اہلِ سندھ کے نفرت انگیز جذبات کا پتہ چلتا ہے۔

بھکرو سیوستان کی تسخیر کے بعد ۹۲۸ھ میں شاہ بیگ کا بعارضۂ قلب انتقال ہوگیا۔ اگرچہ جام فیروز نے اس سے پیمانِ وفا باندھا ہوا تھا، لیکن اس زبردست حریف کی موت پر شریک غم ہونے کے بجائے اس نے اظہارِ مسرت کیا۔ ٹھٹہ میں خوشی کے شادیانے بجائے۔ اس خبر سے شاہ بیگ کا جانشین فرزند شاہ حسن نہایت برہم ہوا اور مراسمِ تعزیت سے فارغ ہوکر جام فیروز کے استیصال کی تیاریاں کیں، انجامِ کار تباہ کن معرکہ آرائیوں کے بعد سندھ سے بیدخل کردیا۔ اصل عبارت یہ ہے:

> وبعد از فراغ امورِ تعزیت خبر رسانند کہ جام فیروز مردم ٹھٹہ از خبر مرگ شاہ بیگ خوشحالی کردند و نقارہ نواختند، عرق غیرت مرزا شاہ حسن بحرکت آمد و نائرہ غضب شعلہ زدن گرفت۔ امراو اعیان صلاح درفتن گجرات نہ دانستہ رایت عزیمت بہ تسخیرِ ٹھٹہ و استیصال جام فیروز برافراختند۔ (ص ۱۲۷ معصومی)

تاریخ معصومی سے ان مقتدر مشاہر علماء کے ترکِ وطن کرنے کی شہادت ملتی ہے۔ اولاً ۹۲۷ھ میں قلعۂ بکھر سے سادات کو بیدخل کیا گیا۔ اس کے بعد

۱- قاضی عبداللہ[۱] بن قاضی ابراہیم ۹۳۴ھ میں گجرات چلے گئے اور وہاں سے حجاز مقدس جا پہنچے اور وہیں وفات پائی۔

۲- شاہ جہانگیر ہاشمی ۹۴۶ھ میں حجاز پاک روانہ ہوئے، جنہیں راہ میں ڈاکوؤں نے شہید کردیا۔

---

[۱] قاضی عبداللہ مع اہل وعیال تشریف لے گئے تھے۔ اس کی شہادت اخبار الاخیار میں شیخ عبداللہ و شیخ رحمۃ اللہ کے ذکر میں باین الفاظ موجود ہے۔ والد شیخ رحمۃ اللہ قاضی عبداللہ از ولایت سندھ در بعضے حوادثِ روزگار بقصد زیارت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم و توطن دران مقامات بابرکات باجمعی کثیر از فرزندان و اہل وعیال برآمدد چندگاہ در احمد آباد گجرات اقامت نمودہ با شیخ علی متقی صحبت داشت و بعد از وصول بمقامات شریفہ در مدینہ منورہ توطن فرمود و در اندک مدت از عالم در گذشت ص ۲۸۰ اخبار الاخیار مطبوعہ۔

۳- اسی اثناء میں قاضی قاضن بھی حجاز پہنچ کر مدینہ منورہ میں رہنے لگے۔ معصومی میں ضمناً صداقت ملتی ہے۔

۴- مولانا شیخ عبداللہ ابن مولانا سعد سندی دربیلہ ۹۴۷ھ میں گجرات اور وہاں سے مدینہ منورہ جاکر قاضی قاضن کی رفاقت میں رہے۔

۵- اسی اثنا میں مسیح الاولیاء کے والد شیخ قاسم اور عم حضرت شیخ طاہر محدث قصبۂ پات سے ہجرت کرکے، گجرات، برار اور وہاں سے برہانپور تشریف لے گئے۔ معصومی میں اس خاندان کا ذکر نہیں ملتا، لیکن عین المعانی اور کشف الحقائق میں مفصل حالات مذکور ہیں اور گلزار میں سب سے زیادہ تفصیل درج ہے۔

۶- ۹۲۲ھ میں مرزا عیسیٰ ترخان نے محاصرہ سے تنگ آکر قلعۂ سیوستان حاصل کیا تو وہاں کے اکابر ہجرت کرکے پہلے گجرات اور وہاں سے دکن پہنچ کر منعم خان کے ملازم ہوگئے۔

یہ مخصوص مشاہیر کی نشاندہی ہے۔ دراصل ۹۲۸ھ کے بعد سندھ کے ہر شہر کے کثیر تعداد ارباب علم وفضل ہجرت کرکے جنوبی ہند کے شہروں میں چلے گئے ظاہر ہے کہ ان بزرگوں نے ملکی داروگیر کے عافیت سوز ہنگاموں سے اُکتا کر وطن چھوڑا تھا اور انہیں اب ایسے گوشۂ امن کی تلاش تھی، جہاں اطمینان خاطر کے ساتھ اپنے روحانی وعلمی مشاغل میں منہمک ہوسکیں۔ لیکن ادھر ملک کا سیاسی ماحول یہ تھا کہ گجرات کی مضبوط اسلامی سلطنت مغلوں کی تاخت وغارت کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ دکن میں بہمنی سلطنت کے حصے نجروں سے وجود میں آئی ہوئی۔ پانچوں مسلم حکومتیں ایک دوسرے سے برسرپیکار تھیں اور کسی مملکت میں تو مسلم حکمران کے برسر اقتدار ہونے کے باوجود غیر مسلم اثر کا دباؤ پایا جاتا تھا اور بعض شاہ ایران سے توڑ جوڑ ملانے کے لئے شیعیت کی طرف مائل تھیں۔ البتہ انہیں سے متصل خاندیس کی چھوٹی سی مگر مضبوط سلطنت واقع تھی، جس کا دارالسلطنت برہانپور تھا۔ جس کے بانی اور حکمران فاروقی سلاطین تھے۔ آلِ فاروق کے سلسلے کے تمام بادشاہ راسخ العقیدہ حنفی تھے اور ہر ایک بادشاہ اپنے صوفیانہ مسلک، علم وفضل معارف پروری اور مشائخ نوازی میں ایک دوسرے سے فائق تھا۔

اگرچہ بُرہانپور بھی ان دنوں ملکی ماحول کی شورش انگیزیوں سے مستثنٰی نہ تھا، پھر بھی بدامنیوں کی آماجگاہ نہ تھا۔ اس کے علاوہ بادشاہ وقت کے مسلک اور اس کی علم دوستی وصلحا نوازی کی شہرت وجہ کشش ہوئی مختلف تارکانِ وطن جو ممالکِ دکن میں منتشر تھے، رفتہ رفتہ اسی طرف کھنچنے لگے۔ خود شاہ وقت نے بیش بہا نذرانے اور عمائدین کے وفود بھیج کر علماء صوفیاء اور اہلِ فضل کو بلایا۔ علم دوست طبقہ نے شایانِ شان پذیرائی کی۔ اپنی مرضی سے آنے والوں کا بھی اُس طرح

اعزاز و اکرام کیا گیا۔ اور بادشاہ کی طرف سے بھی نیازمندانہ سرپرستی عمل میں آئی۔ یہی وجہ تھی کہ آنے والے یہیں پر متوطن ہونے پر مجبور ہوگئے۔ اسی دور میں سندھ کے متعدد سر برآوردہ و ممتاز مشائخ وعلماء بھی برہانپور تشریف لائے اور مختلف مقامات پر فروکش ہو چکے تھے۔

لیکن سندھ کے کثیر التعداد بلکہ بے حد و شمار خواص و عوام کے برہانپور کی طرف رجوع ہونے کا ایک خاص سبب یہ بھی ہے بلکہ صرف یہی ہے کہ دسویں صدی ہجری کے آخر میں جب مسیح الاولیا اور ان کے چچا حضرت شیخ طاہر محدث برہانپور تشریف لائے اور ان کی وطنی نسبت سے ان کی سکونت گاہ سندھی پورہ کے نام سے شہرت پذیر ہوئی تو نہ صرف اطراف و جوانب کے علاقوں میں منتشر سندھی بزرگان کرام کشاں کشاں برہانپور آکر سندھی پورہ کی آبادی و رونق کا باعث ہوئے، بلکہ بعد میں مختلف بلادِ سندھ سے ہجرت کرنے والے تو براہ راست بُرہان پور ہی پہنچتے رہے۔ چنانچہ یہ کھلی ہوئی حقیقت اس بات کا بین ثبوت ہے کہ سندھیوں کا جو اجتماع عظیم شہر برہانپور میں پایا جاتا ہے، اس کا عشر عشیر بھی ہندوستان کے کسی شہر میں ثابت نہیں کیا جاسکتا۔

سندھی پورہ برہان پور کا سب سے بڑا محلّہ بن گیا تھا، لیکن اس کی وسعتیں بھی جب سندھی مہاجرین کو جذب نہ کرسکیں تو اس کے متصل ایک اور محلّہ بس گیا، جس کو صحت کنواں کہا جاتا ہے۔ جو بعد میں نواب ابوالخیر خان کی نسبت سے خیر خانی موسوم ہوا۔ یہاں صرف شہر ٹھٹھ کے مہاجرین آباد ہوئے اور یہ اپنی وطنی نسبت سے ٹھٹائی کہلائے۔ اُنہوں نے برہانپور میں اپنی وطنی صنعت و قومی دستکاری کپڑے رنگنے اور چھاپنے کے کام کو ذریعۂ معاش بنایا ہوا تھا۔ ان کے اخلاف بھی تاحال یہی پیشہ کرتے رہے اور آج بھی ٹھٹائی کہے جاتے ہیں۔ ٹھٹائیوں کی کپڑہ رنگنے اور چھینٹ بنانے کی صنعت اس قدر مقبول رہی ہے کہ باوجود ولایتی مشینوں سے چھپی ہوئی نظر فریب چھینٹ اور دیدہ زیب رنگین کپڑے بازار میں آجانے کے بعد بھی چند سال پہلے تک اس دستکاری کو عام مقبولیت حاصل تھی۔ فی زمانہ یہ صنعت برائے نام رہ گئی ہے اور دستکار حسبِ صلاحیت دوسرے کاروبار میں لگ گئے، لیکن یہ خاندان اب بھی ٹھٹائی ہی کے نام سے شہرت و غرفیت رکھتے ہیں۔

یہ تھا پس منظر اس دور کے ملکی ماحول کا اور یہ ہے توجیہہ مدلل و مفصل سندھ کے اعیان و اکابر کے اس تعداد کثیر میں شہر برہانپور کو دیگر بلاد و امصار پر ترجیح دیکر وطن ثانی بنانے کی جس کی مزید توثیق و تصدیق تذکرۂ ہذا کے مطالعہ سے پیشِ نظر ہوگی۔

☆

تعلیقات

تعلیق (۱): راشد برہانپوری نے تاریخ معصومی سے شاہان وقت کی آپس میں چپقلش، تیز و تند جملہ بازی اور جنگی تیاریوں کے بارے میں خوف زدہ کرنے والے فارسی الفاظ پر مشتمل جو اقتباسات نقل کیے ہیں وہ پڑھنے والے کی نفسیات کو اس حد تک خوفزدہ کردیتے ہیں کہ وہ یہ سوچ کر بے ساختہ پکارنے لگتا ہے کہ ''یہ تو واقعی ایسے حالات تھے کہ انسان تو کجا حیوان بھی سندھ کو چھوڑنے پر مجبور ہوجائے۔'' ان کا انداز بیان پڑھنے والے کو اس کی مہلت ہی کہاں دیتا ہے کہ وہ یہ سوچے کہ ''برہانپور کے سندھی اولیا'' ایک لحاظ سے ''تاریخ خانوادہ مسیح الاولیا'' ہے۔ کسی معرکہ کا احوال اقتدار کی جنگ یا کسی ملک کے سقوط ہونے کی داستان نہیں۔

سندھ کے عمومی حالات پر نظر ڈالی جائے تو سیاسی ابتری کے ساتھ ساتھ اس زمانہ میں بھی ہمیں علمی و ادبی شخصیات کا واضح ذکر تاریخ سندھ کے ابواب میں ملتا ہے۔ بوبک (نزد سہون) میں مخدوم عبدالکریم عرف میران بن یعقوب (وفات ۹۴۹ھ) بہت بڑے مدرس تھے۔ مرزا شاہ حسن ارغون نے خود ان سے علم حاصل کیا۔ آپ کے زیر سایہ کئی طالب علم زیر تربیت تھے جنہوں نے آگے چل کر شہرت حاصل کی۔ وہ ترخان کے زمانہ میں (۱۰۰۰-۹۶۲ھ) علمی دنیا کے درخشاں ستارے تھے۔ مخدوم میران کے ان شاگردوں میں سے آپ کے فرزند مخدوم جعفر اور مولانا قاسم دیوان زیادہ مشہور و معروف ہوئے۔ مولانا قاسم دیار سندھ سے باہر تعلیم حاصل کرنے کے بعد واپس وطن مالوف آئے۔ سلطان محمود بکھری آپ کے قرآن حکیم، تفسیر اور دیگر علوم میں شاگرد تھے۔ ۹۷۷ھ میں وفات پائی۔ مخدوم جعفر بوبکانی دسویں ہجری کے آخری نصف میں سندھ کے سب سے بڑے عالم تھے، آپ ۹۳۰ھ میں پیدا ہوئے۔ والد سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پھر ۹۵۸ھ میں حج پر گئے۔ کچھ عرصہ وہیں رہ کر علم حاصل کیا۔ پھر واپس آکر والد کی درسگاہ میں درس و تدریس کا شغل اختیار کیا۔ آپ نے کئی کتب تحریر کی ہیں۔

ترخانی دور میں ٹھٹہ کے فقیہ اور عالم شیخ عبدالوہاب پورانی اور قاضی نعمت اللہ ولد قاضی سائیندنہ اپنی مثال آپ تھے۔ ''جامع فتاویٰ پورانی'' اور بیاض مخدوم و قاضی برہان الدین ابن شیخ شہاب الدین سہروردی (ثانی) اسی زمانہ کی تحریریں ہیں۔

یہ درست ہے کہ سیاسی ابتری کے اثرات ہر شہری پر پڑتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ہمایوں کی آمد ہی شیخ طاہر اور ان کے احفاد کی ہجرت کا سبب بنی۔ اگر ایسا ہوتا تو خانوادہ کے تمام افراد ہندستان کو سدھارتے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان ہی ایام میں خانوادہ کے دیگر افراد نے قریبی علاقوں میں ہی خانقاہیں اور مدارس قائم کئے۔ ان میں شیخ شہر اللہ ابن شیخ عیسیٰ اور ان کے فرزند شیخ حسن قاری پاٹ میں ہی رہے، مخدوم عباس نے ہنگورجہ سندھ میں ہی مسند قائم کی جبکہ شیخ طاہر محدث کے چچا زاد بھائی سیت پور کے علاقہ کے مرشد و مربی بنے۔ اس کے علاوہ راشد برہانپوری ''ایک اہم سوال کا جواب'' ڈھونڈتے خود ہی اس حقیقت کا اعتراف بھی کررہے ہیں کہ برہانپور میں نہ صرف سندھ کے علماء وفضلا اور صوفیا آکر رہے، بلکہ مالوہ، گجرات، پنجاب، کشمیر اور بنگال سے بھی لوگ کھچے چلے آئے۔ جبکہ یہ علاقے کافی خوشحال اور مسلم حکمرانوں کے زیر نگین تھے۔ جس سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ محض شورش یا سیاسی ابتری ان علماء کے سفر کا سبب نہ تھا۔

ملا غوثی نے ۹۵۰ھ کو ہجرت کا امکانی سال قرار دیا ہے۔ جس کو من وعن تسلیم کرتے ہوئے راشد برہانپوری لکھتے ہیں:

''واقعی اس زمانہ میں تو سندھ اور بالخصوص آپ کا وطن ہر طرح مامون ومصئون تھا۔''

تاریخ سندھ میں ۹۵۰ھ یا اس کے قریب کے سالوں میں پاٹ پر کسی مغل شورش کا ذکر موجود نہیں۔ البتہ ۹۲۱ھ/ ۱۵۱۵ء میں پاٹ کے قریب باغبان کے علاقہ میں شاہ بیگ ارغون نے لوٹ مار کی۔ اس کے برعکس شاہ حسن ارغون کو پاٹ کا شہر بیحد پسند اور مرغوب تھا۔ جہاں وہ فرصت کے اوقات بسر کرتا تھا۔ اپنی بیٹی چوچک بیگم کا نکاح ۱۵۴۳ء میں مرزا کامران سے اسی شہر میں پڑھوایا۔ ہمایوں ۱۳ جولائی ۱۵۴۱ء کو پاٹ آیا اور ۴۰ دن یہاں ٹھہرا۔ اسی دوران اس کی حمیدہ بیگم سے شادی ہوئی اور تیسرے یوم روہڑی روانہ ہوا۔

ان ایام میں پاٹ دریائے سندھ کی ایک اہم بندرگاہ اور ملتان جانے والی سڑک پر واقع تھا۔ یہ علاقہ شاداب لہلہاتے کھیت، سرسبز باغات کی زمین سمجھا جاتا تھا۔ اس کی زرعی اراضی کی وجہ سے کبھی اناج کی کمی نہ ہوئی۔ شاہ حسین نے اپنی جاگیر اسی علاقہ میں قائم کی۔ جب حیدر کلوچ درباری ماحول سے بیزار ہوکر رخصتی چاہنے لگا تو شاہ حسین ہی نے اسے پاٹ میں رہنے کا مشورہ دیا۔ ایسے پرسکون شہر پاٹ کے ماحول نے صاحب دیوان شاعر کلوچ کی حساس دل کو یہیں کا ہوکر رہنے پر مجبور کیا۔ اس نے اپنی حیات مستعار کے

دس سال یا اس کے قریب یہاں گذارے اور ۹۵۹ھ/۱۵۵۱ء میں وفات پائی اور یہیں دفن ہوا۔ اسی کا ایک شعر ہے:

دل مجنون صفت خودرا خلاص از قید عالم کن
رہ صحرائے محنت گیر ورو در وادی غم کن

آپ کا فارسی دیوان خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کے علاوہ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں موجود ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہمایوں کی آمد سے سندھ کا سیاسی ماحول ابتری کا شکار ہوا۔ لیکن اس کا پاٹ کے حالات پر کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ جب ہمایوں نے ۹۴۶ھ میں سندھ میں پناہ حاصل کی تو پاٹ کی خوشحالی کا نقشہ کھینچتے ہوئے ملا عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں یہ الفاظ استعمال کیئے ہیں:

''شاہ حسن نے ہمایوں کو دکھانے کے لئے مصنوعی قحط پیدا کیا۔ لیکن اس کا پاتر پر کوئی اثر نہ ہوا۔ یہاں اناج بہت سستا تھا۔ اس لئے اس نے اپنے بھائی مرزا ہندال کو حکم کیا کہ لشکر کے لئے اناج لینے کیلئے پاتر چلا جائے۔''

اوپر بیان کئے گئے پاٹ کے پرسکون حالات کے برعکس ہم شیخ طاہرؒ محدث اور ان کے بعد شیخ عیسیٰؒ کی ہندستان میں مختلف مقامات پر اقامت کے دوران اور ان کے بعد کے حالات کسی طور موافق نہیں پاتے۔ پھر راشد برہانپوری کی کشف الحقائق کے بنیاد پر یہ رائے قائم کرنا کہ ''آپ کی ترک وطن کی پیش بندی القائے غیبی اور کشف روحانی تھا'' کس حد تک درست ہے، اس کا اندازہ ان تمام مقامات کے آنے والے ایام پر نظر ڈالنے سے پڑے گا، جہاں جہاں شیخ طاہر نے ۹۵۰ھ کے بعد ہندستان میں اقامت اختیار کی۔ پہلے آپ گجرات میں مقیم رہے، جس کے متعلق شارٹ ہسٹری آف مسلم رول ان انڈیا میں ایشوری پرشاد رقمطراز ہیں:

"After Bahadur Shah's death, Gujrat fell into State of anarchy and disorder-such disorders Continued until the annexation of the Province to the Mughal empire by Akber in 1572".

جس کی تصدیق مجمدار اور دتا نے بھی اپنی تاریخوں میں رقم کی ہے۔

شاہ بیگ ارغون اور شاہ حسن ارغون حاکمان سندھ گجرات کے حالات کا فائدہ لیتے ہوئے فوج کشی کرتے رہے۔ سن ۱۵۳۷ء سے لیکر ۱۵۷۲ء تک گجرات کا علاقہ احمد آباد سمیت افراتفری اور بدامنی میں گھرا ہوا تھا۔ راشد برہانپوری بھی اس روشن حقیقت کا اعتراف کرنے پر

مجبور ہیں کہ ان دنوں ''گجرات کی مضبوط اسلامی سلطنت مغلوں کی تاخت و غارت کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ دکن میں بہمنی سلطنت کے حصے بخرے ہونے سے وجود میں آئی ہوئی پانچوں مسلم حکومتیں ایک دوسرے سے برسر پیکار تھیں...... '' آپ آگے لکھتے ہیں: ''برہانپور بھی ان دنوں ملکی ماحول کی شورش انگیزیوں سے مستثنٰی نہ تھا۔''

اس کا ثبوت ہمیں تاریخ برہانپور کے چیدہ چیدہ واقعات سے ملتا ہے۔ جو شیخ طاہرؒ کی وہاں اقامت کے دوران اور بعد میں بھی وقوع پذیر ہوتے رہے۔ ۹۴۹ھ/۱۵۶۱ء میں بیرم خان کے ایک سپہ سالار محمد شروانی نے برہانپور کو تخت و تاراج کیا۔ نہ صرف قتل عام کا حکم صادر کیا، بلکہ بھاری دولت بھی لوٹی۔ لیکن یہ خاندان فاروقیہ کا صدر مقام ۱۰۱۰ھ/۱۶۰۱ء تک رہا۔ پھر اکبر نے فاروقی خاندان کا خاتمہ کر کے اس مملکت کو سلطنت مغلیہ میں شامل کرلیا۔ اس شہر پر شاہی فوجوں نے ابوالفضل کی سپہ سالاری میں ۱۰۰۸ھ/ ۱۵۹۹ء ہی میں قبضہ کرلیا تھا۔ عبدالرحیم خان خانان کو اس کا صوبیدار مقرر کیا گیا۔ جہاں وہ عرصہ دراز تک ٹھہرا۔ ۱۰۲۵ھ/ ۱۶۱۶ء میں شاہجہان نے جو اس وقت شہزادہ خرم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اپنی دکن کی مہموں کے دوران میں اسے اپنا صدر مقام بنایا۔ ۱۰۴۲ھ/۱۶۳۲ء میں یہ ایک مرتبہ پھر شاہجہان کی دکن کی ریاستوں سے معرکہ آرائی میں فوجی مرکز بنا۔ ان ایام میں شدید قحط کی وجہ سے یہاں شدید جانی اتلاف ہوا۔ جس نے شہر کو برباد کر کے رکھ دیا۔ اٹھارہ سالہ اورنگزیب عالمگیر جب دکن اور خاندیش کا صوبیدار مقرر ہوا، تو اس نے اس شہر کو اپنا صدر مقام بنایا۔ اس عرصہ کے دوران اورنگزیب عالمگیر کی متعدد بار حضرت مسیح الاولیا شیخ عیسیٰ جنداللہ پاٹائی ثم برہانپوری کی مزار اقدس پر حاضری کی روایات موجود ہیں۔ ان ایام میں سجادگی و تولیت حضرت مسیح الاولیا شیخ عیسیٰ جنداللہ مقدمہ بازیوں کی وجہ سے بٹ چکی تھی۔ ان ایام کی تاریخ برہانپور نامناسب حالات کے ثبوت اپنے اندر محفوظ کیے ہوئے ہے۔ اسماعیل فرحی سندھی جس نے خانوادہ شیخ عیسیٰ سندھی کی خدمت میں ایک عمر بتائی، برہانپور کو خیرباد کہا اور دربدری کی زندگی گذاری۔ حضرت بابا فتح محمد جیسے رقیق القلب انسان نے برہانپور چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ اور مدینہ منورہ میں تادم آخر اقامت اختیار کرلی۔ ان دنوں حضرت شیخ عیسیٰ کی سندھ میں موجود نرینہ اولاد میں سے مخدوم عبدالواحد کبیر برائے زیارت روضہ برہانپور تشریف لائے۔ علامہ غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب اپنے مضمون ''سہوانی قاضیوں کا کتب خانہ'' میں آپ کے بارے میں رقمطراز ہیں: ''مفتی الاسلام شاہی فخر الدین عبدالواحد کبیر پاتری صاحب کشف الاسرار زائر روضہ جدی مسیح الاولیا در برہانپور و مقرب سلطان اورنگزیب......''

سلطان اورنگزیب نے انہیں سندھ میں جاگیر کا پروانہ عطا کیا۔

تاریخ برہانپور میں بعد میں پیش آنے والے چند اہم واقعات، جس سے اس شہر کی عظمت کو نقصان عظیم پہنچا یہ ہیں:

۱۰۹۲ھ/۱۶۸۱ء میں اورنگزیب نے بیجاپور کا محاصرہ کرنے سے پہلے برہانپور میں دوبارہ پڑاؤ کیا۔ ۱۰۹۶ھ/۱۶۹۵ء میں بادشاہ کے جانے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد مرہٹوں نے اس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ یہ سلسلہ غارت گری ۱۷۱۹ء تک جاری رہا۔ جب بہادر شاہ اول محصول کا ایک چوتھائی حصہ دینے کے لئے راضی ہوا۔

آصف جاہ اول کے انتقال کے بعد اس پر مرہٹوں نے قبضہ کرلیا۔ ۱۸۰۳ء میں لارڈ ویلز لی نے مرہٹوں کو یہاں سے نکال باہر کیا اور رفتہ رفتہ یہاں برطانوی تسلط قائم ہوگیا۔ ۱۸۴۹ء میں یہاں ہندو مسلم فساد پھوٹ پڑا۔ جس میں کئی بے گناہ لوگ مارے گئے۔

۱۲۶۵ھ میں آگ لگنے کا سانحہ ایک بڑے نقصان کا پتہ دیتا ہے۔ راشد برہانپوری لکھتے ہیں: ''۱۲۶۵ء کی آتش زدگی میں یہ تمام عمارات جو سفال پوش تھیں، نذر آتش ہوگئیں۔ یہ سانحہ برہانپور میں تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ آگ محلہ سندھی پورہ ہی سے شروع ہوئی تھی۔ اور اس نے پھیل کر شہر کے بڑے حصے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ہزارہا مکانات پختہ و خام خاکستر ہوگئے۔ سندھی پورہ میں تو ایسا صفایا ہوا کہ بجز مسیح الاولیاء اور حضرت شیخ طاہر محدث کے مسکونہ محلات کے اور کسی مکان کے باقی رہنے کا پتہ نہیں چلتا اور مذکورہ محلات کا فلک بوس شعلوں میں گھرے ہوکر بھی بچ رہنا کرشمہ الٰہی کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے۔''

ہم نے پاٹ کے پرسکون حالات اور شیخ طاہر محدث کے گجرات اور برہانپور میں اقامت کے دوران اور بعد میں پیش آنے والے واقعات کا تجزیہ اس لئے کیا کہ راشد برہانپوری کے کشف الحقائق کی بنیاد پر یہ آرا قائم کرنا کہ بعد میں پیش آنے والی تباہیوں کے پیش نظر القائے غیبی کی وجہ سے وطن مالوف پاتر کو خیر باد کہنا کہاں تک درست ہے۔ کیونکہ تاریخ اس ضمن میں کافی ثبوت مہیا کررہی ہے کہ حالات تو پاٹ کے نہیں، بلکہ آنے والے وقتوں میں برہانپور کے خراب ہونے والے تھے۔
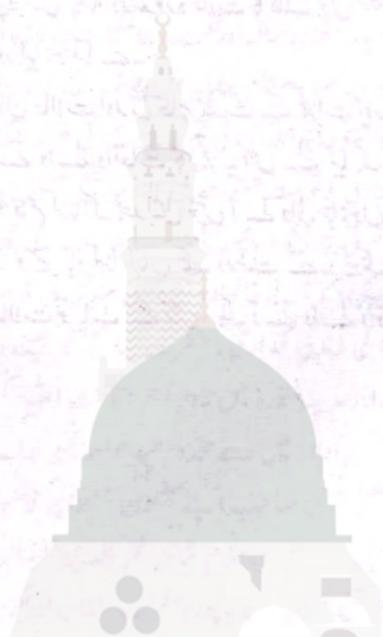
بلحاظ ترتیب مندرجہ اذکار کے تین دور مقرر کیئے ہیں

دورِ اوّل

خانوادۂ حضرت مسیح الاولیا قدس سرہٗ

حضرت شیخ طاہر محمد قدس سرہٗ (۱)

آپ حضرت شیخ یوسف سندھی کے فرزند ہیں۔ زادبوم اور آبائی وطن قصبۂ پات (پاتری) (۲) ہے جو آپ کے بزرگوں کا آباد کیا ہوا ہے اور جوان پاک باطن بزرگوں کی نیک نفسی کی برکتوں اور سعید اخلاف کی علم پروری کے باعث گہوارۂ علوم بنا ہوا تھا۔ راسخ الایمان دینداروں کی یہ آبادی امن وخوش حالی کے اعتبار سے بھی اِس نواح میں اپنا جواب آپ تھی۔

شیخ کی طفولیت اور ابتدائی تعلیم کی تفصیلات کا ہمیں علم نہ ہوسکا۔ البتہ ملاحسن غوثی کی شہادت کے مطابق ہم آپ کو آغاز شعور میں متداول عربی فارسی درسیات کا فارغ التحصیل اور منتہی عربی کتب کی تعلیم پر کاربند پاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں، جس کا مفہوم یہ ہے:

> ''آغازِ ہوش میں آپ حصولِ علم کے شوق میں سفر کر کے حضرت شیخ شہاب الدین سندھی کی خدمت میں پہنچے اور منطق کی کتاب شرح شمسیہ پڑھنے کی خواہش کی۔ شیخ نے یہ درس اپنے مناسبِ حال نہ دیکھ کر حضرت امام محمد غزالیؒ کی منہاج العابدین پڑھنے کی ترغیب دی۔ اس سفر میں آپ کے بڑے بھائی طیب اور والد بھی ساتھ تھے۔ چونکہ مذکورہ کتاب موجود نہ تھی، لہٰذا ان تینوں شیدایان علم نے مل کر دو ہفتہ میں کتاب کی نقل کی اور سبق شروع کیا۔''

(اذکار ابرار مطبوعہ اردو ص ۴۲۶)

اِس فدائے علم خاندان کی جستجو اور سعی حصولِ علم مندرجۂ بالا روایت سے ظاہر ہے۔ نوجوانی میں طلبِ علم کی یہ تڑپ، بزرگ باپ اور حوصلہ افزا برادر بزرگ کی اس حد تک سرپرستی و اعانت نے آپ کو عالمِ جوانی میں عالمِ بے بدل بنادیا تھا۔ آپ نے چچا زاد بھائیوں حضرت شیخ معروف اور شیخ عثمان سے سیت پور متصل بھکر جا کر مرصاد العباد کا درس لیا ہے اور ان کی صحبت میں تصوف کے رموز و نکات معلوم کئے ہیں۔ یہ دونوں بزرگ اپنے عہد کے فاضلِ اجل اور صاف باطن صوفی تھے۔

ایسے باکمال اساتذہ کی شاگردی اور ایسے شایستہ خاندان کی تربیت و پرداخت نے اس جوہرِ قابل کے ظاہر و باطن کو منور و مجلّا کر رکھا تھا۔ علم و فضل میں جو پایہ حاصل تھا، اسی درجہ کا تقویٰ بھی رکھتے تھے۔ آپ کے تقوے کی مستند روایت آگے ملاحظہ میں گذرے گی۔

آپ کا تحصیل علوم اور خدا طلبی کا جذبہ اسی طرح بیدار اور برسرِ عمل رہا، حتیٰ کہ آپ متائل ہوئے، پھر والد اور بڑے بھائی کی وفات کے بعد اپنے کنبے کے سرپرست اور کفیل بننا پڑا۔ اپنے چھوٹے بھائی شیخ قاسم کی خانہ آبادی سے فارغ ہوئے۔ ان تمام مرحلوں اور سب جھمیلوں کے ساتھ ساتھ اپنے علمی مشاغل کو نہ صرف خود جاری رکھا، بلکہ چھوٹے بھائی شیخ قاسم کی بھی حصول علم میں ہر قسم کے مواقع سے مستفید ہونے میں اعانت کرتے رہے۔ انجام کار وہ بھی آغاز شباب میں صاحبِ ذوق عالم ہو چکے تھے۔

جملہ مشاغل علمی اور کاروبار لاحقہ خوش اسلوبی سے جاری تھے کہ آپ نے وطنِ عزیز کو ہمیشہ کے لئے ترک کرنے کا اقدام کیا اور کنبہ کے تمام متعلقین کو لیکر جنوبی ہند کی طرف روانہ ہوگئے۔ ظاہر بینوں کو تعجب ہے کہ وطن میں ہر طرح کی آسائش وطمانیت حاصل ہونے کے باوجود یکا یک غریب الوطنی کیوں گوار کی اور اس بات سے اکتساب علم و کمال مقصود تھا تو خود چلے جاتے جملہ عزیزوں کو کیوں مبتلائے مصیبت کیا۔ فرحؔی نے حضرت مسیح الاولیاء کے ذکر میں ترکِ وطن کی یہ توجیہہ لکھی ہے۔ ہمایوں کی آمد سے سندھ میں ابتری پھیلی تو یہ بندگان ہجرت کر گئے۔ فرحؔی کے الفاظ یہ ہیں:

''دران ایام از آمدن ہمایون بادشاہ در ملک سندھ تفرقہ و حادثہ افتادہ بود پدر وما در وعم حضرت مسیح منقبت وبعضے خویشان از قصبۂ پات انتقال نمودند۔''

(کشف الحقائق قلمی ص۳)

انہوں نے زمانہ کا تعین نہیں کیا، لیکن مُلا غوثی نے سنہ نو سو پچاس لکھا ہے۔ واقعی اس زمانہ میں تو سندھ اور بالخصوص آپ کا وطن ہر طرح مامون و مصئون تھا۔ لیکن مغل یورش کے موقعہ پر قصبۂ پات اس قدر تباہیوں سے دوچار ہوا کہ جس کی کوئی مثال نہیں دی جاسکتی۔

اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی ترکِ وطن کی پیش بندی القائے غیبی اور کشفِ روحانی تھا کہ آپ اپنے متعلقین کو امن و فراغت کی حالت میں اس مقام سے باطمینان نکال لائے جو برباد ہوجانے والا تھا اور وقت آنے پر وہ برباد ہوکر رہا۔(۳)

وطن سے عازم سفر ہوکر آپ منزل بہ منزل واردِ گجرات ہوئے۔ برسات کا موسم شروع ہو چکا تھا، احمد آباد میں فروکش ہوئے۔ خیال یہی تھا کہ اس شہر میں قیام کر کے طوالانی سفر کی تھکن سے آسودہ دتازہ دم ہولیں اور بارش کا موسم بھی ختم ہوجائے تو آگے روانہ ہوں، کیونکہ اس نواح

کی بارش سندھ کے مقابلہ میں کافی زیادہ اور تکلیف دہ ہوتی ہے۔ یہ آپ کا عزم مصمم تھا، لیکن جلد ہی یہ واقعہ رونما ہوگیا۔

آپ احمد آباد میں مقیم ہوئے تھے کہ حضرت غوث الاولیا محمد غوث گوالیریؒ کی یہیں موجود ہونے اور ان کے فضل و کمال کا شہرا سنا تو اپنے چھوٹے بھائی شیخ قاسمؒ کے ساتھ بکمال نیازمندی اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

وہاں طالبانِ فیوض و برکات کا مجمع کثیر تھا۔ روحانی راز و نیاز پر گفتگو ہورہی تھی، دونوں بھائی ایک مناسب جگہ پر بیٹھ گئے۔ غوث الاولیاء مخاطب ہوئے اور یگانگت کی محبت آمیز نظر سے محدث صاحب کو دیکھ کر صوفیانہ انداز سے فرمایا۔ ان کا شیشہ تو نہایت مصفا ہے۔ کیا اچھا ہو اگر اس میں شراب گلرنگ بھر دی جائے۔ شیخ طاہر اس وقت اس رمز کو نہیں سمجھے اور اپنے تقویٰ و تورع کے پیش نظر شیشہ و شراب کی نفلی ٹھیس نہ سہہ سکے ملول ہوکر چلے آئے۔ انہیں اس خیال سے نہایت تکلیف ہوئی تھی کہ ایسے بلند مرتبہ بزرگ کو برسرِ مجلس شراب کا نام زبہار نہیں لینا چاہئے تھا۔ فرحؔی نے یہ روایت اِن الفاظ میں لکھی ہے:

> حضرت ایشان برہند کی شیخ طاہر نگاہ کردہ فرمودند کہ شیشۂ ایشان خوب پاک است چوچہ نیکو بود اگر شراب دریں انداختہ شود بندگی شیخ طاہر را این سخن مطبوع طبع نیفتاد بجہت آں کہ از عایتِ تقوی کہ واشتند بخاطرِ ایشان رسید کہ اینچنین شیخ بزرگ راچہ مناسب کہ درمجلسِ نام ام الخبائث بگیرو۔

(کشف الحقائق قلمی ص۳)

اس صحبت میں ان کی طبیعت اس قدر برہم ہوئی تھی کہ وہاں سے آتے ہی سفر کی تیاری شروع کردی تھی اور دوسرے روز علی الصبح مع متعلقین برار کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ اگرچہ اس وقت بارش کے آثار طاری تھے، لیکن آپ نے کوئی پروا نہ کی اور روانہ ہوگئے۔ بارش شروع بھی ہوگئی، مگر یہ قافلہ چلتا ہی رہا۔ یہاں تک کہ اثنائے راہ ایک پہاڑی نالہ پر گذر ہوا۔ یہ نالہ کثرت باراں کے موقعہ پر چڑھ آتا اور ناقابلِ عبور بھی ہوجاتا تھا۔ لیکن گھنٹہ دو گھنٹہ بعد اتر جایا کرتا تھا۔ اس وقت بھی نالہ ناقابلِ عبور تھا۔ قافلہ اس کے اتر جانے کے انتظار میں ٹھہر گیا، لیکن شام ہونے کو آئی اور طغیانی کم نہ ہوئی تو مجبوراً قریب کے ایک گاؤں میں قیام کیا گیا۔ گاؤں کے لوگوں کو بھی نالہ کی اِس طغیانی سے سخت تعجب اور توہمات کا سامنا تھا۔ وہاں کے بوڑھوں نے بتایا کہ ہم نے عمر بھر سے تو خود دیکھا ہے بلکہ اپنے باپ دادا سے بھی یہی سُنا ہے کہ یہ نالہ اتنے عرصہ تک ناقابلِ عبور کبھی نہیں رہا۔

دوسرے دن بھی نالہ ویسا ہی ناقابلِ عبور پایا گیا۔ حتیٰ کہ کامل چھ روز گزر گئے اور یہ راستے کا سانپ سدراہ ہی رہا۔ اس چھوٹے گاؤں میں مزید قیام ممکن نہ تھا۔ مجبوراً یہی طے کیا گیا کہ احمد آباد لوٹ چلیں اور واپس لوٹ آئے۔

کچھ عرصہ بعد محدث صاحب کو خیال آیا کہ قرآن مجید میں خمر کا لفظ متعدد جگہ موجود ہے۔ حدیث بھی اس لفظ سے خالی نہیں۔ اگر غوث الاولیاء کی زبان پر یہ لفظ آ گیا تو اس میں کوئی خاص برائی نہیں۔ چنانچہ آپ اس مرتبہ تازہ خلوص و عقیدت کے ساتھ حضرت غوث الاولیا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

غوث الاولیاء بڑے تپاک سے ملے اور مسکرا کر فرمایا آپ تو بھاگ کھڑے ہوئے تھے، مگر ہم نے جانے نہیں دیا۔ محدّث صاحب سمجھ گئے کہ نالہ کی خلافِ معمول طغیانی حضرت شیخ کا روحانی اثر تھا۔ محدث صاحب نے مرید ہونے کی تمنا کی۔ غوث الاولیاء نے آپ کو مرید کیا اور اپنے عالم بے بدل مرید کو چودہ خانوادہ کی خلافت عطا فرمائی۔

بارش میں کمی ہوتے ہی مرشد طریقت سے اجازت لے کر آپ مع رفقاء برار کی طرف روانہ ہوئے۔ ان دنوں برار کا نظم ونسق تفال خان کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے بزرگوں کی بڑی خاطر داشت کی نہایت احترام وعقیدت سے ہاتھوں ہاتھ لیا اس کے خلوص کے سبب یہ سب ایلچپور میں مقیم ہوگئے اور محدث صاحب نے درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا۔ اور تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ ہوگئے اور کم وبیش ۳۲ سال برار میں رہ کہ طالبان علوم کو فیض پہنچاتے رہے۔

سلطنت برار کا شیرازہ درہم و برہم ہوجانے پر آپ یہاں سے دل برداشتہ ہوئے اور ۹۸۲ھ میں معہ متعلقین برہانپور چلے آئے۔ کیونکہ آپ کے علم و فضل کا شہرہ سن کر محمد شاہ فاروقی والی برہانپور بارہا تشریف آوری کے لئے اصرار کرچکا تھا۔ آپ کے تشریف لانے پر بادشاہ نے شایانِ شان پذیرائی کی۔ آپ کی و متعلقین کی سکونت کے لئے شاندار محلات نذر کئے۔ یہاں بھی آپ نے علمی کارنامے انجام دئے اور درس بھی جاری رکھا۔

آپ کے درس کی دلکشی اور لطف وکیف کے متعلق ملا غوثی لکھتے ہیں کہ مولانا سید جمال جو بلند پایہ عالم اور حضرت آبا ابراہیم کی مسجد میں خود بھی سنگلاخ کتابوں کا درس دیا کرتے تھے، پابندی کے ساتھ روزانہ ایک میل کا فاصلہ طے کر کے شیخ کے مدرسہ میں آتے رہے اور تا حیات کسی وجہ سے بھی کوئی ناغہ نہیں کیا۔ صحیح بخاری اول سے آخر تک درساً پڑھی۔

اسی طرح حضرت شیخ یوسف بنگالیؒ جو حدیث و فقہ اور تفسیر کا درس دیا کرتے تھے، تصوف کی تعلیم کے خواہش مندوں کو آپ کے مدرسہ میں بھیجدیا کرتے تھے۔ مسیح الاولیاءؒ کی خدمت میں شیخ سکھ جی نے عرض کیا کہ میرے خسر شیخ یوسفؒ نے دم واپسیں وصیت کی ہے کہ میرے

فرزندوں کو شیخ طاہر کے درس میں کم از کم دو تین ہی حرف پڑھ لینا چاہئے' اس پڑھنے کی برکت کا اثر آخر میں ظاہر ہوگا۔ چنانچہ آپ کے دو فرزندوں عبداللہ اور عبدالرحمن نے اس وصیت پر عمل کیا اور علم و فضل اور حق شناسی کی نعمت سے مالا مال ہوئے۔ آپ کی تصنیف سے آٹھ معرکۃ الآرا کتابیں یادگار ہیں۔

(۱) **تفسیر مجمع البحار**[1]: اس کے چند اجزا حضرت شیخ عارف باللہ کی نگاہ سے گذرے۔ آپ نے بہت پسند کیا اور خوش ہوکر فرمایا کہ اس رنگین کتاب کا مصنف اپنی حسنات کی جزا کا اندازہ قیامت کے دن ہی کر سکے گا۔

نیز بادشاہ خاندیس عادل شاہ فاروقی نے اپنے دو ندیم خاص آپ کی خدمت میں بھیج کر التماس کی کہ اس خادم کے عہد کا ذکر اس کتاب کے خاتمہ پر کردیا جائے۔ آپ نے یہ درخواست رد نہ فرمائی اور ایک مزید خطبہ لکھ کر اس خواہش کو پورا کردیا۔ ملا غوثی لکھتے ہیں کہ:

''اسی وجہ سے اس کتاب کا خطبہ دو طرح پر ہے۔''

ایک اشتباہ کی وضاحت:

ملّا غوثیؒ نے اس عہد کے بادشاہ کو ہر جگہ ''علی عادل شاہ'' لکھا ہے۔ یہ ان کا سہو نظر ہے۔ اس بادشاہ کا نام راجے علی خان ہے جو ۹۸۴ھ میں عادل شاہ کا لقب اختیار کر کے خاندیس کے دارالسلطنت برہانپور میں تخت نشین ہوا اور اسی عرفیت سے متعارف رہا۔ علی عادل شاہ بیجاپور کا بادشاہ تھا جو فاروقی نہیں تھا۔ ''اذکار ابرار'' کے ناظرین حوالہ جات میں اس وضاحت کو ملحوظ رکھیں۔

(۲) مختصر قوۃ القلوب

(۳) منتخب مواہب لدنیہ

(٤) ملتقط جمیع الجوامع سیوطی

(۵) موجز قسطلانی

علامہ غوثیؒ لکھتے ہیں کہ اس سے بڑی کوئی شرح بخاری پر نہیں ہے۔ بڑے بڑے بارہ دفتر دو لاکھ بیت میں مختصر کئے ہیں۔

(٦) تفسیر مدارک۔

غوثیؒ کا بیان ہے کہ آپ نے یہ کتاب اپنے دونوں فرزندوں عبداللہ اور رحمۃ اللہ کے

---

[1] صاحب تحفۃ الکرام نے مجمع البحار کو شیخ طاہر پٹنی کی تصنیف لکھا ہے، وہ اس تفسیر سے مختلف ہے، ان کی تحریر کے مطابق شرح صحاح ستہ ہے۔ مجمع البحار کی تحقیق سے متعلق ناچیز مؤلف نے ایک مقالہ رسالۂ معارف میں بغرض اشاعت پیش کیا ہوا ہے۔ جو مارچ ۵۵ء میں شائع ہوگیا ہے۔

واسطے مختصر کی تھی اور اس کا آغاز اس طرح کیا ہے:

قال ابو عبداللہ طاھر بن یوسف رحمۃ اللہ.

(۷) **اسامی رجال صحیح بخاری**: ایک شرح ہے کرمانی کے طور پر۔

(۸) **ریاض الصالحین**: اس کی فہرست کی ترتیب تین روضوں پر رکھی گئی ہے۔

روضۂ اول: احادیث صحیحہ کا بیان۔

روضہ ثانی: مشائخ عظام کے نصائح- غوث پاک، امام غزالی ابو طالب مکی۔ شہاب الدین سہروردی، زین الدین خوانی، شیخ علی متقی۔

روضۂ ثالث: عباراتِ اہلِ عرفان و وجدان۔ عین القضاۃ ہمدانی۔ صدر الدین قونیوی وغیرہم۔

مطالعۂ حدیث میں آپ کی ذہانت حیرت انگیز تسلیم کی گئی ہے۔ آپ کے شغف و انہاک کا یہ عالم تھا کہ آپ کو تیس ہزار حدیثیں زبانی یاد تھیں۔

مولانا فرحیؔ نے لکھا ہے کہ:

''بندگی شیخ طاہر محدث سی ہزار حدیث یاد داشتند۔'' (کشف ص ۴۷)

شیخ طاہر کو علم و فضل- طلبِ علم پر مستعدی۔ حیرت انگیز ذہانت، علوم دینیہ کے درس اور بلند پایہ تصانیف کے اعتبار سے اپنے زمانہ کا انسانِ کاملِ اور عالمِ باعمل تسلیم کیا گیا ہے۔ اس زمانہ کے بزرگ ترین علماء وصوفیاء آپ کی صحبت اور آپ کے درس میں شرکت کو سعادتِ ابدی جانتے تھے۔ آپ نے بھی بلا امتیاز خویش و بیگانہ بیدریغ فیض عام جاری رکھا۔ کامل پچاس سال تک طالبانِ حق کی رہنمائی کرتے رہے۔

یہ تمام تاثیر اور فیض آپ کی صاف باطنی اور حسنِ عقیدہ کا تھا۔ خود بھی بزرگانِ سلف کا انتہائی احترام بمنزلہ ایمان رکھتے تھے۔ مسیح الاولیاء فرماتے تھے کہ آپ کو علم ہوا کہ شیخ جموجیؒ کے پاس حضرت غوثِ اعظم کا پیراہن مبارک ہے تو آپ والہانہ اور بے تابانہ ان کی خانقاہ میں تشریف لے گئے اور پیراہن مبارک کی دامن بوسی کا شرف حاصل کیا۔ اس موقعہ پر خود مسیح الاولیاء اور چند مشائخ بھی موجود تھے۔ سب نے زیارت کی سعادت حاصل کی۔ آپ کی (میاں جموی کی) خانقاہ زین آباد میں دریائے تاپتی کے دوسرے کنارے پر ہے۔

آپ کا انتقال ۱۰۰۴ھ میں ہوا اور اپنے حجرۂ عبادت میں دفن ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد خانخانان عبدالرحیم خان نے حجرہ کی جگہ پختہ بارہ دری تعمیر کرادی۔ آپ کی تاکید تھی کہ میری قبر پر قبہ نہ بنوایا جائے ورنہ وہ عالیشان گنبذ بنوانے پر مصر تھے۔ اب یہ بارہ دری حضرت مسیح الاولیاء

کے روضہ کے احاطہ میں آ گئی ہے جو شمالی حد پر واقع ہے۔ اور کھلی ہوئی بغیر چھت کی ہے۔ اس بارہ دری کی تصویر منسلک ہے۔

آپ کی بلند پایہ نادر روزگار تصانف کی نقول کہاں کہاں ہیں اس سے آگہی نہ ہونے کا افسوس ہے۔ علامہ غوثی نے گلزار ابرار میں تفسیر مجمع البحار کی کچھ عبارت بطور نمونہ درج کی ہے، میں اُسے تمام وکمال نقل کئے دیتا ہوں، اس خیال سے کہ ان کی اس وقیع تصنیف کا اتنا ہی شہ پارہ ان کے ذکر کا جز ولاینفک ہوکر محفوظ رہے۔

نمونہ عبارت تفسیر مجمع البحار

منقول از ترجمہ گلزار ابرار ص ۴۲۷ تا ۴۳۲

فی تفسير قوله تعالىٰ- فى قلوبهم مرض الخ. المرض حقيقة ما يعرض للبدن فيخرجه عن الاعتدال الخاص ويوجب الخلل فى افعاله ومجالاً فى الاعراض النضانيه التى يخل بكمالها كالجهل وسوء العقيدة والزيغة وحب المعاصى لانها مانعة عن نيل الفضائل ومودية الى زوال الحقيقة الابدية والاية تحتملها فان قلوبهم كانت متالمة تخرنا على مافات عنهم من الرياسة وحدا علىٰ ما يرون من اثبات امر الرسول واستعلا شانه يوما فيوماً فزاد الله عنهم بمازاد فى اعلاء امره واسادته ذكره ونفومهم كانت ماؤفة بالكفر وسوء الاعتقاد ومعاداة النبى صلى الله عليه وسلم ونحوها فزاد الله ذالک بالطبع او بازدياد التكاليف وتكرير الوحى وتضاعيف النصر.

وفي الرحماني. فى قلوبهم مرض- هو تفريطهم فى القوة الحكمية وافراطهم فى الشهوية.

فى الاحياء. اعلم ان جندى الغضب والشهوة قد ينقادانِ للقلب انقياداً تاما فيعيناه على طريقة اللذى مسلكه وقد يستعصيان عليه استعصاء بغى وتمرد حتى يملكاه ويستعبداه وفيه هلاكه وانقطاعه عن سفره الذى به وصوله الى سعادة الابد وللقلب جند آخر وهو العلم والحكمة والتفكر وحقه ان يستعين بهذا الجند فانه حزب الله تعالىٰ على الجندين الاخرين فانهما قد يلحقان بحزب الشيطن فانه من ترک الاستعانة وتسلط على نفسه جندى الغضب والشهوة هلک هلاكا يقينا وخسر خسراناً مبينا. وذلک حال اكثر الخلق فان عقولهم صارت مسخرة لشهواتهم فى استنباط الحيل لقضاء الشهوة وكان ينبغى ان يكون الشهوة مسخرة لعقولهم.

اما بیان علامات مرض القلب فکما ان کل عضو من اعضاء البدن خلق لفعل خاص به ومرضه ان یتعذر فعله الذی خلق لاجله کذالک مرض القلب ان یتعذر علیه فعله الذی خلق لاجله وهو العلم والحکمة والمعرفة وحب الله تعالیٰ وعبادته والتلذذبه وایثار ذالک علی شهورة سواء وخاصیة النفس التی للادمی ما یتمیز به عن البهائم ولم یتمیز بها بقوة الا کل والوقاع بل بمعرفة الاشیاء علی ما هی علیه واصل الاشیاء موجدها ومخترعها الذی جعلها شیاء هو الله تعالیٰ فاوعرف کل شیء ولم یعرف الله تعالیٰ فکانه لم یعرف شیئا فان الناس کلهم قد هجروا هذه العلوم واندرست فی هذا الاعصار واشتغلوا بتوسیط الخلق فی الخصومات الثائرة من اتباع الشهوات وقالوا هواء الفقة واحوجوا هذه العلم الذی هو فقه الدین من جملة العلوم وتجردو الفقة الدنیا الذی ما قصد بهٖ الارفع الشواغل لیتفرغ لفقة الدین فکان فقه الدنیا من فقه الدین بواسطة هذا الفقه.

وفی بعض الکتب- اعلم ان القلب بمنزلة القالب فی الشریعة ولا معول الاعلی القلب لانه موضع نظر الله تعالیٰ کما قال علیه السلام ان الله تعالیٰ لا ینظر الی صورکم الخ فالقلب علل وامراض مثل امراض الاشخاص فان القلب الانسان حقیقی وله من الاعضاء حقائق فللقلب اس یحی به کما یحی البدن براسه فاذا جزراس البدن لا یحیی فکذالک القلب وراس القلب ادراکه لطائف الغیب وهذا الادراک بنقسم مثل انقسام حواس الراس واقسامه البصیرة والتذکر والمراقبة والتمیز والتفکر فالبصیرة عین القلب والتذکر لسان القلب والمراقبة سمع القلب والتفکر خیال القلب والتمیز تجار به وفعله فاذا اراد الله تعالیٰ بعبد خیراً فتح عینی قلبه وشرح لسانه واسمع اذنه واذا اراد الله تعالیٰ بعبد شرا ختم علیٰ سمعه وبصره ومنعه عن ادراکته وذالک المنع مرض روحانی یکون صداع القلب منه ومهمازاد المنع تولدت الغفلة والغفلة القلب بمنزلة الصرع وغلبة الظنون الفسادة مثل المالیخولیا للراس فان الراس اذا یبتلی به تخبط اعماله والقلب اذا انفعل بالظنون الفسادة تظهر فیه تخبطات کثیرة ویصیر کالمجنون المتحیر الممنوع من معرفة الله تعالیٰ وحسن الظن به وامتلاع القلب لفضول الطمع والطمع به یورث الاستسقاء فی القلب حتی انه لا یوری من المال والجاه والدخان الغفلة یورث عمی البصیرة فان البصیره تظلم ویقل نورها بدخان الهوی کما یظلم البصر ببخار الهوی فی عالم الدنیا.

☆

تعلیقات

تعلیق (۱): گذشتہ صدیوں میں شیخ طاہر محدث پاٹائی اور شیخ طاہر پٹنی کی سوانح حیات کے مختلف واقعات خلط ملط ہوجانے سے بہت ساری کتابوں میں مغالطے کی صورت پیدا ہوگئی۔ بہتر ہے کہ ہر دو اشخاص کے احوال کو الگ کر کے اصل حقیقت کو ظاہر کیا جائے۔

محمد طاہر پٹنی: علامہ دہر جمال الدین محمد طاہر پٹنی ہندستان کے ممتاز محدثین میں سے ہیں۔ وہ ۹۱۰ھ/۱۵۰۴ء میں گجرات کے قصبہ پٹن (نہروالہ) میں پیدا ہوئے۔ جسے عربی میں فتن کر کے لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔ آپ نے نوعمری میں قرآن حکیم حفظ کیا اور چھوٹی عمر میں ہی علوم دینیہ سے فارغ ہوئے۔ پھر ۹۴۴ھ میں حجاز روانہ ہوئے' وہاں شیخ علی متقی سے فیضیاب ہوئے ۹۵۰ھ میں واپس وطن ہوئے اور تدریس و وعظ میں مشغول ہوگئے۔ آپ نے بوہروں میں ہندوانا رسموں کے خلاف آواز اٹھائی اور مہدویوں کے خلاف بھی جدوجہد شروع کی اور تقریر وتحریر سے ان کی غلطیوں کو ظاہر کیا۔ اس سے مہدوی بھی ان کے دشمن بن گئے۔ ۹۸۰ھ میں جب اکبر نے گجرات پر حملہ کر کے پٹن پر قبضہ کرلیا، وہ شیخ محمد طاہر سے بھی ملا۔ ان کی بڑی عزت افزائی کی شیخ الاسلام کا عہدہ عطا کیا۔ اور ان کے سر پر عمامہ اپنے ہاتھ سے باندھا۔ جب عبدالرحیم خان خانان ناظم گجرات بن کر آیا تو مہدویوں کے فتنہ نے زور پکڑا۔ شیخ طاہر نے پہلے ناظم کی اس طرف توجہ دلائی پھر خود آگرہ جا کر اکبر سے ملنے اور مہدوی فرقے کے استیصال کرانے کا عزم کیا ۹۸۶ھ میں سارنگ پور اجین کے قریب مہدویوں نے شیخ طاہر کو راستے میں جالیا اور عین تہجد نماز میں شہید کردیا۔[1]

شیخ طاہر سندھی نام کی یکسانیت کے علاوہ پٹنی اور پاٹائی یعنی پٹنہ اور پاٹ کے الفاظ محدث ہونے کی پہچان حجاز کا سفر ۹۵۰ھ میں گجرات میں ورود اور سب سے بڑی بات کتابوں کے نام میں بھی مماثلت یعنی تفسیر مجمع البحار اور مجمع البحار کہ شیخ طاہر محدث پاٹائی اور شیخ طاہر پٹنی کو آج بھی بہت سارے پڑھنے والے ایک ہی شخصیت تصور کرتے ہیں۔ جبکہ شیخ طاہر محدث پاٹ سندھ کے مشہور تاریخی اور مذہبی خانوادہ ''صدیقی'' سے تعلق رکھتے ہیں۔ ۹۲۰ھ کے قریب آپ سندھ میں پیدا ہوئے۔ کحل الجواہر اردو قلمی میں آپ کے نسب کے متعلق لکھا ہے: ''شاہد عادل حضرت نعمان ثانی

---

[1] آپ کی تصنیف ''مجمع البحار'' مشہور ہے جس کا پورا نام ''مجمع البحار الانوار'' ہے یہ احادیث صحاح ستہ کی مشکل کشا شرح ہے۔

(مخدوم عبدالواحد سیوستانی) صاحب البیاض قدس سرہ کتاب کشف الحق تصنیف کی ہوئی حضرت مخدوم جعفر بن میران عبدالکریم بوبکانی کے حاشیہ پر نسب اس حضرت شیخ طاہر قدس سرہ کا مندرج فرماتے ہیں۔ شیخ طاہر بن شیخ یوسف بن شیخ رکن الدین بن شیخ معروف بن شیخ شہاب الدین صدیقی سہروردی قدس اللہ سرہ العزیز"۔ آپ نے ایک عرصہ ایرج پور اور حجاز مقدس میں گذارا، پھر آخری ایام میں برہانپور چلے آئے ۱۰۰۴ھ میں وفات پائی اور سندھی پورہ میں آپ کی آخری آرام گاہ ہے:

شیخ طاہر کی سوانح "انساب مشائخ سیوستان" قلمی میں اس طرح مرقوم ہے:

"اصل وی در سندہ ست کہ از مطولات ظاہر است و اکثر حال او کہ در تاریخ ہند مرقوم است بایں سبب کہ اولیاء از متقدمین در خورد سالی در ملک عرب و ہندستان و گجرات گذارندہ اند۔ پس در ہر جا کہ بعزازت و خویشی پیوند گرویدہ اند۔ ازان نشان متاخرین قلمبند کردہ اند۔ میدان حاشیہ تنگ است، ورنہ حال وی از روئے کتب خصوصاً گلزار ابرار للشیخ محمد غوثی و کتاب کشف الحق تصنیف مخدوم بوبکانی مفصل می نوشتم"۔

"انساب مشائخ سیوستان" قلمی بندہ کے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے۔ جس پر لکھا ہوا حواشیہ پیش کیا گیا۔ مخدوم عبدالکریم میران "ٹھٹوی" (المتوفی ۹۴۹ھ-۱۵۴۲ء) مرزا شاہ حسن کے استاد اور مخدوم جعفر بوبکانی کے والد گرامی تھے۔ مولانا دین محمد وفائی تذکرہ مشاہیر سندھ میں رقمطراز ہیں:

"محدث طاہر بن یوسف سندھی نے کچھ ظاہری رسمی علوم اپنے والد سے حاصل کئے۔ جبکہ کچھ مخدوم میران اور مخدوم جعفر سے پڑھے"۔

محمد اسحاق بھٹی کی ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور سے شایع ہونے والی "فقہائے ہند" میں مرقوم ہے کہ:

"علامہ طاہر سندھی برہانپوری ۹۵۰ھ میں عازم گجرات ہوئے اور شیخ عبدالاول بن علی حسینی جونپوری دہلوی (المتوفی ۹۶۸ھ) سے علم حدیث حاصل کیا۔ ایک عرصہ ان کی صحبت میں رہے اور علم حدیث کی سند حاصل کی۔ طریقت اور تصوف میں شیخ محمد غوث گوالیاری کے مرید ہوئے۔ بعد میں احمد آباد اور دکن تشریف لے گئے۔ وہاں شیخ ابراہیم بن محمد ملتانی سے علم حاصل کیا، پھر ایرج پور روانہ ہوئے، جہاں سے برہانپور تشریف لائے"۔

ہمعصر ماخذ کشف الحق کے الفاظ اور فقہائے ہند کا بیان، گلزار ابرار کے بیان سے کچھ اس طرح مماثلت رکھتا ہے کہ غوثی کے الفاظ میں "آپ میخانہ تحقیق کے پرانے میگساروں کے حریف اور منزل توحید کے دیرینہ سیاحوں کے ہم قدم تھے"۔

راشد برہانپوری نے شیخ طاہر محدث پاٹائی کی ولادت سندھ میں دکھانے کے بعد خود ہی ان کے اچانک سفر پر تعجب کا اظہار بھی کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اپنے وطن مالوف میں کل آسائش کے باوجود یہ سفر کیوں اختیار کیا۔ انجام کار وہی کشف اور ہمایوں کی آمد سے پیدا ہونے والے حالات بیان کئے ہیں۔

جبکہ اس کے برعکس شیخ طاہر محدث پاٹائی کے خانوادہ کی قریبی پشتوں میں والد ماجد اور جد مکرم کے علاوہ احفاد کا مختلف مقامات پر آمد و رفت کا سلسلہ گجرات، ہنگورجہ، سیت پور، ناگور اور عربستان میں قیام اور سفر، روایات کے الٹ پلٹ ہونے کا موجب بنے ہیں۔

راشد برہانپوری نے کشف الحقائق اور گلزار ابرار سے احوال سفر کے واقعات کو چن کر ''ہجرت'' کا رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ جبکہ ہمیں شیخ طاہر کا خانوادہ سندھ میں علم ادب اور مذہبی روایات کا پاسدار ہونے کے ساتھ دنیاوی حیثیت کا مالک بھی دکھائی دیتا ہے۔ وہ کیونکر اپنی مساجد، مدارس، جاگیرات و احفاد کو آن واحد میں چھوڑ کر اپنی پردہ نشین خواتین کے ساتھ انجانی منزل کی طرف چل پڑا؟

مختلف اوقات میں انجام پانے والے سفر جو شیخ رکن الدین، شیخ یوسف، شیخ طاہر اور شیخ قاسم نے کئے، ان کا بغور مطالعہ اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے کہ کشف الحقائق، گلزار ابرار اور ان دونوں کی بنیاد پر لکھی گئی برہانپور کے سندھی اولیاء کی کہانی کسی ایک سفر سے تعلق نہیں رکھتی، بلکہ مختلف اوقات میں اختیار کئے گئے سفر کے واقعات کو ایک ہی لڑی میں پرونے کی کوشش کی گئی ہے۔ شیخ یوسف نے ناگور اور ہندستان کے دیگر مقامات کے علاوہ عربستان میں بھی اقامت اختیار کی۔ شیخ طاہر کے ایک سے زیادہ مرتبہ ایرج پور وغیرہ کے سفر یا شیخ قاسم کا ہندستان آنا جانا اور وہاں مختلف شہروں میں گھومتے رہنا۔ خود مسیح القلوب کی سندھ اور ہندستان کے دو مختلف شہر ایرج پور اور برہانپور آمد و رفت کی داستان، مخدوم عباس (م ۹۹۸ھ) کی وفات کے وقت اس کا جانشین اور مسجد و مدرسہ میں حصیدار ہونے کے بعد کہیں جاکر ان کا برہانپور میں مستقل اقامت کرنا ثابت ہے۔ ان کی وفات کے بعد بابا فتح محمد کا سفر سندھ اور عربستان میں اقامت اپنے اندر ایک لمبی داستان لئے ہوئے ہے۔ کشف الحقائق اور گلزار ابرار کے مختلف واقعات اور داستان سفر کو لیکر راشد برہانپوری نے ختم مہر ثبت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہر دو مصنفین نے جو کچھ لکھا، اسے مسیح الاولیا کی آگاہی کا شرف بھی بخش دیا گیا۔ ان دونوں کتابوں کا تنقیدی جائزہ تو ہم آگے لیں گے۔ یہاں محض شیخ طاہر کے سفر میں واضح اختلاف کو مدنظر رکھنا مناسب ہوگا۔

کشف الحقائق کے الفاظ	گلزار ابرار کے الفاظ	راشد برہانپوری کے الفاظ میں گلزار ابرار کا ترجمہ
دران ایام آمدن ہمایون بادشاہ در ملک سندھ تفرقہ وحادثہ افتادہ بود پدر ومادر وعم حضرت مسیح منقبت وبعضے از خوشیان از قصبہ پات انتقال نمودند۔ ترجمہ: ان دنوں ہمایوں بادشاہ کی سندھ ملک میں آمد ہوئی۔ حضرت مسیح المنقبت کے والد والدہ اور عم اور کچھ اور عزیز قصبہ پاتر سے ہجرت کر گئے۔	جب آپ (شیخ طاہر) کا آغاز ہوش ہوا تو آپ کو اور آپ کے بڑے بھائی شیخ طیب کو باپ کے ہمراہ سفر کا اتفاق پیش آیا۔ تینوں اشخاص دانائے حقیقت آگاہ شناسائی فضیلت دستگاہ شیخ شہاب الدین سندھی کی ملازمت میں گاؤں کے اندر پہنچے جو شیخ سندھی کے نامزد تھا۔ آپ نے شرح شمسیہ پڑھنے کی التماس کی۔ شیخ شہاب الدین نے منطق کا درس اپنے مناسب حال نہیں سمجھا۔ اس واسطے حجۃ الاسلام امام غزالی کی منہاج العابدین پڑھنے کی طرف اشارہ فرمایا۔ کم وبیش دو ہفتے کے اندر کتاب مذکورہ کو ان تینوں شخصوں نے لکھ کر سبق شروع کر دیا۔ اس کے بعد ہجری ۹۵۰ میں آپ کو یہاں سے خیال سفر ہوا۔ چنانچہ آپ گجرات کی طرف تشریف لے گئے۔ شہر بہروچ میں پہنچ کر غوث عالم شیخ محمد قدس سرہ کی بابرکت صحبت سے بہت کچھ حاصل کیا۔	آغاز ہوش میں آپ حصول علم کے شوق میں سفر کر کے حضرت شیخ شہاب الدین سندھی کی خدمت میں پہنچے اور منطق کی کتاب شرح شمسیہ پڑھنے کی خواہش کی۔ شیخ نے یہ درس اپنے مناسب حال نہ دیکھ کر حضرت امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی منہاج العابدین پڑھنے کی ترغیب دی۔ اس سفر میں آپ کے بڑے بھائی شیخ طیب اور والد محترم بھی ساتھ تھے۔ چونکہ مذکورہ کتاب موجود نہ تھی، لہٰذا ان تینوں شیدایان علم نے مل کر دو ہفتے میں کتاب کی نقل کی اور سبق شروع کر دیا۔ **نوٹ**: راشد برہانپوری صفحہ ۳ پر لکھتے ہیں کہ کشف الحقائق نے زمانہ کا تعین نہیں کیا، لیکن غوثی نے ۹۵۰ھ لکھا ہے۔

ہجرت سے متعلق دونوں ہندستانی تذکروں میں تضاد واضح ہے۔ ان کے اپنے الفاظ میں کشف الحقائق نے حتمی رائے قائم کی ہے کہ ''ہمایوں کی آمد کی وجہ سے شیخ طاہر، شیخ قاسم ان کی منکوحہ اور بعض عزیز پاٹ سے چلے گئے۔'' اس کتاب میں نہ تو بڑے بھائی، کنبہ کے سربراہ شیخ طاہر کی زوجہ و اولاد کا ذکر کرنا مناسب سمجھا گیا، نہ شیخ طیب کا اور نہ شیخ یوسف کا بلکہ سب سے چھوٹے بھائی شیخ قاسم اور ان کی زوجہ کا ذکر کردیا۔ اور خود ساختہ بات کو وزن دینے کے لئے امکانی سوال کا جواب دیتے ہوئے، وجہ ہجرت ہمایوں کی آمد سے تفرقہ بھی بتادیا، کیونکہ یہ سوال تو ہر ذی شعور کرسکتا ہے کہ یہ بے جوڑ قافلہ آخر کیوں اچانک اپنے مدارس، مساجد اور جاگیرات چھوڑ کر انجانی منزل کی طرف چل پڑا؟

جب اسماعیل فرحی کے احوال پر پہنچیں گے تو ان کی سوانح کے ساتھ ساتھ کشف الحقائق کی صحت پر بھی سیر حاصل بحث کریں گے۔ یہاں صرف اتنا ہی مناسب ہے کہ راشد برہانپوری نے پاٹ سے برہانپور تک سفر کے لئے کشف الحقائق اور گلزار ابرار کو ہی بنیاد بنایا ہے۔ اور ان کی رائے یہ ہے کہ ان دونوں کتابوں کے مصنفین نے جو کچھ لکھا، حضرت مسیح الاولیا کی آگاہی سے لکھا۔ جبکہ ان دونوں نے جو سفر کا احوال دیا ہے، اس میں کھلا تضاد موجود ہے۔ کشف الحقائق نے اس سفر میں کہیں شیخ یوسف و طیب کا ذکر نہیں کیا، جبکہ گلزار ابرار کے بیان میں شیخ قاسم اور ان کے پاٹ چھوڑنے کا ذکر موجود نہیں۔

غوثی کے بیان کردہ احوال سے چند مندرجہ ذیل حقائق سامنے آتے ہیں:

۱- ہندستان کے اس سفر میں شیخ یوسف، شیخ طاہر اور شیخ طیب کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ حتٰی کہ حضرت مسیح الاولیا کے والد شیخ قاسم بھی نہیں۔

۲- راشد برہانپوری گلزار ابرار کے اس جملہ ''اس کے بعد ہجری سن ۹۵۰ھ میں آپ کو یہاں سے خیال سفر ہوا۔ چنانچہ گجرات کی طرف تشریف لے گئے۔ شہر بھروچ میں پہنچ کر غوث عالم شیخ محمد قدس سرہ کی بابرکت صحبت سے بہت کچھ حصہ لیا۔'' کو حذف کرکے غوث عالم سے ملاقات بہت بعد میں دکھارہے ہیں۔

۳- گلزار ابرار نے اسے خیال سفر لکھا ہے نہ کہ ہجرت جو شیخ یوسف شیخ طاہر اور شیخ طیب نے اختیار کیا۔

۴- راشد برہانپوری شیخ کے ۳۲ سال تک ایرج پور میں قیام کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ اندازہ یقیناً انہوں نے ۹۵۰ھ ''خیال سفر'' کے سال سے لیکر سلطنت برار کے شیرازہ درہم برہم ہوجانے کے سال ۹۸۲ سے لگایا ہے۔

اسماعیل فرحی کے الفاظ میں شیخ طاہر کا ذکر جس انداز میں پیش کیا گیا ہے، وہ بھی قابل غور ہے کہ مسیح المنقبت کے والد اور والدہ شیخ طاہر کے ساتھ گجرات کے سفر میں شامل ہیں، لیکن خود جو کنبے کے سربراہ بھی ہیں اور سالار سفر بھی، ان کی اپنی منکوحہ اور اولاد کا ذکر نہیں کیا جارہا۔ جس سے کشف الحقائق کے تحریف شدہ نسخہ تیار کرنے والے کی سوچ کا وہ پہلو از خود ظاہر ہوجاتا ہے کہ وہ بات کو کہاں سے شروع کر کے کہاں لے جانا چاہتا ہے۔

راشد برہانپوری کے دیئے گئے ہجرت کے سال اور فرحی کے پیش کردہ احوال سفر کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایک مرتبہ پھر ہم احوال شیخ طاہر میں راشد برہانپوری کے ان الفاظ کی صحت کا جائزہ لیں گے۔

> ''حتیٰ کہ آپ متاہل ہوئے، پھر والد اور بڑے بھائی کی وفات کے بعد اپنے کنبے کے سرپرست اور کفیل بننا پڑا۔ اپنے چھوٹے بھائی شیخ قاسم کی خانہ آبادی سے فارغ ہوئے......... جملہ مشاغل علمی اور کاروبار لاحقہ خوش اسلوبی سے جاری تھے کہ آپ نے وطن عزیز کو ہمیشہ کے لئے ترک کرنے کا اقدام کیا اور کنبہ کے تمام متعلقین کولیکر جنوبی ہند کی طرف روانہ ہوگئے۔''

گلزار ابرار، کشف الحقائق اور راشد برہانپوری کے متضاد بیانات اور حقائق سفر اس بات کا کافی وشافی دلیل ہیں کہ ہندستان کے ان دو اہم ماخذوں کے لئے جو دعویٰ کیا جاتا ہے کہ حضرت مسیح کی آگاہی سے لکھا گیا۔ اپنے آپ ختم ہوجاتا ہے۔ بلکہ انہوں نے زمانہ مسیح الاولیا پانے کے باوجود سنے سنائے واقعات کے بغیر تحقیق اور تسلسل کے کچھ یادداشتوں اور کچھ اندازوں سے احوال بیان کردیئے ہیں۔

شیخ طاہر محدث سے متعلقہ تعلیق کے اس باب کو ہم ان الفاظ پر ختم کرتے ہیں:

> ''سفر گجرات سے تعلق شدہ داستانیں حقیقت میں سالوں پر محیط آمد و رفت سے چنے گئے چند واقعات ہیں۔ یہ آمد و رفت شیخ یوسف کے زمانہ سے جاری ہوکر حضرت مسیح المنقبت شیخ عیسیٰ جنداللہ پاتائی ثم برہانپوری کے اس آخری سفر برہانپور تک جاری رہی، جب وہ ۹۹۸ھ میں حضرت مخدوم عباس رحمۃ اللہ علیہ کی وفات حسرت آیات کے وقت دیار سندھ میں موجود تھے۔ پھر برہانپور میں مستقل اقامت اختیار کی۔ تادم آخر آپ کے سندھ سے مستقل رابطہ کے ثبوت بعد میں برہانپور جانے والے سندھی تاجروں کے علاوہ اہل علم بزرگان اور احفاد ہیں۔ حتی کہ بابا فتح محمد نے دیگر اولاد مسیح القلوب مقیم وطن سندھ سے مستقل

رابطہ اور آمد کا سلسلہ جاری رکھ کر والد محترم کی روایت کو زندہ رکھا۔ ان کے رابطہ کا واضح ثبوت اپنے بھتیجے مخدوم حسن قاری پاٹائی کو دی گئی وہ کتب ہیں، جن پر آپ کی تحریر موجود ہے۔ مزید درس مفتاح الصلواۃ ان کی حیات مستعار میں ہی سندھ میں جاری ہوگیا تھا۔ الحمدللہ جو کام اس کتاب عظیم پر سندھ میں ہوا اس پر وہ بجا طور فخر کر سکتے ہیں۔ جس سے اہل ہند محروم رہے۔

راشد برہانپوری کی اس کاوش کا لب لباب چند الفاظ میں کچھ اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ:

''حضرت مسیح کے خانوادہ کو جب آنے والے برے حالات کا کشف ہوا۔ تو وہ اپنی تمام تر جاگیریں، مساجد اور مدارس کو چھوڑ کر اپنے تمام متعلیق کے ساتھ وطن مالوف سے اچانک ہندستان کو چل پڑے۔ اس ضمن میں راشد برہانپوری سندھ کے سیاسی حالات اور چند جنگی واقعات منسلک کرتے ہوئے ۹۵۰ھ کے سفر سے ۴۰ یا ۵۰ سالوں میں جو چند عالم و بزرگان گجرات یا مکہ مدینہ جا چکے تھے۔ ان کے نام اور سفر کو بھی اپنی تائید میں گنواتے گئے ہیں۔

مزید یہ کہ حضرت مسیح الاولیاء کی اولاد نرینہ کے متعلق ہاں اور نہیں کی درمیانی کیفیت میں رہتے ہوئے مجبوراً ان کی موجودگی کا ذکر مختصراً کر گئے۔ اور اپنے اصل مقصد کہ ''ہم ہی ہیں'' بڑی خوبصورتی سے بیان کر گئے۔ حالانکہ انہیں خوب معلوم ہے کہ آپ کا خانوادہ اور حضرت مسیح الاولیاء کا الگ الگ شجرات سے منسلک ہیں۔ اگر قادر مطلق نے آپ کو منصب تولیت دیتے ہوئے متولی درگاہ مسیح الاولیاء بنایا ہے تو اُس ذات حقیقی کا شکر ادا کرنا چاہئے اور محض اس خوف کی وجہ سے حقائق کو نہیں چھپانا چاہئے کہ کل کلاں کہیں حقیقی وارث یا اولادِ نرینہ میں سے کسی کی کوئی دعویٰ نہ آجائے۔ جیسا کہ ابتدا سے مقدمے بازیاں ہوتی رہی ہیں۔

آن را کہ حساب پاک است از محاسبہ چہ باک۔''

تفسیر مجمع البحار اور مجمع البحار الانوار کے ناموں اور مصنفین کے متعلق التباسات:

غوثی نے ''تفسیر مجمع البحار'' اور ''مجمع البحار الانوار'' کے مکمل نام دینے کی جگہ سہواً محض ''مجمع البحار'' لکھا ہے۔ شیخ محمد ابن طاہر نہروالہ (پٹنی) کے احوال میں وہ رقمطراز ہیں:

''مجمع البحار'' نام ایک مشکل کشا شرح احادیث کی صحاح ستہ پر جو ہے۔ وہ آپ ہی کے قلم تالیف کی لکھی ہوئی ہے۔

شیخ طاہر محدث سندھی کے احوال میں تحریر کرتے ہیں:

''منجملہ تصانیف مذکورہ کے ایک تفسیر مجمع البحار ہے جو بالکل لطائف قشیری کے اسلوب پر طائفہ صوفیہ قدس سرہم کے نکات اور اشارات کو حاوی ہے۔''

ایک اور ہمعصر مصنف شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اخبار الاخیار میں محمد طاہر پٹنی کے ذکر میں رقمطراز ہیں: ''ودر علم حدیث تراليف مفیدہ جمع کرد ازا نجملہ کتابے است کہ متکفل شرح صحاح است مسمی بہ مجمع البحار و رسالہ دیگر ''الخ''۔ خلاصہ یہ کہ مجمع البحار صحاح ستہ کی شرح ہے اور اسکے مصنف شیخ محمد طاہر ہیں۔

علی شیر قانع ٹھٹوی تحفۃ الکرام جلد اول میں مجد الدین مولانا طاہر قدس سرہ کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں:

''ودر علم حدیث توالیف مفید جمع کرد از نجملہ کتابے است کہ متکفل شرح صحاح ستہ مسمی بہ مجمع البحار و رسالہ دیگر۔۔۔۔''

علی شیر قانع ٹھٹوی اور خزینۃ الاصفیا میں مفتی غلام سرور لاہوری نے اخبار الاخیار کی لفظ بہ لفظ نقل کی ہے۔ علامہ غلام علی آزاد بلگرامی ماثر الکرام میں شیخ محمد بن طاہر الفتنی قدس سرہ کا ذکر کرتے ہوئی لکھتے ہیں:

''مجمع البحار کا نفس مضمون غرایب الحدیث ہے اور اس کے مصنف شیخ محمد بن طاہر الفتنی ہیں۔

تاریخ الاولیاء اردو میں دو جگہ تھوڑی تغیر کے ساتھ شیخ محمد طاہر کے ذکر میں کچھ اس طرح لکھا ہے ''محدث بے بدل مفسر بے عدیل فقیہ لاثانی تھے اور مکہ میں شیخ علی متقی سے خرقہ خلافت حاصل کیا۔ اور پھر اپنے وطن کی جانب آ کر تمام بدعات کو ملک گجرات سے دور کیا۔ تصانیف آپ کی متکفل شرح صحابہ (کذا) مسمی مجمع البحار الخ۔''

نوٹ: شرح صحابہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے یہ شرح صحاح ہے۔ شیخ محمد طاہر پٹنی کے حالات میں لکھا ہے:

شیخ برخوردار سندی و شیخ اجل علی ابن حسام الدین متقی سے فیض کثیرہ حاصل کیا۔ بڑے متقی پرہیزگار صاحب تصانیف کثیرہ ہیں۔ مجمع البحار تذکرہ موضوعات وغیرہ۔''

مولوی خلیل الرحمٰن برہانپوری نے تاریخ برہانپور میں حضرت شیخ علی متقی رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء کا ذکر کرتے ہوئے شیخ محمد طاہر پٹنی مصنف کتاب مجمع البحار کا ذکر کیا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مجمع البحار کے مصنف حضرت شیخ محمد طاہر پٹنی ہیں۔ یہ کتاب فن تفسیر میں ہے یا شرح یہ نہیں لکھا۔

شیخ قاسم محدث والد شیخ عیسیٰ سندھی کے ذکر میں لکھتے ہیں: ''وہ (شیخ قاسم سندھی) فرزند مولانا سندھی برہانپوری کے اور بھائی شیخ محمد پٹنی صاحب مجمع البحار کے تھے۔ حضرت شاہ عیسیٰ جند اللہ خلف الصدق حضرت شیخ محمد قاسم کے ہیں۔ (تاریخ برہانپور مطبوعہ کوثر پریس برہانپور)

یقینن یہاں پٹنی کی جگہ پاٹائی یا سندھی ہونا چاہئے تھا۔ تاریخ برہانپور کے اس اقتباس سے یہ ثابت ہوا ہے کہ نہ صرف اہل سندھ میں شیخ طاہر سندھی پاٹائی اور شیخ محمد طاہر پٹنی کے متعلق مغالط رہا بلکہ اہل ہرہانپور بھی آپ کے متعلق غلط فہمی کا شکار ہوئے۔ (مخدوم) محمد روشن نے ۱۳۵۶ھ/۱۹۳۷ء میں ''تاریخ پاٹ'' پر ایک کتابچہ تحریر کیا۔ اس میں بھی آپ شیخ طاہر صاحبان کا احوال خلط ملط کر گئے ہیں۔ یقینن یہ لکھتے ہوئے تاریخ برہانپور اور دیگر ہندستانی تحریرین آپ کے سامنے موجود ہونگیں۔

آزاد بلگرامی کی سبحۃ المرجان میں شیخ طاہر محدث اور ان کے نواسے شیخ عبدالقادر مکی مفتی مکہ شریف کا احوال کبھی شیخ طاہر پٹنی اور کبھی پاٹائی کے ساتھ خلط ملط ہوتا رہا ہے۔ اکثر تاریخی کتب میں شیخ پٹنی کا نام شیخ محمد بن طاہر پٹنی گجراتی لکھا گیا ہے۔ علامہ غوثی جو دونوں شیخ طاہر صاحبان کا ہمعصر ہے۔ ان کی کتاب گلزار ابرار میں اسماء الرجال کی فہرست حروف تہجی کے اعتبار سے منسلک ہے ''ط'' کے باب میں صرف شیخ طاہر سندھی کا نام درج ہے۔ شیخ طاہر پٹنی کا نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس ''م'' کے باب میں شیخ محمد بن طاہر موجود ہے۔ اس صورت میں کتابت کی غلطی ممکن نہیں۔ قرین قیاس یہی ہے کہ ''مجمع البحار الانوار'' کے مصنف کا نام محمد بن طاہر ہوگا۔ علامہ آزاد بلگرامی نے بھی محمد بن طاہر ہی لکھا ہے۔

حضرت مسیح الاولیاء شیخ عیسیٰ جند اللہ پاٹائی ثم برہانپوری جو شیخ طاہر محدث کے بھتیجے ہیں اپنی عربی تفسیر انوار الاسرار میں جگہ جگہ تفسیر مجمع البحار کا حوالہ دیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مجمع البحار قرآن مجید کی تفسیر ہے اور اس کے مصنف حضرت شیخ طاہر سندھی ہیں۔ ادارہ پاٹ ہاؤس حیدرآباد سندھ نے ۱۹۹۸ء میں سورہ الطّور سے سورہ الحدید تک کل چھ سورتیں اور اٹھارہ رکوع شایع کیئے۔ اس میں تقریبن اٹھارہ مقامات پر حضرت مسیح الاولیاء نے تفسیر مجمع البحار کے حوالے دیئے ہیں۔ جس سے اس میں مزید کسی بحث کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ ''تفسیر مجمع البحار'' شیخ طاہر محدث ابن شیخ یوسف سندھی کی ہی تحریر ہے جو شیخ عیسیٰ جند اللہؒ کے عم مکرم تھے۔

شایع شدہ تفسیر انوار الاسرار سے چند اقتباسات:

صفحہ ۵۳: (۱) ''وفی مجمع البحار عن بحر الحقائق الکلام یشیر الی ان طبیعۃ الانسان متنفرۃ عن الحقیقۃ الدین مجبولۃ مجبولتہ علی حب الدنیا وشھواتھا والجوھر الروحانی الذی جعل علی فطرۃ الاسلام فی الانسان مودع بالقوۃ کالجوھر فی الجسد -----

صفحہ۱۱۲: (۲) وفی مجمع البحار للشیخ المختار طاہر الطہار عن التفسیر المعینی فلما بلغ فوق السموات فی مکان مرتفع وصحبہ جبرئیل حتیٰ جاوز سدرة المنتھیٰ فقال لہ جبرئیل انی لم اجاوز"

صفحہ ۲۱۷: (۳) وفی مجمع البحار للعم المختار عن العرش اذا جاہدو النفس وقہروھا بتائید اللہ او صلی اللہ علیہ وسلم الیٰ مقام مشاہداتہ وہی جنة العارفین فاذا بلغوا الی درجات المعرفة لم یحتاجوا الی نھی النفس۔۔۔"

صفحو ۲۸۶ (۴) وفی مجمع البحار للعم المختار اکثر المفسرین علیٰ انہ اشارة الی انة تعالیٰ یصون من عذاب الدنیا کل من شکر نعمة اللہ بالطاعة والایمان۔۔"

صفحو ۲۹۵ (۵) وفی مجمع البحار عن عائشة رضی اللہ عنھا ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال مجوسی ھذہ الامة القدریة۔۔۔

صفحو ۲۹۸ (۶) "وفی مجمع البحار عن اللطائف فی الحدیث لکل امة مجوس ومجوس امتی القدریة الذین یقولون لا قدر۔۔۔"

صفحو ۳۵۱ (۷) وفی مجمع البحار للعم المختار الشیخ طاہر الاطہار سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن ذالک الشان فقال من شانة ان یغفر ذنبا ویفرح کربا ویرفع قوما ویضع آخرین۔

صفحو ۳۷۸ (۸) وفی مجمع البحار للعم المختار عن جامع البیان لاینظرون الی الغیر۔۔۔"

صفحو ۳۸۹ (۹) وفی مجمع البحار للعم المختار قدس سرہ عن النیسابوری اسفل منھما فی المکان او انی الفضل او فیھما وھو الاظہر

صفحو ۳۹۵ (۱۰) فی مجمع البحار عن ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ الخیمة درة مجوفة فی فرسخ فیھا اربعة آلاف مصراع من ذھب۔۔"

تعلیق (۲): خانوادہ مسیح الاولیا کے مسکن پاٹ شریف کے متعلق کتاب ہٰذا "برہانپور کے سندھی اولیاء" میں اکثر مقامات پر لفظ پات (پاتری) لکھا گیا ہے۔ جس زمانے میں فارسی کا طوطی بولتا تھا، تو اس زبان میں "ٹ" کا تلفظ نہ ہونے کی وجہ سے اکثر کتب میں پاٹ کو پاتر لکھا گیا۔

راشد برہانپوری نے طبیعت کی ناسازی اور عالم ناتوانی میں برہانپور خط لکھ کر اپنے عزیزوں سے کچھ معلومات اور تصاویر اکٹھی کیں اور بستر پر پڑے پڑے اس کتاب کو مکمل کیا۔ تاریخ معصومی کا نسخہ جو آپ کے زیر مطالعہ رہا وہ بھی بزبان فارسی تھا۔ شاید ناقدری روزگار کی وجہ سے آپ کو یہ موقع ہی نہ ملا کہ دیار سندھ میں موجود مقامی ماخذوں کو جمع کرتے، بلکہ وہ ان سے اتنے ناواقف رہے کہ پاتری کے اصل تلفظ "پاٹ" تک سے شاید واقف نہیں تھے۔ وگرنہ سندھی کی طرح اردو میں بھی پاتری کا اصل لفظ "پاٹ" پڑھا اور لکھا جاتا ہے اور آپ کتاب بھی اردو

میں ہی تحریر کررہے تھے۔ افسوس! پیر حسام الدین راشدی نے بھی ان کی اصلاح پر توجہ نہیں کی۔

لفظ ''پاٹ'' کے لکھنے پر آپ نے زیادہ زور دیا ہے، ورنہ اردو اور سندھی زبان میں ''پاٹ'' اور فارسی میں مجبوراً ''پاتری'' لکھا جائے گا۔ جس طرح تاریخ کی کتب میں موجود ہے۔

پاٹ موجودہ ضلع دادو کا مردم خیز تاریخی گاؤں ہے۔ ۱۹۳۲ء تک یہ ضلع لاڑکانہ کی حدود میں تھا۔ اس خطہ نے بڑے بڑے عالم باعمل، صوفیا، شاعر، ادیب مفکر اور موجودہ زمانہ میں بڑے بیورو کریٹ پیدا کئے ہیں۔ اسے قبۃ الاسلام کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اس قصبہ میں مسیح الاولیا کی اولاد نرینہ کی کئی ایک یادگاریں موجود ہیں۔

امریکہ کے ریسرچ اسکالر ڈاکٹر ہونیمن John J. Honigmann ۱۹۵۷ء میں پاٹ آئے اور ۷ اکتوبر سے ۲۶ نومبر تک رہے۔ انہوں نے ایک مقالہ بعنوان "Education and career specialization in a west pakistan village of Renown (PAT)." تحریر کیا۔ جس کے لئے انہیں Fulbright Research grant کی منظوری دی گئی تھی۔ ان کی یہ تحریر شائع بھی ہوئی۔ اس میں سے چند اقتباسات دئے جاتے ہیں، جس سے پاٹ کی ماضی قریب میں عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

"In British times new opportunities opened for Government Service and a Premium came to be placed on formal education, Particularly on learning education. True Hindus took most advantage of the newly Provided educational facilities but Muslims did not totally neglect them. In 1951, after most Hindus had quit the country Dadu District Still Stood first among all the districts of Sind in number of rural and urban literates. In early British times Pat Continued as a rural administrative centre. It was also a Prosperous Commercial depot as well as the residence of living Saint.

One thread reappears Continually through the history of Pat. It remained a centre of Scholar Ship for at least 700 years Although new people Came and old names disappeared during this interval Pat remained a note worthy place".

خانوادہ مسیح الاولیا کے اس وقت موجود افراد کے متعلق ڈاکٹر جان لکھتے ہیں:

"The Sidduqi Caste include at least thirteen house holds. Some men of which designate them Such as "Qureshi" rather than Sidduqi other also use the little Qazi, AL- Sidduqi " the eminently Veracious ", refers to the first Caliph of Islam, Abu Baker Sidduqi, and the caste as Said to have originated in Arabia. Living and deceased. Sidduquis, include a number of Maulvis (religious Scholars), a mukhtairkar, an assistant mukhtiarkar, two deputy Collectors (Executive Judicial officer in-charge of an administrator Subdivision of a District), two universities Professor a retired member of the Provincial Public Service Commission a Sub- Inspector of Police a Government Collector, at least nine School teacher including head masters and Several Clerks in Government offices. One Sidduqi is Pir (Living Saint) with a fair Sized following and Considerable reputation in Sind".

تعلیق (۳): حضرت شیخ طاہر محدثؒ کے متعلق راشد برہانپوری کا یہ کہنا کہ "آپ اپنے متعلقین کو امن و فراغت کی حالت میں اس مقام سے باطمینان نکال لائے جو برباد ہوجانے والا تھا اور وقت آنے پر وہ برباد ہوکر رہا۔"

تاریخ سندھ کا ہم جائزہ لے چکے ہیں کہ کسی مغل شورش سے پاٹ برباد نہیں ہوا اور خدا نہ کرے کہ کبھی وطن عزیز پر کوئی ایسا وقت آئے۔ ہاں البتہ تاریخ کے جس دور کی ہم بات کررہے ہیں ان دنوں پاٹ کی آبادی دریائے سندھ کے کنارے ٹھٹہ سے ملتان جانے والی شاہراہ پر واقع تھی۔ وقت گذرنے سے دریائی راستوں کی اہمیت اپنے آپ ختم ہوتی چلی گئی تو پاٹ کی آبادی چند فرلانگ کے فاصلے پر مغرب کی جانب پھیلنے لگی۔ یوں اس ویران محلّہ کو لوگ پرانی پاٹ اور جس جانب آبادی کا پھلاؤ تھا، اسے نئی پاٹ کہنے لگے۔ انگریزوں کے زمانہ میں دادو کینال بننے سے تو یہ نیا آباد محلّہ مزید مستحکم اور ترقی کرنے لگا۔ حالانکہ نئی آبادی کے مکانات ٹالپروں کے زمانہ سے بننا شروع ہوگئے تھے اور یہ نیا آباد علاقہ حضرت مسیح المنقبت کی

اولاد میں سے حضرت مخدوم عبدالواحد کبیر کی زمینیں تھیں۔ سر سید احمد خان کی تعلیمی میدان میں جدوجہد سے متاثر میاں صاحب احمدی نے پہلے ۱۸۸۵ء میں اپنی اوطاق میں جدید طرز تعلیم کا اسکول قائم کیا، پھر اسے ۱۹۱۵ء میں الگ تعمیر کردہ عمارت میں منتقل کیا۔ ان کے اس انقلابی قدم سے علاقہ میں جدید تعلیمی نظام نے جڑیں پکڑیں۔ میاں صاحب احمدی صدیقی (المتوفی ۱۹۲۳ء) نہ صرف بڑے جاگیردار تھے، بلکہ اعزازی مجسٹریٹ ڈسٹرکٹ لوکل بورڈ کے چیئرمین اور اس علاقہ کی بڑی سیاسی سماجی شخصیت بھی تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب بھی مخدوم عبدالواحد کبیر سے ہوتا ہوا حضرت مسیح الاولیاء سے جا ملتا ہے۔

آپ کی اولاد نرینہ کا سلسلہ آج تک قائم ہے، جو نہ صرف علم کے زیور سے آراستہ ہے۔ بلکہ اعلیٰ سرکاری و نیم سرکاری عہدوں پر فائز ہوتی چلی آرہی ہے۔

محلّہ قدیم جسے عرف عامہ میں پاٹ پرانی کہتے ہیں۔ اس میں موجود مسجد مخدوم حسن قاری کے لئے روایت ہے کہ اس کی بنیاد حضرت مسیح القلوب نے خود رکھنا فرمائی تھی۔ شاید یہ اس برکت کا نتیجہ ہے کہ اس کی چودیواری اور منبر کے آثار آج بھی موجود ہیں۔ پاٹ پرانی کے چاروں اطراف میں جو فصیل تھی وہ اب منہدم ہوگئی ہے۔ البتہ راقم کے پاس ۱۹۵۰ء کی دھائی میں اس فصیل کی کیمرہ سے لی گئی تصویر موجود ہے، جو جسٹس عبدالوحید صدیقی نے نکالی تھی۔ اس فصیل کی حدود سے باہر ڈھلان پر وہ تاریخی شہر خموشاں موجود ہے۔ جسے ''قاسمانی'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس طویل قبرستان کے چاروں اطراف بھی فصیل زمانہ قدیم سے موجود تھی جو ۲۵ یا ۳۰ سال قبل منہدم ہوگئی اور کئی قدیم قبریں بھی سیم وتھور کا شکار ہوتی جارہی ہیں۔ اس تاریخی قبرستان کا نام شیخ قاسم کے نام سے منسوب ''قاسمانی'' مشہور ہے جو زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے۔ قصہ المختصر کہ پاٹ میں ایسی کوئی تباہی نہیں آئی، جس کا ذکر راشد برہانپوری بحوالہ شیخ طاہر محدث کے کیا ہے کہ وہ ''اپنے متعلقین کو امن وفراغت کی حالت میں اس مقام سے باطمینان نکال لائے جو برباد ہوجانے والا تھا۔'' بجز چند مقامی جھگڑوں اور بدامنی کے جوہر انسانی آبادی اور تاریخ سے وابسطہ رہے ہیں۔

☆

حضرت قاسم بن شیخ یوسف سندھیؒ

آپ حضرت شیخ طاہر محدثؒ کے چھوٹے بھائی اور مسیح الاولیاء کے والد بزرگوار ہیں۔ آبائی وطن سندھ سے ہجرت کے وقت آپ کا آغاز شباب تھا اور آپ متاہل ہو چکے تھے۔ ہجرت کی وجہ اور سفر کے تفصیلی حالات محدث صاحب کے ذکر میں لکھے جا چکے ہیں۔ یہاں ان کا اعادہ تحصیل حاصل ہوگا۔ کیونکہ شیخ طاہر ہجرت کے وقت صدر خاندان اور صدر قافلہ تھے۔ (۱) بالخصوص آپ کے مربی تھے جن حالات سے حضرت محدث صاحب دو چار ہوئے۔ آپ شریک حال رہے اور یہ خاندان نہ صرف دورانِ سفر بلکہ قیام ایلچپور سے لے کر آپ کی منتہائے حیات تک یکجا اور ایک دوسرے کا شریک و سہیم رہا۔

قبل ہجرت وطن میں آپ حصولِ علم میں اپنے متبحر بھائی کے دوش بدوش علوم ظاہری و باطنی کی تحصیل پر کاربند رہے اور کافی ذی استعداد اور صاحب بصیرت ہو چکے تھے۔ شیخ بہاء الدینؒ کے مرید تھے جو اس زمانہ میں شیخ بہاء الدین ذکریا ملتانی کے آستانہ کے سجادہ نشین تھے۔ ہجرت کے بعد آپ کو مزید حصول علوم و تکمیل کمال کا شاید موقعہ نہ ملا۔ کیونکہ اس کی کوئی صراحت نگاہ سے نہیں گزری۔ برار میں جب محدث صاحب درس تدریس میں مشغول نظر آتے ہیں۔ آپ جاگیر کے مواضعات کے انتظامی امور میں مصروف پائے جاتے ہیں۔

۹۶۲ھ میں مسیح الاولیاء کی ولادت سے کچھ قبل مولود مسعود کے متعلق آپ کے حرم میں جو غیبی بشارتیں رونما ہوئیں، ان دنوں آپ گھر پر موجود نہ تھے، بلکہ جاگیر کے موضع پر ضروری امور کی انجام دہی کے لئے گئے ہوئے تھے۔ حتی کہ ۵ ذی الحجہ ۹۶۲ھ (۲) کو جب مسیح الاولیاء کی ولادت باسعادت عمل میں آئی تب بھی آپ واپس نہیں آئے تھے۔ محدث صاحب نے مولود کا نام شیخ عیسیٰ رکھا۔ یہ خوش خبری آپ کو موضع پر پہنچی (۳) اور آپ تشریف لائے۔ فرزند کو دیکھ کر آپ بہت خوش ہوئے اور نام بھی بہت پسند کیا اور برادر بزرگ کو مبارکباد پیش کی۔ کچھ عرصہ قبل جب ولادت کی غیبی بشارتوں کا علم ہوا، جن سے مولود کا نام سلیمان مقرر کرنے کا اشارہ پایا جاتا تھا، تو آپ کا جی چاہا کہ کاش اس بچہ کا نام سلیمان رکھا جاتا۔ لیکن بڑے بھائی کی رائے میں

ترمیم یا اختلاف ظاہر نہ ہو۔ اس تمنا کا کبھی اظہار نہ کیا۔ البتہ محدث صاحب کی عدم موجودگی میں مسیح الاولیاء کو سلیمان کہہ کر پیار کرلیا کرتے تھے۔

وقت گذرنے پر خدا نے دوسرے فرزند کی نعمت عطا فرمائی۔ اس وقت آپ موجود تھے۔ بھائی کی بزرگ داشت کے پیش نظر انہیں سے نام رکھنے کی درخواست کی اور انہوں نے آپ کی خواہش سے بیخبری میں اس بچے کا نام عثمان رکھدیا۔ اب بھی آپ نے دم نہ مارا اور نہ اپنی آرزو ظاہر کی۔ اس حفظِ مراتب اور فرمانبرداری کے انعام میں قدرت نے تیسرا فرزند عطا فرمایا اور پھر برادر بزرگ سے نام رکھنے کی التجا کی یہ لطیفہ غیبی ہے کہ اس بچہ کا نام محدث صاحب نے خود ہی شیخ سلیمان رکھا۔ اس طرح آپ کی تمنائے دلی بر آئی۔

آپ نہایت تقویٰ شعار، عبادت گذار اور متوکل تھے۔ شیخ طاہر محدث فرمایا کرتے تھے کہ میرے بھائی قاسم کا مشرب صوفیانہ تھا۔ ان کی دلآویز گفتار اور پسندیدہ اطوار سے اخیار و ابرار کی علامتیں ظاہر تھیں۔ ۹۸۱ھ میں بمقام ایلچپور برار انتقال فرمایا اور وہیں دفن ہوئے۔ (۴)

مسیح الاولیاء نے آپ کی روحانیت کے متعلق فرمایا ہے کہ جب اکبر بادشاہ جبراً مجھے اپنے ساتھ لے گیا تو مجھے ان پابندیوں سے سخت پریشانی تھی۔ ایک روز میرے والد نے خواب میں آکر مجھے تسلی دی اور سندھی زبان کا ایک شعر پڑھا جس کے مفہوم و مدعا پر عمل کرنے سے جلد ہی مجھے آزادی اور برہان پور آنے کی اجازت مل گئی۔

آپ کو اصناف نظم پر بھی دسترس حاصل تھی، حتیٰ کہ تاریخ گوئی پر بھی عبور رکھتے تھے۔ آپ کے کہے ہوئے تاریخی ماذے بھی نگاہ سے گذرے ہیں۔

☆
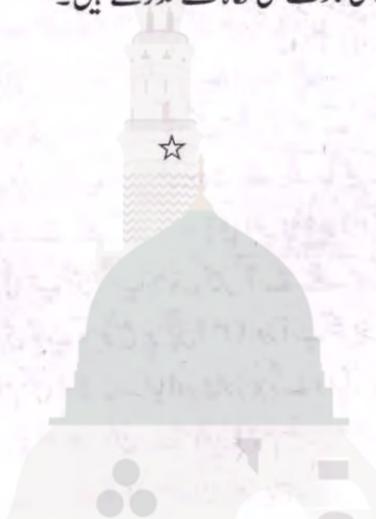
تعلیقات

تعلیق (۱): شیخ طاہر محدث پاٹائی، شیخ یوسف سندھی کے فرزند کلاں تھے۔ اس بنا پر کشف الحقائق کی بنیاد پر راشد برہانپوری نے انہیں گجرات کے سفر میں صدر قافلہ اور صدر خاندان دکھایا ہے۔ اس کے برعکس گلزار ابرار میں شیخ یوسف دوران سفر بذات خود سربراہ تھے۔ کشف الحقائق کے پیش کردہ نسخوں میں مسیح المنقبت کے والد اور والدہ کا شیخ طاہر کے ساتھ گجرات کے سفر میں ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن صدر قافلہ کی اولاد اور منکوحہ کا ذکر نہ کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ کسی خاص مقصد کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے یہ سب کچھ تحریر کر رہے ہیں۔ وگرنہ وہ سالار قافلہ اور ان کی منکوحہ و اولاد کے ذکر کو ضرور محفوظ کرتے۔

تعلیق (۲): حضرت مسیح الاولیا کے ولادت کا سال کشف الحقائق نے ۹۶۲ یا ۹۶۳ھ لکھا ہے۔ ایک طرف تو یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ یہ کتاب حضرت مسیح کی آگاہی سے لکھی گئی دوسری جانب اہل علم اور صاحب قلم خانوادہ جن کا ماحول تصنیف و تالیف اور تحقیق سے مزین ہو، ان سے ان کی اپنی پیدائش کے متعلق ''یا'' کا لفظ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ صاحب تحریر اندازے سے کام لے رہا ہے۔

تعلیق (۳): حضرت مسیح الاولیا کی پیدائش کے متعلق خبر حضرت شیخ قاسم کو ''موضع پر پہنچائی گئی'' اس کا ذکر نہ کشف الحقائق میں ہے نہ گلزار ابرار میں۔

تعلیق (٤): گلزار ابرار کا بیان کہ مسیح القلوب فرماتے ہیں کہ ''ہنوز میرا زمانہ ہوش نہیں آیا تھا کہ آپ کا سایۂ عاطفت میرے سر پر سے اٹھا لیا گیا۔'' اس بنیاد پر صاحب کتاب ''تذکرہ مشاہیر سندھ'' مولانا دین محمد وفائی کا حضرت مسیح الاولیاء کا سال ولادت ۹۶۲ھ ذہن میں رکھتے ہوئے استدلال ہے کہ شیخ قاسم کی وفات ۹۶۸ھ یا اس کے قریب کے کسی سال میں ہوئی ہے۔ لیکن کشف الحقائق اور اس کی بنیاد پر لکھی گئی ''برہانپور کے سندھی اولیاء'' میں اختلاف رائے موجود ہے۔ کشف الحقائق کے مطابق وفات کا سال ''ماہ محرم ۹۸۱ھ نہصد و ہفتاد و یک'' ہے۔ جس سے نقل کرتے ہوئے راشد برہانپوری لکھتے ہیں: ''سن ۹۸۱ھ بمقام ایلچ پور برار انتقال فرمایا اور وہیں دفن ہوئے۔''

گلزار ابرار میں شیخ قاسمؒ کی سوانح بیان کرتے ہوئے شیخ عیسیٰ جنداللہ کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ:

''مسیح القلوب بیان کرتے ہیں: ہنوز میرا زمانہ ہوش نہیں آیا تھا کہ آپ کا سایہ عاطفت میرے سر پر سے اٹھالیا گیا۔''

شیخ عیسیٰ جنداللہ کی سوانح ان کی اپنی زبانی بیان کرتے ہوئے غوثی اسی کتاب میں رقم طراز ہیں: ''پھر تاریخ پانچویں محرم ہجری ۹۸۱ کو پدر بزرگوار کا سایہ میرے سر پر سے اُٹھ گیا۔ اسی سال اپنے عم مکرم رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہ سامان اقامت اُٹھا کر برہان پور خاندیس میں چلا آیا اور ہم دونوں نے یہیں مکان تجویز کرلیا۔ ہجری سن نو سو پچاسی تھا کہ رہنما پیر کی تلاش کے واسطے، جو معرفت کی آباد اور بافروغ بستی میں پہنچادے۔ سیاحی کی شورش نے دل کے اندر سے پاؤں باہر نکالا۔ جب مکان سے نکل کر مسافرت کے راستہ میں چل کھڑا ہوا۔''

تحقیق کے میدان کا ہر باشعور مسافر اس بات پر سوائے افسوس کے اور کیا کرسکتا ہے کہ کشف الحقائق اور گلزار ابرار اپنے اپنے بیانات میں تضاد کا شکار ہیں۔ بلکہ گلزار ابرار تو انہیں شیخ عیسیٰ سے منسوب بھی فرماتے ہیں۔ اگر ان کے بتائے ہوئے سال کو من و عن تسلیم کرلیا جائے تو شیخ قاسم کی وفات کے وقت حضرت مسیح القلوب کی عمر عزیز ۱۹ سال ٹھہرتی ہے۔ جو کسی طور آغاز ہوش کی معنیٰ میں نہیں آتی۔ اسی طرح اگر حضرت شیخ قاسم کی وفات ۹۸۱ھ کے وقت آپ آغاز ہوش یعنی چھ سات یا آٹھ سال کے تھے تو چار سال بعد، حضرت صاحب کو مرشد کی تلاش کی تڑپ محسوس ہوئی اور انہوں نے دس بارہ سال کی عمر میں عزیز اقارب کو چھوڑ کر سفر اختیار کرلیا؟

''تاریخ باب الاسلام'' میں ڈاکٹر حبیب اللہ صدیقی انہی حقائق کو نظر میں رکھتے ہوئے ''سوانح شیخ قاسم'' کے باب میں رقمطراز ہیں:

''قرین قیاس واقعات اس طرح معلوم ہوتے ہیں کہ سن ۹۸۱ھ مطابق سن ۱۵۷۳ء میں شیخ قاسم کی وفات پاٹ شریف میں ہوئی۔ جس کے بعد شیخ عیسیٰ برہانپور منتقل ہوئے' اس سے پہلے مسیح الاولیاء اور ان کے والد شیخ قاسم ایرج پور (برار) کے مدرسے میں شیخ طاہر محدث کی تقرری کے دوران آتے جاتے رہے ہیں۔ بالخصوص شیخ عیسیٰ اپنے عم کے درس میں تفال خان کے قائم کردہ مدرسہ عماد شاہی ایلچپور برار میں مقیم رہے ہوں گے۔''

جاگیرات و مواضعات ''پاٹ'' سندھ میں موجود تھے۔ جن کے حوالہ جات مختلف فرامین شاہی سے بھی ثابت ہیں۔ ہندستانی سوانح نگاروں نے زندگی کی ان آسائشوں کو محض ''کشف''

کی وجہ سے چھوڑ جانے کی بات کی ہے جو 'الف لیلیٰ' داستان معلوم ہوتی ہے۔ شیخ طاہر محدث جو مدرسہ عماد شاہی میں مدرس مقرر ہوئے، اولاً تو انہیں جاگیر ملنے کا امکان کم ہی نظر آتا ہے۔ بالفرض قبول بھی کیا جائے تو برار سے اچانک سب کچھ چھوڑ کر برہانپور منتقل ہوگئے؟ یعنی پہلے ''کشف'' کی بنیاد پر اپنے آبائی وطن پاٹ کی جاگیریں چھوڑ دیں۔ اور انجانی منزل کی طرف چل پڑے پھر ایرج پور پہنچے۔ وہاں جاگیریں ملیں کچھ سال بعد وہاں سے بھی جاگیریں چھوڑ کر برہانپور آگئے؟ فقہائے ہند میں ''بحر ذخار'' سے ماخوذ ''نزہۃ الخواطر'' کے حوالے سے شیخ قاسم بن یوسف سندھی کا ذکر دسویں صدی ہجری کے علماء وفقہاء کے زمرہ میں اس طرح کیا ہے:

''الشیخ العالم الصالح قاسم بن یوسف بن رکن الدین بن شہاب الدین شہابی المعروف بہ سندھی یکے از علمائے ممتازین در فقہ و حدیث۔ مولد و منشا سندھ وہیں درسیات پڑھیں۔ ۹۵۰ھ میں گجرات آئے اور مختلف شہروں میں گھومتے رہے۔ افادہ وتدریس مشغلہ تھا۔ آپ کے صاحبزادہ شیخ عیسیٰ اور دوسرے بیشمار افراد نے آپ سے پڑھا۔ آپ متعدد تصانیف کے مصنف ہیں۔ لیکن مجھے ان کے اسماء معلوم نہیں ہوسکے۔ ۹۸۰ھ میں رحلت فرمائی۔''

بحر ذخار اور ڈاکٹر حبیب اللہ صاحب کے بیانات کو ذہن میں رکھتے ہوئے گلزار ابرار میں مرقوم گجرات کی طرف سفر کے احوال کی پڑتال جس میں شیخ قاسم کا نام تک موجود نہیں ان کی جائے وفات اور شیخ عیسیٰ کی زاد بوم پاٹ سندھ میں ہی ہونا ثابت کرنے کی طرف واضح اشارہ کرتے ہیں۔

مختلف ادوار میں یہ خانوادہ ''قریشان و صدیقان'' اپنے کارناموں کی وجہ سے شاندار القاب سے بھی یاد کیا جاتا رہا ہے۔ جب کچھ شخصیات کو خانقاہ سے منسلک دکھایا جاتا ہے۔ تو ''شیخ'' کے لقب سے نوازا گیا۔ یہی لقب تاریخ میں آگے چل کر مدرسہ کے شیخ یعنی مخدوم کے لقب سے بھی لکھا جاتا رہا۔ علم وعرفان دونوں ہی خصوصیات نسل در نسل چلتی رہیں۔ کبھی ایک کا غلبہ رہا تو کبھی دوسرے کا۔ جب علم اپنے آب وتاب سے ظاہر ہوتا تو فتویٰ نویسی کے مشغلہ نے زور پکڑا۔ یوں اس خاندان کی مختلف شخصیات کے ساتھ قاضی، قاضی القضاۃ اور مفتی کے القاب لکھنے پڑھنے اور کہنے میں آئے۔ جب بفضل ربی جامع العلوم شخصیات پیدا ہوئیں تو شاہ کا لقب بھی زبانِ زد عام ہوا، جیسا کہ شاہ عیسیٰ جنداللہ اور شاہ حسن اللہ الصدیقی الپاتائی۔

الغرض! مسیح الاولیاء کے عظیم والد شیخ قاسم کی شخصیت اس وقت متنازعہ بنی جب کشف الحقائق کا بعد میں تحریر کردہ نسخہ سامنے لایا گیا۔ گلزار ابرار کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ

صاحب تحفۃ الکرام کی طرح غوثی بھی کہیں کہیں سنی سنائی باتوں، یاد داشتوں، غلط تاثر اور اندازوں کو اپنی کتاب میں جگہ دے گئے ہیں۔ گلزار ابرار میں تاج العاشقین شیخ محمد ابن شیخ عبداللہ سندھیؒ کو جو مسیح الاولیاء کے شاگرد، مرید اور خلیفہ تھے، شیخ لشکر عارف باللہ کا خلیفہ لکھ دیا ہے۔ یہ ان کے مشاہدے کا مغالطہ ہے۔ اس کا اعتراف خود راشد برہانپوری نے بھی کیا ہے۔ شیخ طاہر کے سفر گجرات میں ان کے چھوٹے بھائی شیخ قاسم کا ذکر گلزار ابرار میں موجود نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شیخ قاسم بعد میں اپنے بھائی کے ہاں ایرج پور جانے کے علاوہ ہندستان کے دیگر علاقوں میں گھومتے رہے ہیں۔ غوثی آپ کی وفات کے متعلق بھی خاموش ہے۔ جس کے برعکس پاٹ سندھ میں موجود وہ مضبوط روایت ہے، جس کی بنیاد صدیوں پرانا وہ شہر خموشاں ہے، جسے شیخ قاسم کے نام پر ''قاسمانی'' کہا اور لکھا جاتا ہے۔

ہندستان میں اوپر بیان کیئے گئے کشف الحقائق کے نسخہ کی بنیاد پر عام روایت یہی ہے کہ شیخ قاسمؒ کی وفات ایرج پور میں ہوئی۔ لیکن آثار کی نشاندہی کرنے کے لئے وہاں کوئی موجود نہیں۔

کشف الحقائق کے اصل نسخہ کے مؤلف اسماعیل فرحی خود بھی سندھی تھے اگر موجودہ نسخے انہی کے ہوتے تو شیخ قاسم کا وہ سندھی شعر جو انہوں نے خواب میں اپنے فرزند شیخ عیسیٰ کو سنایا، ضرور تحریر کرتے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کشف الحقائق میں تحریف حضرت عیسیٰ جنداللہ کے بعد ہوئی، جب آپ کی اولاد موجود پاٹ سندھ اور برہانپور میں شیخ عبدالستار اور بابا فتح محمد کے درمیان سجادگی و تولیت پر اختلاف شروع ہوئے' جن کی پشت پر مختلف خلفاء اور مریدین کا ہونا یقینی ہے۔

تحریف شدہ کشف الحقائق کے مصنف صدر قافلہ شیخ طاہر کی اولاد اور منکوحہ کا ذکر نہ کر کے صرف مسیح المنقبت کی والدہ اور والد کا احوال دیکر اپنے اس دلی مقصد کو چھپا نہ سکے کہ وہ شیخ عیسیٰ کا سندھ سے تعلق ان کے والد کے زمانہ حیات سے ہی توڑنا چاہتے ہیں۔ (اللہ ہی اپنے راز وقت معین پر ظاہر کرتا ہے اور وہی اصل حقیقت جانتا ہے۔)

حضرت شیخ سلیمان سیفیؒ سندھی البراری البرہانپوری

۱۰۰۵ھ

آپ مسیح الاولیاء حضرت شیخ عیسیٰ جنداللہ قدس سرہٗ کے حقیقی برادر خورد ہیں۔ آپ کی ولادت مسیح الاولیاءؒ کی ولادت کے تین سال بعد ایلچپور برار میں واقع ہوئی۔ (جب کہ ۹۶۶ھ تھا) حضرت شیخ طاہر محدث آپ کے عمِ مکرم نے شیخ سلیمان آپ کا نام رکھا۔

نام کی وجہ تسمیہ آپ کی ہمشیرہ مکرمہ حضرت زینب رحمۃ اللہ علیہا سے اس طرح منقول ہے کہ جب عنقریب حضرت مسیح الاولیاء کی ولادت ہونے والی تھی، حضرت ملا اسماعیل(۱) نے جو بڑے صالح بزرگ اور تعلیم قرآن مجید کے بافیض استاد تھے۔ مجھے بشارت دی کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ تمہارے والد کے گھر حضرت سلیمان علیہ السلام تشریف لائے ہیں۔

نیز میری والدہ نے عالم واقعہ میں مشاہدہ کیا کہ حضرت ملا یونس جو اپنے زمانہ کے بے نظیر و دانشور و درویش تھے، اِس شان سے ہمارے گھر کی طرف تشریف لائے کہ ان کی زرکار نعلین پر طلائی علم بنے ہوئے ہیں۔ ان دنوں میرے والد شیخ قاسم دیہات پر گئے ہوئے تھے۔

جب مسیح الاولیاء کی ولادت ہوئی والد تب بھی واپس نہ آئے تھے۔ لہٰذا عم مکرم نے ہی حضرت کا نام شیخ عیسیٰ تجویز کیا جو ان کے چچا کا اسم گرامی تھا، جو سخاوت، شجاعت اور مجملہ دیگر علمی فضائل کے بے مثل قاری تھے۔

چند دن بعد والد صاحب تشریف لائے۔ مسیح الاولیاء کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ ملا اسماعیل کا خواب اور میری والدہ کے مشاہدہ کا حال سن کر ان کو تمنا ہوئی کہ وہ مولود کا نام سلیمان رکھا جاتا۔ لیکن بڑے بھائی کے ادب ولحاظ کے باعث اپنی خواہش کا اظہار بھی مناسب نہ سمجھا۔ البتہ کبھی کبھی اُس وقت جب بڑے بھائی موجود نہ ہوتے، بچہ کو سلیمان کہہ کر پیار کرلیا کرتے تھے۔

فرحؔی نے یہ روایت بڑے اہتمام و شائستگی سے طولانی عبارت میں لکھی ہے۔ اول و آخر سے اصل عبارت کا کچھ حصہ نقل کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ملاحظہ ہو:

''اے عزیز مریم دہر و رابعہ عصر حضرت بی بی زینب کہ خواہر کلانم حضرت مسیح الاولیا می باشند روزے میفر مودند کہ در ہنگام آخر ایام آبستنی مادرم...... در خواب ملا اسماعیل کہ یکے از زمرۂ صلحائے زمان و در تعلیم قرآن استاد پر فیض بود چنان نمودند کہ درخانۂ پدرم حضرت مہتر سلیمان تشریف فرمودہ اند...... پس عم بزرگوار حضرت ایشان را ہم نام عم خویش کہ مسمّٰی حضرت مسیحا بودند دور اکثر فضائل و کمالات خصوصاً در حفظِ قرآن و قرات و سخاوت و شجاعت نظیر نہ داشتند .... بعدہ پدرم از قریہ کر رفتہ بودند مراجعت نمودہ از سیمائے بہجت افزائے پسر خجستہ اثر سے شگفتند...... و بنا بر خواب مذکور قرۃ العین خود را خواستند کہ مسمّٰی باسم سلیمان کنند اما بملاحظۂ برادر بزرگ اظہار آں تمعنی نہ کروند مگر گاہے از روئے خفیہ بنام سلیمان میخواندند۔''

(کشف الحقائق قلمی ص۴)

اسم سلیمان کے متعلق یہ پذیرائی، یہ انس اور برادر بزرگ کے ادب ولحاظ سے خاموشی و کاملِ رضامندی یقیناً خالقِ کائنات کو بیحد پسند آئی اور اس مستحسن فرمانبرداری کے صلہ میں دوسرے ہی سال خدا نے دوسرے فرزند کی دولت عطا فرمائی اور شیخ قاسم نے حسبِ معمول بڑے بھائی سے نام تجویز کرنی کی التجا کی۔ اُنہوں نے شیخ عثمان نام تجویز کیا کہ مولود خلیفۂ ثالث رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہمنامی سے برکت اندوز ہو۔

ہر چند شیخ قاسم کی دلی تمنا تھی کہ بچہ کا نام سلیمان ہو، لیکن برادر بزرگ کے پاس ادب سے اپنی خواہش کا اظہار تک نہ کیا۔ اس فرمانبرداری اور حفظ مراتب کے صلہ میں قدرت نے تیسرے فرزند کی نعمتِ عظمٰی عطا فرمائی۔ یہ ۲۵ صفر یوم چہار شنبہ ۹۶۶ھ کا واقعہ ہے۔ شیخ قاسم نے اپنی تمنا ظاہر کئے بغیر مولود کا نام رکھنے کی التجا پھر حضرت شیخ طاہر ہی سے کی اور انہوں نے خود بلا تحریک سلیمان نام رکھدیا اور اس طرح حضرت شیخ کی قلبی تمنا اور حضرت ملا شیخ اسماعیل کے خواب کی تعبیر پوری ہوگئی۔

شیخ سلیمان کی ابتدائی تعلیم بھی گھر ہی میں عم مکرم حضرت شیخ طاہر محدث کی خدمت میں انجام پذیر ہوئی اور آپ سنِ شعور کو پہنچنے تک متداول درسیات بالخصوص ادبیات فارسی کے فارغ التحصیل ہوچکے تھے۔ والد کی وفات کے بعد آپ بھی منجملہ تمام بزرگوں و متعلقین

کے برہانپور تشریف لے آئے۔ شعر گوئی کا آپ کو فطری ذوق تھا۔ ساتھ ہی گھر کے صوفیانہ ماحول نے بھی آپ کو متاثر کیا۔ چنانچہ جو کچھ آپ کا کلام بہم پہنچ سکا ہے تصرف میں اس پایہ کا ہے کہ علمائے متوصفین اور خود حضرت مسیح الاولیاء نے اپنی تصنیفات میں بہ احترام و محبت درج کیا ہے۔ چونکہ ولولہ شباب نے آپ کا رجحان سپہگری کی طرف مائل کر رکھا تھا اور فنونِ حرب کے بھی اچھے ماہر تھے۔ عادل شاہ فاروقی کی فوج میں ملازم تھے۔ جب حضرت شاہ لشکر عارف باللہ کے مرید ہوئے تو حضرت شیخ نے آپ کے مشغلے اور بانکپن کے لحاظ سے سیفی تخلص عطا فرمایا۔ فرحی نے حضرت مسیح الاولیاء سے جو کچھ سنا تھا وہ اپنے الفاظ میں اس طرح درج و ملفوظ کیا ہے:

میفر مودند کہ برادرم شیخ سلیمان چوں مرید حضرت پیرمن گشتند تخلص، نہ داشتند،
بعد التماس حضرت ایشان سیفی تخلص دادند۔ (کشف الحقائق ص ۱۵۰)

میدانِ کارزار میں شمشیر آبدار کے جوہر دکھانے والا شیردل سیفی حجرۂ عبادت میں مرتاض و عبادت گذار بھی پایا جاتا ہے اور اہلِ ذوق کی مجلس میں ایسا شاعر بھی جس کا کلام صاحبان حال وقال کو وجد میں لانے کا باعث ہو۔ سیفی نے نہ صرف ادب و تصوف میں ترقی کی بلکہ اپنے شجاعانہ کارناموں سے اپنے فوجی عہدہ میں بھی ترقی کی، یہاں تک کہ ہم ان کو ۹۹۳ھ میں راجے علی خان (عادلشاہ فاروقی) محافظ دستے (باڈی گارڈ) میں دیکھتے ہیں۔ یہ سلطانی قرب اور یہ ذمہ داری کا عہدہ، جانبازی اور سرفروشی کے شجاعانہ امتحانات سے گذر کر ہی ایک سپاہی کو حاصل ہوسکتا ہے۔ یعنی سیفی بادشاہ کے اس منتخب دستے میں تھے جس کو وہ اپنے جلوس میں رکھتا تھا۔

اکبر نے خان اعظم کی سرکردگی میں احمد نگر پر بڑے اہتمام سے مہم بھیجی اور خوشگوار تعلقات کی بنا پر عادل شاہ فاروقی کو بھی پیغام بھیجا کہ وہ اس مہم میں تعاون کریں۔ عادل شاہ نے اس پیغام کو رد نہیں کیا اور نہ صرف فوجیں بھیجدیں بلکہ وہ خود اپنے چیدہ رسالہ کو لے کر برہانپور سے روانہ ہوگیا۔ اس اثناء میں اکبری فوج کے سالار شہزادہ مراد کی جلد بازی اور نخوت و کج خلقی کے باعث باہم متفق نہ رہ سکے۔ عادل شاہ کی آمد پر بھی شہزادہ نے تکبر کا مظاہرہ کیا اور ان کے شایان شان پذیرائی نہ کی۔ عادل شاہ جیسا جلیل المرتبت والی ملک اس برتاؤ کو برداشت نہ کرسکا اور مع اپنے حشم و خدم کے ایک طرف ہوگیا۔ عادل شاہ کا علیحدہ ہوجانا معمولی بات نہ تھی۔ اعظم خان بہت پریشان رہے۔ فتح اللہ شیرازی کو بھیج کر انہیں سمجھانے کی بہت کوشش کی، لیکن عادل شاہ نے رفاقت سے انکار کردیا۔ بلکہ برار اور احمد نگر کی افواج کو اپنا شریک حال کر کے مخالفت پر آمادہ ہوگیا۔ علامہ آزاد کس بے ساختگی سے لکھتے ہیں:

راجے علی خان (عادل شاہ فاروقی) حاکم خاندیس دکن کے حصول کا سردار اور مالکِ شمشیر تھا۔ وہ اعظم خان کی رفاقت پر مستعد ہوگیا تھا۔ یہ حال دیکھ کر اس نے بھی موقعہ پایا برار اور احمد نگر کے امراء اور ان کی فوجوں کو لے کر چلا۔ مرزا عزیز نے یہ سُن کر شاہ فتح اللہ شیرازی کو بھیجا کہ فہمائش کریں۔ وہ دن کے جنگلوں کا شیر تھا۔ اب کس کی سنتا تھا۔ خانِ اعظم گھبرائے امراء کو مشورہ کے لئے طلب کیا...... خان اعظم......

کئی دن آمنے سامنے پڑے رہے۔ مقابلہ کی طاقت نہ پائی، رفیقوں پر اعتبار نہ ہوا۔ ایک رات چپ چپاتے کسی گمنام راستے سے نکل کر ملکِ برار کا رخ کیا...... (دربار اکبری مطبوعہ ص ۲۱۶)

اس مہم میں بھی عادل شاہ کی ہمراہی میں سیفی موجود تھے۔ اگرچہ مذکورہ اقتباس میں ان کا نام نہیں ہے لیکن اس کا ثبوت آگے آتا ہے۔

جن دنوں عادل شاہ اِس مہم پر گئے ہوئے تھے، سندھی پورہ میں رہنے والی کسی عورت نے یہ خبر وحشت اثر سنائی کہ میاں شیخ سلیمان سیفی میدان جنگ میں کام آئے۔ اس خبر سے کہ بھائی کی خبر بدتھی مسیح الاولیاء کو ملال ہوا۔ فرحی لکھتا ہے میں نے دیکھا کہ ایک اجنبی یکایک سامنے آیا اور عرض کی کہ میں میاں سلیمان کی خبر لاتا ہوں اور تھوڑی دیر بعد آ کر خبر دی کی موصوف خیر و عافیت سے ہیں، یہ خبر لوگوں نے غلط اڑا رکھی ہے۔

فرحی کے الفاظ یہ ہیں:

> دراں ایام کہ شہزادہ شاہ مراد و میران عادل خان فاروقی...... باحمد نگر رفتند میاں شیخ سلیمان سیفی نوکر عادل خان مذکور بودند ناگاہ زنے ساکن محلّہ سندھی پورہ خبر قوت ایشاں...... وحضرت قبلہ گاہی پارہ ملول شدند ہماں ساعت ودیدیم شخصے از غیب ظاہر شد وگفت کہ من خبر میاں سلیمان سیفی بیارم...... درلحظہ باز آمد وگفت کہ ایشاں بہ صحت و عافیت اند مردم خبر ایشاں بدروغ گفتہ اند۔

(کشف الحقائق)

یہ ۹۹۳ھ کا واقعہ ہے اور یہ وہی مہم ہے جس کا ذکر مولانا محمد حسین آزاد نے دربار اکبری میں اپنے شگفتہ انداز بیان کے ساتھ تفصیل سے لکھا ہے۔ جس کا ضروری اقتباس ہم نے اوپر درج کیا ہے۔

جس طرح سیفی تخلص کی توجیہہ اور ان کے شاعر ہونے کا علم ہمیں حضرت مسیح الاولیاء کے ارشادات صداقت آیات کے محولۂ بالا الفاظ سے ہوا ہے اسی طرح سیفی کا نمونۂ کلام بھی حضرت مسیح الاولیاء کی ایک گراں پایہ تالیف عین المعانی سے بہم پہنچا ہے اور وہ بھی صرف

رباعیات ہیں جو مختلف اسمائے حسنیٰ کی شرح کے سلسلہ میں باعتبار مطابقت مضمون جستہ جستہ آپ نے درج فرمائی ہیں جن کی مجموعی تعداد صرف بارہ ہے۔ آپ نے سیفی کی رباعی جہاں درج فرمائی پیشانی پر بکمال محبت "لاخیه السیفی عفی عنه" کے الفاظ ضرور لکھے ہیں جو حسبِ ذیل ہیں:

لاخیه السیفی عفی عنه

سیفی نبود در نظرِ اہل یقین — این قصهٔ عاشقی خسر و شیرین
او خود شده ظاہر لباس خسرو — خود جلوه کند ہم بلباس شیرین
(عین المعانی ص۱۴)

لاخیه السیفی عفی عنه

منصور که تا محرم اسرار شود — بالفظ انا الحقش به گفتار شود
یعنی که ہمو نست و ہمونست و ہموں — گر حکم کندور بسردار شود
(عین ص۱۷)

لاخیه السیفی عفی عنه

صوفی که صفا و صفتِ حیاتِ دلِ اوست — زاں ہم گزر و چوں نگر و بر رخِ دوست
یعنی که بود پاک دراں حضرت قدس — از ہرچه بو خواه بد و خواه نکوست
(عین ص ۱۹)

لاخیه السیفی عفی عنه

از خود بسلامت گذر اے صاحبِ سیر — خود رہزن راهِ خویش ہستی نه که غیر
خود اوست که خود کرده تجلی نجود است — گر سالکِ خانقاه و گر راہب دیر
(عین ص۲۰)

لاخیه السیفی عفی عنه

خودر از حدیث غیردر خواب انداز — اوراق فسانه ہمه در آب انداز
از ثاقب آه خانمان سوز و خودی — بردیود ونی ناوکِ پرتاب انداز
(عین ص۲۱)

لاخیه السیفی عفی عنه

سیفی به سرِ مہر کسے حیران است — چوں ذره بمہر مہر سرگردان است
در خلق چو باچشم حقیقت نگرد — نورِ رخ او بہر طرف تابان است
(عین ص۲۴)

لاخیہ السیفی عفی عنہ

سیفؔی بہ غمِ عشق مراخوار مداں — در ظلمتِ شامِ غم سیہ کار مداں
آن خواریم از عزتِ آفاق نکوست — چوں شامِ غمم صبح پر انوار مداں
(عین ص۲۵)

لاخیہ السیفی عفی عنہ

سیفؔی بجہاں کیست بگو غیر از دوست — گر کافر و مسلم است و گر گبر ہموست
از خود گذر وبخود ہمہ اورا بیں — حقا کہ ہموں است ہمونست ہموست
(عین ص۲۶)

لاخیہ السیفی عفی عنہ

سیفی رخِ خود از رہِ کثرت برتاب — ہاں گوہرے از بحرِ حقیقت دریاب
از خود گذر و بخود ہمہ اورابیں — گہ لطف کندگاہ ستم گاہ عتاب
(عین ص۲۹)

لاخیہ السیفی عفی عنہ

عاشق باید بعشق منزل وارد — چوں مظہر فلک ز صدق نورے بارد
حق راد اند بجملہ انواع محیط — اخباس ہمہ زرۂ خود انگارد
(عین ص۳۰)

لاخیہ السیفی عفی عنہ

سیفؔی بخیالِ بت خورشید علم — ورزیر لکدکوبِ فنا گشتہ عدم
مقصود چو اثباتِ وجودش باشد — اور از سر بود نابود چہ غم
(عین ص۳۰)

لاخیہ السیفی عفی عنہ

حیرانِ جمال خویشتن باید بود — سر مستِ وصال خویشتن باید بود
ورکسب کمالِ خویشتن باید بود — یعنی بخیالِ خویشتن باید بود
(عین ص۳۷)

عین المعانی کو بغور و تامل ورق گردانی سے مندرجہ رباعیات سرخی پر یہی رباعیاں مطالعہ میں آئیں۔ کتاب مذکور کے جملہ اوراق ۱۲۸ ہیں اور یہ رباعیاں ۳۷ ورق تک درج پائی گئیں آگے ۹۱ ورق اور ہیں جن میں اسی طرح رباعیات درج بھی ہیں۔ شاید کاتب نے تعجیل کاری کے

باعث ان پر سرخی نہیں لکھی ہے۔ معلوم نہیں ان میں سے کتنی اور رباعیاں سیفی کی اور کتنی مسیح الاولیا یا دیگر صوفی بزرگوں کی ہیں۔ واللہ اعلم بالصوب۔

روائح الانفاس ملفوظات حضرت شیخ برہان الدین راز الٰہی قلمی میں بھی سیفی کی ایک رباعی ملتی ہے اور یہ وہی ہے جس کو ہم نے مذکورہ بالا سلسلہ میں نمبر ۹ پر نقل کیا ہے۔ نیز کاتب کے تصرف سے تیسرے مصرعہ میں بجائے ''بیں'' کے ''دریاب'' تحریر ہے۔ پوری رُباعی اس طرح درج ہے:

سیفی رخِ خود ازرہ کثرت برتاب ہاں گوہرے از بحرِ حقیقت دریاب
از خود گذر و بخود ہمہ اورا دریاب گہ لطف کندگاہ ستم گاہ عتاب

(روائح ص ۳۶۸)

سیفی کے کلام میں صرف رباعیاں ہی ہمدست ہوئی ہیں اور وہ بھی ایک ہی نسخہ سے اور صرف اتنی ہی جو پیش کردی گئیں۔ دیگر اصنافِ شعر غزل، قطعہ، نظم وغیرہ سے کوئی چیز نہیں ملی۔ ظاہر ہے کہ جس شاعر کی اس پایہ کی رباعیات سامنے ہوں اس کے متعلق اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ دیگر اصنافِ نظم سے قاصر نہیں ہوسکتا۔ مندرجہ بالا رباعیات ہم نے نقل کردی ہیں تشریح وتبصرہ کی اس لئے جسارت نہیں کی کہ حضرت مسیح منقبت کا انتخاب ہی ان کی فنی لطافت ومحاسن کی مستند ضمانت ہے اور تصوف میں ان کا یہ درجہ کہ وہ نفس مضمون کے لحاظ سے عین المعانی جیسی کتاب کے عارفانہ مضامین میں بے تکلف سموئی جاسکیں محتاج تعارف وتبصرہ نہیں ہے۔

عین المعانی ۷۹۹ھ میں مرتب ہوئی اور سیفی کو مرید ہوئے یا عطائے تخلص کے بعد شاعری کرتے ہوئے کم وبیش دس سال ہوچکے تھے۔ پھر اس کے بعد بھی وہ آٹھ سال تک زندہ رہے۔ پتہ نہیں اٹھارہ سال کی مشق سخن کے نتیجہ میں انہوں نے کس قدر اور کِن کِن اصناف شعر کا ذخیرہ فراہم کیا ہوگا۔ کہا نہیں جاسکتا۔ ممکن ہے اس مضمون کی اشاعت کے بعد کہیں کچھ اجزا پائے جائیں اور اُن کے منعۂ شہود پر آنے کی کوئی صورت پیدا ہو۔

سیفی کی وفات بھی ان کے سپاہیانہ فطری رجحان کی مناسبت سے میدانِ کارزار میں واقع ہوئی۔ فرحی نے حضرت مسیح الاولیاء کے قول کے مطابق صرف مجملاً اتنا لکھا ہے کہ حضرت نے عطائے تخلص کا ذکر کرتے ہوئے۔

> میفر مودند کہ برادرم شیخ سلیمان چوں مرید حضرت پیر من گشتند تخلص نہ داشتند۔ بعد التماس حضرت ایشان سیفی تخلص دادند...... بعدہ ہمراہ میران عادل خان فاروقی در جنگ سہیل خان وکئی کشتہ شدند۔ (کشف ص ۵۰)

اِس عبارت میں تفصیلات اور تاریخ کی وضاحت نہیں ہے لیکن یہ تاریخی سانحہ بعبارات مختلف کم و بیش جملہ تاریخی کتب میں مندرج ہے۔ ہم ضروری تفصیل علامہ محمد حسین آزاد کی دربار اکبری سے پیش کرتے ہیں کہ یہ کتاب آزاد نے تمام تاریخوں کے مطالعہ کی روشنی میں مرتب کی ہے۔ واقعات کا سلسلہ یوں ہے کہ ۱۰۰۵ھ میں بیجاپور کی مہم پر اکبر نے شہزادہ مراد اور خان خانان عبدالرحیم خان کو مامور کیا تھا اور خانخانان نے حکمتِ عملی سے والی مُلک خاندیس راجے علی خان عادل شاہ فاروقی کو دوست و معاون بنا کر اس مہم کے لئے برہانپور سے ساتھ لیا اور آپ پڑھ چکے ہیں کہ شیخ سلیمان سیفی عادل شاہ کے ملازم اور خاص رسالہ میں تھے۔ اس مرتبہ راجے علی خان فوج کا بھی کافی حصہ ہمراہ لے گئے تھے۔ مقام نا زیر میدانِ جنگ قرار پایا اور فریقین کی فوجیں مناسب ترتیب و قرینہ سے صف آرا ہوئیں۔ سہیل خان دکنی کا توپخانہ ہندوستان میں مانا ہوا توپخانہ تھا۔ اُس نے رات کی تاریکی میں توپوں کو ایسے موقعہ پر نصب کردیا کہ خانخانان کی فوج پر بخوبی زد پڑتی تھی۔ اتفاق سے جلد ہی خانخانان کو اطلاع ہوگئی اور اُس نے فوراً اپنی فوج وہاں سے ہٹادی۔ ساتھ ہی عادل شاہ کو بھی اس خطرہ سے آگاہ کرکے اپنے مقام سے ہٹ جانے کی تاکید کی۔ عادل شاہ اپنی جگہ سے ہٹا تو ضرور لیکن بیخبری میں اپنی لشکر گاہ وہیں قائم کردی، جہاں سے خانخانان ہٹا تھا۔ آزاد لکھتے ہیں:

> قضا کا گولنداز ساعت کا منتظر تھا۔ اس کا ادھر آنا تھا کہ موت نے مہتاب دکھائی۔ کہ عالم اندھیر ہوگیا، دیرتا، تو کچھ دکھائی نہ دیا۔ حریف نے سپہ سالار کو سامنے سمجھ کر آگ دیتے ہی حملہ کردیا۔ یہاں راجے علی خان اپنی فوج لئے کھڑا تھا۔ عجب گھمسان کا رن پڑا۔ افسوس کہ وہ ملکِ دکن کی کنجی اسی میدان کی خاک میں کھوئی گئی۔ کچھ شک نہیں کہ اس نے اور راجہ رامچند ر نے بڑی بہادری اور ثابت قدمی سے ڈٹ کر جان دی اور تیس ہزار دلاوران کے ساتھ کھیت رہے۔
>
> لڑائی کا فیصلہ علی الصبح خانخانان کی فتح کی صورت میں ہوا۔ سپہ سالار نے اپنے رفیق عادلشاہ کی جستجو کی۔ لوگوں نے مشہور کردیا کہ راجے علی خان میدان سے بھاگ گئے۔ بعضوں نے ہوائی اُڑائی کہ غنیم سے جا ملے۔ دیکھا تو بڈھا شیر ناموری کے میدان پر سرخرو پڑا سوتا ہے۔ ۳۵ سردار نامدار اور پانچ سو غلام وفادار گرد کٹے پڑے ہیں۔ (دربار اکبری ص ۶۱۶ و ۶۱۹)

یہ ہے سہیل خان دکنی کے مقابلہ میں فاروقی بادشاہ کی معرکہ آرائی جس کے نتیجہ میں اولو العزم فاروقی بادشاہ مع رفقائے جان نثار دادِ شجاعت دیتے ہوئے کام آئے۔

یہ ۱۸ جمادی الثانی ۱۰۰۵ھ کا واقعہ ہے۔ خانخانان کو یہ فتح عظیم تو میسر آئی، لیکن عادل شاہ کے سانحے سے سارا مزہ کرکرا ہوگیا۔ بادشاہ کی لاش ادب و احترام سے اُٹھائی اور نہایت تزک و احتشام سے برہانپور لاکر ان کے آباد کئے ہوئے عادل پورہ میں ان کے مرشد حضرت عبدالرحیم کپروجی کے مزار کے پاس دفن کیا اور ان کی جگہ ان کے فرزند بہادر خان کو تخت نشین کیا۔

بادشاہ کے سوا اور کسی کی لاش میدانِ جنگ سے لانے کی صراحت نہیں ملتی۔ اس لئے قیاس یہی کہتا ہے کہ سیفی منجملہ دیگر جانبازوں کے میدانِ جنگ یا اسی نواح میں بطورِ گنج شہیداں سپردخاک ہوئے۔

تعلیقات

تعلیق (۱): گلزار ابرار میں غوثی نے سندھ کے چند بزرگان کا ذکر اُن متعلقین خانوادہ مسیح الاولیا سے سن کر کیا ہے، جو ہندستان میں اس وقت موجود تھے۔ اکثر ان بزرگان کے احوال غوثی نے درج کیے ہیں، جن کا بلا واسطہ یا بالواسطہ اس خانوادہ سے تعلق تھا، جیسا کہ شیخ مبارک (پاتری) پاٹائی مخدوم عباس پاٹائی ثم ہنگورجائی، مخدوم نوح، شیخ جلال متو، مخدوم جعفر، شیخ طیب طاب ثرہ، شیخ اسحاق قلندر، شیخ لاڈ جیو سندھی، تاج العاشقین پور عبداللہ سندھی اور اسماعیل سومرہ وغیرہ۔

شیخ اسماعیل سومرہ بلند پایۂ بزرگ ہونے کے باوجود اتنی بڑی شہرت کے حامل شخص نہ تھے کہ اپنی حیات میں ہی ہندستان بھر میں مشہور ہوجاتے اور ان کی شہرت غوثی تک پہنچتی اور وہ ان کا سن وفات ۹۹۸ھ بھی معلوم کرلیتے۔ یہ ملا اسماعیل کی خانوادہ مسیح الاولیا سے وابستگی تھی کہ ان کا ذکر خیر ان کی حیات میں ہی ہندستان میں ہونے لگا۔

ملا اسماعیل سومرہ کا ذکر گلزار ابرار، تاریخ تحفۃ الکرام اور تذکرہ مشاہیر سندھ میں موجود ہے۔ یہ بزرگ ایک زمانے سے سندھ میں مقیم تھے، یہیں دین کی خدمت کی اور سندھ میں ہی وفات پائی۔ ان کا ایرج پور وغیرہ کہیں جانے کا ذکر موجود نہیں۔

تحفۃ الکرام میں لکھا ہے:

> ''ایک بہت بڑے ولی اور نام والے بزرگ تھے۔ کہتے ہیں بچپن سے بڑھاپے تک ریاضتیں کیں۔ بہت امیر تھے، طرح طرح کے طعام اور شربت بناکر حقداروں طالب علموں اور مسافروں کو دیتے تھے۔ خود جو کی روٹی سے افطار کرتے تھے۔ آپ کی کرامات بہت ہیں۔ ۹۹۸ھ میں وفات پائی۔''

گلزار ابرار میں تحریر ہے:

> ''سومرہ سندھ میں ایک گروہ کا نام ہے۔ آپ اس ملک کے نامور مشائخ میں سے ہیں۔ آپ کی خانقاہ کیا تھی۔ ایک زاہدستان تھا، کئی ہزار گون غلہ، زراعتی تخم کا ہوتا تھا۔ جس کا حاصل خانقاہ نشینوں کے مایحتاج میں صرف ہوا کرتا تھا۔

آپ کا خاص طریقہ درویشوں کی خدمت گذاری کرنا تھا۔ ہجری ۹۹۸ھ یا ۹۹۹ھ میں رحمت حق سے جا ملے۔''

صاحب تذکرہ مشاہیر سندھ نے ''کواکب السعادت'' کے حوالہ سے آپ کا ذکر خیر ان الفاظ سے سجایا ہے:

''اپنے وقت کے عارف کامل اور اہل دل تھے، سندھ کے بڑے عارفوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان سے ہزارہا افراد نے علوم ظاہری اور باطنی میں فیض حاصل کیا۔ ان کی حضور پرنور سیدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پاک سے خطیرۃ القدس میں ملاقاتیں ہوتی رہی ہیں۔ انہوں نے ایک رات خواب میں جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارہ پر اپنی چھوٹی بیٹی کا نکاح ٹھیاری کے ایک نوجوان سید سے کردیا۔ جن کی اولاد آج تک ٹھیاری میں موجود ہے۔ آپ کی دوسری بیٹی ایک عارفہ کاملہ ولیہ اور معرفت الاہی کے مقامات سے آگاہ آپ ہی سے فیض یافتہ اور آپ کی خلیفہ تھیں۔ اس خاتون کو بھی سیدوں کی ایک بچی کا ادب کرنے پر مخدوم صاحب کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے روحانیت کی بشارت ملی اور اس کے بعد ہی اس خاتون کو یہ کمالات حاصل ہوئے۔''

آپ کی تدفین ضلع حیدرآباد سندھ کے گاؤں گلاب لغاری کے نزدیک اگھم کوٹ کے قلعہ میں ہوئی، جہاں آپ کا مزار مشہور ہے۔ آپ کے ایرج پور برار جانے کا کہیں اشارہ نہیں ملتا جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ہمشیرہ صاحبہ حضرت زینب رحمۃ اللہ علیہا کو خواب کی بشارت حضرت اسماعیل نے پاٹ سندھ میں ہی دی۔ جس کی روشنی میں حضرت مسیح کی زاد بوم کا سندھ میں ہونا یقینی ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ حضرت مسیح الاولیاء کی پیدائش کے وقت بشارت سے لیکر نو سال کی عمر تک ان کے درس قرآن میں رہ کر قرآن کے حافظ ہونے تک کئی سال کا عرصہ ملا اسماعیل کا سندھ سے باہر جا کر رہنا ممکن نہیں۔ کیونکہ ان سالوں میں آپ یہاں مدرسہ قرآن قائم کر چکے تھے اور ان کی دیکھ بھال ان ہی کے ذمے تھی۔ آپ کی مختلف ممالک کی سیر و سیاحت کا زمانہ بھی بہت پہلے کا ہے۔ حضرت مسیح کی پیدائش اور بعد کے زمانے میں تو آپ تعلیم القرآن اور مدرسہ قرآن کے حوالے سے ہی شہرت رکھتے ہیں۔ آپ کے مشاغل سندھ سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ درس قرآن کے علاوہ آپ سلسلہ سہروردیہ اور قادریہ سے بھی منسلک تھے۔ آپ کی وفات کے بعد درسگاہ کا انتظام آپ کے فرزند مخدوم حامد اللہ نے سنبھالا۔

مسیح الاولیاء(۱) حضرت شیخ عیسیٰ جُند اللہ(۲)

ابن شیخ قاسم سندھی قدس سرہ العزیز

۹۶۲ھ تا ۱۰۳۱ھ

آپ کے آبا و اجداد کا وطن قصبہ پاتری ملکِ سندھ ہے۔ یہ قصبہ خود انہیں کے بزرگوں نے آباد کیا تھا۔ نہ صرف یہ بزرگ اپنے وطن میں معزز و باوقار تھے بلکہ اس عہد کے متبحر عالم محدث و مفسر ہونے کے اعتبار سے قبول عام کا امتیاز رکھتے تھے۔ ہمایوں کی لشکرکشی سے جب ملک سندھ متاثر ہونے لگا تو شورش و بدامنی کے اندیشوں سے دل برداشتہ ہوکر آپ کے والد شیخ قاسم اور آپ کے چچا شیخ طاہر محدث مع متعلقین و دیگر اعزہ و اقربا نے ۹۵۰ھ میں وطنِ مالوف سے ہجرت کی۔ مولانا شیخ اسماعیل فرحی نے مسیح الاولیاء کے ملفوظات میں ہجرت کی صراحت اس طرح لکھی ہے:

> درآن ایام کہ از آمدن ہمایوں بادشاہ در ملک سندھ تفرقہ و حادثہ افتادہ بود پدر و مادر وعم حضرت مسیح منقبت وبعضے از خویشان از قصبہ پات انتقال نمودہ در احمد آباد آمدند۔ (کشف الحقائق قلمی)

وطن سے احمد آباد گجرات اور وہاں سے ایلچپور برار پہنچنے میں آپ کے والد اور چچا کو جن حالات سے گذرنا پڑا، اس کی تفصیلات ہم نے ہر دو بزرگانِ کرام کے ذکر میں بیان کردی ہیں، یہاں ان کا اعادہ تحصیل حاصل ہوتا۔ اس لئے یہ روداد ان بزرگوں کے قیامِ ایلچپور سے آگے بیان کی جاتی ہے اور یہیں سے مسیح الاولیاء کے حالات شروع ہوتے ہیں۔ حضرت شیخ طاہر محدث رحمۃ اللہ علیہ کے زہد و تقویٰ اور علم و فضل کا شہرہ سن کر تفال خان نے جوان دنوں ملکِ برار کے نظم و نسق کا مالک تھا، بڑے اصرار و نیاز مندی سے محدث صاحب سے برار تشریف لانے کی استدعا کی اور جب یہ خاندان اس کی التجا منظور کرکے ایلچپور پہنچا تو علم دوست خان نے ان کے شایان شان احترام و توقیر کا سلوک کیا۔ محدث صاحب کو وہاں کے دار العلوم کی ذمہ داریاں سونپ دیں

نقد پیشکش کے علاوہ زرخیز اراضیات کا ایک موضع بطور جاگیر نذر کیا۔ محدث صاحب نے موضع اور خانہ داری کی دیکھ بھال چھوٹے بھائی شیخ قاسم کے سپرد کی اور آپ درس و تدریس و تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔

کچھ عرصہ بعد ۵ ذی الحجہ ۹۶۲ھ شب یکشنبہ کو آپ کی (مسیح الاولیاء کی) ولادت باسعادت واقع ہوئی۔ اس روز آپ کے والد شیخ قاسم گھر پر موجود نہ تھے۔ محدث صاحب نے مولود مسعود کا نام شیخ عیسیٰ رکھا۔ عیسیٰ حضرت محدث صاحب کے چچا کا نام تھا۔ جو بڑے زبردست عالم اور علامہ عصر تھے۔ اس نام کی معنوی برکت نے آپ کو مسیح الاولیاء مسیح المنقبت بنایا اور آپ کی ذاتِ گرامی مسیح القلوب کی عرفیت سے اربابِ اخلاص کے دلوں کو زندگی بخشنے والی ثابت ہوئی۔

مسیح الاولیاء نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف عین المعانی کی تمہید میں اپنے مولدأ براری ہونے پر فخر کرتے ہوئے یہ عبارت لکھی ہے:(۳)

> عیسیٰ ابن قاسم بن یوسف بن رکن الدین بن معروف بن شہاب الدین المعروف الشہابی الجندی السندی الہندی البراری العشقی الشطاری القادری کہ ملقب بہ عین العرفا ومکنی بہ ابوالبرکات است میگوید۔ (عین المعانی ص۳)

آپ نے مذہبی تعلیم کے ماحول میں آنکھ کھولی تھی اس کا اثر ظاہر ہوکر رہا۔ ۹ سال کی عمر ہوئی تھی کہ قرآن مجید کے حفظ سے فارغ ہوئے اور علوم متداولہ کی طرف توجہ کی۔ اپنے چچا شیخ طاہر محدث سے فقہ و حدیث کی تکمیل کی قرأت و تجوید تصوف کی تعلیم کی طرف سے بہرہ ور ہوئے۔ آغاز شباب میں متاہل ہوئے۔ لیکن طلبِ علوم پر ہمیشہ کار بند رہے۔ ابھی عنفوان جوانی کا آغاز ہی تھا کہ والد کا سایۂ عاطفت سر سے اُٹھ گیا اور وہ ایلچپور ہی میں سپرد خاک ہوئے۔

یہ سانحہ ۵ محرم ۹۸۱ھ کو رونما ہوا اسی اثناء میں تفال خان کا انتقال ہوگیا اور ملک برار کا شیرازہ درہم و برہم ہوگیا۔ اس بحر العلوم خاندان کی فیض رسانی کا شہرہ نزدیک و دور پھیلا ہوا تھا۔ اور والی خاندیس شاہ فاروقی اپنے دارالخلافہ برہانپور میں تشریف لانے کے لئے عرصہ سے منتیں کررہا تھا۔ سقوط سلطنت برار کے فورا بعد حضرت محدث صاحب مسیح الاولیا اور دیگر سندھی اعزا کو لے کر برہانپور چلے آئے۔ بادشاہ نے عزت و احترام سے لیا وسیع اور شاندار محلات و نقد وجنس کی لائقہ پیشکش سے آپ کو ضروریات لاحقہ سے بے نیاز کردیا۔ مسیح الاولیا اور ان کے اعزہ و رفقا کے علاوہ دیگر سندھی بزرگوار جو اطراف و جوانب میں منتشر تھے بُرہان پور آکر آپ کے قریب آباد ہونے لگے اور آپ کی فرودگاہ سے متصل وسیع اور گنجان محلّہ سندھیوں سے آباد ہوگیا جو ان کی وطنی

نسبت سے سندھی پورہ کہلایا اور آج تک سندھی پورہ ہی کہلاتا ہے۔ مسیح الاولیاء کا جس محل میں قیام تھا۔ وہ پندرہ سال پہلے تک موجود تھا، اب منہدم ہوگیا ہے۔ اندرونی دالان کی ایک دو دیواریں موجود ہیں جن کا فوٹو پیش کیا جارہا ہے، جس سے محل کی صنعت تعمیر وسعت وعظمت کا کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور کیا جاسکتا ہے۔

محدث صاحب برہانپور میں بھی علومِ دینیہ کے درس پر مامور کردیئے گئے۔ یہاں شیخ یوسف بنگالی کا مدرسہ جاری ہی تھا۔ مسیح الاولیاء جو محدث صاحب کے درس سے فارغ التحصیل ہوچکے تھے باانیمہ علم وفضل شیخ یوسف کے درس میں شریک ہوئے اور جلد ہی یہاں کی تعلیم سے فراغت حاصل کرلی۔ لیکن ہنوز جستجوئے علوم اور خدا طلبی کا ولولہ برانگیختہ تھا۔ چچا کے مشورے سے سیر وسفر کی تجویز طے پائی۔ عزیز واقارب اور خانمان کو پروردگار حقیقی کے سپرد کرکے توکل علی اللہ آگرا کی طرف روانہ ہوئے۔ ۹۸۲ھ

گوالیار پہنچ کر قصد ہوا کہ حضرت غوث الاولیا کے روضہ مبارک کی زیارت کی جائے۔ چنانچہ تشریف لے گئے اور وہاں بے حد روحانی لذتیں حاصل ہوئیں۔ آگرہ پہنچ کر حضرت قاضی جلال الدین ملتانی سے ملاقات کی۔ اُنہوں نے بڑے اشتیاق سے حضرت طاہر محدث کا حال پوچھا۔ حاضرین مجلس میں سے ملا ابوبکر عطاء اللہ اور حکیم اسحاق ملتانی سے تعارف کرایا کہ شیخ عیسیٰ حضرت محدث موصوف کے برادر زادہ ہیں تو وہ مزید نوازش و مہربانی سے پیش آئے اور مسیح الاولیاء کو اپنی خانقاہ میں مہمان رکھا۔ خانقاہ میں ہر روز غیر معین مقام سے اعلیٰ درجہ کا طعام اس کثرت سے آجاتا کہ تمام حاضرین بفراغت تمام شکم سیر تناول کرتے۔ ایک روز آپ نے دل میں سوچا کی میں نے تو فقر وتوکل کی غرض ترکِ وطن کیا ہے، یہاں تو امیرانہ بسر ہورہی ہے۔ شاید اللہ نے میری تمنا قبول نہیں فرمائی۔

چند روز بعد آپ کے چچا کا خط ملا کہ برہان پور میں حکیم عثمان بوبکانی جو بڑے باعظمت عالم ہیں، تشریف لائے ہوئے ہیں، یہاں آجاؤ۔ شاید ان کے درس میں تمہاری تسکین کا سامان ہو۔ آپ بُرہان پور واپس آگئے اور حکیم موصوف الصدر کے درس میں شریک ہوئے۔ علوم عقلیہ و نقلیہ اور تجوید کی کتابیں پڑھتے رہے۔ یہ سب کچھ تھا، لیکن اب مرشدِ طریقت کی جستجو دل کو بے چین رکھنے لگی تھی۔

انہیں دنوں ایک روز آپ چوک بازار میں ایک دکان پر بیٹھے تھے کہ حضرت شیخ لشکر محمد عارف اور ان کے ماموں شیخ ولی محمد اسطرف سے گذرے۔ آپ کو دیکھ کر اُنہوں نے لوگوں سے دریافت کیا کہ یہ نوجوان کون ہے؟ کسی نے کہا شیخ طاہر محدث کے برادر زادے ہیں، شیخ عیسیٰ

ان کا نام ہے۔ شیخ لشکر محمد عارف نے گھوڑے کی باگ روک لی اور آپ سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ تم تو ہمارے ہو، ہمارے پاس کیوں نہیں آتے اور روانہ ہوگئے۔ مسیح الاولیاء نے سوچا کہ انہوں نے عجیب بات کہی ہے۔ کیا ہرج ہے کہ ان سے بھی کسی وقت ملاقات کر آئیں۔

جب آپ شیخ لشکر محمد عارف کی خدمت میں پہنچے، اس وقت تک آپ کو بیعت ہونے کا خیال تک نہ تھا۔ بلکہ آپ کو اپنے علمی تبحر پر اس قدر ناز تھا کہ کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ داخلِ مجلس ہوتے ہی طبیعت پر خاص اثر محسوس ہوا۔ ایک دو ملاقاتوں میں آئینہ دل پر انوارِ الٰہی کی تجلیات کا انعکاس ہونے لگا، بیعت سے شرفیاب ہوکر زمرۂ مریدین میں داخل ہوگئے۔

فیض رسان شیخ نے اپنے عالم و فاضل مرید کو اپنے فیضانِ باطن سے بہرہ ور فرما کر شیخ عیسٰی سے مسیح الاولیاء مسیح منقبت۔ مسیح القلوب بنادیا اور بلکہ وہ کچھ بنادیا کہ محمد قاسم فرشتہ فرطِ ارادت سے کہہ اُٹھا کہ

دو عیسٰی است فرخندہ در نسلِ آدم

یکے ابنِ قاسم یکے ابنِ مریم

مسیح الاولیاء کو طلبِ علم کا فطری ذوق اور جبلی شغف تھا۔ جملہ علوم وفنون میں فاضل اجل اساتذہ کی شاگردی کر کے ہر ایک علم وفن کو انتہائے کمال تک پہنچایا۔ طفولیت کے زمانہ میں قرآن مجید مُلا اسماعیل سے پڑھا جو اس عہد میں تعلیم قرآن پاک کی فیض رسانی میں ثانی نہیں رکھتے تھے، انہیں کے درس میں نو سال کی عمر ہونے تک صحیح اور پختہ یادداشت سے حافظِ قرآن ہوچکے تھے۔ حضرت شیخ طاہر محدث کے درس میں فقہ و حدیث کی تکمیل کی سند حاصل کی۔ شیخ مبارک سندھی سے اصول فقہ وعلم کلام میں سند فضیلت پائی۔ شیخ عثمان بوبکائی سے علوم عقلی ونقلی حاصل کئے۔ شیخ فتح اللہ شیرازی سے ریاضی وعروض سیکھی۔ شیخ ابراہیم قاری ملقب مرغِ لاہوتی سے تجوید و قرأت میں جبرئیلی لہجہ کی تعلیم حاصل کی۔ الغرض آپ جملہ علوم وفنون میں کاملِ اکمل اور یگانۂ روزگار تھے۔ تصوف سے ذاتی لگاؤ تھا۔ حضرت شیخ لشکر محمد عارف کے مرید ہوئے اور اُن کی خدمت میں اِس علم کے غوامص و نکات حاصل کئے اور ریاضت ومجاہدات، درس و تدریس اور تصنیف وتالیف کے ذریعہ تاحیات فیض رسانی خلق پر کاربند رہے۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آپ نے ہر حالت میں عظیم کارنامے انجام دیئے۔ آپ کے مجاہدۂ نفس کی ایک روایت آپ کے ایک برگزیدہ خلیفہ حضرت شیخ برہان الدین راز الٰہی سے منقول ہے کہ حضرت شاہ لشکر کے ایماء پر آپ نے دریائے تاپتی کے کنارے ایک متوکلانہ چلہ ختم کیا۔ چالیس روز تک یہی معمول رکھا کہ غیب سے کچھ پہنچ گیا تو اس سے ورنہ نیم کے پتوں سے افطار کرتے۔ فرماتے تھے کہ نیم کے پتے

کڑوے نہیں بلکہ میٹھے معلوم ہوتے تھے۔ جب چلہ انجام کو پہنچ گیا تو آپ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ:

الحمدللہ بہ یمن توجہ حضرت ایشاں این چلہ بہ توکل تمام شد۔ حضرت جنداللہ فی ارضہ (لشکر محمد) پارہ گرم شدہ فرمودند کہ اے[1] بھائی این غریب ہموکوں توکل کہاں۔ خداوند تعالیٰ سبحانہ رابہر نانے نباید آزمود۔ (روائح الانفاس قلمی ص۶)

حضرت رازِ الٰہی نے آپ کی ریاضت اور اطاعت مرشد کی ایک اور روایت بیان کی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت شیخ لشکر محمد کے دولت کدہ میں تعمیر کا کچھ کام ہورہا تھا۔ زمین ہموار کرنے کے لئے چند عقیدت کیش مرید مٹی سے ٹوکریاں بھر کر سروں پر اُٹھا کر لاتے اور گڑھے میں ڈال رہے تھے۔ مسیح الاولیاء تشریف لائے اور کام میں شریک ہوگئے۔ چونکہ آپ کثرت ریاضت سے لاغر اور کمزور ہوگئے تھے، ٹوکری اُٹھا کر لاتے ہوئے آپ گر پڑے۔ شیخ نے دوڑ کر آپ کو اُٹھایا اور آپ کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا، پھر بڑی محبت سے فرمایا کہ میاں تم تو جواہر خمسہ پڑھو اور چلہ کشی کرو مٹی ڈھونا تمہارا کام نہیں۔ مگر آہستہ سے کان میں کہا:

آفرین باد کار طالبانِ حق چنیں است- روائح ص۲۹

آپ ہی سے ایک اور روایت آپ کے زہد و استغراق کی اس طرح منقول ہے کہ حضرت نے ایک دن شیخ راز الٰہی سے فرمایا کہ خادمہ محل سے کہہ دو کھانا جلد تیار کرے میں نے چار روز سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ وہ کہتے ہیں جب میں نے خادمہ سے یہ بات کہی تو اُس نے جواب دیا کہ حضرت نے آٹھ دن ہوئے کچھ نہیں کھایا ہے۔ (ترجمہ روائح ص۲۲۸)

مسیح الاولیاء کے تفصیلی حالات آپ کی زندگی ہی میں مدون ہونا شروع ہوگئے تھے۔ اور وہ بھی اس قدر صحیح و مستند کہ جو مرتب کرنے والوں کی آنکھوں دیکھے اور کانوں سنے واقعات پر مبنی ہیں۔ (۴)

۱- آپ کے ملفوظات کا ایک نسخہ آپ کے ایک خلیفہ شیخ اسماعیل فرحؔی نے کامل بیس سال تک حاضرِ خدمت رہ کر اس طولانی زمانہ کے چشمدید اور خود شنیدہ حالات قلمبند کرکے کشف الحقائق نام رکھا۔ ۱۰۲۰ھ اس نسخہ کا سن تالیف ہے۔ مولانا غوثی حسن نے اپنے تذکرہ گلزار ابرار میں مسیح الاولیا کے حالات زیادہ تر کشف الحقائق ہی سے درج کئے ہیں۔ نیز اس کے علاوہ بھی اُنہوں نے بار بار برہانپور آکر بالمشافہ ملاقاتوں اور خط و کتابت سے بھی شیخ مسیح الاولیا کے ذکر کا تکملہ کیا ہے۔ یہ ملفوظات راقم الحروف کے پاس موجود ہے۔ مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف

[1] اردو فقرہ شیخ لشکر محمد عارف باللہ کا فرمودہ ہے۔ راشد۔

نے اس کی ترتیب و تدوین میں انتہائی سعی و سلیقہ سے حسنِ تالیف کا ثبوت دیا ہے۔ نظم و نثر بلند پایہ حمد و نعت و منقبت کے بعد تمہید و تعارف کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

درسن ہزار و بستم مصدی این کار گشتہ نام این ملفوظ کشف الحقائق نہادم دیر دبر پنج باب موسس گروانیدم۔

باب اول: دربیان زاد و بوم و سبب نقل از وطن آبائی معظم حضرت قبلہ گاہی و مولد و مبعث و تحصیل علم حضرت پیرِ دست گیر

باب دوم: در طلبِ حق جستجو نمودن پیر پر تاثیر و یافتن وے۔

باب سوم: در اشارات و نکات کہ بلسان معجز بیان می فرمودند۔

باب چہارم: در معاملات و مکاشفات و تصرفات حضرت ارشاد پناہی۔

باب پنجم: آں کہ خداوند تعالیٰ بسعی صد سال یکے از کمال اولیا مجدد و دین مگرداند۔

اسی ملفوظ میں جامع ملفوظ نے اپنے بیس سال تک پابندی سے حاضر خدمت رہنے کا ذکر اور وجہ تالیف کی صراحت لکھی ہے۔ یہ نسخہ ہنوز طبع نہیں ہوا ہے۔ راقم کے پاس جو مخطوطہ ہے، اس کے آخری صفحات ندارد ہیں۔ کاتب اور سنہ کتابت کا صحیح تعین نہیں کیا جاسکتا۔ پھر بھی اندازہ ہوتا ہے کہ تالیف سے کچھ ہی عرصہ بعد کی کتابت ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مولانا حسن غوثی کا گلزار ابرار بھی آپ کی زندگی میں تکمیل کو پہنچا۔ اس کتاب میں مسیح الاولیا کے حالات کم و بیش ۳۰ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ مؤلف نے کشف الحقائق کے اخذ و اقتباس کے علاوہ آپ سے بالمشافہ ملاقاتوں اور خط و کتابت سے بھی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ یہ کتاب بھی آپ کے زمانۂ حیات ۱۰۲۲ھ میں تالیف ہوئی۔

آپ کے خلیفہ شیخ برہان الدین راز الٰہی کے چند ملفوظات بھی مسیح الاولیاء کے اذکار سے معمور ہیں جو بیس پچیس سال بعد تالیف ہوئے ہیں اور ہنوز طبع نہیں ہوئے ہیں۔ منجملہ ان کے روائح الانفاس کا قلمی نسخہ راقم کے پاس موجود ہے۔ چنانچہ آپ کے حالات مذکورہ بالا کتب اور آپ کی تصنیفات سے (جو خوش قسمتی سے راقم کے پاس موجود ہیں) پیش کئے جارہے ہیں۔

ذوقِ خداطلبی میں آپ کے فقر و توکل کے بہت سے شواہد موجود ہیں۔ ابتدائے سنِ شعور میں ہی علائق دنیوی سے بیزاری آپ کا شعار تھا۔ جب آپ مرشدِ طریقت کی جستجو میں آگرہ تشریف لے جارہے تھے، راہ میں بمقام اوجین (مالوہ) قیام ہوا اور شیخ عبدالکریم ابن شیخ عیسیٰ کی خانقاہ میں مہمان ہوئے۔ اتفاق سے ان دنوں حاکم مالوہ معہ امرا وہاں فروکش تھا۔ اُجین کے مشائخ نے بخیال خود اس ارادہ کے ساتھ آپ کی ملاقات حکام مذکور سے کرانا چاہی کہ آپ کو کچھ

مادی فوائد حاصل ہوجائیں۔ لیکن آپ نے اپنے علم وتقوے اور پرہیزگاری کو جو محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی وطلب کے جذبہ سے حاصل کیا ہوا سرمایہ تھا، دینار و درم کے عوض فروخت کرنا منظور نہ فرمایا اور دوسرے دن ہی اجین سے رخصت ہوگئے۔ راقم گلزار ابرار تصدیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میں اس موقعہ پر موجود تھا اور مسیح الاولیا کے اس فیصلے پر تحسین کی تھی۔ اسی سفر میں آپ نے مالوہ کے دوسرے اولیا خیز شہر سارنگپور میں وہاں کے برگزیدہ مشائخ و اہل اللہ سے ملاقاتوں کا شرف حاصل کیا تھا۔

اسی قبیل کی ایک روایت مولانا فرحتی نے لکھی ہے کہ ایک مرتبہ خانخانان عبدالرحیم خان حضرت کی خانقاہ میں رات کو داخل ہوئے۔ اس وقت علماء و مشائخ کی مجلس گرم تھی، وہ بھی شریک مجلس ہوئے۔ یہ دلچسپ صحبت آدھی رات تک جاری رہی۔ رخصت ہوتے وقت خان خانان نے تین چار سو یا کم وبیش روپیہ نذر کیا اور چلے گئے۔ آپ کی عادت تھی کہ روپیہ پیسہ کبھی پاس نہ رکھتے تھے۔ نذرانہ اور فتوحات کی رقم ایک معتمد خلیفہ شیخ محمد سندھی کی تحویل میں رہتی تھی اور مستحقین خانقاہ کو حصہ رسد تقسیم کردینے پر مامور تھا۔ آپ نے شیخ محمد کو طلب کیا معلوم ہوا وہ گھر جا کر سوگیا ہے۔ فرمایا ابھی بلالو۔ چنانچہ جب شیخ محمد آیا تو آپ نے اس سے غیر وقت طلبی پر معذرت کی اور وہ رقم اس کے حوالے کر کے رخصت کردیا، تب اطمینان ہوا اور آپ کو نیند آسکی۔

آپ کے تقوے اور توکل کی یہ شان تھی۔ مگر ظاہری وضع اور لنگر خانہ کی رونق دیکھ کر لوگوں کو گمان ہوتا تھا کہ آپ بہت دولتمند ہیں۔ حتیٰ کہ جب آپ نے حضرت بیبی خدیجہ سے عقد کیا تو وہ بھی آپ کو متمول خیال کرتی رہیں، یہاں تک کہ چار سال تک انہیں یہی گمان رہا۔

آپ کے تمول کے متعلق لوگوں کو اس لئے حُسنِ ظن تھا کہ اکثر سندھی تجار جو آپ کی خانقاہ میں مہمان ہوتے تھے، حکام صوبہ کا آپ سے حسنِ سلوک و اعتقاد دیکھ کر اپنے مالِ تجارت کا محصول بچانے کے لئے کہہ دیا کرتے تھے۔ کہ یہ مال مسیح الاولیاء کا ہے۔ چوکیدار در آمد و بر آمد کا محصول طلب نہ کرتے تھے۔ جب آپ کو اس فریب کا علم ہوا تو اپنے تجار کو فہمائش کی اور متعلقہ حکام کو حقیقت سے آگاہ کردیا۔

حکام صوبہ میں آپ کے اثر و رسوخ کا کیا عالم تھا۔ حضرت شیخ برہان الدین رازِ الٰہی کے الفاظ میں ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں:

در ابتدائے حال چون بخدمت حضرت مسیح الاولیاء رسیدم پرسیدند اگر قصد یومیہ واراضی است بہ صدرِ شہر کہ آشناست سفارش نمایم و اگر قصد طلب علم است بہ

رفاقت بابا فتح محمد ہرچہ خواہید بخوانید۔ گفتم ازیں ہر دو ہیچ نمی خواہم طلبِ حق دارم۔ میخواہم کہ اربعین بہ نشینم الخ (روائح الانفاس ص ۱۳)

اس روایت کی حقیقت یہی ہے کہ رازِ الٰہی جو آغاز شباب میں حضرت شیخ حسین بنبانی کے مرید ہوئے تھے، لیکن شیخ حسین جلد ہی سیاحت پر روانہ ہوگئے۔ ادھر آپ کے جذبۂ شوق میں ولولے برانگیختہ ہونے لگے۔ خیال کیا کہ گجرات میں کئی نامور مشائخ موجود ہیں، وہاں پہنچ کر کسی بزرگ کی دستگیری سے اپنے ذوقِ طلب کی تسکین کا سامان کریں۔ اتفاق سے مسیح الاولیاء کے ایک خلیفہ شیخ عبدالقدوس مل گئے، وہ صاحبِ کشف بزرگ تھے۔ بہ یک مشاہدہ اُنہوں نے معلوم کرلیا کہ شیخ برہان الدین عالی مرتبہ ولی ہونے والے ہیں۔ نیز یہ بھی کہ آپ کی تکمیل مسیح الاولیاء کی خدمت و تعلیم پر منحصر ہے۔ انہوں نے شیخ برہان الدین کو ترغیب دی کہ حضرت مسیح الاولیاء کے مرید ہوجاؤ۔

چونکہ مسیح الاولیاء کے آئینہ دل پر یہ تقریب منکشف ہوچکی تھی اور وہ پسند نہیں کرتے تھے کہ کوئی شخص کسی کی ترغیب و تحریص سے مرید ہونے کو آئے۔ اسی لئے جب شیخ برہان الدین نے حاضر خدمت ہوکر اظہار بیعت کیا تو آپ نے اس سے پوچھا کہ میاں اگر کچھ یومیہ یا معافی جاگیر حاصل کرنا چاہتے ہو تو ظاہر کرو، والی صوبہ سے میرے ایسے مراسم ہیں کہ اگر میں سفارش کروں تو وہ حسبِ دلخواہ عطا کرسکتا ہے اور اگر علم پڑھنے کا شوق ہے تو مدرسہ میں جا بیٹھو۔ میرا فرزند فتح محمد تمہیں ہر ایک علم پڑھا سکتا ہے۔

مذکورہ بالا بیان سے مسیح الاولیاء کی بے نیازی اور ساتھ ہی ہر شخص کو اس کی آرزو کے مطابق فیض رسانی کا ثبوت ملتا ہے۔ با انہمہ بے نیازی و فقر و توکل آپ نے مدرسہ کلاں، مدرسہ خورد، مسجد و خانقاہ کی پختہ عمارتیں تدریجاً تعمیر کرائیں جو کچھ فتوح و نذرانے حاصل ہوئے، بعد تقسیم حقوق وابستگان خانقاہ انہیں پر صرف فرماتے تھے۔ دم بھر کے لئے بھی کبھی ایک حبہ پاس نہ رکھا۔

سبحان اللہ! آپ کی مقدس و متبرک تعمیرات، کشف الحقائق اور روائح الانفاس میں کئی جگہ مختلف بیانات کے سلسلہ میں تحریر ہے کہ ان تعمیرات کے درمیان مسیح الاولیاء نے خود بھی بنفس نفیس کاریگروں کے زردست چونہ اور مصالحہ پہنچانے کی مشقت متعدد مواقعہ پر انجام دی ہے۔ اور اکثر مریدین وخلفا سعادتِ ابدی جان کر کاریگروں کے ساتھ ہر قسم کی خدمت بجا لاتے رہے ہیں۔ ان مقدس تعمیرات کا عظمت کا پایہ اس اعتبار سے بہت بلند ہے کہ ان میں اہل اللہ علما، صلحا و مشائخ نے سنت ابراہیمی کی تقلید میں جسمانی مشقوں کے ساتھ عملی حصہ لیا۔

فی زمانہ مرور ایام سے مذکورہ عمارات منہدم ہوچکی ہیں، مدرسوں اور خانقاہوں کی قدیم حدود بھی قائم نہ رہیں۔

۱۲۶۵ھ کی آتش زدگی میں یہ تمام عمارات جو سفال پوش تھیں، نذرِ آتش ہوگئیں۔ یہ سانحہ برہانپور میں تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ آگ محلّہ سندھی پورہ ہی سے شروع ہوئی تھی اور اس نے پھیل کر شہر کے بڑے حصے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ہزار ہا مکانات پختہ و خام خاکستر ہوگئے۔ سندھی پورہ میں تو ایسا صفایا ہوا کہ بجز مسیح الاولیاء اور حضرت شیخ طاہر محدث کے مسکونہ محلات کے اور کسی مکان کے باقی رہنے کا پتہ نہیں چلتا اور مذکورہ محلات کا فلک بوس شعلوں میں گھرے ہوکر بھی بچ رہنا کرشمۂ الٰہی کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے۔

مدرسۂ کلاں کی عمارت جنوب رویہ دو منزلہ تھی، منسلکہ تصویر میں شیخ طاہر محمد کے مدفن بارہ دری سے ملحق زینہ مدرسہ مذکور کی دوسری منزل کو جاتا تھا۔ خانقاہ اور مدرسہ خورد کی زمینوں پر وقتاً فوقتاً قبور بنتی گئیں اور اب کسی کی اصل حد نمودار نہیں ہے۔

مسجد کی حویلی، چھت اور چوبی ستون جل گئے تھے۔ اہلِ محلّہ نے انہیں بنیادوں پر بقدر ضرور دیواریں تعمیر کرکے ٹین کا سائبان ڈال لیا ہے۔ مبارک ہیں وہ لوگ، جو اس مسجد میں نماز ادا کرتے ہیں کیونکہ اس مسجد کا باعظمت و محترم ہونا چند در چند وجوہ سے مسلم ہے۔

اول یہ کہ اس کی بنیاد حضرت مسیح الاولیا جیسے خدا رسیدہ بزرگ نے رکھی ہے، ونیز کاریگروں کے ساتھ مع جماعت اہل اللہ تعمیر میں عملا حصہ گیر ہوئے۔

دوم- سمتِ قبلہ کی کامل ترین صحت کا معیار تسلیم کی گئی ہے۔ حضرت بابا فتح محمد محدث نے رسالہ جہت الکعبہ میں سمت قبلہ کے دلائل بصراحت لکھے ہیں اور تعین سمت اور تحقیق سایۂ اصلی برہانپور کے ضمن میں ایک عجیب تحقیقی ثبوت پیش کیا ہے، چنانچہ مفاتح الصلوٰۃ میں لکھتے ہیں:

تحقیق سایۂ اصلی برہان پور و اطرافِ و ایں فقیر در رسالہ جداگانہ بیان نمودہ است چنانکہ حاصل آں دریں ابیات آورو (مفتاح الصلوٰۃ قلمی)

سوم- قاری سید ابراہیم مرغ لاہوتی نے جبرئیلی لہجہ سے سالہا سال اس مسجد میں قرآت کے ساتھ محراب سنائی اور پنجگانہ نمازوں کی امامت کی ہے اور ان سے زیادہ عرصہ تک خود مسیح الاولیاء نے عبادت کی ہے اور اعتکاف میں بیٹھتے رہے ہیں۔ نیز آپ کا ایک روحانی واقعہ اسی مسجد میں رونما ہوا ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ:

۱۰۲۹ھ میں رویت ہلال رمضان المبارک پہلی تراویح اس مسجد میں ہورہی تھی۔ مسیح الاولیاء امام تھے۔ چند رکعتیں ادا کرنے کے بعد بحالتِ قیام قرات پڑھتے ہوئے آپ یکا یک

خاموش ہوگئے۔ مناسب انتظار کے بعد سہو خیال کر کے مقتدیوں میں سے کسی نے لقمہ دیا، لیکن آپ ساکت ہی رہے۔ کافی عرصہ کے بعد آپ نے جہاں سکوت فرمایا تھا وہاں سے آگے قرات پڑھ کر حسب معمول دوگانہ ختم کیا۔ نماز و دعا ختم ہونے کے بعد حاضرین نے طولانی سکوت کی وجہ دریافت کی۔ حضرت نے فرمایا کہ محمد ابن فضل اللہ کا وصال ہوگیا ہے۔ میں ان کی روح کی مشایعت میں دیگر اولیاء واقطاب کے ہمراہ چرخ چہارم تک گیا تھا۔

یہ روایت راقم الحروف نے ہر دو خاندانوں کے بزرگوں سے سنی ہے اور نیازمندوں کو دونوں خاندانوں سے نسباً[1] وابستگی کا افتخار حاصل ہے۔

دونوں بزرگوں کے علمی تبحر، اثر و رسوخ، باہم ارباط اور اتحاد عمل کی یہ واضح مثال ہے کہ برہانپور کے ایک نوجوان عالم، قاضی نصیر الدین ابن مولوی سراج الدین بنبانی اور شکر اللہ شیرازی نے علم حدیث کی بحث میں یہاں تک بات بڑھ گئی کہ مجتہد صاحب نے اپنے عقیدے کے خلاف قاضی پر الزام عائد کر کے محضر جاری کیا کہ یہ شخص کشتنی، گردن زدنی و سوختنی ہے اور ماحول سے متاثر ہوکر متعدد علماء نے بھی موافقت میں رائے لکھ کر مہریں کردیں۔ لیکن مسیح الاولیاء اور حضرت محمد ابن فضل اللہ نائب رسول اللہ نے اختلاف کیا اور قاضی صاحب شرعی سزا سے بچ گئے۔ خانخانان عبدالرحیم خان نے قاضی صاحب کے حجاز پاک جانے کا انتظام کردیا اور یہ فتنہ دب گیا۔

مریدوں کی تعلیم و فہمائش کا طریقہ نہایت سادہ ہوتا تھا اور آپ موقع محل کی مناسبت سے واضح تمثیلات کے ساتھ نصائح ذہن نشین کرنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ابتدائی حالات میں آپ مریدین کو فنا فی الشیخ رہنے کی تاکید فرماتے اور خود بھی آپ کا مسلک یہی تھا۔

حضرت شیخ برہان الدین راز الٰہی کا بیان ہے کہ آپ نے اپنے مرید سید چاند کو جو بعد میں مجذوب ہوگئے تھے، تاکید کی کہ تم کسی بھی درویش سے ملنے جاؤ، اپنے پیر کی صورت کو پیش نظر رکھو۔ اور مجھے حکم فرمایا کہ پیر کا تصور اس قدر غالب رکھو کہ جس سے صحبت کا اتفاق ہو خواہ وہ مشائخانہ وضع پر نظر آئے یا قلندرانہ لباس میں نظر آئے یا جوگی، یہی سمجھو کہ میرا پیر بیٹھا ہے۔

حضرت راز الٰہی سے روایت ہے کہ ایک روز میں نے مسیح الاولیاء سے دریافت کیا کہ حضور دنیا کیا ہے؟ آپ نے جواب میں ایک ہندی دوہا ارشاد فرمایا، جس کا مفہوم مولانا روم کے اس مشہور کے شعر کا بلیغ ترجمہ ہے:

چیست دنیا از خدا غافل بُدن　　نے قماش و نقرہ و فرزند وزن

---

[1] راقم الحروف راشد شیخ محمد فضل اللہ نائب رسول اللہ کی اولاد نرینہ سے شجرہ نسب مربوط رکھتا ہے اور حضرت مسیح الاولیاء کے اخلاف میں ننھیال ہے اور سسرال بھی۔ (ملاحظہ کیجئے تعلیقات ۵)

یعنی دنیا وہی ہے جو خدا سے غافل کر دے۔ صرف سونا چاندی اور عورت بچے نہیں۔ اتنا ٹکڑا میں اس ملفوظ سے نقل کئے دیتا ہوں کہ ناظرین اصل سے بھی لطف اندوز ہوں۔ شیخ برہان فرماتے ہیں:

روزے بعالی حضرت مسیح الاولیاء التماس نمودہ شد کہ دنیا چہ باشدتا بداں اجتناب نمودہ آید، فرمودند- دوہرہ

دنیا نانوں اُسی کا کہی   جے ہرکوں بسرادے سہی

(نوائح ص۳)

ایک مرتبہ آپ حوض کے کنارے بیٹھے تھے۔ آفتاب ذرا بلند ہوا اور روشنی کا عکس مسجد کی دیوار پر دکھائی دینے لگا۔ عقید تمندوں کا جھرمٹ ہر وقت گرد و پیش رہتا ہی تھا۔ آپ نے نگاہ اُٹھائی اور فرمایا کہ اگر حوض کا پانی درمیان نہ ہوتا، آفتاب کا عکس دیوار پر ظاہر نہ ہوتا، حالانکہ دیوار بالکل سامنے ہے، اسی طرح پیر کا وجود بھی مرید اور خدا کے درمیان ایک ضروری واسطہ ہے۔ اگر مرشد کا واسطہ درمیان میں نہ ہو تو جمالِ الٰہی کی تجلی مرید کو نظر نہیں آ سکتی۔ یا جس طرح خس و خاشاک ہر چند کہ شعاع آفتاب کی زد میں پڑا ہوتا ہے، لیکن جل نہیں سکتا۔ ہاں اگر آئینہ درمیان میں لاکر آفتاب کی شعاعیں خس و خاشاک پر منعکس کی جائیں تو وہ جل اُٹھے گا۔ اس مثال میں پیر کی ہستی آئینہ کی قائم مقام ہے۔

ان مثالوں کو بیان کر کے فرمایا: مرید کو لازم ہے کہ اپنی تمام توجہ مرشد ہی کی طرف وابستہ رکھے، مرشد ہی کے وسیلہ سے اس کو ملے گا جو کچھ ملے گا۔

ایک اور موقعہ پر یہ واقعہ بیان فرمایا کہ قاری ابراہیم سندھی جو میرے پیر بھائی ہونے کے علاوہ علم حدیث و فقہ میں میرے شاگرد اور فن تجوید و قرأت میں میرے استاد ہیں۔ اپنے مرشد شیخ عارف باللہ کے ساتھ غوث الاولیاء کی خدمت میں مقیم تھے، ان کی خدمات لائقہ اور حسنِ قرأت سے متاثر ہو کر غوث الاولیاء نے اپنا خرقۂ مبارک عطا فرمایا۔ لیکن شیخ ابراہیم اس عطیہ عظمیٰ کو، لینے کے لئے نہ بڑھے، بلکہ اپنے پیر کی طرف متوجہ بیٹھے رہے۔ شیخ لشکر عارف نے کہا لیتے کیوں نہیں؟ ادب سے عرض کیا آپ دیں گے تب لوں گا۔ اس جواب پر غوث الاولیاء بہت مسرور ہوئے اور فرمایا آفرین ہے ابراہیم۔ مرید کو یہی لازم ہے کہ اپنے پیر کے سوا کسی اور سے سروکار نہ رکھے۔ بہت دعائیں دیں اور قاری صاحب کو مرغِ لاہوتی خطاب دیا اور خرقۂ خلافت شیخ لشکر محمد عارف کے توسط سے عطا فرمایا۔

ایک مرتبہ آپ نے اپنے مرید نور الایمان کو خرقہ عطا فرمایا۔ کچھ دن بعد نور الایمان سے کسی درویش نے وہ خرقہ مانگا اس نے بے تکلف حوالے کردیا۔ آپ کو خبر ہوئی کہ اس نے عطیہ خاص کی قدر نہ کرتے ہوئے ایک ناشناسا سائل کو دے ڈالا ہے۔ مسیح الاولیاء نے نور الایمان کو طلب کر کے جواب طلب کیا کہ تم نے وہ خرقہ کسی کو کیوں دے دیا۔ اس نے کمال سادگی اور نہایت ادب سے جواب دیا کہ حضرت محترم آپ نے طلب فرمایا اور میں نے دیدیا۔ تعجب ہے کہ حضور خود ہی لیکر مجھ سے دریافت فرماتے ہیں۔ پھر آپ نے کچھ تعرض نہ کیا۔ ظاہر ہے کہ وہ ہر پیکر میں مرشد ہی کو دیکھتا ہے۔

مسیح الاولیاء کی ذات گرامی سراپا کرامات تھی، لیکن آپ باوجود خرق و عادات پر ہمہ اوقات قادر ہوتے ہوئے بھی اظہار کرامات سے گریز فرماتے، بلکہ اس چیز کو ناپسند کرتے تھے۔ اپنے صاحب کمال مریدین کو بھی یہی تاکید فرماتے تھے اور اس ضمن میں یہ واقعہ دہراتے تھے کہ لوگ حضرت شیخ لشکر عارف باللہ کی مجلس میں اولیاء اللہ کی کرامتوں کا ذکر کرتے تو آپ پسند نہ کرتے تھے۔ کسی نے دریافت کیا کہ آپ مقربانِ خدا کی اس فضیلت کو باور نہیں فرماتے۔ فرمایا میں اولیا کی کرامت کا کیوں منکر ہونے لگا، لیکن لوگ کرامت ہی کو اولیاء اللہ کا کمال سمجھتے ہیں یہ غلط ہے اور یہ مجھے پسند نہیں، کیونکہ کرامت تو ان کے روحانی قرب وفضیلت کے مقابلہ میں ادنیٰ ترین درجہ ہے، پھر ادنیٰ کو اعلیٰ مدارج پر فوقیت دینا ایک طرح سے ان بزرگانِ کرام کی توہین ہے۔ اسماعیل فرحؔی لکھتے ہیں کہ مجھے بسا اوقات مسیح الاولیا کے پاؤں دبانے کی سعادت حاصل ہوتی رہتی تھی، لیکن عجیب بات یہ ہوتی تھی کہ پاؤں دباتے وقت میں اکثر محسوس کرتا تھا کہ چند لمحات کے لئے میرا عروج بے ساختہ پستی کی طرف رجوع ہوجاتا ہے۔ میں نے رجعت سے اندیشہ مند ہوکر اس کا سبب دریافت کیا۔ پیر و مرشد نے فرمایا: اہلِ ریاضت کے موکل بہمہ حال ان کے محافظ ہوجاتے ہیں، جسم دبانے میں یہ بھی تو ہوتا ہے کہ بعض وقت غیر محسوس طور پر کھال یا جسم کے بال دبتے یا کھچتے ہیں اور اس لمحہ برائے نام سی ایذا ہوتی ہے۔ موکل اس کو برداشت نہیں کرسکتے اور وہ اسی لمحہ سرزنش کے طور پر خاص کیفیت سے متنبہ کردیتے ہیں۔

انہیں مولانا اسماعیل فرحؔی کا کوئی دوست عبدالحکیم نامی ایک سیاح تھا اور سیاحی کے ذوق میں نزدیک و دور کے بے شمار اولیا اور خدا رسیدہ بزرگوں سے فیض حاصل کیا تھا۔ ملک سراندیپ تک کی سیر کی تھی۔ جب وارد برہانپور ہوا تو یہیں کا ہورہا۔ شہر کے باہر تکیہ بنواکر بود و باش اختیار کرلی تھی۔ مسیح الاولیاء سے اس کو بڑی عقیدت تھی اور اکثر حاضر مجلس ہوا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ عید

کے روز خانقاہ میں حاضر ہونے کے قصد سے روانہ ہوا، دل میں خیال کیا کہ حضرت کے ولی کامل ہونے میں کس کو کلام ہے۔ کاش آج میری یہ دو تمنائیں حضرت کی کرامت اور ولایت کے تصرف سے پوری ہوجائیں تو زہے نصیب۔ ایک تو یہ کہ خانقاہ کے تمام سنگریزے سونے چاندی کے ہوجائیں۔ دوسرے آج عید کا دن ہے۔ ہر گھر میں سونیاں ہی پکی ہوں گی، مگر مجھے گرم گرم روٹی جس پر گھی لگا ہو کھانے کو ملے۔

اس نے یہ خیالات دل سے زبان تک بھی نہ لائے تھے کہ داخلِ مجلس ہوا۔ دیکھا کہ صحن کے تمام سنگریزے فی الحقیقت سونے چاندی کے ہیں۔ چاہا کہ تبرکاً کچھ اُٹھالوں مگر ہمت نہ ہوسکی۔ سامنا ہونے پر مسیح الاولیاء نے فرمایا بعض لوگ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے معجزہ طلب کرتے اور اس کو دیکھ کر ایمان لاتے تھے، لیکن وہ وصالِ حق سے محروم رہتے تھے۔ اور جو لوگ معجزہ طلب کئے بغیر ایمان لاتے تھے، وہ فائز المرام ہوتے تھے۔ سیاح کا بیان ہے کہ یہ سن کر مجھے بڑی ندامت ہوئی شرم کے مارے میں وہاں زیادہ ٹھہرنے کی جرأت نہ کرسکا اپنے تکیہ میں چلا آیا۔ میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ کسی اجنبی شخص نے مجھے گرم گرم روٹیاں لاکر دیں، جن پر گھی لگا ہوا تھا۔ فرحی لکھتے ہیں کہ یہ واقعہ خود سیاح نے مجھ سے بیان کیا اور میں اسی کی تصدیق پر درج ملفوظ کررہا ہوں۔

آپ کی خانقاہ سے متصل ایک پیپل کا درخت تھا جب آپ کی طرف رجوع خلائق کی کثرت ہوئی اور لوگ اپنے امراض وتکالیف بیان کرکے آپ سے استمداد چاہتے تو آپ فرماتے پیپل کا ایک پتہ اُٹھالاؤ، آپ اس پتہ پر کچھ لکھ کر یا دم کرکے دیدیا کرتے تھے۔ مشہور ہے کہ ہر شخص کی ہر ایک تکلیف دور ہوجاتی تھی۔ عوام نے آپ کی برکت انفاس کے ساتھ ساتھ اس پیپل کے درخت کو بھی متبرک سمجھنا شروع کردیا۔ یہ دیکھ کر اس خیال سے کہ لوگ آگے چل کر اس درخت کی پرستش نہ کرنے لگ جائیں، اس کو جڑ سے کٹوادیا۔ اسی بیخ و بن پر کچھ عرصہ بعد درخت پھر نکل آیا اور آج بہت گھنا تنا درخت وہاں کھڑا ہے۔ مگر اب دم عیسیٰ کہاں!

درخت کٹ جانے کے بعد ضرورتمندوں کو آپ پانی پر کچھ دم کرکے دیدیا کرتے اور اس پانی سے بھی یہی فائدہ ظاہر ہوتا رہا۔ بعض مریدوں نے حضرت بابا عبدالستار سے پوچھا، آپ کو معلوم ہے کہ حضرت کونسا اسم پڑھ کر پانی پر دم کرتے ہیں۔ اُنہوں نے کہا ہاں۔ آپ اپنے مرشد کا نام شیخ لشکر محمد عارف دم کردیا کرتے ہیں۔ آپ کے خلیفہ حضرت شیخ برہان الدین راز الٰہی فرماتے ہیں کہ اُس وقت میں بھی ایسے حالات میں ضرورتمندوں کو مسیح الاولیاء کا اسم گرامی لکھ کر یا پانی پر دم کرکے دیدیا کرتا ہوں اور ہمیشہ فائدہ ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ خانخانان عبدالرحیم خان اوران کا بیٹا داراب خان آپ سے ملتجی ہوئے کہ ہمیں حضرت بوبو راستی[1] رحمۃ اللہ علیہا کے درس سننے کا بڑا اشتیاق ہے۔ حضرت تشریف لے چلیں تو یہ سعادت میسر آسکتی ہے۔ آپ نے قبول فرمایا اور بہملیوں پر سوار ہوکر معہ خانخانان وغیرہ راستی پورہ[2] پہنچے۔ حضرت موصوفہ لمعات[3] ونزہتہ الارواح[4] اور اسی پایہ کی اعلیٰ کتب تصوف بطرز شائستہ ودلنشین پڑھانے میں شہرت رکھتی تھیں۔ درس جاری تھا، یہ لوگ کافی عرصہ تک اس روز کے درس سے مستفید ہوئے۔ واپسی میں مسیح الاولیاء ارباب خان کی سواری کے رتھ پر اپنی خانقاہ میں تشریف لائے۔

آپ ابھی صحن ہی میں تھے کہ رتھ بان سامنے آکر مؤدب کھڑا ہوگیا۔ حضرت نے خادم سے فرمایا اسے کچھ دیکر رخصت کردو۔ رتھ بان نے عرض کی حضور! خادم کے ہاتھ سے کیا دلاتے ہیں اور وہ بے چارہ دے گا بھی کیا! میں تو دولتِ اسلام سے مالا مال ہونے کا منتظر ہوں۔ آپ میرے رتھ پر سوار ہوں اور میں کافر ہی رہوں!

حضرت اس کے اس کلام سے بہت محظوظ ہوئے اور اس کو مشرف باسلام فرمایا اور اپنے ساتھ کھانا کھلاکر رخصت کیا۔ دوسری مرتبہ ایک اور بہلیبان نے آپ کی سواری پہنچادینے کے بعد آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور دونوں آپ کے فیضانِ نظر سے ولایت کے درجہ کو پہنچے۔

اسماعیل فرحی لکھتے ہیں کہ ایک روز آپ کا مرید حاجی پایندہ حاضر خدمت ہوا، اس کے ساتھ ایک پچاس سالہ نوجوان میر محمد بھی جس کے سر پر چیرہ[5] بندھا ہوا تھا، مگر نہایت بے ڈھنگا

---

1. حضرت بوبو راستی رحمۃ اللہ علیہا مسیح الاولیاء کے مرشد شیخ لشکر عارف باللہ کی دختر تھیں۔ عالمہ، فاضلہ، عارفہ، ولیہ اور تصوف میں بلند پایہ رکھتی تھیں۔
2. راستی پورہ برہانپور کے جنوبی حصہ کا وہ محلہ جہاں زندگی میں حضرت لشکرؒ کا قیام تھا۔ بعد وصال اپنے حجرۂ عبادت ہی میں مدفون ہوئے اور بعد میں آپ کے فرزندوں اور بعض خلفاء کے مزار بنائے گئے۔ یہیں حضرت شاہ کلابتو چھرپتی اور نو شہیدوں کے مزارات ہیں۔ حضرت بوبو راستی کے انتساب سے اس محلّہ کا نام اسی زمانہ میں راستی پورہ مقرر کیا گیا تھا اور آج تک اسی نام سے معروف و متعارف ہے۔ عبدالحکیم سیاح کا تکیہ راستی پورہ دروازہ کے باہر تھا۔ مقدیم تعمیر اب کہاں تکیہ البتہ ہے اور فقرا اس میں قیام کرتے ہیں۔
3. لمحات علامہ فخر الدین عراقی کی بلند پایہ تصنیف ہے، جس کی شرح مولانا جامی نے ۸۸۱ھ میں لکھی اور اس کا نام اشعۃ اللمعات رکھا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ راقم الحروف کے پاس موجود ہے۔
4. نزہتہ الارواح حضرت سادان حسینیؒ کی عارفانہ تصنیف ہے۔ اس کا قلمی نسخہ بھی راقم الحروف کے پاس موجود ہے۔
5. چیرہ ایک پر تکلیف دستار ہے، جس کے کچھ حصہ میں کلابتوں (زری) کی ایک پٹی بنی ہوتی ہے، جس کو آئینہ سامنے رکھ کر سر پر لپیٹا جاتا ہے اور زری کی پٹی کو اس احتیاط سے جمایا جاتا ہے کہ دستار پوری زری کی دکھائی دیتی ہے۔ اب اس کا رواج باقی نہیں رہا۔ لیکن برہان پور میں اب بھی چیرہ مندیل اور ہر قسم کی دستار بنانے والے کاریگر موجود ہیں، جن میں ٹھٹائیوں کو اکثریت حاصل ہے۔

اور بدنما بندش تھی، چونکہ چیرہ نہایت خوشنما دستار ہے، بشرطیکہ سلیقہ سے باندھی جائے۔ مسیح الاولیاء نے اس سے بہ ملائمت دریافت کیا تم نے اتنی لاپرواہی سے چیرہ کیوں باندھ رکھا ہے۔ میر محمد نے جواب دیا: حضرت محترم چند سال ہوئے میرے سیدھے ہاتھ کو تکلیف پہنچ گئی تھی۔ علاج سے ہاتھ اچھا تو ہوگیا ہے، لیکن سر سے اونچا نہیں ہوسکتا، اس مجبوری کے باعث مجھے الٹے ہاتھ سے باندھنا پڑتا ہے اور وہ اچھا نہیں بندھتا۔ حضرت نے فرمایا ایک مرتبہ ہمارے سامنے تو سیدھے ہاتھ سے باندھو، اس نے سر سے چیرہ اتارا اور سیدھے ہاتھ سے باندھنا شروع کیا۔ اول اول تو کچھ تکلیف سے ہاتھ اونچا ہوا، لیکن جلد ہی یہ دقت جاتی رہی اور چیرہ کی بندش ختم ہونے تک ہاتھ بالکل کارآمد ہوگیا اور کوئی سقم باقی نہ رہا۔

جب حضرت اُٹھ کر محل میں تشریف لے گئے تو حاجی پائندہ نے اپنے مہمان میر محمد سے کہا کہ چلو اب ہم لوگ بھی گھر چلیں۔ پھر کبھی حاضر ہوجائیں گے۔ میر محمد اُس کے ہاں چند روز سے مقیم تھا، کہنے لگا کہ اب میں یہاں سے کہیں نہیں جاسکتا اور اس نے ایسا ہی کیا حضرت کی خانقاہ کے مہمان خانہ میں مقیم رہا۔ پچھلی رات سے جاگ اُٹھتا اور بلند آواز سے اشتیاقیہ اشعار پڑھتا مسجد میں اذان دیتا۔ مہمان خانہ سے کھانا کھالیتا اور کسی چیز کی طمع نہ رکھتا۔ چند سال اسی وطیرہ پر زندہ رہا اور یہیں انتقال کیا۔

فرحؔی نے ایک اور واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ صحن خانقاہ کے حوض کا پانی خراب ہوگیا۔ اس میں کثرت سے سرخ کرم پیدا ہوگئے، تمام فقرا و طلبا کنویں سے پانی نکال کر وضو وغیرہ کے استعمال میں لاتے تھے۔ ایک دن مسیح الاولیاء ظہر کی نماز کے بعد مسجد کے ستون سے تکیہ لگا کر بیٹھے تھے، منجملہ دیگر حاضرین کے فرحی بھی موجود تھا۔ ایسے میں خادم مسجد ملا بابا نے حوض کا حال بیان کرکے پوچھا اگر حکم ہو تو حوض کو صاف کرکے اس میں نیا پانی بھرلیں۔ حضرت اُٹھ کر حوض پر آئے اور چلو میں پانی لے کر ایک کلی حوض میں کی اور فرمایا یہی پانی صاف ہے لوگ کیوں کہتے ہیں کہ پانی خراب ہوگیا اور حجرہ میں چلے گئے۔ اسی وقت حوض کا پانی اتنا مصفا ہوگیا، جیسے نہر رواں کا پانی صاف ہوتا ہے کرم جو اس میں بیحد و شمار تھے، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا ہوئے۔ فرحی لکھتے ہیں کہ جب میں نے یہ واقعہ شیخ محمد سندھی سے بیان کیا تو انہوں نے بتایا کہ ایک بار پہلے بھی ایسا ہوچکا ہے، اسی طرح حوض میں کرم پیدا ہوگئے تھے۔ حضرت نے اس میں ایک غرغرہ کیا اور سب خرابیاں دور ہوگئیں اور یہ معاملہ میری موجودگی میں واقع ہوا تھا۔

ایک مرتبہ آپ کی چند نایاب کتابیں جو بابا عبدالستار کے مطالعہ میں رہتی تھیں، ان کے حجرہ سے چوری ہوگئیں۔ شامت زدہ چوروں نے بغرض فروخت ملا حبیب کشمیری کو دکھائیں جو

آپ کا مرید تھا۔ قیمت پوچھی تو ناواقفیت سے اس قدر کم بتائی کہ ملا حبیب کو شبہ ہوگیا کہ یہ چوری کی نہ ہوں۔ اُنہوں نے ورق گردانی کی تو ہر کتاب میں مسیح الاولیاء کی مہر اور کتابت نظر آئی۔ چنانچہ ملا حبیب نے چوروں کو معہ کتب اپنے آدمی کے ساتھ حضرت کے پاس بھیجدیا۔ آپ نے گم شدہ کتابوں کے اس طرح مل جانے پر الحمدللہ کہا اور فرحؔی سے پوچھا تم اس الحمدللہ کا مطلب سمجھے؟ عرض کیا گمشدہ دولت کی بازیابی پر شکر ادا کیا گیا ہے۔ فرمایا ایسا نہیں ہے، بلکہ جب یہ چوری ہوگئی تھیں اُس وقت کوئی ملال نہیں ہوا تھا اور اب جب یہ مل گئی ہیں کچھ خوشی نہیں ہوئی۔ میں نے اس بات پر اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر یہ ادا کیا ہے کہ اُس نے ہر حال میں میرے دل کی حالت یکساں رکھی۔

مسیح الاولیاء کے دو حقیقی بھائی شیخ عثمان اور شیخ سلیمان سیفی سپاہی پیشہ اور عادلشاہ فاروقی کی فوج میں ملازم تھے۔ شیخ سلیمان سیفی عالم و فاضل صاحب ذوق و وجدان اور شاعر بے بدل تھے۔ خانِ اعظم کی رفاقت میں خود فاروقی بادشاہ اپنے چیدہ رسالہ کو ساتھ لے کر محاذ احمد نگر پر گیا۔ جس میں سیفی بھی شریک تھے۔ انہیں دنوں محلّہ سندھی پورہ میں یہ افواہ پھیلی کہ سیفی میدانِ جنگ میں کام آگئے۔ مسیح الاولیاء کی خدمت میں ایک اجنبی شخص آیا اور عرض کیا: اجازت ہو تو میں حقیقتِ حال معلوم کروں۔ رضا ملنے پر گیا اور فوراً واپس آکر خبر دی کہ یہ افواہ غلط ہے۔ سیفی خیر و عافیت سے ہیں اور جلد ہی واپس آئیں گے۔ کسی نے اس کا نام پوچھا، اس نے بتایا شمو طشیار اور چلا گیا۔ حاضرین نے اس نام اور اس کی شخصیت کے متعلق استفسار کیا۔ مسیح الاولیاء نے فرمایا یہ موکل تھا۔ یہ نام تورانی زبان کا ایک جملہ ہے، جس کا عربی ترجمہ **اللہ الالٰھۃ الرفیع و جلالہ** ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ مولانا فرحؔی اپنے دو پیر بھائیوں شیخ نصر اللہ اور شیخ رکن کے ہمراہ چوک بازار برہانپور میں مہتابی کی سیر کو گئے۔ وہاں اُنہوں نے بعض لوگوں کی سرگوشیاں سنیں، جن کا مطلب یہ تھا کہ حاکم شہر مسیح الاولیاء سے صاف نہیں ہے۔ مولانا فرحؔی نے ساتھیوں سے کہا کہ جب والی[1] شہر حضرت سے کدورت رکھتا ہے اور آپ کی قدر نہیں کرتا تو کیا وجہ ہے کہ آپ ہجرت کر کے مکہ معظمہ یا دوسرے ملک کو نہیں چلے جاتے۔

حضرت پر یہ امر منکشف ہوگیا۔ چنانچہ جب فرحی واپس ہوکر حضور میں پہنچا تو فرمایا کہ

---

[1] والی شہر یعنی اکبر بادشاہ۔ یہ ۱۰۰۸ھ کا واقعہ ہے۔ جبکہ اکبر نے اپنی سلطنت کی پوری طاقت کے ساتھ قلعہ آسیر کی تسخیر کے لئے خود موجود رہ کر سخت جدوجہد کی، لیکن گیارہ ماہ تک کچھ بنائے نہ بن سکا اور والی برہانپور مع اپنے مٹھی بھر رفقا کے اطمینان سے قلعہ میں محفوظ بیٹھا رہا۔ اب بوڑھا ضدی بادشاہ جھنجھلا کر اوچھے ہتھیاروں پر اتر آیا۔ اس وہم سے کہ برہان پور کے اہل اللہ فاروقی بادشاہ کی رد بلا کے لئے وظیفے پڑھتے ہیں۔ اس لئے قلعہ فتح نہیں ہوتا، چنانچہ اس نے صوفیہ و مشائخ کو جس طرح بنا قابو میں کرلیا اور اکثر کو جبر و تعدی اور بعض کو حکمت عملی سے اپنے لشکر کے ہمراہ آگرہ لے گیا۔

بھائی اگر مکہ مکرمہ یا کسی دوسری ولایت کو ہجرت کو جاؤں اور وہاں کے حکام بھی مخالفت پر اُتر آئیں تو کیا ہوگا؟ یاد رکھو ہر شخص کا ضمیر مشیتِ ایزدی کے تابع ہے قرآن کریم فرماتا ہے۔ **وکذالک فسلکه فی قلوب المجرمین** اور اس فہمائش کے بعد مجھے بہت تسلی و دلاسا دے کر رخصت فرمادیا۔

مسیح الاولیاء اپنے مرشد کی نگاہ میں اس قدر محبوب ومکرم تھے۔ اُنہوں نے باوجودیکہ دوفرزند صاحب علوم وادراک ایک ملک حبیب اور دوسرے شیخ بایزید موجود تھے، لیکن اپنی جانشینی وسجادگی کے لئے مسیح الاولیاء کو تجویز کیا۔ جملہ اولاد اور متعلقین کو جمع کر کے وصیت فرمائی کہ میرے بعد شیخ عیسیٰ سجادہ نشین ہوں گے۔ میرے فرزند سپاہ گری کی ملازمتیں کرلیں، جوان کے آبا واجداد کا بہترین شغل رہا۔ ایسا نہ ہو کہ اس موضع کے لئے جو میرے نام معافی جاگیر ہے سجادگی کا کوئی مدعی ہو۔

اس وصیت پر عمل ہوا شیخ کی مسند رشد و ہدایت معہ متعلقات مسیح الاولیاء ہی سے متعلق رہی اور سعید مرشد زادوں نے کبھی دست اندازی یا والد محترم کی وصیت سے انحراف نہیں فرمایا۔ حالانکہ ملک حبیب تو شاہی فوج کے نامور کارگزار ہونے کی وجہ سے صاحب اثر اور قوی بازو بھی تھے۔ بلکہ اُنہوں نے آپ سے نہایت نیازمندانہ اور خوشگوار تعلقات رکھے۔ فرحی لکھتے ہیں کہ یہ صراحت میں نے ملک حبیب کے بیان کے مطابق درج ملفوظات کی ہے۔

ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ اکبر مسیح الاولیاء سے صاف نہ تھا، چنانچہ قلعہ آسیر پر تسلط ہوگیا تو اس نے ہاتھ پاؤں نکالے۔ اکثر مشائخ وصوفیا پر فاروقی بادشاہ کی حمایت و ہوا خواہی کا الزام عائد کر کے قید و بند میں ڈال دیا، لیکن مسیح الاولیاء کی عام مقبولیت کو دیکھ کر اس قسم کی کاروائی نہ کی بلکہ بڑی نیازمندی سے پیغام دیا کہ آپ کی ذات گرامی تو فیض و برکات کا سمندر ہے۔ یہاں رہ کر محض چند مریدین کو فائدہ پہنچانے کے بجائے میری فوج کے لاکھوں طالبانِ ہدایت کو سیراب فرمایئے اور آپ کو لشکر گاہ میں طلب کرلیا۔ غرض لطائف الحیل اور جبر و تعدی سے متعدد مشائخ اور صوفیائے کرام کو آگرہ لے جاکر نظر بند کردیا۔(۶) حضرت مجدد الف ثانیؒ (۱۰۳۴ھ) کے ممتاز خلیفہ میر محمد نعمان نقشبندیؒ (۱۰۵۸ھ) کا تو آگرہ ہی میں وصال ہوگیا۔ مسیح الاولیاء اس نگرانی اور گوناگوں پابندیوں سے تنگ آکر بارگاہ ایزدی میں تضرع وزاری سے آزادی کے لئے دعائیں مانگا کرتے تھے۔ جلد ہی دعاؤں کا اثر ظاہر ہوا ایک شب آپ کے والد مغفور نے خواب میں آکر آپ کو تسکین دی اور سندھی زبان کا ایک شعر پڑھا، جس کے مفہوم کے مطابق عمل کرنے سے آپ کو آزادی اور برہانپور جانے کی اجازت مل گئی۔ علامہ غوثی نے دبے دبے الفاظ میں یہ واقعہ تو لکھا لیکن سندھی زبان کا مذکورہ شعر نہیں لکھا کاش وہ یہ ضروری چیز لکھ دیتے۔

فرحیؔ نے یہ روایت اپنے انداز میں بیان کرتے ہوئے حاجی نعمت اللہ ساکن شیخوپورہ اور حاجی اسحاق سندھی کے نام بھی لکھے ہیں جو منجملہ دیگر مریدوں کے اس عالم میں بھی مسیح الاولیاء کے رفیق سفر تھے۔

آپ کا لوگوں کو مرید کرنے کا طریقہ نہایت سادہ اور اثر انگیز تھا۔ فرحیؔ نے بڑی وضاحت اور کامل تفصیل سے اس معاملہ کو لکھا ہے۔ فرماتے ہیں جس طالبِ بیعت میں منزل شناسی کی صلاحیت دیکھتے مرید کرتے ورنہ انکار کر دیتے تھے۔ یا جہاں اس طالبِ نعمت کا حصہ ہوتا وہاں تک رہنمائی کر دیتے تھے۔

جس کو مرید کرتے تھے اُس کے دونوں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر یہ پڑھواتے:

الحمدللہ الذی لا الہ الا ھو الحی القیوم واتوب الیہ استغفراللہ ربی من کل ذنب اذنبتہ عمداً او خطاءً سراً او علانیۃ واتوب الیہ من الذنب الذی اعلم ومن الذنب الذی لا اعلم وانت علام الغیوب ان الذین یبایعوں اللہ اذ یبایعونک تحت الشجرۃ ید اللہ فوق ایدیھم.

پھر بتاکید یہ تلقین فرماتے کہ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو حرام کہا ہے، ان کو حرام جاننا چاہئے۔ روزانہ پانچ وقت نماز ادا کرنی چاہئے۔ ماہ رمضان کے روزے رکھنے چاہئیں۔ خدا مال دے تو اس کی زکوٰۃ دینی چاہئے اور استطاعت ہو تو حج کرنا چاہئے۔

اب مُرید کے ہاتھ چھوڑ دیتے اور فرماتے کہ دو رکعت نماز شکرانہ ادا کرو۔ عورتوں کو مرید کرنے میں جو پابندی اور اہتمام تھا، اس سے آپ کے تقوے کا روشن ترین پہلو سامنے آتا ہے، یعنی جب آپ کسی خاتون کو مرید کرتے تو درمیان میں پردہ قائم ہوتا اور پردہ کے نیچے دوپٹہ اس طرح گذارا جاتا کہ اس کا ایک سرا مرید ہونے والی خاتون کے ہاتھوں میں ہوتا اور دوسرا سرا آپ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیتے اور مذکورۂ بالا استغفار و تلقین کی خواندگی عمل میں آتی اور دوگانۂ شکر کا حکم دیتے۔

مرید عورتوں کو ایک دامنی بھی عطا فرماتے تھے۔ یہ چار گز طول کا ایک کپڑا ہوتا تھا، جس پر یہ عبارت تحریر کرائی جاتی تھی اور یہ تحریر بالعموم حضرت بابا عبدالستار آپ کے فرزند کلاں کیا کرتے تھے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم— لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ قل یا عبادی الذین اسرفوا علیٰ انفسھم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعا انہ ھو الغفور الرحیم. فلانۃ بنت فلانۃ راحق سبحانہ وتعالیٰ بحرمت کلمہ طیب وایۃ مسطورہ وبحق النبی وآلہ واصحابہ اجمعین بیامرزد.

اتنا ٹکڑا فرحی کے الفاظ میں پیش کئے دیتا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں کہ مولانا نے کس اختصار اور جامعیت سے چند جملوں میں امر واقعہ کی عکاسی کی ہے۔

وچوں زنے را مرید میکردند درمیان پردہ بستہ داز زیر پردہ دو پٹہ گذر اندہ یکطرف آن دردوست خود میگرفتند ویکطرف بدو دستش گیراندہ انچہ مذکور گشت بعمل آوردہ حکم بدوگانہ شکرش میکردند (کشف ص ۲۵)

اسی احتیاط اور صاف باطنی کا اثر تھا کہ آپ کے بے حد وشمار مریدین میں سے ہر ایک صاحب مقام، برگزیدہ خلق اور فیض رسانِ عالم ہوا۔ اور یہ انوار توحید وعرفان کی برقتاب شمعیں نہ صرف برہانپور و خاندیس میں جگمگائیں، بلکہ دکن سے لے کر پنجاب و کشمیر تک چاردانگِ ہند وحجاز مقدس اور مدینہ طیبہ میں بھی منور رہی ہیں۔ یعنی ہر مقام پر آپ سے فیض یافتہ خلفا روحانی تجلیات کے مظہر رہے ہیں۔

آپ کے جملہ خدا رسیدہ مُریدین کا تفصیلی ذکر تو ایک عمر کی فرصت چاہتا ہے، اگر صرف سب کے نام و مقام ہی لکھنے پر اکتفا کی جائے تب بھی یہ تذکرہ ایک طومار ہوجائے گا۔ بعض کے مختصر حالات جداگانہ بیان کئے جائیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

مسیح الاولیاء اپنے مرشد کی وصیت کے مطابق اُن کے سجادہ نشین اور متولی تھے۔ خاص اہتمام سے عید الفطر کے روز جو شیخ لشکرؒ کا روز وصال ہے، اُن کے دیوان خانے میں اور دوسرے دن اپنی خانقاہ میں عرس کی تقریب انجام دیتے تھے۔ طریقہ یہ تھا کہ آپ غرہ شوال کو بعد افطار راستی پورہ پہنچ جاتے۔ شیخ کے شہر کے تمام مشائخ وعلما وصوفیا یکے بعد دیگرے جمع ہوجاتے۔ بعد عشا مجلسِ میلاد منعقد ہوکر نصف شب تک جاری رہتی۔ عبدالرحیم میلاد خوان پر سوز لہجہ اور دگلداز آواز سے عربی قصائد پڑھتا مجلس میں وجد و حال کا سماں بندھ جاتا تھا۔ مناسب وقفہ کے بعد پھر قصیدہ خوانی ہوتی پھر دس قدم چل کر مسیح الاولیا کھڑے ہوجاتے، تمام جماعت صلحائے حاضرین اتباع کرتی۔ مزار پر چڑھانے کے لئے صندل، عطر، پھول و تبرک کی کشتیاں ادب سے سروں پر اٹھاکر مامور اشخاص ساتھ ہوجاتے اور یہ مقدس جلوس مزار کی طرف روانہ ہوتا۔ دس قدم چل کر آپ رُک جاتے اور اپنا عصا ٹھوڑی سے ٹکا کر قیام کرتے۔ عبدالرحیم یہاں بھی ایک قصیدہ ختم کرتا، غرض اسی طرح ہر دس قدم پر رک کر قصیدہ خوانی کے ساتھ یہ جلوس قریب سحر مزار پر انوار پر پہنچ کر اول نماز صبح، پھر صندل، عطر، پھول چڑھا کر بعد فاتحہ منتشر ہوتا۔ آپ لوٹ کر مرشد کے دیوان خانے میں حاضر ہوتے اور حضرت بوبو راستی رحمۃ اللہ علیہا سے تبرک لے کر اپنی خانقاہ میں واپس آتے اور اس شب اپنی خانقاہ میں اسی اہتمام سے عرس کی تقریب کا اعادہ فرماتے۔

عمائدین شہر، مشائخ وصوفیا شریک مجلس ہوتے۔ تمام رات عبدالرحیم خوش الحانی سے عربی فارسی قصائد پڑھتا، اہلِ ذوق پر وجدانی کیفیت طاری رہتی۔

مسیح الاولیا کو سماع سے رغبت تھی، لیکن منکرین سماع کو بھی آپ بُرا نہیں سمجھتے تھے۔ (۷) فرماتے تھے کہ سماع کو اسی لئے حرام کہا جاتا ہے کہ وہ مُسکر ہے اور جو چیز مُسکر ہے وہ لاریب حرام ہے۔ لیکن یہ سکر ان لوگوں کے لئے حرام ہے جن کے عالمِ مستی میں راہ صواب سے بھٹک جانے کا اندیشہ ہو۔ لیکن ان کے لئے جو اس قدر روحانی قوتوں پر دسترس رکھتے ہیں کہ سرمستی و مدہوشی کے جوش میں بھی اپنی منزل مقصود کی طرف زیادہ تیزی سے بڑھ سکتے ہیں، حرام نہیں بلکہ مباح اور عین ثواب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی مجلسوں میں سماع کے آداب کو عبادت کا درجہ حاصل تھا۔

فرحؔی نے اس تمثیل میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت کی خانقاہ میں مجلسِ سماع منعقد تھی، مشائخ صوفیہ کا مجمع تھا۔ ملا مجیب علی سندھی آ نکلے اور شریک مجلس ہوئے۔ چونکہ وہ آدابِ سماع سے واقف نہ تھے، اُنہوں نے کسی قریب بیٹھے ہوئے شناسا سے گفتگو شروع کر دی۔ مودب سامعین کو گراں گزرنے لگا۔ مسیح الاولیاء انہیں مخاطب کر کے ملاطفت سے فرمایا:

السماع کالصلاۃ. سماع، صلوٰۃ کی طرح ہے (یعنی سماع کے وقت خاموش رہنا چاہئے) کے برابر تھا۔

سماع میں آپ کے تواجد کی کیفیت بھی عجیب ہوتی تھی۔ فرحؔی کی تالیف میں اس کی تفصیل بھی متعدد جگہ بالوضاحت لکھی ہے۔ ایک مجلس کا ترجمہ پیش کرتا ہوں۔ لکھا ہے کہ:

حضرت مسیح الاولیاء کی خانقاہ میں ان کے پیر کے عرس کی تقریب میں مجلس سماع منعقد ہوئی تھی، آپ پر وجہ کی کیفیت طاری ہوئی۔ اس کیفیت کا اثر مجلس کے ہر متنفس نے قبول کرنا شروع کیا، ہر شخص پر اس کی استعداد کے مطابق جوش و مستی رونما ہونے لگی۔ بعض زارو قطار رونے لگے۔ کچھ مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہے تھے، کچھ مدہوش پڑے تھے۔ ہر شخص مستانہ وار جھوم رہا تھا۔ ایسا کوئی بھی باقی نہ رہا تھا جس کے سر پر دستار نظر آتی ہو۔ منکران سماع ووجد بھی بے اختیار رقصاں تھے اور تو اور خود گانے والے اپنی پگڑیاں پھینک کر گریہ و زاری کرتے ہوئے گا رہے تھے۔ اسی عالم میں حبیب خان، حاجی عبدالرحیم اور محمد شریف اپنے چند ملازموں کے ہمراہ آگئے اور داخلِ مجلس ہوتے ہی اسی رنگ میں رنگین ہوگئے۔ ایک ملازم برچھی ہاتھ میں لئے ہوئے تھا، برچھی سمیت بے تحاشا گر پڑا۔ حاجی عبدالرحیم کا بیان ہے کہ میں جب اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا تو مسجد کے ستون سے لپٹ گیا محسوس ہوتا تھا کہ خانقاہ اور مسجد کے ستون اور دیواریں تک جنبش میں ہیں۔ جب مسیح الاولیاء کی حالت درست ہوئی رفتہ رفتہ سب کو سکون ہوا۔

مسیح الاولیاء کو قرآن مجید سے خاص رغبت اور اس پر تدبر میں بڑا انہاک تھا، جید حافظ اور بے بدل قاری تھے۔ متعدد تفسیریں درساً پڑھی تھیں اور خود بھی ایک لاجواب تفسیر الانوار الاسرار لکھی تھی۔ تلاوت اور سماعت قرآن کا یہ ذوق تھا کہ ہر روز بعد نماز عصر مسجد میں بیٹھ جاتے۔ اکثر حفاظ اور قاری بھی حاضر رہتے۔ اول آپ ایک رکوع تلاوت فرماتے پھر کوئی اور قاری یا حافظ۔ غرض ایک ایک رکوع کی تلاوت کا دور مغرب تک جاری رہتا۔ یہ معمول آپ کے نظام الاوقات میں اس پابندی سے داخل تھا کہ اس میں سرِ موفرق نہ آیا۔

آپ کے درس میں ایسی جاذبیت تھی کہ طلبا کے علاوہ اہلِ ذوق سامعین بھی کثیر تعداد میں موجود رہتے۔ طالبانِ علم تو اس درس سے جو کیفیت و لذت حاصل کرتے وہ ان کا مخصوص حصہ ہی تھا۔ سامعین بھی اپنے ذوق و وجدان کی حدتک سیرابی و تسکین کی حدتک پابندی سے حصہ گیر ہوتے تھے۔ اس فضیلت خاص میں آپ اپنے فیض رساں اساتذہ شیخ محمد طاہر اور حکیم عثمان وغیرہ کی طرح شہرت رکھتے تھے۔ متعدد علماء و معاصرین مشائخ کے حالات میں یہ بات صراحت سے مذکور ہے کہ اکثر بزرگ علماء جو اپنے مقام پر اپنے تلامذہ کو مختلف علوم کا بلند پایہ کتابیں پڑھانے میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ آپ کا درس سننے کے لئے روزانہ پابندی کے ساتھ میلوں چل کر آتے تھے۔ آپ فرداً فرداً بھی ترقی یافتہ طلباء کو اعلیٰ کتابیں پڑھاتے اور جماعتی طور پر بھی۔ ابتدائی تعلیم درس املا کے طور پر ہوتی۔

جماعت میں سے کوئی بھی طالب علم زیر درس عبارت کا کچھ حصہ پڑھتا۔ پھر طلبا کو اجازت ہوتی کہ اگر کوئی چاہے تو درس کا مفہوم اور اس کے نکات بیان کرے، طلبا کی بحث اور رد و بدل کے بعد آپ درس کے معنیٰ و مفہوم غوامض و نکات آسان و سادہ الفاظ میں ذہن نشین کراتے اور مبہم مقامات کو تمثیلات اور قابلِ قبول دلائل سے سمجھاتے کہ ہر استعداد کا طالب علم مطمئن و محظوظ ہوجاتا۔ مغلق عبارات کے حل میں گہرائی سے معانی و مطالب کی فصاحت اور ہر لغت کے معانی و مفہوم پر موشگافیاں اور سیر حاصل بحث و تبصرہ سن کر طلبا و سامعین کے ذہن و دماغ منور و مجلی ہوجاتے۔ اکثر طلبا ضروری باتیں نوٹ کرتے اور بعض تو درس کی پوری تحریصات لکھ لیا کرتے تھے۔

آپ کی بعض تصانیف سلسلۂ درس ہی میں وجود پذیر ہوئی ہیں اور بعض تو آپ نے اہلِ تعلق کے اصرار و التجا پر تالیف فرمائیں اور بعض آپ کے طالب علمی کے دور کی یادگار ہیں۔ علامہ غوثی حسن نے حسب ذیل نام اور صراحت لکھی ہے۔

۱- **روضة الحسنیٰ شرح نود و نہ نام الھی**: اس کا سنہ تالیف ۹۸۹ھ ہے۔ مادہ تاریخ لفظ حافظ (۹۸۹) ہے۔

۲- **عین المعانی شرح نود و نہ نام الھی**: اس کا سنہ تالیف ۹۹۷ھ ہے۔

غوثی نے دونوں رسالوں کے متعلق لکھا ہے کہ اول اول ہے اور ثانی کا ثانی نہیں۔ اس جامع تعریف کی تعریف نہیں ہوسکتی۔ مولانا نے دو مختصر جملوں میں دو دفتروں کا حق ادا کیا ہے۔ آگے چل کر عین المعانی کے ایک مقام کی عبارت بھی نقل کی ہے، لیکن میرے خیال میں پھر بھی اس کتاب کی مخصوص ندرت اور وجہ تالیف کی اہمیت فی زمانہ مزید صراحت کے بغیر تشنہ ہے۔ ممکن ہے اس زمانہ میں یہ تشنگی محسوس نہ کی جاتی ہو۔

نیاز مند راقم کے پاس عین المعانی کا ایک قلمی نسخہ ہے جو ایک با اخلاص مرید عبداللطیف کا مکتوبہ ہے۔ گمان غالب تو یہی ہے کہ کاتب وہی شخص ہوگا، جو اس کتاب کی تالیف کا محرک ہوا۔ مسیح الاولیاء نے عین المعانی کی تمہید لکھا ہے کہ:

> ایک با اخلاص محبت شعار محبّ رسالہ روضة الحسنیٰ کی نقل کر رہا تھا۔ مجھے خیال ہوا کہ اس کام میں اس کی مدد کی جائے۔ چنانچہ اس کے ہاتھ سے کاغذات لے کر لکھنے لگا۔ چند ہی سطور کی نقل کی تھی کہ اس سے مختلف اور جدید معانی خیال میں آنے لگے اور اصل کے مقابلہ میں زیادہ بہتر اور مناسب۔ طبیعت میں ولولہ پیدا ہوا کہ اس میں رد و بدل کے از سر نو دوسری شرح لکھی جائے، جس میں خوش اسلوبی اور ندرت کے ساتھ نظم و نثر کا اہتمام رکھا جائے۔

(ترجمہ عین المعانی ص۳)

چنانچہ یہ نادر روزگار کتاب اسی بلاغت وصوفیانہ رموز و نکات اور اصطلاحات پر مبنی درود وظائف اور دعوت اسما کی تعلیم سے متعلق بلیغ و برجستہ منظومات کے ساتھ چند ماہ کی کوشش سے تکمیل کو پہنچی۔

یہ مصدقہ شہادت اسی کتاب سے بہم پہنچی کہ آپ ولایت و قطبیت کے اعلیٰ روحانی فضائل کے ساتھ ساتھ بلیغ و برجستہ گو ماہر فن شاعر بھی تھے اور اس فنِ لطیف کے تمام دقیق اصناف پر کاملِ عبور رکھتے تھے۔ عین المعانی تمہید سے لے کر آغاز تک ہر فصل میں قطعہ۔ فرد۔ رباعی۔ مثنوی وغیرہ بڑی کثرت سے تحریر ہیں۔ کتاب شروع ہوتے ہی منظوم نوادر و غرائب کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے، جو ختم کتاب تک اسی التزام و اہتمام سے جاری رہتا ہے۔ عام ترتیب یہ ہے کہ جس اسم جمالی کی شرح پر قلم اٹھایا اول اس اسم کا معما ایک شعر میں، اس کے بعد اشارہ،

اس میں نظم کا کوئی عنصر، پھر المظاہر، زاہد، الوظائف، داعی نصاب، زکوٰۃ عشر قفل دور وغیرہ۔ زاہد موحد، محقق، الاشغال، ہر عنوان کے تحت لازماً نظم۔ آپ نے اپنی عربی و فارسی منظومات کے علاوہ دیگر عارف شعرا کی منظومات بھی درج کی ہیں۔ اپنے چھوٹے بھائی میاں سلیمان سیفی کی بھی چند رباعیاں درج کی ہیں اور بڑی محبت سے لاجیہ السیفی عفی عنہ لکھا ہے۔ آپ کے کلام سے چند معما و رباعیات بطور نمونہ پیش کرتا ہوں جو حسبِ ذیل ہیں:

زاد راہ راستان جز غم مداں
راہ قلاباں بود برعکس آں

یہ القہار کا معما ہے۔ دیگر معموں کے مقابلے میں بہت آساں، حل آخری، مصرعہ میں موجود ہے۔ راہ قلا کو برعکس کر لیجئے۔ القہار ہے، ایک اور معما ہے۔

ہست شمع خانہ آہِ سوز ناک
آہِ دل گرہست مارازاں چہ باک

شمع کی رعایت سے آہِ سوزناک تشبیہا لو ہے۔ لو کو آہ کا دل کہہ کر آہ کے وسط میں جگہ دی الوہ ظاہر ہوا۔ آگے کہا ہے۔ ہست ما ماء یعنی پانی کو فارسی میں آب کہتے ہیں شریک کیا۔ الوہاب ہوا۔ یہ الوہاب کا معمہ تھا۔

بادشاہ فقر را در ملکِ جاں
ہست پے درپے لوا خورشید ساں

یہ نہایت نادر ترکیب کا معما ہے۔ حل آخری مصرعہ سے ظاہر ہے یعنی پے درپے لوا اور پے درپے خورشید کی ترکیب مطلوبہ جواب ہے۔ لوا علم کو بھی کہتے ہیں اور علم کی تشبیہ الف ہے۔ لہٰذا ا کی لوا= ا دوسرے لوا سے ملا الوا ہوا خورشید کو سور اور عین کہتے ہیں، پہلے خورشید کا مخفف س دوسرے عین کا حرف مکتوبی ع۔ الوا کے ساتھ سع ملکر الواسع ہوا۔ یہی اسم مطلوبہ تھا۔

درد فرقت چوں گریباں گیر گشت
رایتِ جاہت زگردوں بر گذشت

الفاظ کے معنوی رد و بدل سے یہ معما ترکیب کیا گیا ہے۔ درد کا ہم معنی یا بدل الم ہے اور گریبان کا مترادف جیب ہے۔ الم اور جیب درست و گریبان حالت میں تحریر کئے گئے تو المجیب صاف پڑھا گیا۔ یہی حل یا اسم مطلوبہ ہے۔

ہمچنیں عالم اگر آید بدست
سر بنہ برپائے وے ہر جا کہ ہست

عالم آید بدست۔ دست بمعنیٰ ہاتھ کا عربی ید ہے۔ عالم ید سے مل کر عالمیہ ہوا۔ آگے اشارہ ہے اس کا (عالم کا) سر وہیں جہاں وہ ہے اُس کے پاؤں پر رکھدو۔ عالم المع ہوگیا۔ ید سے ملایا المعید ہوا۔ یہی حل ہے۔

آپ کے کلام سے اصنافِ نظم کے چند بدیع نمونے بحرِ بیکراں سے جرعہ بلکہ قطرہ ہی سمجھ لیجئے، کیونکہ پوری کتاب ان نوادر گہر پاروں سے درج گوہر بنی ہوئی ہے۔ پیش کرنے کے بعد آپ کی چند رباعیاں نقل کرتا ہوں، ملاحظہ فرمائیں۔

رباعی

هاں هاں نبود غیرِ وجودِ تو بہ سیر — ساعی بدلت چند رسد زخم زغیر
زیراکہ خدا محض وجود است بہ خیر — از خود گذرائے بوالھوس لاف زنے

صوفیانہ مسلک کی اس برجستہ وسلیس رباعی میں توحید کی تعلیم اور ترکِ خودی پر بشدت توجہ دلائی گئی ہے۔ جناب جوش ملیح آبادی نے جو عام نظریہ سے الحاد کی حد تک آزاد خیال شاعر ہیں، اِس رباعی کے آخری مصرعہ کا مضمون اپنی ایک رباعی میں نظم کیا ہے۔ پوری رباعی تو یاد سے اُتر گئی آخری دو مصرعے یاد رہ گئے ہیں جو یہ ہیں:

اللہ تو رحمت کے سوا کچھ بھی نہیں — اللہ کو قہار بتانے والو

رباعی

خود را بدر از درمباہات مجو — تلخیص معانی زکنایات مجو
تحقیق حقائق زاشارات مجو — خواہی کہ بری پئے دلارام وفا

حکیم بوعلی سینا کی مشہور کتاب اشارات ہے۔ اس میں انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ میں حقائق اشیاء کا بوجہ احسن علم رکھتا ہوں۔ آپ نے اس رباعی کے ذریعہ اہلِ تحقیق کو آگاہ کیا ہے کہ اگرتم اپنے مطلوب کی خدمت میں وفا کا تحفہ لے جانا چاہتے ہو تو حقائق کی تحقیق 'اشارات' میں تلاش نہ کرو۔ سعی لاحاصل میں بھٹک جانے کا قوی امکان ہے کیونکہ منطق کی دلیلوں کا راستہ قرآن سے مخالف سمت کو جاتا ہے۔ خود شناسی کے لئے اشرف المخلوقات کے دائرے سے باہر تک ودہ نہ کرو۔ معانی کی تلخیص تمہیں کنایات میں نہ ملے گی، وہاں اس کی جستجو عبث ہے۔ اس رباعی پر حسبِ ذیل حاشیہ لکھا ہوا ہے۔

می فرمودند یک وقتے گفتہ شدہ بود بے ملاحظۂ الفاظش خالی از مناسبت نیست ومیفر مودند اشارات نام نسخہ ایست کہ بوعلی سینا نوشتہ و دعویٰ کردہ کہ حقائق اشیا مرا بوجہ احسن معلوم است۔ (عین المعانی ص ۱۲۰)

رباعی

بیرون ز حدود کائنات است ولم　　برتر ز احاطہ جہات است ولم
فارغ ز تقابلِ صفات است ولم　　مرأت ربوبیت ذات است ولم

پوری رباعی بے ساختہ سلیس و برجستہ ہے۔ نفس مضمون من عرف نفسہ فقد عرف ربہ کی مدلل و مفصل تفسیر ہے۔

رباعی مستزاد

گاہے بمن سوختہ دل نعرہ زند　-　بادیدۂ گریاں
گاہے لبِ من ازلب او خندہ کند　-　وہ عیش کنان
نَے نَے غلطم چوں بحقیقت نگرم　-　در وحدت و کثرت
خود اوست اگر گرید و گرخندہ کند　-　آن فتنہ فتاں

اس مستزاد رباعی کا بھی وہی رنگ ہے اور ہمہ اوست کے نظریہ کا پورا ثبوت پیش کیا ہے۔ اوپر کے دونوں مصرعوں میں ہمہ ازوست کا مسلک تھا۔ نے نے غلطم کہہ کر آخری مصرعہ میں ہمہ اوست کی شان پیدا کردی۔

رباعی

ہم دل بہزار جاں گرفتار تو ہست　　ہم جان بہزار سرخریدار تو ہست
اندر طلبت نہ بود داند نہ شہود　　آنکس کہ صفاش دیدہ دیدار تو ہست

یہ اشتیاقیہ رباعی مسیح الاولیا نے اپنے مرشد حضرت شیخ لشکر محمد عارف کی طرف ہمہ تن توجہ کے عالم میں بے ساختہ فی البدیہہ سرراہ کہی ہے۔ حاشیہ پر صرف اتنی عبارت لکھی ہے۔

میفرمودند روز بے بزیارت تربت شریفہ حضرت شاہ لشکر محمد قدس سرہٗ میرفتم ازراہ ایں رباعی روداد۔ (عین المعانی ص ۷۱)

میں لفظ رباعی کی رعایت سے نموئتاً ۴ ہی رباعیاں درج کرنا چاہتا تھا، لیکن حاشیہ کی عبارت سامنے آجانے سے قلم نہ رک سکا اور بے اختیار یہ رباعی بھی معہ حاشیہ درج کردی، اس طرح رباعیات کا یہ خمسہ شریک مضمون ہے۔ معموں کے حل میں بہت کچھ بلکہ سب کچھ رہنمائی کتاب سے ہی ہوئی۔ رباعیات کی شرح البتہ میں نے اپنی کوتاہ علمی کے مطابق خود کی ہے۔ اہل علم و دانش اگر اس میں لغزشیں پائیں تو اس کو میری محدوٗد استعداد پر محمول فرمائیں۔

۳-انوار الاسرار: قرآن مجید کی معرکتہ الآرا بے نظیر تفسیر ہے۔ (۸) آپ نے جب یہ تفسیر لکھنی شروع کی تو بنظر اطمینان دو اجزاء مسلسل اپنے استاد و عم محترم حضرت شیخ طاہر محدث ؒ کی

خدمت میں ان کی رائے معلوم کرنے کے لئے ارسال کئے اور لے جانے والے کو تاکید کردی کہ وہ یہ نہ بتائے کہ کس نے لکھی ہے اور بھیجنے والا کون ہے۔

اس شخص نے وہ اوراق محدث صاحب کی خدمت میں یہ کہہ کر پیش کئے کہ حضرت مجھے یہ کاغذات ملے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔ قابلِ مطالعہ ہیں یا نہیں؟

محدث صاحب نے بغور و تعمق ملاحظہ فرمانے کے بعد بہت تعریف کی اور فرمایا اے عزیز! تو خوش قسمت ہے کہ یہ نعمت تجھے میسر آئی۔ اس پایہ کی تفسیر عام علماء کی دسترس سے باہر ہے۔ اس انداز اور گہرائی سے تو وہی خدا رسیدہ عالم لکھ سکتا ہے، جو غوث یا قطب کا درجہ رکھتا ہے۔

یہ امید افزا رائے معلوم کر کے آپ کو تسکین ہوئی اور بسعی تمام اسی انداز پر اس کو اختتام کو پہنچایا۔ جب محدث صاحب کو معلوم ہوا کہ یہ تفسیر آپ نے لکھی ہے تو بے انتہا مسرور ہوئے اور تشریف لاکر مبارکباد دی۔ بڑی محبت سے بغلگیر کر کے فرمایا: الحمدللہ خدا نے مجھ کو کامل کیا اور تم کو مکمل۔

٤- رسالہ حواس پنجگانہ: یہ رسالہ آپ نے صدر جہاں دھاروال کی التماس پر لکھا تھا۔ موصوف آپ کے برگزیدہ خلفا میں سے ہیں۔ اس میں آپ نے حضرات خمس سے مطابق دی ہے۔

٥- حاشیہ بر اشارۂ غریب کتاب انسانِ کامل: اس کتاب کے مصنف شیخ عبدالکریم جیلی قدس سرہٗ ہیں۔ یہ حاشیہ آپ نے اُس وقت تحریر فرمایا تھا، جب آپ شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی کے خلیفہ سید احمد دکنی کی شاگردی میں داخل تھے۔

٦- شرح قصیدۂ بردہ: فارسی شرح۔

٧- رسالہ قبلۃ المذاہب اربعہ معہ اشارات اہلِ تصوف۔

٨- حاشیہ بر شرح ضیائیہ: یہ شرح مولانا جامی نے کافیہ پر لکھی تھی۔ اس شرح پر حاشیہ آپ نے اپنے بڑے فرزند شیخ عبدالستار کو درس دینے کے زمانہ میں ان کی تعلیم کے لئے لکھا تھا۔

٩- فتح محمد در علوم ما یتعلق بہ التفسیر: یہ کتاب چھوٹے فرزند بابا فتح محمد کے واسطے تالیف کی تھی۔

١٠- تمیم شرح مأۃ عامل: اس شرح کو میر فتح اللہ شیرازی نے شروع کیا، لیکن تمام نہ کر سکے تھے کہ ان کی عمر پوری ہوگئی۔ آپ نے قاضی نوراللہ کے ابن عم میر سید علی کی تمنا پر آغاز کی طرح انجام کو پہنچایا۔

۱۱- رسالہ عقود جس کو سب سے زیادہ مختصر عبارت میں لکھا ہے۔ اربابِ حدیث اعداد کا شمار اپنے ہاتھوں کی انگلیوں پر رکھتے ہیں۔ اس نسبت سے رسالہ کا یہ نام ہوا۔

۱۲- دو رباعی کی دو شرح۔

۱۳- ترجمہ اسرار الوحی۔

یہ فہرست ۱۰۲۲ھ تک کی ہے جو علامہ غوثی نے گلزار ابرار میں درج کی ہے۔ اس کے بعد آپ کم و بیش ۹ سال اور زندہ رہے۔ واللہ اعلم اور کتنی کتب و رسالے تالیف فرمائے ہوں گے۔

تصنیف و تالیف کے سلسلہ میں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ تدبر فی القرآن کے فیض سے آپ کے ضمیر پر معانی کے اس قدر ہجوم اور ولولوں کا اس قدر جوش رہتا تھا کہ اگر صاحبِ استعداد سامعین پابندی سے سن سکتے تو تمام قرآن مجید کو سورۂ فاتحہ میں اور سورۂ فاتحہ کو تمام قرآن کی ہر ایک آیت میں بلکہ پورے قرآن کو بسم اللہ میں اور بسم اللہ کو قرآن کی ہر آیت میں بیان و عیاں کرسکتے تھے۔ فرحی کے الفاظ یہ ہیں:

> میفر مودند کہ در ایام جوانی بغلبۂ ذوق و حالت کہ از دلِ من جوش معانی سر میزد کہ اکثر اوقات بخاطرم میگذشت کہ اگر سامع صاحب استعداد مقید شدہ بشنود تمام قرآن رادر سورۂ فاتحہ و سورہ فاتحہ دا در تمام قرآن بضمن ہر آیت بلکہ تمام قرآن را در بسم اللہ و بسم اللہ را در ہر آیت بیان و عیان سازم۔

(کشف الحقائق ص۲۹)

یہ ہجوم معانی آغاز غلبۂ ذوق اور عالم عہد جوانی میں رونما تھا۔ آگے چل کر پختہ عمری کے دور اور روحانی کمال کی منزل میں، زورِ قلم، شوکت بیان، معنوی موشگافیوں پر جو معجزاثر دسترس رہا ہے اس کا زندہ ثبوت مسیح الاولیاء کی جملہ تصانیف میں منہ سے بول رہا ہے۔

سطور بالا میں گلزار ابرار سے مسیح الاولیاء کی تصانیف کے چند نام پیش کرتے ہوئے ہم نے عرض کیا تھا کہ ان کتب کے علاوہ بھی آپ کی متعدد تصانیف کا امکان ہے۔ یہ بات محض حسنِ ارادت پر مبنی نہیں ہے، بلکہ ایک کھلی ہوئی حقیقت اور مستند دلیل کے ساتھ دعویٰ ہے۔ یعنی خود راقم کے مختصر قلمی نسخہ جات میں آپ کے ایسے دو رسالے موجود ہیں، جن کا ذکر علامہ غوثی کی مذکورہ فہرست میں موجود نہیں۔

ایک رسالہ وحدت وجود جو حضرت شیخ عبداللہ بلیانیؒ نے حدیث نبوی **من عرف نفسہ فقد عوف ربہ** کی شرح میں عربی زبان میں تالیف فرمایا تھا۔ اس کی فارسی شرح مسیح الاولیاء نے

اپنے مرشد کے ایما پر لکھی اور غالباً یہ آپ کی اولین تالیف ہے یعنی حضرت شیخ لشکر عارف باللہ متوفی ۹۹۳ھ کے زمانۂ حیات میں واقع ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دیباچہ میں ادباً آپ نے اپنا نام واضح طور پر نہیں لکھا۔ تمہید کی عبارت حسبِ ذیل ہے۔

> میگوید فقیر ضعیف خاکروب درگاہ معدن انوار الہ حضرت شاہ لشکر اللہ کہ چوں رسالہ کہ متضمن تواحید وحدت الوجود بود و مشتمل بر اذواق وجد وشہود از مصنفات شیخ العاشقین والعارفین آن موحد ربانی شیخ عبداللہ بلیانی در معنی حدیث نبوی من عرف نفسہ فقد عرف ربہ.
> لیکن زبان تازی بود بعضے عزیزان حضار مجلس شریف بحضرت ارشاد مآبی خلد اللہ ظلالہ السامی التماس نمودند کہ این رسالہ را اگر بزبان پارسی املا کردہ شود و بلسان مشہور انشا نمودہ آید بہتر است۔ تا ہر خاص و عام از افادات واستفادات محروم نہ ماند۔

پس بایں ضعیف اشارت نمودند۔ این ضعیف از فیض حضرت یک ذرہ در منقبتش میگوید۔

مرشدِ کامل کہ نامش لشکر است — لشکرِ اہلِ صفارا رہبر است
دیدہ اش بینا شدہ از نور حق — چوں کلیم اللہ شدہ برطہ حق
مقتدائے جملۂ اہلِ وفا — پیشوائے زمرۂ صدق و صفا

بشارت حق دانست والتماس دعا نمود تا این ترجمہ از خیانت بدیانت مصئون ومحفوظ ماند۔
واللہ ولی التوفیق والھدایۃ والیہ المرجع ولمآب۔

یہ رسالہ عبارت آرائی اور مختصر تمثیلات کے ساتھ عربی فارسی برجستہ اشعار سے مزین ہے۔ وہی زور بیان، صوفیانہ اصطلاحات کے موزوں جملے برجستہ فقرے جو مسیح الاولیا کی تصانیف کا طرۂ امتیاز ہیں، آغاز سے اختتام تک فراوانی کے ساتھ نمودار ہیں۔ موجود مخطوطہ ۱۱۸۲ھ میں کتابت کیا گیا۔ خود شکستہ مگر نہایت پاکیزہ خاتمہ کی عبارت یہ ہے۔ بتاریخ چہار دہم رجب المرجب ۱۱۸۲ھ روز دوشنبہ در بلدۂ حیدرآباد باتمام رشید۔

دوسرا رسالہ تعینات اور حقیقت محمدیہ کے بیان میں ہے۔ یہ مختصر رسالہ متوسط سائز کے ۱۲ صفحات میں ختم ہوا ہے۔ نیازمند کی ایک بیاض مسمّٰی بیاض یادگار میں تحریر ہے۔ کاتب نے اپنا نام سنہ کتابت وغیرہ کچھ نہیں لکھا۔ اس رسالہ کی نقل یہ ہے:

نقل رسالہ دقیقہ از بیاض یادگار

رسالہ تصنیف برہان خافقین حضرت شاہ عیسیٰ قدس سرہ و اسرارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فائدہ خلق بعد از ارتفاق کثرت عین حق است۔ اگر لام جمال کہ عبارت از ظہور کثرت است از میان برداری و نقطہ[1] تعین از سر خا بر گیری بنگر کہ چہ ماند۔

فائدہ تعین[2] حجاب وخود است اگر نواز عین وجود چشم احولی کہ عبارت از حرف تا است[3] دور کنی دانی کہ تعین عین وجود است۔

دقیقہ- وجود مطلق چوں از اطلاق و عدم انحصار خود توجہ بعالم ظہور کرد اول تعین کہ پیدا گشت نامِ او وحدت شد و آن را حقیقت محمدی گویند۔ وحقیقت تعین تو دانستہٴ و مغائرت دور کردن میان تعین و حق ہم فہم کردہٴ اکنوں تو در تعین و تجلی و در ہر مرتبہ ہمچنین فہم کن چنانچہ سیاہی است نسبت حروف و اگر حروف گوئی ہم درست بود و اگر سیاہی دانی کہ بصورت حروف ظاہر است عین معرفت بود و آن وحدت راد و شاخ[4] ظاہر گشت یکے احدیت کہ ذات بآن اعتبار از ہمہ اعتبارات منزہ و مجرد است و دوم واحدیث کہ ذات بآن اعتبارات بہمہ صفات الٰہیہ واعتبارات کیانی متصف است۔

دقیقہ- صفات الٰہی دو قسم اند یکے موقوف بظہور مخلوق در خارج چنانچہ خالق و رازق و دیگر محتاج نہ چنانچہ سمیع و علیم[5] وغیر آن از امہات صفات پس انچہ محتاج نیستند بکمالِ ذاتی و غنائی مطلق تعلق دارند و این مرتبہ را تقدیم ذاتی بر اسمائے دیگر است[6] وانچہ محتاج ہستند بکمالہ اسمائی و بکمال جلا و استجلا تعلق دارند۔ کمالِ جلا آنرا گویند کہ وجود بایں تعینات خود ظاہر شد و کمال استجلا آنرا گویند کہ وجود ما در تعینات مراتب خود را خود مشاہدہ کند۔

دقیقہ- واحدیت منقسم است بدو قسم یکے صفات الٰہی و دیگر اعتبارات کیانی و تعین واحدیت ہر دو را شامل۔ وصفاتِ الٰہی آنرا گویند کہ وصف وجوبی و فعلی[7] صفت ذاتی ایشان باشد و اعتبارات کیانی آنرا گویند کہ صفت لازمی ایشان انفعال و امکان[8] بود و انفعال اثر قبول کردن است۔

---

[1] نقطۂ تعین فرمود زیرا کہ باعتبار غیر نقط حائے حطی خاگشت

[2] کتابت از حروف تاء منقوط است

[3] حرف تا حرف اشارہ است بآنکہ تو نباشی تا ہمہ ادبا شد۔

[4] اے دو طرف ظاہر گشت کے طرف بطون و آنرا نام احدیت شدو یکے طرف ظہور کہ اُنرا نام واحدیت شد۔

[5] حی علیم کلیم۔ سمیع بصیر۔ قدیر۔ مرید

[6] حاصل آن است کہ کمال نزول وجود تنزلات و تعین او تبعینات وکمالِ استجلا عروج است ومشاہدہ کردن تعینات کہ ما تنزلات وجودیم۔

[7] اے فاعلی الانفعال [8] امکان بغیر وجوب محال است

دقیقہ - لفظ اللہ وحق را دوجا اطلاق کنند یکے در مرتبۂ لاتعین کہ عین وجود مطلق است بے ملاحظۂ مفہوم۔ دوم در مرتبۂ الوہیت وآن عبارت است از ظہور جمیع صفات الٰہی اجمالاً و ظاہر وجود کہ وصف وجوب خاص اوست اینجا گویند۔ ورب آنجا گویند کہ آں صفاتِ الٰہی تفصیل یابند۔

دقیقہ - اعتبارات کیانی ومقتضیات اسمائے الٰہی و مرتبہ ربوبیت اندو آنرعیان ثابتہ وظاہر علم نیز گویند۔ پس درین ہر دو مرتبہ یعنی صفات کلی الٰہی و اعتبارات کیانی یک حقیقت جامع است (الحمد للہ رب العالمین) وآن وجود مطلق است پس بہ اصالت و بہ تبع حقیقت انسانیہ است کہ آدم عبارت از وست تا اینجا مراتب ظہور الٰہی بود۔ اکنوں مراتب ظہور خلقی بیان خواہد شد (چنانچہ در تعین اول کہ باعتبار ظہور حقیقت محمدی بود نیز قیہ تشبیہ و تنزیہہ نبود ہمچنان در تعین اول خلقی نیز فہم من فہم)

دقیقہ - اول تعین باعتبار خلقیت نہ باعتبار ظہور نور محمدی است نام او روح اعظم و عقل اول و عقل کل است واو بمرتبہ قند است واین جمیع عوالم مختلف بمرتبۂ قند صاف وکدرتا بمرتبۂ قطارہ (باعتبار ظہور تعین اول کہ حقیقتِ محمدی است) وایں را عالم ارواح نامند۔ وفرشتہ مختلف بمرتبہ قند صاف (باعتبار تا مرتبۂ قطارۃ واین را عالم ارواح نامند وفرشتہ کہ در صف اول عالم ارواح است اور اروح القدس گویند وآخرا و جبرئیل امین است و بالائے این مرتبہ ارواح ہر چہ مذکور گفتہ شد در عالم غیب شمروہ اند۔

دقیقہ - پس ازیں عالم عالم مثال است وآن عبارت است از صور مرکبات لطیفہ کہ قابل تجزی وتعبیض نیستند کہ آنرا تجزی خیال منفصل نامند پس ہر حرکت وحس کہ دریں عالم موجود است بواسطۂ اوست۔ یعنی اول فیض فیاضِ مطلق بعالم ارواح میرسد و ازدِ بعالم مثال وازد بعالم حس۔

دقیقہ - پس ازیں عالم شہادت است وآن عبارت است از عرش رحمانی تا مرکز خاک بدیں تفصیل اول عرش پس کرسی فلک زحل۔ فلک مشتری فلک مریخ۔ فلک شمس۔ فلک زہرہ۔ فلک عطارد۔ فلک قمر۔ کرہ نار۔ کرہ خاک۔ موالید ثلاثہ۔ معدن۔ نبات حیوان۔ پس انسان کامل۔ این جمیع مراتب را شامل است ومقصود از ظہور ایں مراتب اوست کہ وجود بایں مراتب شدہ تا بانسان پیوست دور انسان بحواسِ انسان درین مراتب خودرا مشاہدہ کرد کہ معراج عبارت از وست

کسوتے دیگر بپوشد جلوۂ دیگر کند
مظہرِ دیگر نماید بہرِ اظہار دگر

اگر خواہی کہ این مراتب در تحت توجہ وبسیر تو باشند پس بدیں شغل عروج و نزول و مبدا و معاد اشتغال نماید کہ این است وجود تعین اول وتعین ثانی۔ عالم غیب عالم ارواح۔ روح الاعظم یعنی روح القدس۔ روح اللہ یعنی جبرئیل امین۔ عالمِ مثال۔ عرش۔ کرسی۔ فلک زحل۔ فلک مشتری۔ فلک مریخ۔ فلک شمس۔ فلک زہرہ۔ فلک عطارد۔ فلک قمر۔ کرۂ نار۔ کرۂ ہوا۔ کرۂ آب۔ کرۂ خاک۔ معدن۔ نبات۔ حیوان۔ انسان۔

دقیقہ- چنانچہ وجود مطلق در اول مراتبہٗ جمیع تعینات را شامل است۔ انسان در آخر مرتبہ جمیع را حامل کہ مرتبہ احدیت وحقیقت محمدی است۔

دقیقہ- وجود چوں تنزل کنہ اول خود رابلباس تعین اول و ثانی بیارایید پس بلباس عالم غیب بیارایید پس بلباس حقیقت انسانی و عالم ارواح بیارایدپس بلباس عالم مثال تا بلباس عالم انسان خود را بیارایید چنانچہ الخ۔ چنانچہ تخم بلباس سانے وشگونہ و برگ و بن خود را بیارایید تا حدے کہ باز بہ تخمیت آید و چوں این تخم باصل خود رجوع کندمی بیند کہ چندیں لباس مختلف ہمہ من گرفتہ ام۔ فہم من فہم۔

دقیقہ- معرفت سہ نوع است۔ معرفتِ افعالی۔ معرفت صفاتی۔ معرفت ذاتی۔ ومعرفت افعالی عبارت ازان است کہ ہر فعلے کہ در کائنات موجود است خواہ ازانسان خواہ از غیر انسان بیند فعل حق داند۔ ومعرفت صفاتی عبارت ازاں است کہ ہر صفت کہ در خود یا بد یا در غیر خود صفت حق داند۔ اگر کسی گوید و سالک شنود گوبندہ را بہ صفت کلیم تصور کند وخود را بصفت سمیع۔ و اگر چیزے بیند آنرا صفت ظاہر داند و خود را بصیر۔ واگروہم و خطرہ (خیال) دل گذرد آنرا باطن

ربود

تعین اول
تعین ثانی
عالم غیب
عالم ارواح
روح اعظم یعنی روح القدس
روح اللہ یعنی جبرئیل امین
عالم مثال
عرش
کرسی
فلک زحل
فلک مشتری
فلک مریخ
فلک شمس
فلک زہرہ
فلک عطارد
فلک قمر
کرۂ نار
کرۂ ہوا
کرۂ آب
کرۂ خاک
معدن
نباتات
حیوان
انسان

تصور کند و خود را باری۔ واگر چیزی کسی را مید ہد خود را معطی داند کند واورا قابض تصور کند۔ داگر دردستِ خود کتا بے چیزے دیگر گیرد و بخشاید خود را باسط وقابض تصور کند واگر خواہد کہ کسے را منع کند خودرا مانع و اورا ممنوع تصور کند۔ واگر خواہد کہ برود چوں پائے بردار و اسم رافع تصور کند و چوں برزمین نہد خافض تصور کند و چوں چیزے بخورد خود را رزاق وشکم را مرزوق تصور کند۔ وچوں کرسنگی را دور کند خودرا جبار تصور کند۔ وچوں بخسید داند کہ تا این زماں باسم ظاہر حق خود را مشاہدہ میکرد۔ اکنوں میخواہد کہ باسم باطنِ خود را مشاہدہ کند۔ الی مالانہایہ۔

اگر چہ ایں اسرار گفتنی نیست اما از صاحبِ بصیرت منع کردنی ہم نے۔ وچوں بنویسد تصور کند کہ خالق از کتم عدم بر صفحۂ کاغذ حروف در وجود سرمی آرد۔ ہماں سیاہی است کہ باین لباس مختلفہ پدید آمدہ وانچہ ورائے این باشد تجلی ذاتی وبرتی گویند وآن کم باشد واگر باشد نادر باشد۔

بود کلی جہاں درد مستور کرد در کل ذات خویش ظہور

دقیقہ۔ در انسان گویند روح و در عالم صفاتِ حق گویند ے۔ ودر انسان گویند گوش۔ آنجا گویند سمیع و در انسان گوبند چشم و آنجا گویند بصیر در انسان گویند دماغ آنجا گویند قدیر۔ در انسان گویند عقل آنجا گویند علم۔ در انسان گویند دل، آنجا گویند مرید۔ پس انسان بدیں تعینات آنجار ساند یا اواز مراتب ظہور بانسان رسد۔ اگر در حقیقت بنگری خود بخودمی بازد وبنگرد۔ نے نے خود بخودی بازد و بلکہ نگرو۔

رباعی

یار ماہر ساعتے آید ببازار دگر تابود حسن وجمالش را خریدارے دگر
کسوتے دیگر بپوشد جلوہ دیگر کند مظہر دیگر نماید بہر اظہارِ دگر
ظہور کمالاتِ حق وشہود تعینات پیغامبر صلعم محقق و مقرر باد
آدمی چیست برزخ جامع صورت خلق و حق درو واقع
نسخۂ مجمل است مضمونش ذاتِ حق و صفات بیچونش
کل در و عین اوست اندر کل عین کل ہچو آب اندر گل
آب اندر گل است وگل در آب عین آب ایں دقیقہ را دریاب

من تصنیف جامع العلوم ظاہری و باطنی اکمل ولی مکمل قطب زمان غوث دوران حضرت شاہ عیسیٰ قادری شطاری قدس سرہٗ العزیز۔ رباعیہ من تصنیف حضرت الیشان۔

رباعی

ہیچ میدانی تو خودرا ہستی ویانیستی — خویش را بشناس و بنگر کیستی و چیستی
آنکہ میگوید کلیم است آنکہ بیند بصیر — وانکہ ی شنود سمیع است پس بگو تو کیستی

تم تم تم تمت تمام شدتم تم

مسیح الاولیاء کی ذات قدسی صفات مجمع الکمالات اور سرتاپا کرامات تھی، آپ کی زندگی کے جس شعبہ پرنظر ڈالیں مابہ الامتیاز خوبیاں ہی خوبیاں دکھائی دیں گی۔علم وفضل کے اعتبار سے آپ علوم ظاہری و باطنی کے جملہ اصناف پر منتہیانہ عبور کامل رکھتے تھے۔ دینیات اور تصوف سے آپ کو خاص لگاؤ تھا۔علم حدیث وتفسیر کے سلسلہ میں آپ کی تصانیف اپنا جواب آپ ہیں۔ شاعری کا زبردست ملکہ تھا عروض میں دستگاہ کامل رکھتے تھے، مختلف اصناف نظم میں آپ کا کلام آپ کی ہر ایک تصنیف میں موجود ہے اور تمام کا تمام تصوف میں ہے۔ صنعت معما پر جو نظم کی دقیق ترین صنعت ہے، آپ کو معقول دسترس حاصل تھا۔ گذشتہ صفحات میں عین المعانی سے چند نمونے پیش کئے جاچکے ہیں۔

آپ کی فیض رسانیاں ہمہ گیر اور دوامی ثابت ہوئی ہیں۔ آپ کی زندگی میں بے حد و شمار طالبان حق نے آپ کی تعلیم۔ آپ کے فیضانِ صحبت آپ کی دعاؤں، آپ کے نمونہ زندگی سے استفادہ کرکے ولایت، کرامت وقربِ الٰہی کے اعزاز پائے اور اپنے وقت میں فیض رسان خلائق ہوئے۔ آپ کے وصال کے بعد سے آج تک مزار فائز الانوار سے خاص و عام بلا لحاظ مشرب ومسلک اپنی جائز تمناؤں میں فائز المرام ہوتے رہے ہیں۔

زیادہ عرصہ نہیں گذرا ۱۹۴۶ء کا واقعہ ہے خان بہادر سید دلاور حسین خان سپرنٹنڈنٹ پولیس صوبہ متوسط مسیح الاولیاء کے انتہائی عقیدت مند تھے۔ مرض الموت میں آپ کے قرب میں دفن کئے جانے کی وصیت کی اور حسب وصیت روضہ مبارک کے باہر جنوب مشرقی گوشہ میں دفن ہوئے۔ آپ نواب میر فضل علی خان صاحب کے خویش ہیں، نواب صاحب برہانپور کے عمائدین میں ممتاز ترین شخصیت ہیں۔ نیز نواب صاحب کے اسلاف کا مخصوص قبرستان ان کی مملوکہ زمین پر اندرون شہر موجود ہے۔ لیکن مرحوم نے مسیح الاولیاء کے احاطے ہی کو ترجیح دی۔

میں نے وہ درخواست دیکھی ہے جو نواب صاحب موصوف الصدر نے موجودہ سجادہ نشین کو دی تھی۔ واضح الفاظ میں تحریر تھا کہ مرحوم نے اپنی عقیدت و نیاز کی بنا پر بجائے خاندانی قبرستان کے مسیح الاولیاء کے احاطہ میں دفن کرنے کی وصیت کی ہے، براہ کرم اجازت دیجئے اور زمین قبر کی جتنی قیمت ہو ظاہر کریں کہ پیش کردی جائے۔ اور سجادہ صاحب کی طرف سے جواب

ملا کہ مرحوم کے حسنِ اعتقاد کے پیش نظر دفن کرنے کی اجازت ہے اور زمین کی ہم کچھ قیمت نہیں چاہتے نذر تصور فرمائیں۔

آپ کی تصنیفات کی فیض رسانی ظاہر ہے کہ جب تک وہ اہل استعداد کے مطالعہ میں ہیں اور رہیں گی ان کی افادیت مسلم ہے۔

اسی طرح آپ کے خلفا و اولاد و احفاد آپ کے پرتو علوم سے فیض یاب ہوکر اپنے وقت میں صاحب مقام، صاحب تصانیف و توالیف ہونے کے لحاظ سے فیض رساں عالم رہے ہیں۔ اس تذکرہ میں علحدہ طور پر بعض صاحب تصانیف خلفاء کا ذکر اور ان کی تصانیف کا حال حسب گنجائش بیان کیا جائے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

مسیح الاولیا کا وصال ۱۴ شوال ۱۰۳۱ھ میں ہوا۔ آپ اپنے حجرۂ عبادت میں دفن کئے گئے۔ خانخانان عبدالرحیم خان نے مزار مقدس پر شاندار گنبد تعمیر کرادیا جو ہنوز زیارتگاہ خلائق ہے۔

بعد وصال آپ کی اولاد میں چار فرزند اور دو دختر پسماندگان میں پائے جاتے ہیں۔ فرزندوں کے نام شیخ عبدالستار، شیخ فتح محمد، شیخ طٰہٰ، شیخ ہاشم۔ دختروں کے نام: امۃ الرحمٰن، فاطمہ۔(۹)

حضرت مسیح الاولیاء کی اولاد و احفاد میں بھی آپ کے علم و عمل اور تعلیمات کے فیضان کا سلسلہ عرصہ دراز تک جاری رہا ہے اور ہنوز جاری ہے۔ یہ بزرگ زادے اپنے عہد کے علمائے متبحر، فاضلِ اجل، صوفی صفاکیش صاحب کشف و حال، دینی، دنیاوی اور روحانی فضیلتوں کے مالک اور خاص و عام میں عظمت و شہرت کے ورثہ دار رہے ہیں، فرزندوں میں حضرت بابا عبدالستار اور حضرت بابا فتح محمد کو خدمت خلق اور علمی کارگذاریوں کے باعث یہ منزلت حاصل ہے کہ ان کے حالات اور قابلِ فخر کارنامے متعدد تذکروں اور تاریخوں میں مذکور ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس تذکرہ میں ہر دو حضرات کے اذکار تحریر کئے گئے ہیں۔

دیگر دو فرزندوں حضرت شیخ ہاشم اور حضرت شیخ طٰہٰ قدس سرہما کے متعلق کوئی ایسی صراحت نہیں ملی جس سے ان حضرات کے حالات زندگی علمی استعداد، روحانی مشاغل، کاروباری مصروفیات وغیرہ پر روشنی ڈالی جاسکتی بجز ایک مختصر تحریر کے جو ۱۰۶۹ھ کے ایک مابہ النزاع محضر پر ثبت ہے اور یہ تحریر حضرت شیخ طٰہٰ قدس سرہٗ کی ہے اور اسی تحریر کی بنیاد پر تبرکاً ان کا ذکر بھی بالاختصار جداگانہ قلمبند کیا گیا ہے۔ حضرت شیخ ہاشم کے متعلق اس کے سوا کچھ علم نہ ہوسکا کہ وہ حضرت مسیح الاولیاء کے فرزند تھے۔ اسی طرح مسیح الاولیاء کی ہر دو دختران کے متعلق بھی یہ تفصیل نہیں ملتی کہ وہ کہاں منسوب تھیں اور کس کو کیا اولاد تھی۔ البتہ بابا فتح محمد محدث کی تصنیفات کے سلسلہ میں ایک رسالہ کا ذکر مطالعہ میں آیا تھا کہ آپ نے یہ رسالہ اپنے ہمشیرہ زادہ شیخ احمد بن

سلیمان کے مطالعہ یا تعلیم کے لئے لکھا تھا۔ معلوم نہیں شیخ احمد مذکور کی والدہ کا کیا نام تھا یعنی وہ کس محترمہ کے بطن سے تھے۔

مسیح الاولیاء کی اولاد و احفاد کا شجرہ منسلک کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے متعلق بعض ضروری اشارات کی طرف متوجہ کر دیا جائے۔

حضرت بابا عبدالستار اور حضرت بابا فتح محمد محدث کی اولاد کا سلسلہ بارہویں صدی ہجری کے آخر اور تیرہوں صدی ہجری کے ربع اول تک۔ اور احفاد کا سلسلہ دونوں شاخوں میں آج تک مربوط چلا آتا ہے۔ چنانچہ حضرت بابا عبدالستار کے احفاد میں آخری سجادہ مولوی سید عزیز الدین تھے، جو کم و بیش دس سال ہوئے حیدرآباد دکن میں انتقال فرماگئے۔ سنا جاتا ہے مرحوم نے دو فرزند یادگار چھوڑے ہیں جو حیدرآباد دکن ہی میں سکونت پذیر ہیں۔ واللہ اعلم۔ ان کے مشاغل کیا ہیں اور کس عالم میں بسر کرتے ہیں۔ خدا کرے یہ بزرگ زادے اپنے اسلاف کی عظمتوں کے ورثہ دار و امین ہوں۔ تاہم درگاہ مسیح الاولیاء کی تولیت اور سجادگی سے انہیں کوئی علاقہ نہیں رہ گیا ہے کہ یہ چیز مرحوم سید عزیز الدین نے حضرت سید جنید علی سجادہ نشین درگاہ حضرت شاہ برہان الدین راز الٰہی کو تفویض کر دی تھی۔

حضرت بابا فتح محمد محدث رح کی اولاد نرینہ کا سلسلہ بھی ۱۳۰۰ھ سے کچھ قبل ختم ہوگیا ہے۔ آپ کے احفاد میں تولیت و سجادگی ۱۲۷۴ھ میں تفویض ہوئی پہلے شخص جو اس منصب پر فائز ہوئے حافظ عبدالکریم تھے۔ ان کے فرزند کلاں محمد صاحب ذیشان اور بسم اللہ صاحب قادری بیگم کے نواسے تھے۔ اور قادری بیگم موصوفہ حضرت محمد عبداللہ خان عرف نواب لعل صاحب کی دختر تھیں۔ آپ نے اپنے نواسوں کے ساتھ انتظاماً چھوٹے صاحب کو بھی شریک رکھا تھا جن کا سلسلہ نسب سجادۂ سوم سے ملتا ہے جو نواب لعل صاحب کی وفات کے بعد متعلقہ ائمہ جات پر قابض ہوگئے تھے۔ تفویض تولیت کی باضابطہ کارروائی کو چھوٹے صاحب مذکور نے بمصداق جاتا دھن دیکھئے تو آدھا دیجئے بانٹ۔ بڑی خوشی سے منظور کرلیا، چنانچہ اس بیان کی صداقت اس اقرارنامہ سے ملتی ہے جو اُنھوں نے حافظ بسم اللہ صاحب کو لکھدیا تھا۔ ضروری حصہ کی نقل ملاحظہ ہو:

> باعث تحریر ایں چند سطور آنکہ منکہ مسمٰی چھوٹے صاحب ولد غلام جنداللہ عرف میان صاحب اقرار میکنم ونوشتہ میدہم بریں معنی انچہ کہ معاش حضرت شاہ عیسی قدس سرہٗ العزیز است تفصیل معاش موضع منگنور و پاٹونڈی پرگنہ راویہ دائمہ جات تعلقہ آسیر پرگشہ بہادر پورہ موضع کھیڑہ وناددو وغیرہ پرگسنہ زین پور و زمین

سندھی پورہ وغیرہ در ہمہ چیزہا نصف حصہ ما بگیریم ونصف حصہ بہ (محمد صاحب)
وبسم اللہ صاحب عبسیۂ قادری بیگم را بداہیم۔ وعرس وصندل حضرت موصوف من
مقروبسم اللہ صاحب مذکور ہر دو متفق شدہ سال بسال میکردہ باشیم الخ۔

ایں چند کلمہ بطریق اقرار نامہ نوشتہ دادہ شد کہ عندالحاجت بکار آید۔ تحریر فی التاریخ ہشتم ماہ ذیقعدہ ۱۲۷۴ ہجری۔

یہ اقرار نامہ شرعی تکمیل شدہ موجودہ سجادہ حضرت حکیم لاڈلے صاحب کے کاغذات میں موجود ہے جو راقم الحروف نے مطالعہ کیا ہے (حافظ بسم اللہ صاحب جن سے اس اقرارنامہ میں خصوصی مخاطبت ہے۔ محمد صاحب ذیشان کے چھوٹی بھائی ہیں، یکجا سکونت کے باعث اس دور کی سادہ معاشرت کے باعث کسی کو اعتراض واختلاف نہ ہوا)

اس خاندان کے سجادگی سے فائز ہونے کے بعد ایک قابلِ ذکر مستحسن کوشش یہ ہوئی ہے کہ محمد صاحب وبسم اللہ صاحب نے سندھ میں پتہ چلاکر وابستگانِ اخلاف مسیح الاولیاء سے خط و کتابت کی اور برسوں یہ سلسلہ قائم رہا جو محمد صاحب کے وصال کے بعد اُن کے جانشین محمد منور صاحب کے عہد تک جاری رہا۔ راقم الحروف ان مکاتیب کے مطالعہ سے برہانپور میں شرفیاب ہوچکا ہے۔ برہانپور سے جانے والے خطوط کا تو علم نہیں، البتہ حیدرآباد سندھ سے جو جوابات یا جواب طلب خطوط برہان پور آئے تھے۔ متعدد دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اس تذکرہ کی نگارش کے موقعہ پر میں نے جناب حکیم لاڈلے صاحب سجادہ حال کو لکھا کہ ان خطوط کی نقل یا اصل مجھے روانہ کردیں۔ موصوف نے جواب دیا تھا کہ بوسیدہ کاغذ ہونے کی وجہ سے ان کا اکثر حصہ مخدوش حالت میں آگیا ہے۔ اس پر بھی انہوں نے قابل خواندگی حصہ کی نقول مرحمت فرمائیں جو پیشِ نظر ہیں۔

ایک فارسی خط جو خاصا طولانی تھا اور اس کا بہت سا اہم حصہ تلف ہوگیا ہے۔ خط کے جن ٹکڑوں کی نقل آئی ہے، اُس میں بالصراحت مضمون مربوط نہیں ہوتا۔ راقم اور تاریخ کتابت بھی موجود نہیں ہے۔ لیکن اسلوبِ نگارش اور دیگر خطوں کے تعلق سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مکتوب سنہ ۱۳۰۰ھ کے قریب لکھا گیا ہوگا۔ نیز یہ محمد صاحب ذیشان سجادہ نہم کے خط کا جواب ہے۔ نیز اس میں متعدد سوالات بھی دریافت کیے گئے ہیں۔ خط کی ابتداء اس طرح ہوتی ہے:

هو العلی العلیم

ہردم دعاہا میکنم بر خاک می مالم جبیں
جمع کن باعزیزاں جامع المتفرقین

حضرات بابرکات صاحب الاشفاقات و تعظیمات ذوالمجد والمواہب سرتاج برادران امید گاہ دور افتادگان رجوع الی اللہ الاحد مقرب بارگاہِ صمد شیخ میاں محمد سلمہا اللہ تعالیٰ سجادہ نشین قطب الاقطاب جند اللہ خطاب جدنا شیخ عیسیٰ پاتائی سندھی، ثم برہانپوری خلف الصدق شیخ قاسم سندھی بن شیخ یوسف قدس اللہ سرہم الاقدس۔

برآن جنابان مخفی نہ بودہ باشد کہ مردم اہلِ سندھ معہ جملہ اولاد حضرت موصوف را از قدیم الایام اقتضائے خاطر مشتاق الوصال از پر آ گہی یافتن مرقد مبارک حضرت جدنا مذکور والا دنسلِ او کہ دریں حمید آوان در دیار ہندوستان بلدہ برہان پور کدام صاحب سجادہ از فضل عمیم رب الکریم عزوجل بہ شگون خیریت مامون جوئیندہ یابندہ از معرفت شیخ فاضل صاحب دو خطوط یکے مرقومہ شیخ احمد صاحب برہانپوری دویم دستخط آنجنابان سرتاج برادران دریں دریار سندھ غرور ودیافتند۔

دریں جملہ بآں صاحب روشن بادکہ خط اولین کہ شیخ احمد فاضل ارقام فرمودہ بود دران عبارت نوشتہ در دیہہ ڈھوری ہنگورہ سندھی بطرف حیدرآباد سندھ مشہور است و مزار شریف[1] آنحضرت شاہ قاسم سندھی پدر حضرت شاہ عیسیٰ پاتائی و اولاد نسلی آنحضرت محلات اقوام در سندھ موضع قبۃ الاسلام قطب الاقطاب موصوف تا حین مالوہ در سندھ معروف اند واز قدیم الایام اولادش پشت بہ پشت دریں سلسلہ سجادہ نشین تا حال در موضع پاتر مذکور مقرراند کہ یکے ازاں خالو صاحب ام جامع العلوم واقف اسرار سبحانی حق آگاہ مخدوم فضل اللہ قدس سرہٗ خلف صدق او مولانا نظام الدین سجادہ نشین در عمر شصت سال حیات است و بعضے ازان از اولاد شیخ عیسیٰ علیہ الرحمۃ از موضع پاتر اوچیدہ در عہد امیران کلہوریائے سندھ در حویلی سیوستان بلدہ متبرکہ حضرت قلندر لعل شہباز سکونت در زرید کہ ازاں پشت بہ پشت سجادہ نشینی قطب ربانی، واقف اسرار یزدانی مخدوم میاں محمد سلمہ اللہ تعالیٰ تا حال بعمر ہشتاد سالہ حیات است وارث جملہ کتب خانہا جد بہ جد علی التواتر از جدنا شیخ برہانپوری موصوف تا حال نزد این سجادہ نشین است و کاتب الحروف در اشتیاق نیاز برادر زادۂ اوست و مشہور است کہ جملہ اولاد شیخ عیسیٰ پاتری برہانپوری قدس سرہٗ صاحبان فیض و مشاہیر علما در سندھ گذشتہ کہ

---

[1] حضرت شیخ قاسمؒ کا مزار ایلچپور برار میں ہے۔ سندھ یا اور کہیں ہونا کسی عنوان درست نہیں۔

یکے ازان قطب سبحانی مخدوم حسن قادری قدس سرہ گذشت کہ باسم این حضرت نسبت است خط جدنا مخدوم فتح محمد مصنف مفتاح الصلوٰۃ نبشت است کہ تا حال موجود است وارث مولانا حامد گنج بخش پاتری علیہ الرحمۃ ومولانا عمر و مولانا............

ومولانا یوسف کہ این جملہ شرکاء وظیفہ اسلاف اولاد در سندھ گذشتند کہ ورثہ او بحکم بادشاہ اورنگزیب............

باسم شیخ عبدالواحد متقی (۱۰) ولد شیخ عبدالرحمٰن مذکور بمہر شاہی خود مرقوم فرمودند کہ این جمیع کار واسنادات حکام اسلام ورسالات کتب معتبر علی التواتر مثبت است رجا واثق کہ ہر گاہے کہ در جواب باصواب آن جنابان رسد تادراں حین مفصل احوال ذریات وغیرہ مرقوم ساختہ بہر یاد خاطری و آگاہی آن جناباں ارسال خدمت خواہد ساخت مگر در حال این دوسہ محاکات او احوال آنحضرت وجدنا علیہ الرحمۃ موصوف بر وقوف یافتن خود بہ جناب آن حضرات می نویسد توقع کہ رحم بردور افتادگان مرعی داشتہ سربستہ احوال مرقوم فرمایند............

سوالِ اولین ما فقرا ہمیں است کہ حضرت عیسیٰ در سلسلۂ جدی وفرزندانِ او فتح محمد آن جناباں بکدام صاحب مشہور اند وکدام صاحب پیر جدی می بودند وآں صاحب بکدام قوم ونسبت مشہور اند وبخدوم فتح محمد بچند واسطہ میر سند۔

سوال دوم۔ حضرت عیسیٰ چند فرزندِ حقیقی دارو و در برہانپور دور سندھ و مولود مبارک در پاتر است یا نہ

سوال سوم۔ فتح محمد محدث علیہ الرحمۃ بعضے اوقات در دیار سندھ آمدہ یا نہ۔ عرس او بکدام تاریخ مقرر است وسال وفات او کدام است مفصل تحریر فرمائید۔

خط ناتمام ہے باقی ٹکڑے باوجود تلاش کے نہیں ملے۔ یہ ٹکڑے بھی بدشواری مربوط کئے ہیں جہاں عبارت کٹ گئی ہے وہاں لکیر کھینچ دی ہے۔

(مولانا مولوی - اختر محمد خان)

اس خط میں یہ امور قابلِ غور و تحقیق ہیں:

راقم مکتوب کے خالو مخدوم فضل اللہ تھے ان کا فرزند مولانا نظام الدین سجادہ تحریر خط کے وقت ساٹھ سال کی عمر میں حیات تھا۔

مسیح الاولیاء کی اولاد سے بعض لوگ امیران کلہوڑا کے عہد میں سیوستان میں متوطن ہوگئے تھے اور ان میں حضرت مخدوم میاں محمد (۱۱) سجادہ زندہ تھے اور اس وقت ان کی عمر اسی

سال تھی اور ان کے پاس مسیح الاولیاء اور ان کے اخلاف کی تصانیف یا کتب خانہ اُس وقت موجود تھا۔

حضرت مخدوم حسن قادری کے پاس حضرت مخدوم فتح محمد محدث کا کوئی خط محفوظ تھا۔

بادشاہ عالمگیر کے فرمان کے مطابق مولانا یوسف اور ان کے شرکاء کو اسلاف کے وظائف میں شرکت و وراثت حاصل تھی۔

....

ایک اور خط ہے جو ۱۹۰۰ء کو حیدرآباد سندھ سے لکھا گیا تھا۔ یہ خط عبدالمولا میاں محمد منور سجادہ صاحب کے نام ہے۔ راقم نے اس طرح ترقیمہ لکھا ہے:

خاک راہ حبیب اللہ عفی عنہ سیوہانی۔ بمقام حیدرآباد سندھ ۷ رمضان المبارک ۱۳۱۸ھ۔

خط کے متن میں یہ عبارت محل نظر ہے:

حضرت رہنمائے من نیکو روشن ہو کہ حیدرآباد سندھ میں اولاد حضرت علیہ الرحمۃ کا موجود نہیں ہے (۱۲) فقط بندہ کا قبلہ گاہ خاص مریدی خادمی کے سبب سے مثلِ وطن حیدرآباد سندھ آ گیا تھا کہ اس صورت پدری کے بندہ بھی اس شہر میں توقف کرتا ہے..........

اصل وطن مالوفہ جدی سیوہان شہر ضلع کراچی.......... کوئی عنایت نامہ مندرج فرماؤ تو ہمیشہ سیوہان شہر کراچی ضلع سندھ ملک میں باسم حضرت مخدوم رکن الدین عرف میان اجر الدین سجادہ نشین قاضی شہر سیوہان کو ن تحریر فرمانا۔

اور گاہے شہر پاتر ضلع کراچی اسٹیشن سیستان میں باسم حضرت مخدوم محمد صالح صاحب سجادہ نشین درگاہ حضرت پیر مخدوم پیر حاجی ہدایت اللہ بخش خلق اللہ فضل اللہ (۱۳) صاحب مرقوم کر کے مرحمت فرمائیں گے۔

یہ سجادہ بندہ کے ماموں صاحب کا ہے اور اصلی وطن مالوفہ حضرت شاہ عیسیٰ علیہ الرحمۃ کی جائے ہے اور میاں اجر الدین برادر زادہ فقیر ہیں۔

اس خط میں قابلِ لحاظ امور یہ ہیں: ۱- حیدرآباد سندھ میں مسیح الاولیاء کی اولاد میں کوئی نہیں ہے۔ ۲- میان اجر الدین سجادہ صاحب راقم کے والد مرید خاص اور خادم تھے۔ (غالباً اخلاف مسیح الاولیاء میں سے کسی کے) ۳- میاں اجر الدین سجادہ صاحب راقم کے برادر زادہ تھے۔ ۴- فضل اللہ صاحب کے سجادہ نشین محمد صالح صاحب راقم کے ماموں تھے۔ اور یہ مسند پاتر میں ہے۔

....

ایک اور اردو خط ہے یہ خط ۱۳۱۹ھ کا لکھا ہوا ہے، محمد منور صاحب سجادہ کے نام ہے اور راقم وہی حبیب اللہ صاحب ہیں۔ اس خط میں انہوں نے خیریت طلبی اور مختلف افرادِ خاندان کے متعلق متعدد سوالات کئے ہیں۔

....

ایک اور اردو خط ہے۔ یہ ۱۳۲۲ھ کا لکھا ہوا ہے۔ محمد منور صاحب سجادہ کے نام ہے۔ اس خط کے راقم بھی وہی حضرت حبیب اللہ سندھی ہیں۔ یہ خط محمد منور صاحب کے مکتوب کا جواب ہے۔ نیز اپنے کسی خط کے استفسارات کا جواب نہ ملنے پر مزید تقاضا کیا ہے اور اسی خط میں ظاہر کیا ہے کہ میں نے بزرگان مسیح الاولیاء اور شیخ طاہر محدث اور مسیح الاولیاء کی اولاد و احفاد کا تفصیلی شجرہ رجسٹرڈ ڈاک سے روانہ کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ:

حضرت مولانا شاہ فتح محمد محدث کی اولاد کا زیادہ مفصل احوال نہیں سنتے ہیں۔
لاجرم بندہ نے ایک رسالہ حال حضرت مسیح الاولیاء درست مفصل حال اولاد قریب و بعید کا مندرج کیا ہے۔ اسی سلسلہ میں یہ ذکر بھی ہے کہ
تمام اضلاع و دیار برہانپور میں نوشادر سرخ کے لئے تلاش فرمانا کہاں دستیاب ہو مطلع فرمانا۔
ترقیمہ یہ ہے: رقیمہٗ نیاز خاک نشین متوطن جدنا مسیح الاولیاء سندھی اعنی فقیر زادہ حبیب اللہ سندھی از حیدرآباد سندھ امیر شاہی ۲۷ ربیع الاول ۱۳۲۲ھ۔

....

آخری چیز ان نقول میں ایک شجرہ ہے جو حضرت مخدوم یوسف سندھی سے شروع ہو کر مسیح الاولیاء کی اولاد کی مختلف شاخوں میں منقسم ہے جن کے سلسلے گجرات، پٹن، مکہ مکرمہ، پاتر سندھ، سیوان سندھ اور خاندیس (برہانپور) و دکن تک وسیع ہیں لیکن کسی بھی شاخ میں چھ سات یا دس ناموں سے زیادہ نام نہیں ہیں۔ حالانکہ حبیب اللہ صاحب کے مکتوب میں طومار یا چادر شجرہ روانہ کرنے کا ذکر ہے۔

اس کے علاوہ ہر شاخ میں ناموں کی ترتیب بھی صحیح نہیں ہے۔ نیز بعض مشاہیر کے نام کے ساتھ جو معلومات مندرج ہیں، ان میں بعض تو بالکل خلاف واقعہ ہیں۔ معلوم نہیں اس اہم دستاویز میں ایسی فروگذاشتیں کیوں واقع ہوئیں۔ مثلاً
شیخ طاہر کے متعلق تحریر ہے کہ وہ مسیح الاولیا کے چچا ہیں۔ مخدوم دوراں میراں محدث بوبکانی سے تربیت پائی؟ گجرات میں شیخ علی متقی کے مرید ہوئے اور پٹن گجرات کو وطن بنایا۔

بواہر قوم کو ہدایت پر لایا۔ بواہر کی قوم میں شہید ہوگیا (یہ شیخ طاہر پٹنی سے متعلق ہے) بواہر قوم کا مرشد ہوا اور اُنہیں کے قبرستان میں مدفون ہے (یہ صحیح نہیں ہے) حضرت کا وصال ۱۹۹ھ میں ہوا (۹۸۶ھ صحیح ہے) فتح محمد محدث کی کتاب فتوح الاوراد سے اس کی پوری تحقیق معلوم ہوگی (ایسا بھی نہیں ہے فتوح الاوراد میں جگہ جگہ طاہر سندھی اور ان کی تفسیر (مجمع البحار کے حوالے ہیں)

مولانا عبدالقادر مفتی مکہ کو مسیح الاولیا کا فرزند ظاہر کیا گیا ہے۔ لیکن ان کا سن وصال ۱۱۷۲ھ ہے جو مسیح الاولیاء کے وصال کے (۱۴۱) سال کا تفاوت رکھتا ہے۔

مخدوم شیخ عبدالواحد مفتی پاتر ۱۰۷۲ھ میں منصب افتاء پر فائز ہوئے۔ عالمگیر نے انہیں جاگیریں انعام میں دیں، لیکن ان کو مسیح الاولیا کی پانچویں پشت میں ظاہر کیا گیا ہے اور انہیں مفتی صاحب کے فرزند مخدوم محمد حسن سیوہانیؒ کے نسبت لکھتے ہیں کہ آپ اجل علماء وفضلاء سندھ تھے۔ روساء سندھ نے آپ کو اراضیات کے محصول کی رعایت دی ہوئی تھی۔ مگر ان کی تاریخ رحلت ۱۲۲۴ھ درج ہے جو والد کی تاریخ منصب سے ۱۵۲ سال بعد واقع ہوتا ہے، نیز ان کا سلسلۂ نسب اس طرح درج ہے۔

مخدوم محمد حسن سیوہانی بن مخدوم شیخ عبدالواحد مفتی پاتر بن شیخ عبداللہ ابن شیخ محمود بن شاہ عیسیٰ بن شاہ مخدوم حسن قادری بن شاہ عیسیٰ جند اللہ ابن شاہ قاسم علیہ الرحمۃ بن مخدوم یوسف سندھی۔

شجرۂ مذکور میں ان افسوسناک فروگذاشتوں کی ایک وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ راقم خطوط و شجرہ شیخ حبیب اللہ صاحب یا ان کے اسلاف سے قدیم شجرہ گم ہوگیا ہوگا(۱۴) اور انہوں نے برہانپور و دکن کے سجادوں سے رابطہ قائم کرکے یہ چیز طلب کی ہوگی۔ اسی طرح اور مقامات کا بھی تصور کیا جاسکتا ہے۔ اس ذوقِ جستجو اور اشتیاق کی تڑپ سے اُنہوں نے نہ معلوم کہاں کہاں خطوط بھیجے اور کس نے انہیں کیا لکھ دیا۔ چنانچہ حضرت شیخ عبدالستار کے اخلاف کا سلسلہ یقیناً انہیں سید جنید علی صاحب سجادہ نشین حضرت برہان الدین راز الٰہی کا مرسلہ ملا ہے مگر اس میں بھی شیخ عبدالستار کے فرزند شیخ ابوالقاسم سرمست کا نام نہیں ہے۔ نیز اس سلسلہ کو گجرات سے منسوب ظاہر کیا گیا ہے۔ مذکورہ نام کی کمی کے بعد بقیہ تمام نام معہ فٹ نوٹ کے قطعاً اس ترتیب کے مطابق ہیں جو مجھے سجادہ صاحب مغفور کے جانشین حضرت سید ریاض الدین صاحب نے نوٹ کرائے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یقیناً کا لفظ استعمال کیا۔

میں نے جو شجرۂ نسب منسلک کیا ہے، اس کے متعلق میں مصدقہ تحریری شہادتوں سے اطمینان کر چکا ہوں۔ یہ تحریری صداقتیں تمام و کمال بجنسہ حضرت سجادہ نشین درگاہ حضرت شیخ بُرہان الدین راز الٰہی قدس سرہ کے ذخیرۂ اسناد میں مطالعہ کر چکا ہوں اور ان میں سے بعض متعلقہ اسناد کے ضروری حصوں کی نقول میرے پاس بھی موجود ہے۔ نیز موجودہ سجادہ نشین حکیم لاڈلے صاحب کے قدیم کاغذات سے بھی مطابقت و تصدیق پائی جاتی ہے۔

شجرہ سے ظاہر ہے کہ حضرت بابا فتح محمد کی اولاد نرینہ میں سلسلۂ تولیت و سجادگی علی التواتر نواب لعل صاحب سجادہ ششم تک قائم رہا۔ نواب لعل صاحب کے وصال کے بعد ان کی دختر قادری بیگم تھیں جو وارث املاک و تولیت ہوئی تھیں اور کاروبار تقریبات عرس و صندل وغیرہ ان کے شوہر ڈھولن صاحب انجام دیتے تھے۔ ان کا ایک فرزند غلام یٰسین اور ایک لڑکی بخشی بیگم تھیں جو حافظ عبدالکریم صاحب کو بیاہی گئی تھیں۔ غلام یٰسین کا سنِ شعور سے قبل انتقال ہوگیا۔ ڈھولن صاحب بھی فوت ہوگئے۔ قادری بیگم نے اپنے داماد حافظ عبدالکریم کو سجادگی تفویض کی اور وہ سجادہ ہشتم مقرر ہوئے۔ اس تولیت نامہ پر سرکاری و شرعی توثیق کے مطابق عمل ہوا اور اس طرح تولیت و سجادگی احفاد میں منتقل ہوئی۔ حافظ عبدالکریم کے دو فرزند تھے۔ حافظ بسم اللہ اور محمد صاحب ذیشان۔ محمد صاحب عالم، شاعر، فقیہ تھے۔ برہانپور کی مسند قضا کی نیابت آپ سے متعلق تھی۔ والد کی وفات کے بعد متولیت و سجادگی آپ سے متعلق رہی۔ آپ راقم الحروف کے نانا تھے۔ دونوں بھائی علم و فضل، اخلاق و اطوار کے اعتبار سے عمائدین شہر میں معزز و محترم تسلیم کئے جاتے تھے۔ نیز یک جہتی، صلۂ رحمی، اتحاد و خلوص میں نظیر نہ رکھتے تھے۔ خدا نے دونوں کو نیک اور نامور و وافر اولاد عطا فرمائی تھی۔ بسم اللہ صاحب سجادہ تو نہ تھے، لیکن مسیح الاولیا کے علمی فیض، حفظ قرآن مجید کی وراثت سے آپ اور آپ کے اخلاف آج تک بہرہ مند ہیں۔ ضروری تفصیل آگے آتی ہے۔

محمد صاحب ذی شان کے تین فرزند تھے۔ عبدالمولا محمد منور صاحب سجادہ دہم۔ نیابت قضا بھی والد کے بعد آپ سے متعلق تھی۔ آپ راقم الحروف کے حقیقی ماموں اور خسر بھی تھے۔ عرس کے موقعہ کا جو فوٹو منسلک ہے سفید ریش سفید لباس میں آپ دروازہ کے پاس استادہ ہیں۔ دوسرے فرزند محمود صاحب تھے، جو شہر برہانپور میں داروغۂ صفائی کے عہدے پر مامور تھے۔ تیسرے فرزند محمد رحمت صاحب تھے جو علاقہ سازی کا پیشہ رکھتے تھے اور کاروباری سلسلہ میں ایولہ ضلع ناسک میں مقیم تھے۔ کثیر الاولاد تھے ۱۳۳۴ھ میں وفات پائی۔ چار فرزند یادگار

ہیں جو اسلاف کی روش پر قائم ہیں دنیاوی ثروت و عزت سے مالامال ہیں۔ ان کے بڑے فرزند غلام احمد صاحب ہیں جن کا ایک فرزند مغربی علوم کا فاضل اور خاندیس کے محکمۂ تعلیم میں انسپکٹر مدارس ہے۔

حافظ بسم اللہ صاحب مرحوم کے چاروں فرزندوں میں ایک حکیم لاڈلے صاحب ہیں جو اس وقت سجادہ نشین ہیں۔ آپ کا پیشہ طبابت ہے۔ اور اپنے کاروبار کے سلسلہ میں اکولہ برار میں سکونت رکھتے ہیں۔ مسیح الاولیاء کی خدمت اور ان کے نام کی برکت سے آپ کو طبابت میں وست فیض حاصل ہے۔ اور اسی فیض روحانی کا کرشمہ ہے کہ اس مسلم آزار دور میں بھی آپ کو طبقہ ہنود میں قبول عام حاصل ہے۔ تصویر میں آپ دروازہ کے پاس استادہ ہیں۔ حافظ بسم اللہ صاحب کے دوسرے فرزند حسن صاحب اور تیسرے فرزند میاں صاحب تھے۔ ہر دو لاولد فوت ہوئے۔ چوتھے فرزند حضرت حافظ احمد صاحب تھے آپ کا انتقال ۱۳۵۲ھ میں ہوا۔ آپ کے ایک فرزند محمد حسن صاحب ہیں جو سجادہ صاحب کی غیر موجودگی میں درگاہ شریف کی نگرانی، گل پوشی، روزانہ روشنی وغیرہ کا انتظام کرتے ہیں۔ تصویر میں آپ سجادہ صاحب کے داہنے ہاتھ کی طرف چھٹے نمبر پر سیاہ شیروانی میں ملبوس استادہ ہیں۔ حافظ احمد صاحب کے دوسرے فرزند غلام محمد عرف نواب صاحب حافظ قرآن تھے۔ ۱۳۳۳ھ میں فوت ہوئے تیسرے فرزند جناب حافظ بخشن صاحب ہیں۔ شہر میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کے دو فرزند ہیں اور دونوں حافظ قرآن ہیں، ان کے نام ہیں حافظ بسم اللہ صاحب اور حافظ منجھلے صاحب سلمہم اللہ تعالیٰ۔

منسلکہ فوٹو اٹھارہ یا بیس سال قبل کا ہے۔ اور اس لحاظ سے فی الوقت یہ ایک یادگار مرقع کی حیثیت رکھتا ہے کہ سجادہ سابق محمد منور مغفور اور سجادہ حال حکیم لاڈلے صاحب کے علاوہ اس وقت کے متعدد مشائخ و عمائدینِ شہر موجود ہیں۔ لیکن ان میں سے اکثر انتقال فرما گئے ہیں۔ یہ بھی مسیح الاولیا کے تذکرہ خیر کا اعجازِ مسیحائی ہے کہ مرقعہ کی اشاعت سے ان مرحوموں کو عرصہ دراز تک روشناس عالم رہنے کا موقعہ مل گیا اور وہ اپنی پوری شکل و نمود کے ساتھ کتاب کی موجودگی تک تو بہر حال قائم برقرار رہیں گے۔

شجرۂ نسب کے علاوہ ایک جداگانہ شجرہ مسیح الاولیاء کے خلفاء کا بھی منسلک ہے۔ اگرچہ یہ کام آسان نہیں ہے کیونکہ مسیح الاولیاء کے خلفاء کی اول تو تعداد ہی کثیر ہے۔ پھر ان میں اکثر خلفاء ایسے بھی ہیں جن کے بکثرت مرید اور متعدد خلفاء ہیں اور پھر ان خلفا کے مرید و خلفاء اس طرح یہ سلسلہ شاخ در شاخ بڑھ کر اس قدر وسیع ہوتا چلا گیا ہے کہ جس کا تمام و کمال احاطہ کرنا کم

از کم میرے تو بس کی بات نہیں، البتہ مجملاً ومختصراً کچھ نہ کچھ اس نیک مقصد سے پیش کرنے کی کوشش کروں گا کہ اس سعادت سے یکسر محرومی نہ ہو۔

ترتیب و تدوین کے اعتبار سے مسیح الاولیا کے اخلاف کے اذکار کے بعد چند خلفاء کے جو کچھ حالات بہم پہنچ سکے جداگانہ اور جن بزرگوں کے حالات زیادہ شرح وبسط سے نہ مل سکے ان کا تعارف معہ مختصر حال بصورت فہرست پیش کیا گیا ہے۔

عرس حضرت مسیح الاولیاء ۱۳ اور ۱۴ شوال کو نہایت سادگی سے ہوتا ہے۔ صندل کا جلوس بعد دوپہر حافظ بخشن صاحب کے مکان پر ترتیب دیا جاتا ہے۔ اہلِ ذوق، عمائدین شہر، صوفیائے کرام و مشائخ عظام کا اجتماع اور بصد خلوص و نیاز خواص وعوام حاضر ہوتے ہیں۔ صندل اگلا و عطریات کے ظروف، پھولوں کی چادریں ایک آراستہ پالکی میں لے کر مودب درود خوان روانہ ہوتے ہیں۔ صندل کی پالکی ویسے تو مخصوص پالکی بردار اٹھاتے ہیں، لیکن بطور اظہار نیاز مشائخ و عمائدین بھی کاندھا دینے کی سعادت کا شرف حاصل کرتے جاتے ہیں۔ جلوس کی حد تک بینڈ ضرور ہوتا ہے جو قوالی کی دھن میں دلکش نغمے بجاتا ہوا گذرتا ہے اور حسب دستور قدیم چوک بازار ہوکر قریب نماز عصر احاطۂ درگاہ مقدس تک پہنچتا ہے۔ نمازِ عصر سے فارغ ہوکر حاضرین بابا عبدالستار کے مزارِ اقدس کے متصل صف بستہ ہوجاتے ہیں۔ اب ظروف صندل وغیرہ سجادہ صاحب و دیگر افراد خاندان بکمال ادب سروں پر اُٹھائے ہوتے ہیں اور نعت خوانی شروع ہوتی ہے۔ ایک دو قصائد یہاں استادہ ہوکر میلاد خوان پڑھتے ہیں۔ پھر اسی طرح نعت خوانی کے ساتھ مرتب جلوس آہستہ آہستہ ایک ایک قدم آگے بڑھتا ہے۔ اگرچہ چند ہی قدم کا فاصلہ ہے، لیکن قریب مغرب درگاہ میں روضۂ اقدس کے دروازے تک پہنچتے ہیں۔ مزار مقدس کو جو خام ہے یعنی تربت کا تعویذ سنگی یا چونہ گچ کا پختہ نہیں ہے۔ گلاب وعطر سے معطر کیا جاتا ہے۔ پھر صندل آلود کرکے غلاف پوش کردیا جاتا ہے اور پھولوں کی چادریں چڑھا کر فاتحہ خوانی ہوتی ہے۔ بعد نماز مغرب کچھ دیر اور میلاد خوانی ہوتی ہے اور حاضرین میں تبرک تقسیم کردیا جاتا ہے۔ بعد نماز عشا مجلس میلاد منعقد ہوتی ہے۔ اس مجلس میں شہر کی متعدد میلاد خواں جماعتیں شریک ہوتی ہیں۔ اہلِ ذوق سامعین بھی بکثرت حاضر ہوتے ہیں، رات کے دو بجے تک تو عموماً مجلس جاری رہتی ہے۔ کبھی جماعتوں کی کثرت ہوتی ہے تو نماز صبح تک نعت خوانی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ایک خصوصیت اس مجلس کی یہ ہے کہ اس میں کوئی نہ کوئی جماعت سید حسن غزنوی کا یہ عربی قصیدہ ضرور پڑھتی ہے:

سلموا یقوم بل صلوا علی صدر الامین   مصطفی ماجاء الا رحمة للعالمین

ہر چند کہ فی زمانہ عربی قصائد کو سمجھنے والے مفقود ہیں۔ لیکن طرز کی دلکشی کچھ ایسی مرغوب ہوتی ہے کہ خاص و عام بے اختیار جھومنے لگتے ہیں۔ حضرت سید ریاض الدین مغفور فرماتے تھے کہ یہ قصیدہ حضرت مسیح الاولیا کو بہت پسند تھا اپنے مرشد کے عرس کے موقعہ پر عبدالرحیم میلاد خواں سے پڑھواتے اور ایک ایک شعر کی لذت سے تواجد اور استغراق کی حالت میں آ جاتے تھے۔

دوسرے دن عرس میں بھی مجلس میلاد خاص اہتمام سے ہوتی ہے۔ تمام دن زائرین پھولوں کی چادریں اور تبرک لے کر آتے اور کچھ قرآنِ مجید کی تلاوت کرتے اور فاتحہ پڑھ کر چلے جاتے ہیں اور یہ سلسلہ شام تک جاری رہتا ہے۔ بعض وقت عرس کی شب مجلس میلاد کے علاوہ مجلسِ وعظ بھی منعقد ہوتی ہے۔ اور یہ رات بھی نعت و منقبت وعظ اور آپ کے ذکر خیر کے لئے مخصوص ہے۔ رقص و سرود وغیر شرعی حرکات یہاں قطعاً نہیں ہوتیں اور کبھی نہیں ہوئیں۔ ۱۵ شوال کو بعد نماز صبح قرآن خوانی ہوتی ہے اس مجلس میں بھی عمائدین شہر دیگر مسندوں کے سجادے و مشائخ شریک ہوتے ہیں۔ چاشت کے وقت تک کئی مرتبہ قرآن مجید ختم ہوجاتا ہے۔ اس وقت بعد فاتحہ حاضرین کو طعام تبرک پیش کیا جاتا ہے اور یہ تقریب ختم ہوجاتی ہے۔

چند سال سے میں نے عرس کی شب آپ کی منقبت میں طرحی مشاعرہ کا سلسلہ شروع کیا تھا جو نہایت کامیابی سے جاری رہا۔ میں دس سال ہوئے برہان پور چھوڑ چکا ہوں۔ اس اثناء میں مشاعرہ کا نظام درہم برہم ہوگیا ہے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہاں موسم کے تغیر سے شوال بارش کے دنوں میں واقع ہورہا ہے اور اتفاق سے عرس والے ہفتہ میں شدید بارش ہوتی رہی ہے۔

سفر در سفر کی افراتفری کے باوجود بے سر و سامانی کے عالم میں بھی مسلسل پانچ سال کے طرحی مشاعروں کے منقبتیں تو اب بھی میرے پاس موجود ہیں مگر میں انہیں تمام وکمال درج کرنے سے اس لئے محترز ہوں کہ اول تو تطویل کا اندیشہ ہے۔ دوسرے خواہ مخواہ اپنا کلام درج کرنا خود نمائی متصور ہوسکتی ہے۔ البتہ ایک مختصر نظم حاضر کررہا ہوں کہ یہ نظم مجھ پر گذرے ہوئے ایک واقعہ سے تعلق رکھتی ہے اور اس کے بعد ہی سے تو میں نے اس مشاعرہ کو کامیاب بنانے کے لئے سرگرمی سے حصہ لینا شروع کیا اور اپنی موجودگی تک کامیاب بھی رہا۔

مشاعرہ طرحی ہوا کرتا تھا، اس لئے شعراء کو مصرعہ طرح عید کے دوسرے دن تقسیم کردیا جاتا تھا۔ ایک سال میں رمضان المبارک ہی میں سخت علیل ہوگیا، مرض نے طول کھینچا، گو میں عید کے دن بھی صحت مند نہ تھا۔ اسی عالم میں دوسرے دن شعرا کو دعوت نامے بھیجنے کا انتظام کیا۔

عرس کی تاریخیں قریب آ گئیں، مگر میری حالت نہ سنبھلی ۱۳ شوال کو صندل شریف کا جلوس آنے کی خبر سنی جس کا راستہ میرے دروازے کے سامنے واقع ہے۔ جیسے ہی جلوس سامنے آیا میں ایک چادر اوڑھ کر باہر نکل آیا کہ چند قدم جلوس میں شرکت کی سعادت حاصل کرلوں۔ چنانچہ جلوس کے ساتھ چلنے لگا۔ یا تو مجھے چند قدم چلنا دوبھر تھا یا بے تکان روضۂ اقدس تک جا پہنچا۔ آستانۂ مبارک سامنے آتے ہی ارتجالاً حسب ذیل اشعار موزوں ہوگئے۔ نیز آپ کی مسیحائی کی برکت سے علالت کا ضعف قطعاً جاتا رہا اور میں نے حسبِ معمول عرس اور سہیلہ کی تقریبوں میں شرکت کی۔ وہ اشعار یہ ہیں:

جبیں سائی میسر آئے اس در پر تو کیا کہئے
خوش اقبالی سمجھئے خوبی بخت رسا کہئے

یہاں کی خاک کو بیماری غم کی دوا کہئے
مزارِ عیسی دوراں نہیں دارالشفا کہئے

جو پوچھا میں نے رضوان سے کہ اس روضہ کو کیا کہئے
کہا باغ ارم کہیے بہشت دلکشا کہئے

تقاضائے خرد یہ ہے ذکر ہو اوصاف عیسیٰ کا
زبانِ فطق کو حیرت سے شکستہ ہوکر کیا کہیئے

دلوں کو جس نے حسن خلق سے زندہ کیا اس کو
امام الاتقیا کہئے مسیح الاولیاء کہیئے

ہنوز اس آستانِ محترم سے فیض جاری ہے
وہ فیضِ عام جس کو چشمۂ لطفِ خدا کہیئے

یہاں جب بے طلب ہر مد عاملتا ہے اے راشد
برابر ہے زبان سے کچھ نہ کہئے آپ یا کہئے

☆

تعلیقات

تعلیق (۱): مسیح الاولیاء کا لقب آپ کو کس نے دیا اور کب دیا۔ یا یہ کہ کب آپ کے نام گرامی سے منسلک ہوا۔ اس سلسلے میں گلزار ابرار یا کسی اور ہمعصر کتاب سے واضح صراحت نہیں ملتی۔ البتہ المکتوب الحبیب قلمی (۱۳۳۲ھ) میں لکھا ہے:

''حضرت مسیح الاولیا وہ مرد عباداللہ الصالحین میں سے مقرب اللہ العظیم تھے کہ ملفوظات خواجہ سید قاسم نقشبندی سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر مجلس معرکہ ذکر قال اللہ قال رسول ﷺ میں جب بھی حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہ منعقد ہوتی تو ہر اس وقت آپ کے در جلہ دہان گوہر افشان سے حضرت شیخ عیسیٰ قاسم سندھی کا نام بغیر لقب مسیح الاولیا کے نہ لیا جاتا۔ سبحان اللہ۔''

رسالہ الناطق قلمی جو مخدوم محمد عارف سیوستانی (المتوفی ۱۲۵۸ھ) کی فرمائش پر کسی نامعلوم مصنف نے تحریر کیا۔ اس میں حضرت شیخ فتح اللہ صاحب لاہوری قدس سرہٗ کے ملفوظات کے حوالے سے المکتوب الحبیب سے مشابہ روایت بیان کی گئی ہے۔ رسالہ الناطق بالحق کتب خانہ سہون دواخانہ مخدوم محمد مراد سہوانی موجود ہے۔ جس کی ایک نقل راقم کے کتب خانہ میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

ابھی سلسلہ نقشبندیہ کا سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ ہندستان پر طلوع نہ ہوا تھا کہ حضرت مسیح القلوب نے بھی اس کی ترویج میں حصہ لیا۔ حالانکہ آپ پیشوا سلسلہ شطاریہ تھے۔ المکتوب الحبیب قلمی میں بہ زبان سندھی اس کی وضاحت کچھ اس طرح تحریر ہے:

«جن ڏينهن ۾ اجا راهہ نقشبندي جي پوري پکڙيل نہ هئي، تن ڏينهن ۾ مسيح الاوليا جا گڏيات راه نقشبندي ۾ بہ هئا، پر گهڻو ڪري پاڻ حضرت قدس سره پيشوائي راه شطار پاڪ جا هئا. اها راه پنهنجي مٿي خصوصيت تي ڏيکاري عرفان حق جي. هي اهو مخصوص طرق هو، جو حضرت مجدد امجد (مجدد الف ثاني) بہ انهي بحار جي فيض کان سيراب هئا. جن ڏينهن ۾ حضرت نعمان

خليفه حضرت مجدد امجد اجازت گير ٿي برهانپور شهر ۾ راه نقشبندي جي پکيڙ ٿي ڪئي، تن ڏينهن ۾ به پيرا موٽيا ويا. وريو وريو مرشد جي خدمت ۾ چوته ترويجي طرق جي نه ٿي سگهي هئي. قادرين ۽ شطارين جو اڪمل شغل هو ۽ ڪي ڪتاب چون ٿا ته طرق نقشبندي چلت برهانپور ڏيه ۾ مسيح الاوليا جي ترغيب تحريص ساڻ زور ورتو هو. اهڙا عنوان ڪتاب زبدت المقامات مان چوندي ڏسو ۽ تاريخ برهانپور مان به».

ان حقائق کی تصدیق مولانا سید زوار حسین شاہ کی کتاب ''حضرت مجدد الف ثانی'' جو ادارہ مجددیہ ناظم آباد کراچی نے شایع کی، سے بھی ہوتی ہے۔ آپ رقمطراز ہیں: ''خواجہ میر محمد نعمان بدخشیؒ دومرتبہ برہانپور تشریف لے گئے۔ چونکہ اس شہر میں شیخ عیسیٰ روح اللہ رحمہما اللہ جیسے صاحب علوم و حال و قال اور اہل کمال و اکمل موجود تھے، اس لئے وہاں آپ کے طریقہ کی اشاعت نہ ہوسکی۔ آپ نے واپس آکر حضرتؒ کی خدمت میں حقیقت حال عرض کی۔''

المکتوب الحبیب قلمی میں لکھا ہے:

«مسيح الاوليا ١٠٣١ هه ۾ وصال ڪيو هو ۽ حضرت مجدد امجد ١٠٣٤ هه ۾ لکن ٿا ته جيسين حضرت امام رباني جو والد امجد حضرت عبدالاحد سرهند ۾ حيات هئا، تيسين حضرت مجدد قدم پنهنجو شهر کان ٻاهر نه ڪيو هو. پوءِ پنهنجي مرشد جي حضور ۾ مصاحب هئا، تن ڏينهن کان حضرت مسيح الاولياء مخبر فوقيت راه نقشبندي جو هو ۽ پاڻ به مائل انهي راه جا هئا. جن ڏينهن ۾ خواجه سيد محمد هاشم صاحب زبدت المقامات وارو خواجه عبدالاحد جو بيان ڪيل فوقيت طرق نقشبنديه جيجو حضرت مجدد کان نقل ٻڌي راه سفر جي وٽي آزمائش ٿي ڪئي، ته پيو به ڪو مشائخ ٻئي طريقي جو فوقيت ٻين طريقن تي نقشبندي جي فرمائي ٿو. ڪي رڳو مخدوم عبدالاحد سرهندي، سو سيد جڏهن برهانپور ۾ پهتو ته اهو تاڻو ١٠٣٢ هو. حضرت مسيح الاوليا جي وفات کان بعد هڪ ورهيه پوءِ درگاهه فيضياب مسيح الاوليا جي ۾ پهتو ۽ فوقيت راه نقشبندي جي حضرت سجاده نشين وڏي پٽ

مسيح الاوليا شيخ عبدالستار قدس سره کان لهي شڪر مند ٿي اسهيو هو. حضرت مخدوم عبدالستار مٿيون گوٺ پاتر ۾ جايل هو. پوءِ برهانپور ۾ قبله گاه وٽ صحبت ۾ هوندا هئا.»

المکتوب الحبیب کے بیان سے مندرجہ ذیل اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں:

۱- والد محترم کے آخری ایام میں حضرت مجدد ان کے ساتھ سرہند میں مقیم تھے اور ان کی وفات حسرت آیات (۱۰۰۷ھ) تک انہیں چھوڑ کر کہیں سفر اختیار نہ کیا۔

۲- تاریخ کی دیگر کتب میں اس کی وضاحت موجود ہے کہ والد کی وفات کے بعد جب آپ حج بیت اللہ اور زیارت روضہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادہ سے ۱۰۰۸ھ میں روانہ ہوئے۔ دہلی پہنچے تو وہاں مولانا حسن کشمیری سے ملاقات ہوئی، جن کی تحریک پر سلسلہ نقشبندیہ کے بزرگ حضرت خواجہ باقی باللہؒ سے ملاقات ہوئی۔ حضرت مجدد نے اپنے والد ماجدؒ سے سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کی بہت تعریف اور اس سلسلہ کے بزرگوں کے حالات سنے تھے اور والد ماجد کا ذوق و شوق اس سلسلہ عالیہ کے متعلق مشاہدہ فرمایا تھا۔ آپ نے جلدی حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ سے بیعت کی درخواست کی۔ ان دنوں میں حضرت مسیح الاولیاء سلسلہ شطاریہ کے ساتھ سلسلہ نقشبندیہ کے بھی مرشد و رہنما تھے۔

حضرت مسیح الاولیاء کے روحانی مراتب سے واقفیت کا ذکر حضرت مجدد الف ثانی نے المکتوبات یازدہم معہ اول میں ان الفاظ میں کیا ہے: ''میاں شیخ و شیخ عیسیٰ و شیخ کمال در جذبہ بنقطہ فوق رسیداند۔''

تعلیق (۲): جنداللہ آپ کا لقب ہے یہ لقب پیر و مرشد شاہ لشکر کی نسبت سے تھا کہ جُند اور لشکر مترادف المعنیٰ ہیں۔

آپ نے یہ لقب حضرت شیخ لشکر محمد عارف کے حلقہ ارادت میں آنے کے بعد اختیار کیا۔ ۹۸۲ھ کے بعد آپ کی ملاقات شیخ لشکر محمد عارف سے ہوئی۔ جس کے بعد ۹۹۸ھ میں حضرت مسیح کی سندھ میں موجودگی گلزار ابرار سے ثابت ہے' جس سال مخدوم عباس نے قصبہ ہنگورجہ سندھ میں وفات پائی تو آپ جانشین مقرر ہوئے۔ غوثی بعنوان یاد مخدوم عباس میں رقمطراز ہیں:

> ''اب با استحقاق جانشین اس مسجد میں اور حال کے مدرسہ میں مسیح القلوب شیخ حبیب اللہ ہیں جو ظاہری فضیلت میں سب سے زیادہ کامیاب اور سرسبز اور پرہیزگاری میں وہاں کے جملہ فضلاء سے زیادہ مشہور اور با استحکام ہیں۔''

اس جملہ سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ اس زمانہ میں دیار سندھ میں ہی اقامت پذیر تھے۔ اور یہاں کافی مقبولیت بھی رکھتے تھے۔ شیخ لشکر محمد عارف کی مریدی میں آنے اور روحانی تربیت حاصل کرنے کی وجہ سے پرہیزگاری کی اس منزل تک پہنچ چکے تھے کہ اپنے وطن عزیز سندھ کے جملہ فضلاء سے زیادہ مشہور ہوگئے اور مرشد کامل کی نسبت سے اختیار کیا گیا لقب جُنداللہ بھی اس حد تک زبان عام ہوگیا تھا کہ آئندہ لکھی جانے والی تاریخوں میں آپ کے اسم مبارک کے ساتھ یہی لقب بھی لکھا گیا۔ ۱۱۸۱ھ میں لکھی گئی تاریخ تحفۃ الکرام اور اس کے بعد ''معیار سالکان طریقت'' میں آپ کی وطنیت سندھ ہونے کے ساتھ لقب جُنداللہ بھی لکھا گیا ہے۔ علی شیر قانع ''معیار سالکان طریقت'' میں رقمطراز ہیں: ''شیخ عیسیٰ سندی، جنداللہ لقب، مرید شیخ محمد لشکر۔''

تحفۃ الکرام کے الفاظ یہ ہیں:

''شیخ عیسیٰ سندی: لقب جُنداللہ- شیخ محمد غوث گوالیاری کے خلیفہ شیخ محمد لشکر کے مرید تھے۔ شیخ برہان شطاری برہانپوری آپ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ آپ کی تصنیفات میں تفسیر 'انوار الاسرار' مشہور ہے۔ آپ ۱۰۳۱ھ میں فوت ہوئے۔ آپ کے فرزند شیخ عبدالستار فضیلت کمال اور عمدہ حال کے صاحب اپنے والد کی مسند ارشاد پر بیٹھے اور وفات پا گئے۔''

تاریخ تحفۃ الکرام میں شیخ عبدالستار کا ذکر ان مقامی روایات اور قلمی مواد کی تائید کرتا ہے، جس میں شیخ عیسیٰ کے فرزند شیخ شہراللہ رمضان کے متاہل ہونے کے بعد عالم جوانی میں فوت ہونے کا ذکر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ذکر ہندستانی تذکروں میں نہیں ملتا۔ جس طرح شیخ عبدالستار اور بابا فتح محمد کے علاوہ دیگر اولاد نرینہ و دختران و ہمشیرہ کا ذکر بھی ہندستانی تذکروں میں موجود نہیں۔ پیر حسام الدین راشدی نے تذکرہ مشاہیر سندھ کے حواشیہ میں موجود جو شجرہ شیخ عیسیٰ جنداللہ دیا ہے، اس میں موجود پیدائش اور وفات. سال سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ شہراللہ عالم جوانی میں اپنے والد شیخ عیسیٰ کی زندگی میں ہی وفات پا گئے اور پسماندگان میں ایک فرزند شیخ حسن قاری چھوڑا۔ جن کی اولاد سندھ میں موجود ہے۔

حضرت مسیح الاولیاء کی شہرت کا زمانہ حضرت شیخ لشکر محمد عارف کے خلیفہ ہونے کے بعد کا ہے۔ جب آپ فرزند شیخ عبدالستار کے ہمراہ اپنے عم مکرم مخدوم عباس کی وفات کے بعد مستقلاً برہانپور میں مقیم ہوگئے۔ باپ اور بیٹے کی ایک ساتھ سندھ سے سفر کی وجہ سے دونوں کا نام ساتھ ساتھ تحفۃ الکرام اور دیگر تحریروں میں شامل ہوگیا۔

تعلیق (۳): عین المعانی میں حضرت مسیح الاولیاء کا دیا ہوا شجرہ مع القاب سے لفظ ''برار'' کا انتخاب کر کے راشد برہانپوری نے خود ساختہ وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: ''شیخ عیسیٰ نے اپنے مولداً براری ہونے کی وجہ سے اس کا نام لکھا ہے۔''

بزرگان دین کی یہ روایت اکثر مشاہدہ میں آئی ہے کہ وہ اپنے نام اور لقب کے فوراً بعد اپنی زاد بوم کا ذکر کرتے ہیں اور یہی اصول عام بھی ہے۔ حضرت مسیح الاولیا نے بھی البراری سے پہلے الہندی اور اس سے پہلے السندی تحریر فرمایا ہے۔ جیسا کہ آپ سندھ سے ہند آئے، پھر برار میں ایک عرصہ طویل رہ کر عم مکرم کے زیر سایہ تعلیم حاصل کی۔ اس وجہ سے آپ نے اپنے اسم مبارک کے بعد ''السندی'' پھر ''الہندی'' پھر ''البراری'' لکھا ہے۔ بعد کی تحریروں میں آپ کے نام کے ساتھ البرہانپوری بھی لکھا جاتا رہا ہے۔ لیکن اس شہر کو کوئی آپ کی زاد بوم نہیں کہہ سکتا۔

ڈاکٹر حبیب اللہ صدیقی صاحب نے بھی ''تاریخ باب الاسلام'' میں اس کی وضاحت یہ کی ہے کہ حضرت مسیح الاولیا نے پہلے السندی لکھ کر اپنی زاد بوم ظاہر کی ہے۔ جس کے بعد وہ ہند کی طرف سفر کر گئے اور یہ برار میں اپنے عم مکرم کے پاس کچھ عرصہ علم حاصل کرتے رہے۔ اس درمیان ان کا اپنے وطن مالوف پاٹ سندھ آنا جانا جاری تھا۔

غوثی حضرت مسیح کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ ''جن ایام میں میری ماں مجھ سے امیدوار تھیں۔ انہی ایام کے قریب قریب میری ماں نے یہ خواب دیکھا کہ مولانا یونس ہمارے گھر آئے ہوئے ہیں۔''

مولانا یونس سمرقندی، مرزا شاہ حسن ارغون کے دور میں ماوراء النہر سے آ کر سندھ میں سکونت پذیر ہوئے تھے۔ کچھ عرصہ مرزا شاہ حسن کو پاٹ، سہون یا ٹھٹہ میں شرح مواقف کا درس دیا۔ آپ ۹۵۱ھ/۱۵۴۴ء میں وفات پا گئے۔ حضرت عیسیٰ جنداللہ سے تقریباً دس برس قبل یہ بزرگ سندھ میں ہو گذرے۔ لیکن صاحب گلزار ابرار کا یہ اصرار ہے کہ شیخ عیسیٰ کی زاد بوم ایلچ پور یا ایرج پور دار السلطنت صوبہ برار ہے۔ غوثی نے یہ ذکر بڑے اہتمام کے ساتھ کیا ہے۔ انہوں نے حضرت مسیح کی پیدائش سے منسلک روایات بیان فرمائیں تو خود انہی کے حوالے سے لیکن روایات کے شروع ہونے سے پہلے جب زاد بوم ایرج پور لکھا تو حضرت مسیح کے حوالے سے یہ بات کہنے سے اجتناب برت گئے۔ یہ جملہ نہ کہا کہ حضرت مسیح نے فرمایا کہ میں ایرج پور میں پیدا ہوا تھا۔ آپ لکھتے ہیں: ''شیخ عیسیٰ کی زاد بوم ایرج پور دار السلطنت صوبہ برار ہے۔ ایک روز آپ نے فرمایا......'' (پھر پیدائش کے وقت خواب اور دیگر واقعات بیان فرمائے)

اس روایت کے مطابق ولادت کے وقت شیخ قاسم کسی گاؤں میں گئے ہوئے تھے جو ایرج پور کے نزدیک تھا۔ اگر یہ گاؤں قریب تھا تو فرزند ارجمند کی خوشخبری کیوں نہیں پہنچائی گئی۔ نام بھی رکھ لیا گیا۔ پھر آپ تشریف لائے۔ راشد برہانپوری کی تحریر کے مطابق حضرت زینب بنت شیخ قاسم سے روایت ہے کہ ''جب مسیح الاولیا کی ولادت ہوئی، والد تب بھی واپس نہیں آئے تھے۔ لہٰذا عم مکرم نے بھی حضرت کا نام شیخ عیسیٰ تجویز کیا...... چند دن بعد والد صاحب تشریف لائے۔''

مسیح الاولیاء کی ولادت ۹۶۲ میں دکھائی گئی ہے۔ جس کے بعد آپ کے دوسرے نمبر بھائی شیخ عثمان ۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء اور تیسرے نمبر بھائی شیخ سلیمان سیفی ۹۶۶ھ/۱۵۶۰ء میں تولد ہوئے۔ اگر یہ دونوں بھائی ایرج پور میں پیدا ہوئے تو پھر فرحی اور غوثی سے ان کا احوال کیونکر پوشیدہ ہوا؟ ڈاکٹر حبیب اللہ صاحب کی تحقیق کے مطابق ''شیخ عثمان اپنے چھوٹے اور بڑے بھائی کی طرح پاٹ سندھ میں پیدا ہوئے۔ لیکن صغرسنی میں وفات پاگئے۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ عیسیٰ نے اپنے تیسرے فرزند کا نام شیخ عثمان رکھا اور مذکورہ تذکرہ نگار مغالطہ میں رہے۔ علم کے معاملہ میں حلم سے کام لینا چاہئے۔ خوف خدا لازم ہے۔ کہہ نہیں سکتے کہ سہواً یا قصداً فرحی اور غوثی کی تحریریں اضافوں اور غلط تاویلوں کی نظر ہوئی ہیں۔''

درگاہ مسیح الاولیاء کے متولی اور سجادہ حکیم غلام خواجہ صاحب قادری برہانپوری فرزند حکیم لاڈلے صاحب نے اپنی کمال عنایت سے کتاب ''جواہر ہاشمیہ'' مصنف اختر محمد خان سن تالیف ۱۹۳۸ء برہانپور بندہ کو ارسال کی ہے۔ اس میں صفحہ ۳۸ پر حضرت شیخ عیسیٰ جُند اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا احوال اس طرح بیان کیا گیا ہے:

> ''جامع معقول ومنقول حاوی فروع و اصول علوم ظاہری و باطنی میں وحید عصر و فرید دہر تھے۔ تمام علوم اپنے والد ماجد شیخ محمد قاسم اور عم مکرم بزرگوار شیخ محمد طاہر سے حاصل کئے۔ اپنے وطن مالوف ملک سندھ سے آکر برہانپور اقامت گزین ہوئے۔''

اختر محمد صاحب آگے رقم طراز ہیں کہ ان کے زمانہ میں حکیم لاڈلے صاحب ابن جناب بسم اللہ صاحب درگاہ مسیح الاولیاء کے متولی ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی معلومات کا ذریعہ بھی حکیم لاڈلے صاحب ہی ہیں۔

مسیح الاولیاء کی ولادت باسعادت پاٹ سندھ میں ہوئی ہے۔ اس کی تصدیق خود ہندستانی تذکروں میں سے ایک معتبر کتاب مآثر الامراء سے ہوتی ہے۔ جس کا مؤلف صمصام الدولہ شاہنواز خان شیخ عیسیٰ جنداللہ کا خان خانان پر تصرف بیان کرتے ہوئے حواشیہ میں ان کا تعارف اس طرح دیتے ہیں:

''شیخ عیسیٰ جنداللہ سندھی ثم برہانپوری۔''

معارج الولایۃ کا ایک نادر قلمی نسخہ پروفیسر خلیق احمد نظامی، علی گڑھ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ شیخ عیسیٰ کے متعلق اس میں تحریر ہے: ''خلیفہ و مرید شیخ لشکر محمد عارف است۔ جامع علوم ظاہری و باطنی بودہ۔ اصل او از سند است و از آنجا آمدہ در برہان پور سکونت گرفتہ و سندی پورہ در برہانپور بہ نام او است و شیخ لشکر محمد عارف کہ خلیفہ شیخ محمد غوث است بہ محبت او از گجرات آمدہ در برہانپور رفت اقامت انداخت دراستی پورہ بہ نام بی بی راستی منکوحہ او است و شیخ عیسیٰ مردے بزرگ و شخصے متبرک بود و بر مسلک او توحید غالب بود و اتباع شیخ محی الدین برکمال داشت و توحید را آشکارا گفتی و کتب شیخ محی الدین را درس و تدریس نمودی و مواضع مشکلات را توجیحات فرمودی۔'' (صفحہ ۵۸۴)

سوانح مسیح الاولیا بیان کرتے ہوئے، مصنف ''برہانپور کے سندھی اولیاء'' آپ کی ابتدائی تعلیم کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''طفولیت کے زمانہ میں قرآن مجید ملا اسماعیل سے پڑھا جو اس عہد میں تعلیم قرآن پاک کی فیض رسانی میں ثانی نہیں رکھتے تھے۔ انہیں کے درس میں نو سال کی عمر ہونے تک صحیح اور پختہ یادداشت سے حافظ قرآن ہو چکے تھے۔''

ملا اسماعیل کا ذکر ہم گذشتہ اوراق میں تفصیل سے کر چکے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ انہوں نے کبھی ہندستان جا کر شیخ عیسیٰ جنداللہ کو قرآن کی تعلیم نہیں دی۔ یہیں ان کا مدرسہ تھا اور یہیں ان کا مزار ہے۔

آپ نے حضرت مسیح الاولیاء کو درس قرآن دیا۔ جس کے بعد یقیناً والد کی وفات کے بعد آپ اپنے عم مکرم شیخ طاہر محدث کے پاس ایلچ پور برار تشریف لائے اور مزید علم حاصل کرنے کے لئے انہیں کے زیر سایہ رہے۔ یوں آپ نے برہانپور میں مستقل سکونت اختیار کرنے سے پہلے اپنے وطن مالوف پاٹ سندھ اور ہندستان آنا جانا جاری رکھا۔

تعلیق (۴): راشد برہانپوری نے مسیح الاولیاء کے تفصیلی حالات پیش کرتے وقت دو اہم ماخذوں کے نام لیے ہیں: ۱- کشف الحقائق ۲- گلزار ابرار۔

ان کے متعلق آپ کی رائے ہے کہ یہ کتابیں:

۱- اسماعیل فرحی نے کامل ۲۰ سال حاضر خدمت رہ کر کشف الحقائق کتاب قلمبند کی۔ ۱۰۲۰ھ اس نسخہ کا سن تالیف ہے۔ گلزار ابرار نے بھی کشف الحقائق سے حالات نقل کئے ہیں۔ لیکن ایک اور جگہ اس کتاب کی تکملہ کا سن ۱۰۶۱ھ یعنی شیخ عیسیٰ کی وفات کے ۳۰ سال بعد دکھایا ہے۔

۲- گلزار ابرار جو۱۰۲۲ھ میں تالیف ہوئی، اس میں زیادہ تر حالات کشف الحقائق سے لئے گئے ہیں۔

کشف الحقائق کی صحت کے متعلق ہم شیخ اسماعیل فرحی کے باب میں بحث کریں گے۔ یہاں اتنا واضح کرنا ضروری ہے کہ گلزار ابرار کشف الحقائق سے پہلے لکھی گئی کتاب ہے۔ پہلے لکھی گئی کتاب بعد میں لکھی جانے والی کتاب سے کس طرح نقل کرسکتی ہے۔

دوم گلزار ابرار نے گجرات کے سفر میں شیخ طاہر کے ساتھ شیخ قاسم کا ذکر نہیں کیا۔ اس کتاب کی تکملہ ۱۰۲۲ھ دکھائی جاتی ہے۔ جبکہ کشف ۱۰۶۱ھ میں مکمل ہوئی۔ فی زمانہ اس کتاب کا اصل نسخہ موجود نہیں۔ تمام نسخے بہت بعد کی کتابت ہیں۔

حضرت مسیح الاولیاء کی زاد بوم کا فیصلہ کرتے وقت مندرجہ ذیل حقائق کو زیر نظر رکھنا پڑے گا:

۱- گلزار ابرار میں شیخ قاسم کی گجرات کی طرف ہجرت کا ذکر ہی موجود نہیں۔ بلکہ ۹۷۷ھ میں حضرت عیسیٰ کی بڑی بہن امۃ اللہ حبیبہ سلطان بنت محمد قاسم محدث کا سندھ میں کتابت کیا ہوا تفسیر یعقوبی اس خانوادہ کا یہاں موجود ہونے کا ثبوت پیش کررہا ہے۔

۲- گلزار ابرار شیخ قاسم کی وفات ایلچ پور میں نہیں دکھاتا۔ اس کے برعکس سندھ میں شیخ قاسم کے وطن مالوف پاٹ میں اس زمانہ سے موجود ''قاسمانی'' تاریخی قبرستان آپ کی آخری آرام گاہ کی طرف واضح اشارہ کررہا ہے۔

۳- گلزار ابرار شیخ عبدالستار کی زاد بوم ایلچ پور میں نہیں دکھاتا، جبکہ اس کے برعکس سندھ کے مقامی ماخذ اور قلمی مواد آپ کا جنم پاٹ میں دکھارہے ہیں۔

۴- پیدائش کے وقت ذکر کیے گئے واقعات، ملا اسماعیل سے درس قرآن سندھ کے علاوہ کہیں اور ممکن نہیں۔

۵- جیسا کہ 'اصول عام' ہے کہ نام اور القاب کے بعد وطنیت کا ذکر ہوتا ہے، حضرت مسیح کے ساتھ بھی لفظ سندھی آپ کی زاد بوم کی طرف اشارہ ہے۔

۶- سندھی علماء فضلا کا حضرت مسیح الاولیا کے برہانپور میں مستقل اقامت (۹۹۸ھ) کے بعد بھی تعلق جاری رکھنا آپ کی اہل سندھ کے ساتھ ذاتی شناسائی کا دلیل ہے۔

۷- آپ کی درگاہ پر سندھی تاجروں کا ہجوم، دیار سندھ میں بتائے ہوئے ایام اور اہل سندھ کے ساتھ براہ راست مراسم کا ایک اور روشن ثبوت ہے۔

۸- والد گرامی شیخ قاسم کی وفات کے بعد آپ ایک عرصہ تکمیل علم کے لئے عم مکرم کے پاس ایلچ پور برار آکر ٹھہرے۔ بچپن اور جوانی کے گذارے ہوئے یہ ایام بہت سارے

متعلقین کے لئے سہو نظر کا سبب بنے کہ آپ کا زاد بوم برار سمجھ بیٹھے۔ اس عرصہ میں آپ کا گھر ایلچ پور میں بھی موجود تھا اور پاٹ سندھ میں بھی۔ اور آپ کا وقفے سے آنا جانا بدستور جاری تھا۔ صاحب گلزار ابرار بھی اس مغالطے میں تھے۔ جب کسی خانوادہ کے بیک وقت ایک سے زیادہ شہروں میں مکان موجود ہوں تو اس قسم کے مغالطے اکثر جنم لیا کرتے ہیں۔

بندہ کے والد محترم نے ساٹھ کی دہائی میں اولاد کی اعلیٰ تعلیم کے لئے حیدرآباد منتقل ہونے کا ارادہ کیا اور یہاں ایک مکان حاصل کرلیا۔ راقم چند سال کا تھا کہ حیدرآباد منتقل ہوگئے، لیکن اپنے وطن عزیز پاٹ بدستور آنا جانا رہا، جو ہنوز آج تک جاری ہے۔ دوران گفتگو ہمارے قریبی عزیز بزرگ بضد ہوگئے کہ بندہ کی زاد بوم حیدرآباد ہے۔ بہت سمجھانے کے بعد کہیں جا کر سمجھے۔

زمانہ حال میں سید صبغت اللہ شاہ پیر ایرانی المتوفی ۱۹۸۴ء ایران سے تشریف لائے۔ کچھ عرصہ والد گرامی کے مہمان پاٹ میں رہے۔ بہت بڑے عالم تھے۔ ایک عرصہ حیدرآباد میں گذارا۔ آپ کی آخری آرام گاہ شادی شہید خیرپور میرس میں ہے۔ بڑے بھائی مخدوم عبدالجبار صدیقی کو خلافت سے نوازا۔ آپ کی ہمشیرہ نے آپ کی ملفوظات تحریر فرمائے۔ جب یہ آپ کے زیر مطالعہ آئے تو اپنے دست مبارک سے صفحہ اول پر تحریر فرمایا: ''اس میں بہت ساری چیزیں غلو ہیں۔''

حضرت مسیح الاولیا شیخ عیسیٰ جنداللہ ایک عرصہ برار میں گذارا، جس کی وجہ سے غوثی کو آپ کی زادبوم کے متعلق مغالطہ ہوا۔ ذرا غور کیجئے کہ پیدائش کے وقت خواب اور دیگر واقعات پیش کرتے ہوئے غوثی نے یہ نہیں لکھا کہ حضرت مسیح نے فرمایا کہ میں ایلچ پور میں پیدا ہوا تھا۔ بلکہ یہ جملہ کہ ''آپ کی زاد بوم ایلچ پور ہے۔'' غوثی نے اپنی طرف سے تحریر کیا ہے۔ جو کہ مغالطہ ہے۔

۹- حضرت مسیح الاولیاء حضرت مخدوم عباس کی وفات (۹۹۸ھ) پر ان کے جانشین مقرر ہوئے۔

۱۰- آپ کی دو منکوحہ تھیں۔ زوجہ اول سندھی تھیں، جن کا ثبوت بابا فتح محمد کی وصیت سے ہوتا ہے۔

۱۱- بابا فتح محمد کا اپنے بھتیجے شیخ حسن قاری پاٹائی کے پاس پاٹ میں آکر رہنا ثابت ہے۔

گلزار ابرار کا تنقیدی جائزہ ہمیں بتاتا ہے کہ اس تذکرہ کا نقش اول ۹۹۰ھ/۱۵۹۰ء میں تیار ہوا۔ پھر ۱۰۱۰ھ تک اس میں اصلاح و اضافہ ہوکر اس کی دوسری صورت سامنے آئی۔ لیکن زیادہ تر حصہ ۱۰۲۰ھ اور ۱۰۲۲ھ کے درمیان لکھا گیا۔ مولانا حسن غوثی کے گلزار ابرار کے لئے

راشد برہانپوری رقمطراز ہیں: ''مؤلف نے کشف الحقائق کے اخذ و اقتباس کے علاوہ آپ (یعنی مسیح الاولیا اور متعلقین) سے بالمشافہ ملاقاتوں اور خط و کتابت سے بھی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ یہ کتاب بھی آپ کے زمانۂ حیات ۱۰۲۲ھ میں تالیف ہوئی۔''

اگر راشد برہانپوری کا یہ بیان من وعن تسلیم کرلیا جائے تو پھر تحقیق وجستجو کرنے والے طلب علم کے خلوتخانہ قلب سے چند سوال پھوٹ کر زبان سے الفاظ کی شکل اختیار کرتے ہیں کہ: غوثی بالمشافہ ملاقاتوں میں کیا معلوم کرتے رہے تھے شیخ طاہر محدث اور مسیح الاولیا کا خانوادہ جو علم ادب تحقیق اور جستجو میں پورے ہندستان کے اندر منفرد مقام کا مالک تھا، ان سے براہ راست معلومات حاصل کرنے کے بعد بھی غوثی کبھی اندازوں پر مبنی سال اور کبھی ''یا'' کا لفظ استعمال کرکے ثابت کررہے ہیں کہ بالمشافہ ملاقات کے باوجود بھی وہ شیخ عیسیٰ اور ان کے خانوادہ کے ذاتی حالات سطحی طور پر جانتے تھے۔ جیسا کہ ان کا اندازہ ہے کہ:

۱- شیخ طاہر قصبہ پاتری میں دسویں صدی کی دوسری دہائی کے کسی سال میں پیدا ہوئے۔
۲- اور آپ کی وفات کے لئے بھی کبھی ۱۰۰۳ھ اور کبھی ۱۰۰۴ھ لکھ رہے ہیں۔
۳- شیخ قاسم جیسی شخصیت کا مدفن اور مقام وفات تک کا ذکر نہیں۔
۴- حضرت مسیح الاولیا کی ولادت کے لئے بھی ۹۶۲ یا ۹۶۳ لکھ دیا۔

راشد برہانپوری کا یہ اصرار کہ غوثی نے کشف الحقائق سے اقتباس اخذ کئے ہیں، تحقیق کے دائرہ میں نہیں آتا جیسا کہ بیان ہوچکا کہ گلزار ابرار کی تکمیل کا سال ۱۰۲۲ھ لکھا جاتا ہے۔ جبکہ اسماعیل فرحی کے لئے بتایا گیا ہے کہ آپ نے ۱۰۶۱ھ میں اپنی مختصر سی تحریر مکمل کی۔ علاوہ ازیں غوثی نے کہیں فرحی کا ذکر بھی نہیں کیا۔

ملا حسن غوثی کے اپنے ہمعصر اشخاص کے متعلق غیر تحقیقانہ رویہ کی شکایت خود راشد برہانپوری نے اس کتاب میں ان الفاظ میں کی ہے:

> ''ملا غوثی نے اس عہد کے بادشاہ کو ہر جگہ ''علی عادل شاہ'' لکھا ہے یہ ان کا سہو نظر ہے، اس بادشاہ کا نام راجے علی خان ہے جو ۹۸۴ء ''عادل شاہ'' کا لقب اختیار کرکے خاندیس کے دارالسلطنت برہانپور میں تخت نشین ہوا۔ اور اس عرفیت سے متعارف رہا۔ علی عادل شاہ بیجاپور کا بادشاہ تھا، جو فاروقی نہیں تھا۔''
>
> غوثی کے برھانپور آنے اور حضرت مسیح الاولیا سے بالمشافہ ملاقاتوں کے باوجود ان کے خلیفہ تاج العاشقین کو حضرت شیخ لشکر محمد عارف کا خلیفہ لکھ دیا ہے۔ اس قسم کے مغالطے اور غلط اندازوں کا سبب تحقیقی معیار کا سطحی ہونا ہے۔ کوئی شخص

اگر کسی سے چند ملاقاتیں کر لے تو ضروری نہیں کہ وہ دوسرے کے متعلق ٹھیک ٹھیک اور مکمل جانکاری حاصل کر چکا ہو۔

حضرت مسیح الاولیا کی چند تصانیف کے نام گلزار ابرار میں دیئے گئے ہیں، ان کی مکمل فہرست دینے کا غوثی شرف حاصل نہ کرسکا۔ حتّٰی کہ آپ کی اوائلی زمانہ مریدی کی ایک تصنیف کا ذکر راشد برہانپوری اس افسوس کے ساتھ کررہے ہیں کہ غوثی گلزار ابرار میں اس کے تعارف سے محروم رہا۔ وہ مسیح الاولیاء کی تصانیف کے ذکر میں لکھتے ہیں:

''ایک رسالہ وحدت وجود جو حضرت شیخ عبداللہ بلیانیؒ نے حدیث نبوی من عرف نفسہ فقد عرف ربہ کی شرح میں عربی زبان میں تالیف فرمایا تھا۔ اس کی فارسی شرح مسیح الاولیاء نے اپنے مرشد کے ایما پر لکھی اور غالباً یہ آپ کی اولین تالیف ہے۔ یعنی حضرت شیخ لشکر عارف باللہ ۹۹۳ھ کے زمانہ حیات میں واقع ہوئی ہے۔''

اس کے علاوہ بھی غوثی حضرت مسیح الاولیاء اور ان کے متعلقین سے وابستہ اہم معلومات دینے سے قاصر رہا ہے۔ شیخ یوسف جیسی بلند و بالا شخصیت کا احوال شیخ طاہر کی اولاد کا ذکر اور شیخ عبدالستار کی زاد بوم بتانے کے علاوہ شیخ عیسیٰ کی دیگر اولاد و امجاد کے نام تک نہیں دیئے چاہے وہ برہانپور میں مقیم تھے یا پاٹ سندھ میں۔

گلزار ابرار اور کشف الحقائق کے علاوہ ہندستان کے دیگر کتب میں بھی اس قسم کی غلطیوں کا ارتکاب پڑھنے کو ملتا ہے۔ حیدرآباد دکن کے دائرۃ المعارف العثمانیہ کے شایع کردہ ایک عربی تذکرہ ''نزہۃ الخواطر'' مطبوعہ ۱۳۷۸ھ/ ۱۹۵۵ء میں ''الشیخ عیسیٰ بن قاسم السندی'' کے باب میں ان کی اولاد (ابناؤہ) کا ذکر کرتے ہوئے "اخذ عنہ ابناؤہ عبدالستار وفتح محمد و برھان الدین البرھانپوری واسماعیل بن محمود الشطاری السندی و خلق کثیر" کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

کشف الحقائق کے مصنف اسماعیل فرحی اور خلیفہ و مرید شیخ برہان الدین راز الٰہی شیخ عیسیٰ کے فرزندوں کے ساتھ دکھائے گئے ہیں۔ جبکہ دور دراز علاقہ پاٹ میں موجودہ فرزند شیخ شہر اللہ اور خود برہانپور میں موجود دیگر فرزندان ان کی نظروں سے اوجھل ہوگئے۔

اردو جامع انسائکلوپیڈیا جس کے مترجمین و مرتبین میں پیر حسام الدین راشدی کا نام بھی آتا ہے۔ مطبع غلام علی پرنٹرز لاہور بہ اشتراک، موسسہ مطبوعات فرینکلین نیویارک۔ کے جلد دوم کے ایک ہی صفحہ پر عیسیٰ جنداللہ اور عیسیٰ برہانپوری دو مختلف شخصیات دکھا کر ان کا احوال الگ کالم میں اس طرح دیا ہے:

عیسیٰ جنداللہ حضرت شیخ (۹۶۲ھ-۱۰۳۱ھ): سندھ کے ممتاز صوفی بزرگ نو برس کی عمر میں قرآن پاک حفظ کیا۔ چچا شیخ طاہر محدث سے فقہ، حدیث، تجوید اور دیگر فنون میں تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں شیخ یوسف کے درس میں شامل ہوئے۔ پھر برہان پور چلے گئے اور حکیم عثمان بوبکانی کے درس میں شرکت کی اور معرفت و عرفان کی منازل طے کیں۔ اور مرشد کی تلاش شروع کردی۔ بالآخر شیخ لشکر محمد عارف کی ملاقات سے انہوں نے یہ محسوس کیا کہ انہیں جس مرد کامل کی تلاش تھی، وہ شیخ لشکر محمد عارف ہی ہیں۔ چنانچہ دو ملاقاتوں ہی میں مرشد کامل شیخ لشکر محمد عارف کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ مرشد کے ارشاد پر دریائے تاپتی کے کنارے ایک چلہ کھینچا۔ سماع سے رغبت تھی۔ لیکن منکرین سماع کو برا بھی نہ کہتے۔ ایک عرصہ درس و تدریس میں مصروف رہے۔ فارسی اور عربی میں متعدد کتب تصنیف کیں، جو علمی دنیا میں اہم مقام رکھتی ہیں۔ روضۃ الحسنیٰ، شرح اسماء الٰہی، عین المعانی، انوار الاسرار (تفسیر)، رسالہ حواس پنجگانہ، شرح قصیدہ بردہ، حاشیہ بر اشارہ عزیبہ، کتاب انسان کامل، رسالہ قبلۃ المذاہب، اربع معہ اشارات، اہل تصوف رسالہ غفور اہم تصانیف ہیں۔ اپنے حجرہ عبادت میں مدفون ہیں۔ خان خانان عبدالرحیم نے مزار پر گنبد تعمیر کرایا۔

عیسیٰ برہانپوری شیخ (۱۵۵۴ء-۱۶۲۱ء): قادریہ و شطاریہ سلسلے کے مشہور صوفیہ میں سے تھے۔ ان کے اجداد تعلقہ سیوہن (سندھ) کے ایک گاؤں پاٹ کے رہنے والے تھے۔ شیخ کے والد شیخ قاسم ۱۵۵۴ء میں سندھ میں بدامنی کی وجہ سے ترک وطن کرکے ایلچ پور (برار) میں مقیم ہوئے، وہیں شیخ عیسیٰ پیدا ہوئے اور انہوں نے اپنے چچا اور دوسرے اساتذہ سے علوم رسمیہ کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۵۷۴ء میں برار کا نظم و نسق خراب ہونے کی وجہ سے شیخ عیسیٰ اور ان کا خاندان برہان پور میں منتقل ہوگیا۔ اس شہر میں انہوں نے شیخ محمد عارف شطاری سے بیعت کرکے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ فارسی اور عربی میں ان کی تصانیف کی تعداد تیرہ ہے۔ شیخ نے برہانپور میں وفات پائی۔ نواب عبدالرحیم خان خانان نے ان کی مزار پر گنبد تعمیر کروایا۔

اس کے برعکس سندھ کے علمی ذرائع اور تاریخ، نام کے ساتھ لفظ سندھی لکھ کر اس امر پر متفق ہیں کہ شیخ عیسیٰ جنداللہ کا زاد بوم پاٹ ہے۔ اور ان کے فرزند شیخ شہر اللہ ہیں۔ مغل بادشاہ اورنگزیب عالمگیر نے ان کی اولاد میں سے مخدوم عبدالواحد کبیر پاٹائی صدیقی کو شیخ عیسیٰ جنداللہ کی اولاد تسلیم کرتے ہوئے شاہی فرمان جاری کیا۔ اس فرمان کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر گربخشانی نے کیا جو شایع شدہ ہے۔

پاٹ اور سہون کے خانوادہ صدیقی کا شیخ عیسیٰ جنداللہ کی اولاد سے ہونا ایک اور فرمان شاہی/ حکمنامہ سے بھی ثابت ہے۔ یہ حکم نامہ شاہجہان بادشاہ کا جاری کردہ ہے۔

ان حقائق سے ثابت ہوتا ہے کہ نہ صرف شیخ قاسم کی آخری آرام گاہ پاٹ میں ہے، بلکہ شیخ عیسیٰ ان کے فرزند شیخ عبدالستار و شیخ شہر اللہ اور شیخ عثمان کی زاد بوم پاٹ ہی میں ہے۔

حضرت مسیح الاولیا کے دو حرم تھے، جیسا کہ راشد برہانپوری بابا فتح محمد کے بیان میں فرماتے ہیں:

> ''مذکورہ فرزندوں کو ان (اپنی دوسری بیوی) کے ساتھ مہربانی کرنے کی ترغیب میں خود اپنی مثال دی ہے کہ جس طرح میں اپنی مادر عارضی (سوتیلی ماں) سے حسن سلوک کرتا رہا ہوں۔ تم لوگ بھی کروگے تو میری خوشنودی، خدا اور رسول ﷺ کی رضامندی کا باعث بنو گے۔''

آپ کی والدہ حقیقی کا اسم مبارک بی بی خدیجہ تھا، جیسا کہ عرس مبارک کی داخلہ میں یہ یاداشت موجود ہے۔ حضرت بی بی صاحبہ والدہ بابا فتح محمد شاید وہی شخصیت ہیں جن کے متعلق ہندستانی تذکرہ نگار یہ واقعہ بیان کرتے ہیں جو برہانپور منتقل ہونے کے فوراً بعد پیش آیا۔ گلزار ابرار میں حضرت مسیح الاولیاء کی زبانی لکھا ہے:

> ''قصہ کوتاہ میں نے برہانپور کی بازگشت کی یہاں آکر ایک حسین مظہر کے حسن پر دل مائل ہوا اور محویت کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ کتاب پڑھنے کے وقت صحیفوں کے حروف اور خطوط سے نام محبوب کے نقش کے سوا کچھ نظر میں یا اندیشہ میں نہیں آتا تھا اور نماز کے محراب میں محبوب کی صورت نے صنم ہونے کی شان اختیار کی، بلکہ ادراکات اور حواس اپنے مدرکات سے بیکار ہوکر محبوب کے سوا کچھ معلوم نہیں کرسکتے تھے۔ قوت ذائقہ پانی کو دودھ سے جدا نہیں کرسکتی تھی۔ اور کان نغمہ کو نوحہ سے علحدہ نہیں پہنچانتے تھے۔ میرے سودا کی کسی قدر کیفیت استادی عم مکرم کو معلوم ہوئی اور میں نے اس بات کی از روئے شریعت ناروا جانا۔ لہٰذا شیخ لشکر محمد عارف شطاری قدس سرہ کی خدمت میں حاضر ہوکر اصلیت گمراہی بیان کی......''

راشد برہانپوری خود بھی حضرت مسیح الاولیاء کے عقد ثانی کے قائل تھے۔ آپ بابا فتح محمد کے ذکر میں مفتاح الصلوٰۃ کی تفصیل دیتے ہوئے حرفی اشارات کا تعارف ان الفاظ میں کیا ہے:

''فقہ میں منجملہ دیگر کتب کے مفتاح الصلوٰۃ کو ہر زمانہ میں قبول عام رہا ہے۔ یہ کتاب فارسی زبان میں نماز کے فرائض واجبات اور سنن کی تفصیلات پر مبنی ہے۔ کسی سندھی بزرگ کے حرفی اشارات میں تین شعر مشہور تھے اور اس قدر مشہور تھے کہ تعلیم یافتہ گھرانوں میں مستورات کو بھی از بر تھے اور وہ انہیں اولاد کو صغر سنی ہی میں یاد کرادیا کرتی تھیں۔ خود حضرت شیخ فتح محمد نے بھی یہ اپنی والدہ محترمہ سے سیکھے تھے۔ جیسا کہ مفتاح میں مذکور ہے۔''

یقیناً سندھی بزرگ کے مرفی اشارات جو سندھ کی مستورات میں مشہور تھے۔ بابا فتح محمد نے اپنی سندھی والدہ سے سیکھے تھے۔ جو حضرت مسیح الاولیاء کی منکوحہ اول تھیں۔ آپ سندھ سے برہانپور تشریف لائیں تھیں۔ جن کے لئے مقامی روایات و قلمی نسخوں میں درج ہے کہ وہ حضرت مخدوم عباس ہنگورجائی کی بیٹی تھیں۔ جس بزرگ کی وفات پر غوثی نے لکھا ہے کہ: ''اب با استحقاق جانشین اس مسجد میں اور حال کے مدرسہ میں مسیح القلوب ہیں۔''

حضرت مسیح الاولیاء کی اولاد پہلے اور دوسرے عقد سے کچھ اس طرح ٹھہرتی ہے:

(الف) منکوحہ اول سے جو سندھ سے تھیں	(ب) منکوحہ ثانی جو برہانپور سے تھیں
۱- شیخ عبدالستار	۱- شیخ عبدالرحمٰن عرف بابا فتح محمد
۲- شیخ شہراللہ	۲- شیخ طٰہٰ
۳- شیخ عثمان	۳- شیخ ہاشم
۴- بی بی امۃ الرحمٰن	۴- فاطمہ بی بی

اوپر بیان کئے گئے حالات و واقعات کا جائزہ لینے کے بعد اہل سندھ کا یہ دعویٰ برحق اور ہر طرح سے درست معلوم ہوتا ہے کہ (۱) شیخ قاسم کی وفات پاٹ میں ہوئی۔ (۲) شیخ عیسیٰ، شیخ عبدالستار، شیخ شہراللہ اور شیخ عثمان کی زاد بوم پاٹ شریف ہی ہے۔ ہاں البتہ شیخ عیسیٰ اپنے عم مکرم شیخ طاہر کے پاس تحصیل علم کے لئے ایرج پور آ کر رہے۔ آپ کا طالب علمی کے زمانہ میں شیخ طاہر کے پاس رہنا سوانح نگاروں کے لئے مغالطے کا سبب بنا کہ آپ کی زاد بوم ہی ایرج پور سمجھ بیٹھے۔ اس عرصہ کے دوران آپ کا اپنے وطن مالوف آنا جانا بدستور قائم رہا۔ انہی ایام میں آپ کی پہلی شادی ہوئی۔ کھاتے پیتے مذہبی گھرانوں میں دس بارہ سال میں شادی ہونا کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ پیر حسام الدین راشدی نے ''تذکرہ مشاہیر سندھ'' کے

حواشیہ میں جو شجرہ حضرت مسیح الاولیا دیا ہے اور مختلف پیڑھیوں کے سن پیدائش اور وفات مقرر کیئے ہیں، ان سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ علم وعرفان کی جستجو اور سفر پھر دور دراز علاقوں میں کئی کئی سال کی اقامت کی وجہ سے حضرت مسیح نے اپنے فرزند شیخ شہر اللہ کی بھی نو عمری میں شادی کروادی۔ یہ نیک فرزند پسماندگان میں حضرت مخدوم حسن قاری چھوڑ کر عالم جوانی میں ہی وفات پاگئے۔ ان کی پشت سے حضرت مسیح الاولیاء کے صحیح صحیح جانشین اجل علماء، شاعر، ادیب، مفتی، قاضی، صوفی اور موجودہ دور میں بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد پیدا ہوتے رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے پاٹ کو ہر زمانہ میں لازوال علمی شہرت حاصل رہی۔ موجودہ زمانہ سے لیکر شیخ عیسیٰ جنداللہ تک اور ان سے اوپر کا شجرہ ہر دور میں ہمعصر تحریروں، ان کے حواشیوں، شاہی فرمانوں اور گزیٹیئرس سے تصدیق ہوتا چلا آیا ہے۔

حضرت مسیح الاولیا کی نو عمری میں عقد اول کی دلیل آپ کی وفات کے چند سال بعد شیخ عبدالستار کا طبعی عمر کو پہنچ کر وفات پانا ہے۔ اندازہ ہے کہ شیخ عبدالستار اور اس کے بعد شیخ شہر اللہ رمضان کی پیدائش کے وقت آپ کی عمر ۲۰ سال سے زائد نہ تھی۔

گذشتہ اوراق میں حضرت مسیح الاولیاء کی عقد اول کے دلیل میں بابا فتح محمد کے وصیت نامہ اور مفتاح الصلوٰۃ میں دیئے گئے حرفی اشارات کے ضمن میں سندھی والدہ سے سیکھے گئے اشعار کا ذکر کیا گیا۔ لیکن آپ کی ایک اور تحریر بھی اس ضمن میں روشن دلیل کے طور پر پیش کی جاتی ہے۔ آپ جب پاٹ شریف تشریف لائے تو کئی کتابیں معدودہ بہ طریق ہبہ اپنے بھتیجے مخدوم حسن قاری ابن شہر اللہ کو لکھ کر عنایت کیں۔ شرح المواقف کے آخری صفحے پر آپ کی تحریر غور طلب ہے۔ جو المکتوب الحبیب قلمی میں درج ہے:

> ''شجر مبارک به مواهر علما و امرا هندستان شرح آنکه هذه شجرة اصلها ثابت وفرعها فی السماء وکتبتها مطابق لاصلها ما ثبت بمواهير المتدينين وسلمتها لابن اخی الشيخ محمد حسن القاری ابقاء الله تعالیٰ وهو ابن الشيخ رمضان وهو ابن ابی قطب الاقطاب الشيخ عيسیٰ الباتائی البرهانپوری وهو ابن الشيخ قاسم نورالله مرقده وهو ابن الشيخ يوسف.''

شیخ شہر اللہ رمضان پاتائی کے ساتھ ''ابن ابی'' کے الفاظ استعمال کر کے آپ نے ان کے سوتیلے ہونے کی طرف اشارہ بھی کر دیا ہے۔

آپ نے سندھ کے مختلف شہروں، سیوستان، سن، پاٹ وغیرہ میں سایہ اصلی کے موسمی اختلاف کے عالم میں رخ بدلنے اور ان تبدیلیوں کے اندازے کا تعین کرنے، سایہ کے فرق کرکے نماز کے اوقات کا نقشہ بھی تیار کیا، جو اب تک کوٹڑی کبیر کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ کتاب مفتاح الصلوۃ آپ کی حیات طیبہ میں ہی سندھ کے مدارس میں پڑھائی جاتی رہی۔ آج بھی اس کے کئی قلمی نسخے مختلف خاندانوں کے قدیم کتب خانوں میں موجود ہیں۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی ہیں، جو براہ راست مصنف کے نسخے سے نقل کئے گئے ہیں۔

محترمہ رضیہ عباسی پرنسپال نے مضمون بہ عنوان: "Makhdoom Abdul Wahid Sewistan: and his Ancestors" تحریر کیا، جو شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدرآباد کے انگریزی رسالہ "Al-Hikma" شمارہ ۱۹۶۴ء میں شایع ہوا۔ اس میں محترمہ رقمطراز ہیں:

> **"Baba Fath Allah alias Abdul Rahman was the Son of Masih-ul-Auliya. He was the father of Makhdoom Abdul Wahid al-kabir and greatgrand father of Makhdoom Abdul Wahid Sewestani. Hisname is Abdul Rahman and Kuniyah Abdul al- Mmjad but he was well known by the title of Fatah Muhammad So much So that his Kuniyah and name are unknown to many people. this name Baba Fatah Allah was given to him by his father on account of great love for him, So much So that he even wrote a book and gave it the title "Fatah Muhammad", Baba Fatah Muhammad was a great Scholar and Spiritual leader. He died in A.H.1080 at Madina and was buried in jannat-ul Baqi".**

محترمہ مضمون کے Footnote نمبر ۲۳ میں لکھتی ہیں:

> **" See the old Ms. Leaves in the Sindh University Library".**

ممکن ہے بابا فتح محمد کا سندھ میں عارضی قیام ان کے لئے ایک دلیل بنا ہو کہ مخدوم عبدالواحد کبیر پاٹائی عفی عنہ کو ان کا فرزند دکھایا گیا۔ مخدوم عبدالواحد کبیر خانوادہ صدیقی سیوستان (سہون) اور پاٹ والوں کے جد امجد ہیں۔ محترمہ کے بیان کے مطابق یہ خانوادہ حضرت شہر اللہ رمضان کی پشت سے نہیں بلکہ بابا فتح محمد کی نسل سے ہے۔

محترمہ عباسی تادم تحریر حیات ہیں۔ بندہ نے ان سے ایک ملاقات میں یہ اہم سوال کیا اور ان دستاویزات کے دیکھنے پر اصرار کیا، لیکن عمر رسیدہ محترمہ نے اپنے استاد علامہ ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ مرحوم کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ایک عرصہ ہوا یہ دستاویزات انہوں نے مجھے دکھائے تھے۔ یہ مضمون بھی میں نے انہی کی رہنمائی میں لکھا تھا۔ یہ غلط فہمی ممکن ہے اس لئے پیدا ہوئی ہو کہ حضرت مخدوم عبدالواحد کبیر کے والد کا نام بھی عبدالرحمٰن تھا اور بابا فتح محمد کا نام بھی عبدالرحمٰن ہی لکھا جاتا ہے۔
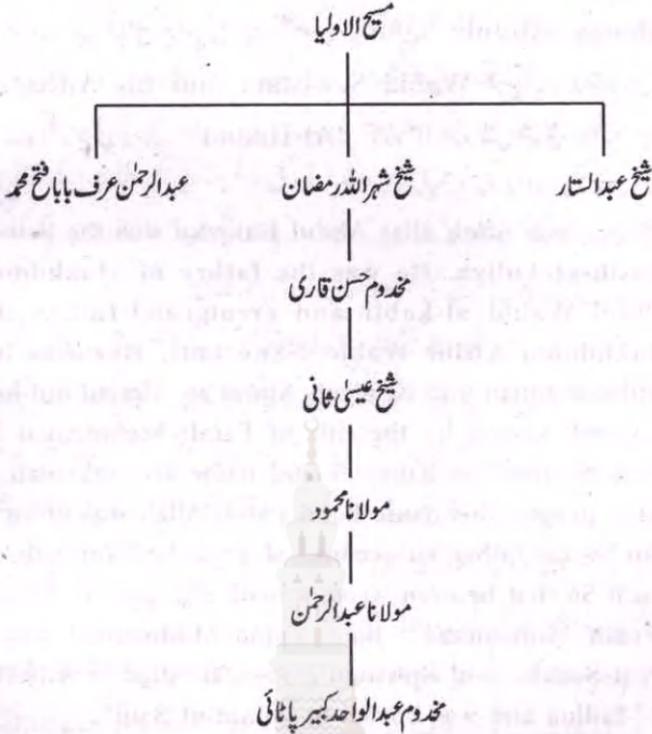
ایک ہی نام کا مختلف پشتوں میں دہرایا جانا اکثر شجرات میں مغالطے کا سبب بنتا ہے۔ صدیاں گذرنے کے بعد لوگ انہیں ایک شخصیت تصور کرتے ہوئے، بیچ کی پشتوں کو نظر انداز کردیتے ہیں۔ اس عمل سے کبھی تو کئی نام غائب ہوجاتے ہیں۔

تعلیق (۵): راشد برہانپوری نے حواشیہ میں یہ وضاحت فرمائی ہے کہ خود ان کا شجرہ نسب نرینہ حضرت مسیح الاولیاء سے نہیں ملتا۔ حضرت شیخ عیسیٰ جنداللہ کی چھٹی پشت جو بابا فتح محمد سے شروع ہوئی اور حضرت عبداللہ خان عرف نواب لعل صاحب قدس سرہ ۱۲۲۹ھ پر ختم ہوئی۔ چونکہ

انہیں فرزند کی اولاد نہ تھی، اس لئے ان کے داماد ڈھولن صاحب سجادہ مقرر ہوئے، ان کا فرزند ان کی حیات میں وفات پا گیا۔ اس لئے ان کے داماد حافظ عبدالکریم خانقاہ مسیح الاولیاء کے متولی مقرر ہوئے، جن کی پشت سے حکیم لاڈلے صاحب تھے۔ جن کے فرزند ارجمند غلام جنداللہ عرف حکیم غلام خواجہ صاحب ہیں۔

حافظ عبدالکریم صاحب سے لیکر تولیت کے فرائض مسیح الاولیاء کے خانوادہ سے خانوادہ شیخ محمد فضل اللہ نائب رسول اللہ کی طرف منتقل ہوگئے جیسا کہ راقم کتاب ہٰذا راشد برہانپوری نے خود تحریر فرمایا ہے۔ لیکن حیرت ہے ان کے فرزند سید عابد میر قادری نے ۸ جون ۱۹۸۸ء روزنامہ جنگ میں اپنے والد کو خانوادہ مسیح الاولیاء سے لکھا ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ ہر دو خانوادوں میں رشتہ داریاں ضرور رہی ہیں، جیسا کہ راشد برہانپوری نے اپنا رشتہ خانوادہ مسیح الاولیاء سے ننھیال اور سسرال کا دکھایا ہے۔ اس بات کی ہم تفصیل سے وضاحت کر چکے ہیں کہ حضرت مسیح الاولیاء کا شجرہ نسب حضرت شیخ شہاب الدین السہر وردی بغدادی سے ہوتا ہوا سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔

تعلیق (٦): اہل برھانپوری کے خطوط اور مراسلوں نے بندہ کو کئی ایسی تاریخی حقیقتوں سے واقف کیا ہے۔ جس سے جانکاری میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ خصوصاً موجودہ سجادہ نشین صاحب، محترمہ ہمشیرۂ ڈاکٹر فرید صاحب مرحوم اور مولوی معین صاحب کے فرزند ارجمند افتخار صاحب خصوصی شکریہ کے مستحق ہیں۔ جنھوں نے کتاب ھذا کی تعلیقات کے لئے بہت کچھ فراہم کیا۔ افتخار صاحب مراسلہ میں تحریر فرماتے ہیں:-

حضرت قبلہ گاھی

جناب مخدوم سلیم اللہ صدیقی

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

بعد خیریت طلبی و عافیت قلبی بندہ ناچیز نے حال ہی میں آپکا پتہ پناہ گاہ و آرام گاہ مسیح المنقبت بہ وسیلہ ورضائے ایزدی اچانک حاصل کیا۔ اس لئے جسارت قلم کر رہا ہوں۔ اور امید پر امید کرتا ہوں کہ آپ اولاد مسیح الاولیا سے رابطہ روحانی و روانی قلم جاری رہے گا۔ بلکہ آس و آرزو ہے کہ مرشدنا مسیح القلوب کے وطن مالوف پاتر شریف (پاٹ) کی خاک سے آنکھیں ٹھنڈی کرنے اور آپکی قدمبوسی کا شرف ضرور حاصل ہوگا انشاء اللہ آپ کی تحریر وتصویر اور تفصیل کا منتظر۔

غلام افتخار

☆☆

محترم افتخار صاحب کے دیگر تحریر کردہ خطوط بھیجے ہوئے مضامین سے فتح اسیر، حضرت مسیح الاولیا کو اکبر کے لشکر کے ساتھ روانگی، اور میر معصوم بکھری سندھی کے برھانپور اور اس کے نواح میں موجود کتبوں کے متعلق جو معلومات میسر ہوئی ہے اس کی بنیاد پر مندرجہ ذیل معلومات فراہم ہوئی ہے:-

فتح اسیر گڑھ کے وقت جامع مسجد برھانپور میں نصب کتبہ

جامع مسجد برھانپور مین کئی ایک کتبے نصب ہیں۔ جس میں سے ایک کتبہ مغلیہ دور کا ہے۔ جو جنوبی مینار کے زیرین حصہ پر ہے۔ اس کی زبان فارسی اور خط نستعلیق ہے۔

فارسی عبارت

تاریخ الٰہی عبارت است از زمان جلوس حضرت شہنشاہ ظل اللہ اکبر، بادشاہ شاہ اکبر کہ ز تائید جوان بخت جویش قلعہ اسیر کشاد گشت آباد اسیر ازاں نامی ☆ سنہ بیش گفت الہ آباد

بتاریخ ۲۱ فرور دین ماہ الٰہی سنہ ۴۵ موافق رمضان سنہ ۱۰۰۹ حضرت شہنشاہ فلک بارگاہ ظل الہ برھانپورا۔

مقر رایات ظفر آیات ساختند و بہادر خان آمدہ بپا بوس مشرف شدوا ورا باتباع جان بخشی کروند وقلعہ اسیر فتح شد۔

شاہ غازی جلال دین اکبر	آن بتائید بخت قلعہ کشا
کرو فتح اسیر ازان نامی	گفت بگرفت قلعہ املا

قائلہ کاتبہ محمد معصوم المتخلص بہ نامی ابن سید صفائی الترمذی والبکری مسکناً و مدفناً۔

والمنتسب اما الی سید قلندر ابن بابا حسن ابدال اصلاً السبز واری مولداً والقندھاری موطناً ومرقداً

بتاریخ دواز دہم اردی بہشت سنہ ۴۶ موافق ۲۶ شوال سنہ ۱۰۰۹ بندگان حضرت عازم لاہور شدند

فتح خاندیس و دکن چون کرد شاہ	عازم ہندستان فی الفور شد
یک عدو نامی فزود آں گاہ گفت	شاہ والا عازم لاہور شد

ترجمہ

تاریخ الٰہی سے مراد حضرت شہنشاہ، بزرگ ترین خدا کے سایہ، بادشاہ شاہ اکبر کا زمانہ، جلوس مراد ہے جنھوں نے اپنی جوان قسمت کی حمایت سے قلعہ اسیر فتح کیا (شعر) اسیر آباد ہو گیا اس لئے نامی نے ایک عدد کا اضافہ کرکے اس کا تاریخی مادہ الہ آباد کہا۔

بتاریخ ۲۱ ماہ فروردین سنہ ۴۵ الٰہی مطابق (۲۴) رمضان سنہ ۱۰۰۹ھ حضرت شاہ فلک بارگاہ سایہ خدا نے برھانپور کو اپنے ظفر نشان جھنڈوں کے مستقر بنایا (برھانپور کا بادشاہ) بہادر خان آکر

قدمبوسی سے مشرف ہوا۔ اس کی اور اس کے ماتحتوں کی جان بخشی کی گئی اور قلعہ اسیر فتح ہو گیا۔

شاہ غازی جلال الدین اکبر نے قلعہ فتح کرنے والی اپنی قسمت کے زور سے اسیر کو فتح کرلیا۔ اس لئے نامی نے (اس کا تاریخی مادہ) بگرفت قلعہ اعلیٰ (نہایت بلند قلعہ فتح کیا) کہا۔

اس کتبہ کا قائل و کاتب محمد معصوم المتخلص بہ نامی سید صفائی کا فرزند ہے جو دراصل شہر ترمذ کے باشندے تھے اور جنہوں نے بکھر (سندھ) میں سکونت اختیار کر لی تھی اور وہیں وہ دفن بھی ہوئے۔

اور والدہ کی طرف سے اس کا نسب سید شیر قلندر ابن بابا حسن ابدال سے ہے۔ جن کا مولد سبزدار اور وطن قندھار تھا اور اسی قندھار میں ان کا مزار ہے۔

بتاریخ ۱۲ اروی بہشت سنہ ۴۶ (الٰہی) مطابق ۲۶ شوال ۱۰۰۹ھ ہجری بادشاہ سلامت نے لاہور کا قصد کیا۔

(قطعہ) جب بادشاہ نے خاندیس ودکن کو فتح کیا تو فوراً ہندستان کا قصد کیا۔ نامی نے ایک عدد کا اضافہ کر کے (تاریخی مادہ) شاہ والا عازم ا لاہور شد (شاہ والا عازم لاہور ہوئے) کہا۔

کتبہ پر مزید معلومات:

ہمیں اس کتبہ سے تاریخی مادے ملتے ہیں جس سے ہم واقعات کے ساتھ ساتھ زمانے کا بھی اندازہ کر سکتے ہیں۔ "الہ آباد"، "بگرفت قلعہ اعلا" "شاہ والا عازم لاہور شد" پہلے دو مادے اسیر کو ظاہر کر رہے ہیں جبکہ آخر الذکر اکبر کی تاریخ مراجعت بتا رہا ہے۔

محمد معصوم بکھری نے "الہ آباد" سے فتح اسیر کی تاریخ اکبر کے سنہ جلوس میں نکالی ہے، اسیر گڑھ سنہ ۴۵ جلوس میں فتح ہوا تھا۔ اور الہ آباد کے عدد ۴۴ ہوتے ہیں اس لئے اس میں ایک عدد کا اضافہ کر کے ۴۴ کو ۴۵ بنا دیا اور "سنہ بیش گفت" کے الفاظ سے اس کی وضاحت بھی کر دی۔

سوال اپنی جگہ معقول ہے کہ بکھری نے فتح اسیر کے مادہ تاریخ کے لئے "الہ آباد" کے الفاظ کیوں تحریر کئے جبکہ اس میں ایک عدد کم بھی ہے۔ اور ان الفاظ سے فتح اسیر پر دلالت کرنے کے بجائے "الہ آباد" شہر سے کوئی وابستگی کی غلط فہمی میں مبتلا کرتے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ ان الفاظ کا استعمال محض شہنشاہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کیا گیا۔ کیونکہ اکبر اپنے آپ کو شان الٰہی کا مظہر سمجھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس سے تعلق رکھنے والی کئی ایک اشیا کا جزو خاص لفظ الٰہی تھا۔ اس کا جاری کردہ گز گز الٰہی، سنہ سنہ الٰہی، دین الٰہی وغیرہ وغیرہ۔ عہد کبری کے امراء اپنے شہنشاہ میں شان الوہیت کا اعتراف کر کے اس کی عظمت کا اظہار کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ جب اسیر گڑھ فتح ہوا تو معصوم بکھری کے بقول اکبر شہنشاہ کے ذریعے آباد ہو گیا۔

اور اس نے الٰہ آباد کو اکبر آباد کا مرادف سمجھتے ہوئے فتح اسیر کی تاریخ نکالی حالانکہ اس میں ایک عدد کی کمی بھی تھی۔

کتبہ کا دوسرا اہم مادہ جس سے تاریخی بادہ فتح اسیر نکلتا ہے وہ ہے بگرفت قلعہ اعلا۔ جس سے ۱۰۰۹ھ برآمد ہوتا ہے۔ اس مادہ میں قلعہ اسیر کو نہایت ئی بلند ظاہر کیا ہے۔ یہ قلعہ بہت بلند تھا۔ ۸۶۶ھ میں جب مالوہ کا بادشاہ محمود خلجی جب اس قلعہ کی تسخیر کے ارادہ سے آیا تو محض اس کی بلندی دیکھ کر دلبر داشتہ ہوا اور واپس لوٹ گیا۔ معصوم بکھری بھی قلعہ اسیر کے نہایت بلند اور ناقابل تسخیر ہونے کا اعتراف اپنے اس کتبہ کے آغاز میں کیا ہے۔ جو اسیر گڑھ کی اس طویل و بلند چٹاں پر کندہ ہے۔ جس کی عبارت یہ ہے:

(۱) قلعہ اسیر کے یا کرہ اسیر ہمسر است واز زمان بناتا امروز دست

(۲) تصرف ازان کوتاہ بود، بتاریخ ۴۵ھ موافق ۱۰۰۹ سنہ بردست

(۳) شہنشاہ ظل اللہ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ مفتوح شد

(۴) کرداز تائید لطف ایز دی فتح اسیر

شاہ ہفت عالمگیر اکبر بادشاہ

(۵) نامیا داد الٰہی دادش این فتح عظیم

سال تاریخ الٰہی خواہ از داد اللہ

(۶) قائلہ کاتبہ محمد معصوم بکھری

اس کتبہ مین بھی قلعہ اسیر کی بلندی کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اس کتبہ کا تسیرا تاریخی مادہ ''شاہ والا عازم لاہور شد'' سے شہر برھانپور سے اکبر کی روانگی کا سال معلوم ہوتا ہے۔ واضع رہے کہ مذکورہ الفاظ کے عدد سے ۱۰۰۸ سنہ ثابت ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بکھری نے ''یک عدد نامی فزوذ'' کے الفاظ سے ایک عدد کے اضافہ کی بات کر کے ۱۰۰۸ کو ۱۰۰۹ بنا دیا۔ اس کتبہ کے جس قلعے میں اکبر کی مزاجعت کا ذکر ہے وہ قطعہ معصوم بکھری ''نامی'' کے معمولی فرق کا ساتھ تین مختلف مقامات پر کندہ کیا ہے۔ اسیر گڑھ ہی کی اس چٹان پر جس پر نامی کا مذکورہ بالا کتبہ کندہ ہے، جامع مسجد برھانپور کے جنوبی بینار اور اجین کے قریب کالیادیہ گاؤن میں سیراندی کے کنارے کی ایک عبارت پر جامع مسجد برھانپور بینار پر کنندہ الفاظ یہ ہیں:

فتح خاندیس و دکن چون کردہ شاہ عازم ہندستان فی الفور شد

یک عدد نامی فزود آں گاہ گفت شاہ والا عازم لاہور شد

برہانپور کے کتبے میں ''فی الفور'' کے لفظ اپنے اندر بہت بڑی معنیٰ لیئے ہوئے ہیں۔ وہ کیا حالات تھے۔ کہ اس علاقہ کا فاتح یہاں سے فوری مراجعت کے لئے مجبور ہوا۔ ظاہر ہے کہ ظاہر بینوں کے لئے یہ واقعہ شہزادہ سلیم کی بغاوت تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اکبر کئی ماہ سے سینکڑوں میل دور اسیر گڑھ کی مہم میں الجھا ہوا ہے۔ اور شہزادہ دانیال بھی کوسوں دور احمد نگر کی مہم میں مصروف ہے چانچہ شمالی ہند کا میدان خالی سمجھتے ہوئے۔ جہانگیر نے شاہی منصبداروں کو معزول کرنا شروع کیا۔ اور دیگر اقدامات سے اپنی بادشاہت کا اعلان کرتا چلا گیا۔ اکبر کو جب برھانپور میں یہ بدخبر ملی تو وہ پریشانی کے عالم میں فوراً رولنہ ہوگیا اور وہ براہ راست آگرہ نہ جاکر لاہور گیا۔ تاکہ تصادم سے ہٹ کر حسن تدبیر سے اس مشکل کا حل نکالنے کتبہ کا لفظ ''فی الفور'' اس واقعہ کی غمازی کررہا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ فتح اسیر تکے تھوڑے ہی عرصہ بعد نہ خاندیس کی سلطنت پر فتح حاصل کرنے والا شہنشاہ اکبر رہا نہ ہی فاتح اسیر گڑھ ابو الفضل اس مہم کا سپہ سالار نہ شہزادہ دانیال جسے خاندیس کا صوبہ دار بنایا گیا۔ جہانگیر کے ایما سے نرسنگھ نے ۱۰۱۱ھ میں ابو الفضل کو قتل کردیا۔ اس کے پوتے دو سال بعد شہزادہ دانیال کی عبرتناک موت ہوئی۔ اکبر جو پہلے ہی اپنی والدہ کی رحلت، شہزادہ مراد اور ابوالفضل کی موت اور جہانگیر کی پے درپے بغاوت سے شکستہ دل تھا۔ دانیال کی موت کے چھ ماہ بعد بصد حسرت وفات پاگیا۔ معصوم بکھری کا ایک اور کتبہ برھانپور کے شاھی قربستان کے مشرقی روضہ کی مغربی دیوار پر کندہ ہے جس کی ساتویں اور آٹھویں سطر میں قلعہ اسیر و احمد نگر کی فتح کا ذکر ہے۔

ہمیں مسیح الاولیا کی اکبر کے لشکر کے ساتھ روانگی کے زمانے کا ٹھیک ٹھیک اندازہ تب ہوگا جب ہم اکبر کی آمد و مراجعت کے سالوں پر غور کریں گے۔

ابوالفضل نے اکبر کے ورود برہانپور کی تاریخ ۲۱ فرورویں ۴۵ الٰہی تحریر کی ہے۔ اور یہ بھی واضع کردیا ہے کہ ۴۵ الٰہی ۴ رمضان المبارک ۱۰۰۸ھ سے شروع ہوا تھا۔ چونکہ سنہ الٰہی کا آغاز یکم فرورویں سے ہوتا ہے۔ اس لئے ۲۱ فرورویں ۴۵ الٰہی ۲۴ رمضان ۱۰۰۸ھ کے مطابق ہے۔ مینار کے اس کتبہ میں ۲۱ فرورویں ۴۵ الٰہی تو موجود ہے۔ لیکن اسلامی تاریخ ''رمضان ۱۰۰۹ھ'' تحریر ہے یعنی رمضان مہینے کی تاریخ درج نہیں اور ہجری ۱۰۰۸ کے بجائے ۱۰۰۹ھ درج کردیا۔

شہنشاہ اکبر کا ۱۰۰۸ھ میں برھانپور آمد کا ثبوت اکبر نامہ کے علاوہ معصوم بکھری کے اس کتبہ سے بھی ملتا ہے جو کالیاویرہ میں سپراندی کے کناری کی اسی عمارت پر نصب ہے جہاں ان ہی کا ایک اور مذکورہ کتبہ موجود ہے۔

اس کتبہ کے الفاظ یہ ہیں۔

"بتاریخ ۴۴ سال الٰہی موافق ۱۰۰۸ھ کہ رایات ظفر آیات عازم تسخیر دکن بود اینجا عبور افتاد"

جامع مسجد برہانپور کے جنوبی مینار کے کتبہ سے پہلے ہی معلوم ہو چکا ہے کہ شہنشاہ اکبر ۲۱ فروردیں ۴۵ الٰہی میں وارد برہانپور ہوا۔ جامع مسجد اسیر گڑھ کے اس کتبہ سے بھی ثابت ہو گیا کہ وہ ۲۴ بہمن ۴۵ الٰہی میں مکمل قبضہ کے بعد قلعہ اسیر میں داخل ہوا تھا۔ فروردیں .... فصلی سنہ کا پہلا مہینہ ہے۔ اور بہمن گیارہواں مہینہ یہی وجہ ہے کہ ہم ان دونوں کتبوں کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسیر گڑھ پر گیارہ مہینے میں قبضہ ہوا۔ مزید یہ کہ جامع مسجد برہانپور کا جو ہجری ۱۰۰۹ تحریر ہے۔ وہ سہو قلم کا نتیجہ ہے۔ ہم تاریخی شواہد کی روشنی میں اکبر کی برہانپور آمد ۲۴ رمضان المبارک ۱۰۰۸ اور ۸ شعبان المعظم ۱۰۰۹ھ قلعہ پر قبضہ اور شوال ۱۰۰۹ھ کو لاہور روانگی کی تاریخ کہہ سکتے ہیں۔

شہنشاہ اکبر کی فتح اسیر گڑھ اور آمد کی داستان اپنے اندر کچھ اور حقائق بھی چھپائے ہوئے ہے:

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ انسان جو اشرف المخلوقات اور جسے خدا واحد نے اپنا خلیفہ ارشد بنا کر اس دنیا میں بھیجا وہ جب اپنے مقام و مرتبہ کو بھول کر حرص دنیا میں مبتلا ہو جاتا ہے تو جائز و ناجائز کی حدود تک کا پاس نہیں رکھتا۔ وہ نہ کسی کے احسان کا خیال کرتا ہے نہ رشتہ کا پاس۔

بہادر شاہ فاروقی کی حکومت اس اکبر نے چھینی، جس کی حمایت میں بہادر شاہ کے والد عادل شاہ فاروقی اس کے کئی سرداروں اور بے شمار سپاہیوں نے ۱۰۰۵ھ یں احمد نگر بیجاپور اور گولکنڈہ کی ساٹھ ہزار فوج سے لڑتے ہوئے اپنی جانیں قربان کر دیں تھیں۔ سب سے بڑی بات کہ بہادر شاہ خود اکبر اعظم کا عزیز بھی تھا اور فاتح اسیر گڑھ ابو الفضل کا بھی، جیسا کہ شہزادہ مراد کی بیوی بہادر شاہ کی بیٹی تھی اور بہادر شاہ کی بیوی ابو الفضل کی بہن۔

اس علاقہ کے بزرگاں دین میں عقیدہ رکھنے والے آج بھی یہ سمجھتے ہیں۔ کہ قلعہ کا کئی ماہ تک فتح نہ ہونا۔ فتح نہ ہونے کے بعد اس کی خوشی کا راس نہ آنا وہاں کے بزرگان کی وجہ سے تھا۔ جن کی دل آزاری کی گئی تھی۔ اکبر نے اسیر گڑھ فتح کیا تو برھانپور کے اکثر مشائخ پر فاروقی بادشاہ کی حمایت کا الزام لگا کر انہیں قید و بند کے مصائب میں مبتلا کر دیا۔ حضرت مسیح الاولیا شا عیسیٰ جند اللہ رحمتہ اللہ علیہ کو جو اپنے زمانہ کے غوث تھے دیگر بزرگان کے ساتھ آگرہ لے گئے۔ انہیں مسیح الاولیا کے مرید و خلیفہ ارشد حضرت عبداللہ سندھیؒ جو اپنے مرشد کے حسب الحکم گجرات جا کر خلق خدا کی ہدایت میں مصروف تھے۔ ایک عرصہ کے بعد اپنے پیر کی اجازت سے برہانپور آئے تھے۔ اکبر نے انہیں بھی شاہ برہانپور کی حمایت کا الزام لگا کر آگرہ لے جا کر نظر بند کر دیا۔

لیکن کچھ عرصہ کے بعد حضرت مسیح الاولیا کے فرزند شیخ عبدالستار کی سفارش پر اکبر نے انہیں رہا کر دیا۔ مگر پھر بھی برہانپور واپس آنے کی اجازت نہ ملی آخرکار وہ ۱۰۱۳ھ میں پنجاب میں راجپوتوں سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔

اکبر خود مسیح الاولیا کو ان کی شہرت کے پیش نظر بڑی عزت وتکریم کے ساتھ آگرہ لے گیا لیکن حضرت مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب مرحوم کا کہنا تھا کہ حضرت مسیح الاولیا کو اکبر سے ملانے میں ابوالفضل نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ کیونکہ ان کے جد حضرت یوسف سندھی کے مرید تھے۔

اکبر نے فاروقی خاندان کا خاتمہ کر کے اس مملکت کو سلطنت مغلیہ میں شامل کر لیا۔ اس شہر پر شاہی فوجوں نے ابوالفضل کی سپہ سالاری میں ۱۵۹۹/۱۰۰۸ھ ہی میں قبضہ کر لیا تھا۔ عبدالرحیم خان خاناں کو اس کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ جہاں وہ عرصہ دراز تک ٹھہرا۔

تعلیق (۷): سلسلہ شطاریہ کو سہروردیہ سلسلے کی بازگشت کہا جاتا ہے۔ اس کی وجوہات میں سے چند یہ ہیں:

اولاً: شریعت کی پابندی۔

ثانیاً: ورد وظائف کی پابندی۔

ثالثاً: شیخ عبداللہ، جنہوں نے سب سے پہلے اس سلسلہ کو ہندستان میں متعارف کروایا، حضرت شیخ الشیوخ عمر بن محمد شہاب الدین السہر وردی کی اولاد سے تھے۔ اس کے علاوہ ہندستان میں شطاریہ سلسلہ کے بہت بڑے بزرگ حضرت مسیح الاولیاء شیخ عیسیٰ جنداللہ بھی "خانوادہ سہروردیہ" کے ہی روشن چراغ تھے۔

چہارم: سماع کے سلسلے میں بھی سلسلہ سہروردیہ اور شطاریہ میں کوئی زیادہ اختلاف نہیں۔ حضرت مسیح الاولیاء نے اپنے جد امجد حضرت شیخ الشیوخ عمر بن محمد شہاب الدین السہر وردی کے عمل اور عوارف المعارف میں تحریر شدہ موقف کو ہر ممکن طرح ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے۔

شیخ الشیوخ شہاب الدین السہر وردی کی طرح حضرت مسیح الاولیاء کی حیات مبارکہ میں بھی سماع "عمل کثیر" کی صورت میں ظاہر نہیں ہوا تھا۔ سوانح نگار چند ایک سماع کے واقعات پیش کرنے سے زیادہ قاصر ہیں۔ سلسلہ سہرودیہ کی قائم کردہ حدود محفل سماع کا تجزیہ کرنے کے بعد ہی ہمیں مسیح الاولیا کی سماع کے متعلق حقیقت سمجھ میں آئے گی۔ بندہ نے سوانح شیخ الشیوخ لکھتے وقت سماع کا تاریخی اور شرعی جائزہ لیا تھا، جو من وعن یہاں پیش کیا جاتا ہے، انہی اصولوں کو سلسلہ شطاریہ اور حضرت شیخ عیسیٰ کے سماع سے متعلق رویہ پر قیاس کرنا چاہیے۔

سماع

ہر طبع سلیم فطرتاً صدائے دلکش کی طرف کھنچتی چلی جاتی ہے۔ ماں کی میٹھی آواز میں لوری ہر درد کی دوا بن جاتی ہے۔ الست بربکم سے لیکر سلام قولاً من رب رحیم تک کے سفر میں ہر نیک نفس، خوبصورت آواز سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ قدرت کے عطیہ کان کے ذریعے اسے ہر قسم کی اچھی یا بری آواز متاثر کرتی رہتی ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام جب تلاوت زبور لحن داؤدی میں فرماتے تھے تو آپ کی مجلس میں بعض سننے والے جان دینے پر مجبور ہوجاتے۔ سورٹھ راءِ ڈیاچ کے قصہ کو پڑھ لیجئے۔ میٹھی آواز کے پیچھے اپنی گردن کٹوادی۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکی کے وصال کا واقعہ زبان زد خاص و عام ہے۔ حضرت مسیح الاولیاء شیخ عیسیٰ جنداللہ پاٹائی برہانپوری نے تو فرمایا: ''السماع کالصلوٰۃ۔'' یہ تو عام تجربے کی بات ہے۔ کسی کے کچھ الفاظ سنے اور طبیعت باغ و بہار ہوگئی یا خون کھولنے لگا۔ الغرض ہر اچھی آواز انسان کو متاثر کرتی ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ قرآن کو اچھی آواز سے آراستہ کرو۔

اہل تصوف کے نزدیک محفل سماع اسے کہتے ہیں جب لذتِ نفسی سے مجرد اور خواہشاتِ شہوانی سے بے تعلق ہوکر ذوق خداوندی میں مجتمع ہوں۔ آداب کا لحاظ کرتے ہوئے از اول تا آخر توجہ قلب سے خالق حقیقی کے ساتھ قیام کرنے کے شوق سے اور نہ کہ کسی اور غرض سے اجتماع رکھیں۔ واضح رہے کہ اجتماعات رسم و رواج اور نمود و نمائش کو دنیائے تصوف سے کوئی واسطہ نہیں۔ جو سماع ان شرائط سے عاری ہے، وہ صوفیاء کے نزدیک سماع ہی نہیں۔ سلسلہ سہروردیہ اور چشتیہ میں ہمہ وقت خرقہ حاصل کرنے والے شیخ حمید الدین ناگوری (المتوفی ۶۴۱ھ/۱۲۴۳ء) کو جب سماع سننے کی پاداش میں سلطان التمش نے اپنی دربار میں طلب کیا تو علماء کے اس سوال پر کہ سماع جائز ہے یا نہیں؟ آپ نے فرمایا: ''اہل قال کے لئے ناجائز جبکہ اہل حال کے لئے جائز ہے۔''

غور کرنے کی بات ہے، یہ گانا بجانا نہیں کیونکہ راگ و سرود کے مسئلہ میں آیات و احادیث متعارض واقع ہوئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِیْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ تا اُولٰٓـئِکَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ﴾ یعنی ''بعض آدمی وہ ہیں جو بیہودہ بات خرید کرتے ہیں تاکہ خدا کے راستے سے گمراہ کریں بغیر علم کے اور اس کو مسخری بنائیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے رسوا کرنے والا عذاب ہوگا۔'' یہ آیت راگ کی حرمت میں وارد ہوئی ہے۔ حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: راگ دل میں نفاق پیدا کرتا ہے جس طرح پانی کھیتی کو اگاتا ہے۔ (شعب الایمان) ابو مالک اشعری کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری

امت میں ایسے گروہ ہوں گے جو شراب اور ریشمی لباس اور باجوں کو حلال سمجھیں گے۔

حضرت سید علی ہجویریؒ سماع کے قائل تھے، مگر اپنے مریدوں کو اس قسم کی مجلسوں سے دور رہنے کی تاکید فرماتے تھے آپ کے پیر و مرشد حضرت ابوالفضلؒ کا مشہور قول ہے، سماع ان لوگوں کا توشہ ہے جو ابھی درمیانی منزل میں ہوں مگر جو منزل رسیدہ ہوں ان کو سماع کی ضرورت نہیں۔

سماع صوفیاء اور علماء میں اختلافی مسئلہ رہا ہے لیکن حضرت شیخ الشیوخ نے اس کا مطلقا انکار نہیں کیا۔ فوائد الفواد کی اکتیسویں مجلس میں لکھا ہے: ''اس کے بعد شیخ شہاب الدین عمر سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر ہوا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ وہ سماع نہیں سنتے تھے۔ شیخ نجم الدین کبری رحمۃ اللہ علیہ ان کی شان میں فرمایا کرتے تھے کہ ہر ایک نعمت جو بشر کو عطا ہونی ممکن ہے، وہ حضرت شہاب الدین کو دی گئی مگر ایک نعمت ذوق سماع سے بے بہرہ رہے۔

اس کے بعد ذکر استغراق شیخ شہاب الدین عمر سہروردی کا ہوا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ ایک مرتبہ شیخ اوحد الدین کرمانی رحمۃ اللہ علیہ آپ کی ملاقات کو آئے۔ آپ نے اپنا مصلیٰ لپیٹ کر زیر زانون رکھ لیا مشائخ میں مصلیٰ لپیٹ کر زیر زانو رکھ لینا نہایت درجہ کی تعظیم ہے۔ الغرض جب رات ہوئی، شیخ اوحد الدین کرمانی نے سماع کی خواہش کی۔ آپ نے باوصف انکار قوالوں کو بلایا اور مجلس ترتیب دے کر ایک گوشہ میں گئے اور مصروف بیادِ الٰہی ہوئے، شیخ اوحد الدین کرمانی نے رات بھر سماع سنا اور آپ یاد الٰہی میں مستغرق تھے، جب صبح ہوئی، خادم خانقاہ نے عرض کی کہ رات بھر ان قوالوں نے گایا اور صوفیوں نے سنا ہے۔ ان کے واسطے نہاری ہونی چاہئے۔ شیخ شہاب الدین نے غایت استغراق سے فرمایا کہ رات کو سماع تھا؟ خادم نے عرض کیا بیشک سماع تھا۔ آپ نے فرمایا مجھے خبر نہیں۔ یہ فرما کر حضرت ذکر اللہ بالخیر فرمانے لگے اس کی حکایت سے غایت استغراق شہاب الدین رحمۃ اللہ علیہ کو قیاس کر لینا چاہئے کہ ان کو سماع کے شور و شغب کی مطلق خبر نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ واقف ہے کہ کس قدر مستغرق بحر شہود تھے۔''

سیر الاولیا میں اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد کچھ یوں اضافہ کیا گیا ہے: ''حضرت سلطان المشائخ (نظام الدین اولیاءؒ) نے فرمایا کہ ذرا شیخ شہاب الدین کے استغراق کی انتہا تو ملاحظہ ہو وہ حق میں یوں محو تھے کہ سماع کا پتہ ہی نہیں اور ہر بار جب راگ بند ہوتا تھا اور قرآن خوانی ہوتی تھی تو شیخ بھی قرآن پاک سنتے تھے۔ اور راگ کو اس شور شغب کے باوجود بھی نہیں سنتے تھے تو مطلب یہ ہوا کہ کس حد تک محویت کا عالم تھا۔

راقم الحروف نے (امیر خورد) اپنے نانا مولانا شمس الدین درمغانی سے سنا کہ شیخ اوحد الدین کرمانی شیخ شہاب الدین سے رخصت ہونا چاہتے تھے اس مجلس میں شیخ شہاب الدینؒ نے

اپنا سراویل شیخ اوحد الدین کرمانی کے سامنے رکھ دیا۔ شیخ نے اسے قبول کر لیا اسے درمیان سے چاک پیراہن کے اوپر پہن لیا، اور دونوں ہاتھ دونوں پاؤں کی جانب سے باہر نکال لیے اور شیخ شہاب الدین کے ہاتھوں کو بوسے دے کر کہا کہ یہ ہمارے شیخ کا ایک معمولی سا عمل ہے۔"

کچھ بزرگان دین جنہوں نے سماع سے رغبت نہیں رکھی، اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ وہ اس نعمت سے محروم رہے بلکہ ان بزرگان کے لئے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ شریعت کی خشوع قلب کے ساتھ پاسداری اور ذکر قلبی سے انہیں دربار خداوندی میں حضور قلب کی نعمت کچھ یوں حاصل ہوجاتی ہے کہ انہیں سماع کا سہارا لینے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ کتب تاریخ میں حضرت جنید بغدادیؒ کے سماع ترک کردینے کے کچھ ہی اسباب گنوائے گئے ہوں لیکن کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ترک سماع سے آپ حضوری قلب سے محروم قرب خداوندی سے دور اور روحانی درجات میں بلندی کے بجائے پستی کی طرف ہو چلے تھے؟

حضرت شیخ الشیوخ کے پاس شیخ اوحد الدین کرمانیؒ تشریف لائے اور سماع کی خواہش کی۔ شیخ الشیوخ نے مجلس سماع منعقد کروائی۔ خود ایک گوشہ میں گئے اور یادِ الٰہی میں اتنے مستغرق ہوئے کہ انہیں صبح کو یہ تک یاد نہ رہا کہ رات بھر محفل سماع قائم تھی۔ اگر سماع کے سہارے کے سوا ہی کیفیات حاصل ہوجائیں اور قرب خداوندی نصیب ہوجائے، ذکرِ قلبی سے اس پر وجد و مستی و استغراق کی کیفیات غالب ہونے لگیں تو ایسے دوست خدا کے لئے یہ کہنا ہرگز مناسب نہیں کہ وہ ذوقِ سماع کی نعمت سے محروم ہے۔ بلکہ یہ ناواقفیت ہے اس ہستی کے روحانی درجات سے جو بغیر سماع کے سہارے کے بلندی کی طرف پرواز کرتی چلی جارہی ہے۔ یہ دنیائے تصوف کا اعلیٰ مقام ہے جو الفاظ کا محتاج نہیں بلکہ کیفیات سے تعلق رکھنے والی حقیقت ہے۔ یہ درجہ اتنا اعلیٰ وارفع ہے کہ جہاں قلب پر بغیر کسی وجہ اور سہارے کے کیفیات طاری ہوجاتی ہیں۔ آپ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کی حیات بہترین نمونہ ہیں۔

حضرت شیخ الشیوخ فرماتے ہیں: "جب یہ صورتحال پیدا ہوجاتی ہے تو اس وقت نفس سماع سے اس طرح لطف اندوز ہوتا ہے جس طرح وہ مباح اور جائز لذتوں سے لذت یاب ہوتا ہے۔ اس وقت اسے یہ اختیار حاصل ہوجاتا ہے کہ خواہ وہ سماع کی طرف متوجہ ہو یا اس میں اضافہ کرے اس سے اثر قبول کرے یا اثر کو رد کردے...... کہتے ہیں کہ شیخ ابو محمد الراشی کا بالکل یہی حال اور یہی کیفیت تھی کہ وہ اپنے ساتھیوں کو سماع میں مشغول کرکے خود ایک گوشہ میں جاکر نماز میں مشغول ہوجاتے تھے۔ بایں ہمہ سماع کے یہ نغمات نمازی کی نماز کی طرح باطن میں سرایت کرجاتے ہیں اور جب نفس اس سے محظوظ ہوتا ہے (اس وقت مقام روح اس اُنس و محبت کی وجہ

سے اور بھی واضح اور صاف ہوجاتا ہے اور نفس روح سے دور رہتا ہے خواہ نفس اس صورتحال میں مطمئن ہی کیوں نہ ہو) لیکن وہ اپنی خلقت اور جبلت کے باعث روح سے اجنبی رہے گا۔ اس وقت نفس کی دوری کی وجہ سے روح کو طرح طرح کے فتوح حاصل ہوتے ہیں۔ پس اگر نماز کے وقت یہ نغمات (سماع) کانوں تک پہنچیں بھی تو یہ نمازی کی مناجات اور کلمات نماز کے معانی کی تفہیم میں کسی طرح حائل نہیں ہوسکتے، بلکہ مصلیٰ کی صلوٰۃ بغیر کسی مزاحمت یا خلل کے پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گی، جس کی وجہ صاف ظاہر ہے یعنی ایمان کی بدولت اس کے سینے کو کھول کر مزید وسیع کردیا گیا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے کہ وہ بڑا محسن ومنان ہے۔" (عوارف)

عوارف کے باب ۲۳ میں حضرت شیخ الشیوخ نے حضرت سہل تستریؒ کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

"آپ نے فرمایا کہ روحانی طاقت یہ ہے کہ شیخ پر جب کوئی وجد طاری ہوتو وہ اس کے ذریعے اس کیفیت وجد کو برداشت کرلے اور یہ عارضی جذبہ اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کرسکے۔"

ایک اور جگہ اسی باب میں حضرت شیخ الشیوخ فرماتے ہیں:

"وجد اس وارداتی کیفیت کا نام ہے، جو خداوند بزرگ و برتر کی طرف سے وارد ہوتی ہے، لیکن جس بندے کا مقصد خود ذات الٰہی ہے، وہ اس عطا کردہ واردات پر اکتفا اور قناعت نہیں کرسکتا اور جو شخص قربِ الٰہی کی منزل پر ہے اس شخص کو یہ واردات اپنی طرف مائل نہیں کرسکتی ہیں۔ (پس ایسا شخص وجد سے بے نیاز ہوتا ہے) اس لئے کہ یہ واردات خداوندی مجد و علا سے دوری اور بُعد کی مظہر ہیں۔ مقرب بندہ ان واردات سے اس لئے بے نیاز ہوتا ہے کہ جس کو قربِ الٰہی میسر آ گیا ہو اس کو سب کچھ حاصل ہوگیا۔ پس وہ ان واردات کی طرف متوجہ ہوکر کیا کرے؟" (عوارف)

عوارف کے ان اقتباسات سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ اللہ کے مقرب کچھ خاص بندوں کو سماع یا کسی اور سہارے کے بغیر وہ کیفیات اور مقام حاصل ہوجاتے ہیں جن سے عام لوگ واقف نہیں ہوتے اور یہ بہت بڑا قربِ خداوندی ہے۔

حیات طیبہؐ، سیرت صحابہؓ میں سماع سے متعلق چند واقعات ضرور موجود ہیں، جنہیں حجت کے طور پیش کیا جاتا ہے اور پیش کرنا بھی چاہئے۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ ان ہستیوں کی روحانی ترقی ان واقعات یا سماع کی محتاج نہیں تھی اور نہ ہی یہ واقعات ان کی حیات پر

محیط ہیں۔ ان حضرات نے سماع کو اپنا معمول اور عادت نہیں بنایا کہ اس کی وجہ سے عبادت ہی کو ترک کر دیا ہو۔

حضرت شیخ الشیوخ بھی سماع کے منکر نہیں تھے۔ آپ فرماتے ہیں:

''سماع کا مطلقاً انکار ممنوع ہے، کیونکہ بغیر کسی صداقت کے سماع کا انکار ان تین احوال سے خالی نہیں ہوگا: اول یہ کہ منکر سماع یا تو سنن و اخبار سے واقف نہیں ہے، یا وہ اپنے نیک کاموں پر مغرور ہے یا وہ ایسا مردہ دل اور بد ذوق ہے کہ اپنی مردہ دلی اور بد مذاقی کی وجہ سے اُس کا انکار کر رہا ہے۔'' (عوارف)

لیکن آپ سماع کو غلط رنگ دینے پر دکھ کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اب دلی رغبت کے حصول کے لئے یہ اجتماع منعقد نہیں ہوتا جیسا کہ مخلص درویشوں کا طریقہ تھا۔ بلکہ اب تو نفسانی خواہشات کی تحریک اور سیر تماشے کے لئے ایسے اجتماعات ہوتے ہیں جس کے نتیجے میں مریدوں کی روحانی ترقی منقطع ہوگئی ہے اور اب اس طریقے سے سوئے تضیع اوقات کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا اور مزید برآں یہ کہ اس سے لطف عبادت بھی گھٹ گیا ہے۔'' (عوارف)

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

''اب ایسے اجتماعات کا مقصد نفسانی خواہشات سے محظوظ اور عیش و عشرت سے لطف اندوز ہونے کے سوا اور کچھ نہیں۔ بس ایسا اجتماع اور ایسی محفل سماع ارباب صدق و صفا کی نظر میں ناجائز ہے۔ ان حضرات کی نظر میں سماع صرف خدا رسیدہ بزرگ کے لئے جائز ہے۔ مبتدی مرید کے لئے یہ مباح و جائز نہیں ہے۔ حضرت جنید فرماتے ہیں کہ اگر شیخ یہ مشاہدہ کرے کہ مرید کو سماع کا شوق ہے تو اس کو سمجھ لینا چاہئے کہ اس میں سستی اور اس کا ذوق عبادت سے تکاہل و تساہل باقی ہے۔ روایت ہے کہ حضرت جنید بغدادیؒ نے سماع کو ترک کر دیا تھا۔ لوگوں نے آپ سے دریافت کیا کہ پہلے تو آپ سماع سے رغبت رکھتے تھے، اب آپ نے اس کو کیوں ترک کر دیا؟ تو انہوں نے فرمایا کہ میں کس کے ساتھ سنتا تھا؟ لوگوں نے کہا کہ آپ اپنے لئے سنتے تھے۔ آپ نے فرمایا: کن لوگوں سے سنتا تھا؟ خود ہی فرمایا کہ اس کے اہل کے ساتھ سنتے تھے پھر جب ایسے لوگ نایاب و ناپید ہوگئے تو چھوڑ دیا۔ لہٰذا جب ایسی روحانی صحبت ختم ہوجائے تو سماع کو ترک کر دینا چاہئے'' (عوارف)

''پس مشائخ نے سماع کو اس کے قیود اور آداب کے ساتھ اختیار کیا تھا اور اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ آخرت کو یاد کر کے جنت کی طرف راغب ہوں اور دوزخ سے محفوظ رہیں۔ طلب حق میں اضافہ ہو اور ان کے احوال میں حسن و درستی آ جائے۔ بایں ہمہ یہ محفلیں کبھی کبھار ہوتی تھیں۔ ان حضرات نے اس کو اپنا معمول اور عادت نہیں بنایا تھا کہ اس کی وجہ سے اوراد و وظائف ہی کو ترک کر دیا جائے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے، انہوں نے کتاب القضاء میں کہا ہے کہ غنا (گانا) جو لہو کے لئے ہو، وہ مکروہ ہے۔ وہ باطل سے مشابہ ہے......''

''حضرت فضیل بن عیاض رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ گانا زنا کا منتر ہے۔ حضرت ضحاک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ راگ دل کو فساد میں مبتلا کرنے والا یعنی دل کو بگاڑنے والا اور پروردگار کو ناخوش کرنے والا ہے۔ ایک بزرگ کا ارشاد ہے کہ راگ سے بچو کہ راگ شہوت کو زیادہ اور مروت اور آدمیت کو تباہ کرنے والا ہے۔ راگ شراب کا قائم مقام ہے اور نشہ کی طرح کام کرتا ہے۔''

''حضرت حسن بصری سے مروی ہے کہ دف بجانا مسلمانوں کا شعار نہیں ہے اور اس سلسلے میں رسول اکرم ﷺ سے جو منقول ہے کہ آپ نے اشعار سماعت فرمائے تو اشعار کا سننا گانے کے جواز کی دلیل نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ شعر تو کلام منظوم کا نام ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ کلام ہے، وہ کلام منثور ہے جو کلام عمدہ ہے، وہ اچھا ہے اور جو کلام برا ہے وہ برا ہے، لیکن غنا الحان سے پیدا ہوتا ہے (یعنی سروں کے امتزاج سے راگ راگنیاں پیدا ہوتی ہیں) اب انصاف کیجئے اور اس زمانے کے مطربوں کا تصور کیجئے کہ مغنی دف ہاتھ میں لئے بیٹھا ہے اور مجیر چی کے ہاتھ میں مجیرے ہیں۔ کیا اس قسم کی نشست اور شعر خوانی کی یہ ہیئت عہد حضور سرور کائنات ﷺ میں ہوتی تھی اور کیا قوال قوالی گانے کے لئے لایا جاتا اور لوگ اس سے قوالی سننے کے لئے اس طرح جمع ہوتے تھے؟

بیشک ہر شخص یہی کہے گا کہ حضور ﷺ اور صحابہ کرام کے زمانہ میں یہ بات نہیں تھی۔ پس غور کرنا چاہئے کہ اگر اس میں کوئی فضیلت ہوتی تو حضور ﷺ اور آپ کے اصحاب اس سے کس طرح یوں بے اعتنائی فرماتے؟ لہٰذا اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ یہ گانا سننا تو ایک فضیلت کا کام ہے اور اس کے سرانجام دینے کے لئے اجتماع ضروری ہے تو اس کو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ رسول اکرم ﷺ اور صحابہؓ اور تابعینؒ کے مدارج روحانی اور ان کے اعلیٰ ذوق و شوق سے واقف نہیں ہے، بلکہ بعض متاخرین نے چونکہ اس فعل کو بنظر استحسان دیکھا، اس کو مستحسن کہا ہے۔ وہ اس سے مطمئن رہے۔ بہت سے لوگ اس سلسلہ میں مغالطہ میں مبتلا ہوئے ہیں، کیونکہ جب ان کے

سامنے سلف صالحین کی روایات پیش کی جاتی ہیں تو وہ اس کے جواب میں متاخرین مشائخ کی روایت پیش کرتے ہیں، حالانکہ انہیں یہ سمجھنا چاہئے کہ اسلاف کرام رسول اکرم ﷺ کے عہد باسعادت سے (بہ نسبت متاخرین کے) زیادہ قریب تھے اور ان کا طریقہ اور مسلک حضور اکرم ﷺ کے مقدس طریقے سے زیادہ مشابہ تھا۔" (عوارف المعارف)

حضرت شیخ الشیوخ سماع کے منکر نہیں تھے لیکن گانے بجانے (غنا) سے پرہیز کا پتہ فوائد الفواد میں بیان کئے گئے ایک واقعہ سے ہوتا ہے کہ ایک مطربہ نے آپ کے ہاتھ پر گانے بجانے سے توبہ اختیار کی: "ایک مطربہ قمر نامی نہایت حسین وجمیل تھی۔ بڑھاپے میں دولت توبہ اس کو نصیب ہوئی اور سعادت ازلی کی دستگیری سے اس کو بیعت حضرت شیخ الاسلام شہاب الدین عمر سہروردی میسر ہوئی۔ مرید ہوکر وہ حج کو گئیں۔ حج کیا، واپس آتے ہوئے ہمدان میں ٹھہری چونکہ گانے میں شہرت تامہ رکھتی تھی۔ والئ ہمدان کو خبر ہوئی۔ اس نے اپنے آدمیوں کو بھیجا کہ مطربہ کو مجرے کے واسطے حاضر کریں۔ وہ لوگ آئے۔ قمر نے جواب دیا کہ میں توبہ کرچکی ہوں اور خانہ کعبہ کی زیارت سے مشرف ہو آئی ہوں، میں مجرا نہ کروں گی۔ والئ ہمدان نے یہ جواب سن کر حکم دیا کہ اس کے ساتھ سختی کا برتاؤ کر کے حاضر کرو۔ بیچاری قمر مجبور ہوئی اور شیخ یوسف ہمدانی کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض حال کیا۔ شیخ نے کہا کہ تو ان سے کل کا وعدہ کر، میں آج رات کو تیرے واسطے دعا بجناب کروں گا اور صبح تجھ کو اس حال سے اطلاع کروں گا۔ قمر نے واپس آ کر فرستادگان والئ ہمدان سے وعدہ کل کا حاضر ہونے کا کیا۔ وہ لوگ چلے گئے۔ یہ دوسرے روز علی الصباح یوسف ہمدانی کی خدمت میں پہنچی۔ شیخ نے فرمایا کہ تیرے خزانہ تقدیر میں ایک معصیت باقی رہ گئی ہے۔ یہ حیران ہوئی اور فرستادگان والئ ہمدان کھینچ کر لے گئے اور چنگ قمر کے ہاتھ میں دے دیا۔ مجبوراً بجانا اور گانا پڑا۔ قمر نے اس وقت ایک بیت انشا کی اور اس انداز سے گایا کہ حاضرین پر رقت ہوئی اور اسی مجلس میں والئ ہمدان و دیگر ملوک تائب ہوئے۔ الحمدللہ علیٰ ذالک۔"

مندرجہ بالا واقعہ سے واضح ہوتا ہے کہ آپ مجلس میں عورتوں کا اس طرح راگ گانا پسند نہیں فرماتے تھے، تب ہی تو ایک مطربہ آپ کے دست پر توبہ تائب ہوئی تھی۔ یقیناً آپ کی نصیحت و واعظ کی وجہ سے ہی اس نے ایسا کیا ہوگا۔ حضرت شیخ الشیوخ کے راگ نہیں بلکہ سماع سننے کے چند ایک واقعات تاریخ میں ثبت ہیں۔ فوائد الفواد میں لکھا ہے:

> "اس کے بعد ذکر حضرت خواجہ بہاء الدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ کا ہوا کہ ایک شخص عبداللہ نامی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ میں نے شیخ

بشہاب الدین عمر سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ سماع سنا ہے۔ شیخ بہاء الدین نے فرمایا کہ ہم کو بھی بہ تبعیت اپنے مرشد کے سماع سننا چاہئے۔ الغرض عبداللہ کو آپ نے ٹھہرنے کے واسطے کہا اور بوقت شب ہمراہ ایک خادم کے ایک حجرہ میں بھیجا جہاں سوائے ان دو کے اور تیسرا نہ تھا۔ بعد عشاء آپ خود تشریف لے گئے اور اپنے اوراد معمولہ بمقدار آدھے سیپارے کے پڑھے اور حجرہ کو زنجیر لگا کر عبداللہ سے فرمایا کہ تم کوئی شے گاؤ۔ عبداللہ فرماتے ہیں کہ میں نے راگ شروع کیا۔ شیخ کو جنبش ہوئی۔ اٹھ کر چراغ گل کر دیا کہ حجرہ تاریک ہو گیا اور آپ اسی طرح وجد فرماتے تھے لیکن بوجہ تاریکی مجھے دکھلائی نہ دیتے تھے۔"

مندرجہ بالا واقعہ سے حضرت شیخ الشیوخ کے سماع سننے کی خبر معلوم ہوتی ہے۔ وہ لوگ جو حضرت بہاء الدین زکریا کے نام پر راگ و رنگ کی مجالس کرواتے ہیں، وہ بھی عبداللہ قوال کے واقعہ کو بطور سند پیش کرتے ہیں مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ حضرت زکریا رحمۃ اللہ علیہ نے ۹۶ برس کی طویل عمر میں کبھی کسی قوال کو نہیں بلایا اور نہ ہی ان کی خانقاہ میں کسی محفل سماع کا ذکر ملتا ہے۔ عبداللہ قوال نے جب حضرت بہاء الدین رحمۃ اللہ علیہ سے یہ کہا کہ میں نے آپ کے مرشد کو قوالی سنائی ہے، آپ بھی سنیں تو جواباً آپ مرشد سے محبت کے اظہار میں سننے کو تیار ہوئے، لیکن نہ صاجزادگان نہ خلفاء اور نہ خانقاہ کے درویشوں نے اس میں حصہ لیا اور نہ کوئی با اہتمام محفل منعقد ہوئی۔

کچھ صوفیاء کا خیال ہے کہ تصوف میں جس طرح کشف و کرامات سے روحانی ترقی وہیں رک جانے کا خطرہ ہوتا ہے، اس طرح سماع کے ذریعے کیفیات پیدا کرنے والے کی مزید ترقی رکنے کا خدشہ ہر وقت لاحق رہتا ہے، کیونکہ سماع اس کا عضوہ اور مجبوری بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ الشیوخ سماع کے منکر نہ ہونے کے باوجود اسے اپنی مجبوری بنانے سے اجتناب کرتے ہوئے شریعتِ محمدیؐ پر استقامت کو اولیت دیتے رہے، جس کی وجہ سے سماع کے ذریعے جو کیفیات ایک سالک کو حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، وہ انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے بدرجہ اُتم عطا کی تھیں۔

شراب کی خباثتوں میں سے ایک خباثت یہ ہے کہ شراب پینے والا رفتہ رفتہ مکمل طور پر اس کے اثر میں آجاتا ہے اور اس کی زندگی کے تمام شعبہ جات اس کے اثر سے بچ نہیں سکتے۔ انسان پہلے شراب کو پیتا ہے، پھر شراب شراب کو پیتا ہے، حتیٰ کہ پھر شراب اس انسان کو پینا شروع کرتا ہے اور وہ انسان معاشرتی لحاظ سے ناکارہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ چجائیکہ وہ انسان کچھ خوبیوں کا مالک

بھی بن جائے جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ شرابی کا دل بہت اچھا ہے یا وہ شرابی تھا مگر تھا سخی مرد۔ بالکل درست ہے لیکن شریعت محمدیؐ تو پورے انسانی معاشرے کو صحتمند بنانا چاہتی ہے نہ کہ فرد واحد کو، جو صرف اس کے قائم کئے ہوئے ضابطہ حیات پر عمل پیرا ہونے سے ہی ممکن ہے۔

کچھ حضرات سماع کے لئے بھی حیات طیبہؐ، سیرت صحابہؓ، تابعین، تبع تابعین، ائمہ اربعین، بزرگان دین کی زندگیوں میں سے کچھ مثالیں اس کے حق میں لے آتے ہیں۔ خاص طور پر خوشی کے مواقع جیسے شادی، غمی، ختنہ، مسافر کا آنا، کسی کے استقبال وغیرہ پر دف اور نغموں کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں، لیکن آپ انہی ہستیوں کی حیات کا بغور مطالعہ کریں تو انہوں نے سماع کو اپنی زندگی کا معمول یا مجبوری نہیں بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ جب سماع کے حق میں ان ہستیوں کے رویہ اور افکار کو بطور دلیل کے ضرورت پڑتی ہے تو ان کی حیات سے ایسے واقعات کو ڈھونڈنے اور چھان بین کرنے کی محنت کرنی پڑتی ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے سماع سنا لیکن یہ ان کا معمول نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سلسلہ سہروردی نے سماع سننے کے آداب کو وضع کیا، تا کہ حیات طیبہؐ، سیرت صحابہؓ اور مشاہیر نے سماع کا جائز اور جو صحیح استفادہ کیا، آئندہ آنے والی امت مسلمہ بھی حقیقت شناس ہو۔ عوارف المعارف کے ۲۳ تا ۲۵ ابواب میں شیخ الشیوخ نے صوفیاء اور مریدین کے لئے سماع کی شرائط و آداب بیان کئے ہیں۔

کچھ صوفیاء نے سماع کو اللہ اور رسول سے محبت و عشق کی کیفیات کو تحرک میں لانے کے لئے جائز قرار دیتے ہوئے غنا اور راگ رنگ میں فرق کیا ہے اور سماع کے لئے شیخ طریقت، محفل، اخوان، ماحول وغیرہ جیسے اصول متعین کیے۔ عوارف میں بھی سماع کے آداب بیان کیے گئے ہیں، بلکہ اکثر کتب سماع و دیگر سلاسل تصوف میں بھی شرائط ترتیب دیے گئے ہیں۔ اور انہوں نے بھی آداب اور اصولوں سے استفادہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بات اس کی واضح دلیل ہے کہ سلسلہ سہروردیہ سماع کا منکر نہیں، البتہ وہ اس کے منفی اثرات سے سالک کو آگاہ کرتا ہے، ورنہ اگر انہیں اپنے سلسلے کی شہرت عام کرنے کا جنون ہوتا تو جس طرح اکابرین ہند و مذہب نے جب دیکھا کہ ہندو مذہب اپنی شہرت عوام میں کھو رہا ہے تو اپنی عبادتگاہوں میں انہوں نے راگ رنگ کو عام کیا، تا کہ زیادہ سے زیادہ عوام ان کی طرف متوجہ ہوں اور وہ خوب شہرت پائیں، لیکن سلسلہ سہروردیہ کے اکابرین نے شریعت محمدیؐ کو اپنی مقبولیت پر ترجیح دی۔

مندرجہ بالا بحث سے کچھ حقائق سامنے آتے ہیں کہ اگر کوئی شیخ یا اہل اللہ مجلس میں ہو اور سماع ہو رہا ہو تو انکار نہیں کرنا چاہئے اور خاموش رہنے کا مطلب یہ ہے ک جو چاہے سنے جو چاہے نہ سنے۔ مگر اس کی طرف کامل التفات بھی نہیں کرنا چاہئے اور یہی معتدل نظریہ ہے۔ حکم

ہے کہ خیر الامور اوسطھا. بہترین کام وہ ہے جو درمیانہ درجہ کا ہو۔ زہر خالص کھانے سے آدمی مرجاتا ہے، اس لئے اسے کھانا حرام ہے۔ مگر بوقت ضرورت حکماء اور اجزاء سے ملا کر اس کا مرکب بناتے ہیں تو زہر حرام نہیں رہتا بلکہ تریاق کا کام دیتا ہے۔ بعینہٖ اگر ناقص مرید و معتقد سماع کو بطور لہو و لہب کے سنیں گے تو ان کے لئے نقصاندہ ہے۔ مگر ارباب حال کے بعض اشغال و اعمال میں شامل کر کے متعین کردہ آداب محفل مشائخ کو پابندی سے سنا جائے تو اس کا سننا روا اور جائز ہے۔ یہی حال شعراء کی شاعری کا ہے کہ شاعری بھی ایک طرح کا سحر ہے۔ جس طرح سامری جادوگر نے جادو کے ذریعے بچھڑا بنا کر بنی اسرائیل کو گائے کی پرستش پر لگایا۔ اسی طرح بہت سارے شاعروں نے الفاظ کا کھیل کھیل کر حضرت انسان کو گمراہ کیا۔ کائنات کی معمولی معمولی چیزوں کو ایسے رنگ میں پیش کرتے ہیں کہ گویا لوگ انہیں خالق کا درجہ دینے لگتے ہیں۔ جبکہ دوسری جانب خالق حقیقی کے متعلق بے ڈھنگ اشعار بنا کر انسان کو اس کے برابری میں لانے کی ناکام کوشش کرتے ہیں اور یوں لوگ شرک و الحاد کے مرتکب ہوتے ہیں۔ عشق مجازی میں ہی ان کو سب کچھ نظر آنے لگتا ہے اور انسان جو اشرف المخلوقات ہے اپنے مقام عبدیت سے گرتا چلا جاتا ہے۔ اس لئے جس طرح سماع اور غنا میں صوفیا کرام نے فرق کیا ہے۔ اس طرح شعراء کی شاعری جو انسان کو بلندی یا پستی کی طرف لے جاتی ہے اس میں موجود فرق کو سمجھ کر حدود کا تعین بلکل اسی طرح کرلینا چاہئے۔ تا کہ وہ شعر جو بلندی اور عشق حقیقی کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور وہ شعر جو پستی سے دو چار کرتے ہیں ان میں فرق سمجھ میں آجائے۔ یہی حضرت شیخ الشیوخ عمر بن محمد شہاب الدین سہروردی اور ان کی تحریک سہروردیہ کا منشا تھا۔ حضرت شیخ الشیوخ کے مرید شیخ سعدی کے یہ اشعار مقصد سماع کو کچھ یوں واضح کرتے ہیں:

سماع ای برادر بگویم کہ چیست؟ اگر مستمع را بدانم کہ کیست؟
اگر ازواج معنی پرد طیر او فرشتہ فروماند از سیر او
اگر مرد لہو است و بازی ولاغ فزون تر شود دیوث اندر دماغ

ترجمہ: اگر میں سماع کرنے والوں کو جان لوں کہ وہ کون ہیں تو اے بھائی میں تمہیں بتاؤں کہ سماع کیا ہے۔ اگر اس کا طائر خیال حقیقت کی بلندی سے پرواز کرے تو اس کی پرواز سے فرشتہ بھی عاجز آجاتا ہے اور اگر اس کا مقصد لہو و لہب اور فریب کاری ہے، تو اس سے اس کے دماغ کا شیطان قوی ہوجاتا ہے۔

تعلیق (۸): تفسیر انوار الاسرار فی حقائق القرآن وہ معرکتہ الآراتفسیر ہے، جو برہانپور میں مکمل کی گئی۔ اس نسخہ عظیم کو آئندہ نسلوں تک پہنچانے کا شرف اہل برہانپور حاصل نہ کرسکے، اس کا افسوس تو یقیناً خود ان کو بھی ہوگا۔

قرآن حکیم کی اس تفسیر کی نوعیت اور طرز نہ صرف باقی تفاسیر سے مختلف ہے، بلکہ سالک کے لئے تصوف کے انتہائی نازک اور نفیس مسائل کو بھی ظاہر کرتی ہے۔ مؤلف کے لئے ان کی علمی قابلیت کا اعتراف ان کے استاد عم مکرم نے ان الفاظ میں کیا کہ: ''الحمدللہ! اللہ تعالیٰ نے تمہیں مکمل کیا۔'' اور ان کے روحانی درجات کے لئے حضرت مجدد الف ثانی کے یہ الفاظ جو مکتوبات کے یازدہم باب اول میں اس طرح لکھے ہیں: ''شیخ عیسیٰ در جذبہ بنقطہ فوق رسیدہ اند'' آپ کی یہ تفسیر صرف تصوف کی نازک اور نفیس نقاط کا مجموعہ نہیں، بلکہ اس میں منقوالات اور قانون تحریر کا بھی ہر طرح لحاظ رکھا گیا ہے۔

ڈاکٹر سالم قدوائی ''ہندستانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں'' مطبوعہ ادارہ معارف اسلامی لاہور میں رقمطراز ہیں:

> ''انوار الاسرار کا بھی مکمل یا نامکمل نسخہ الگ سے نہیں مل سکا ہے۔ البتہ اس کے بعض اجزا نزہۃ الخواطر اور معارج الولایۃ میں نقل کئے گئے ہیں۔ معارج الولایۃ میں اعوذ باللہ بسم اللہ اور سورۃ الحمد کی تفسیر کی عبارتیں ہیں۔ اس کے بعض اجزا نزہۃ الخواطر میں بھی موجود ہیں۔ چونکہ معارج الولایۃ بذات خود ایک نادر کتاب ہے اور جو کچھ اس میں موجود ہے، اس کا بہت کم لوگوں کو علم ہے۔ اس لئے انوار الاسرار کے یہ اجزاء بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ بھی موجود ہے، بہ جنسہٖ نقل کردیا جائے۔ (معارج الولایۃ کا ایک نادر قلمی نسخہ پروفیسر خلیق احمد نظامی علی گڑھ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ جس کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی میں موجود ہے۔ جس کی نقل بندہ کو سید حسن نواز شاہ صاحب نے اسلام آباد سے کمال محبت کا ثبوت دیتے ہئے عنایت کی)''

تذکرہ علماء ہند تالیف مولوی رحمان علی (المتوفی ۱۹۰۷ء) مرتبہ و مترجمہ محمد ایوب قادری مطبع ۱۹۶۱ء پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی میں لکھا ہے:

> ''شاہ عیسیٰ جنداللہ برہانپور کے اکابر علماء اور اعظم عرفاء میں سے تھے۔ قرآن مجید کی تفسیر انوار الاسرار عربی زبان میں چار جلدوں میں ان کی مشہور تصنیف ہے۔''

اس اہم تفسیر کے چند نامکمل نسخے سورۃ الطور سے سورۃ الحدید تک سندھ میں موجود ہیں۔ جن میں سے ایک پیر بدیع الدین شاہ راشدی نیو سعید آباد کے کتب خانے، سندھ یونیورسٹی

جامشورو اور بندہ کے پاس موجود ہیں۔ سورۃ الطّور سے الحدید تک کل چھ سورتیں اور اٹھارہ رکوع ہوتے ہیں۔ ان کا سندھی ترجمہ اور ایڈٹنگ کا کام ڈاکٹر پروفیسر حافظ محمد عثمان میمن نے بڑی جانفشانی سے کیا۔ ۱۹۹۸ء میں ادارہ ''پاٹ ہاؤس'' نے اسے شایع کرنے کی سعادت حاصل کی۔

تعلیق (۹): راشد برہانپوری نے حضرت مسیح کی وفات حسرت آیات کے بعد پسماندگان کے نام بغیر کسی تاریخی مستند حوالے اور تحقیق کے دیئے ہیں۔ بجز اس وضاحت کے کہ حضرت مسیح الاولیا کے ایک اور فرزند شیخ شہر اللہ جو آپ کی حیات مبارکہ میں ہی پاٹ سندھ میں وفات پاگئے تھے۔ ان کی اولاد پاٹ میں رہائش پذیر رہی اور پاٹ میں اس خاندان میں کئی بزرگ عالم، فاضل اور شاعر پیدا ہوئے۔ جس کی تصدیق اور حوالے راشد برہانپوری بھی کئی مقامات پر کررہے ہیں۔ ان میں سے بعض بزرگوں نے تصوف، حدیث، تفسیر، فقہ اور دوسرے علوم میں کئی تصانیف یادگار چھوڑیں ہیں۔ مفتی عبدالواحد کبیر پاٹائی (المتوفی ۱۱۲۳ھ/۱۷۱۱ء) اس خاندان میں بہت بڑے عالم و فاضل ہوگذرے ہیں۔ آپ کے فرزند صغیر مخدوم دین محمد پاٹ سے نقل مکانی کرکے سہون میں آکر سکونت پذیر ہوئے۔ جبکہ مفتی صاحب کے فرزند کلاں مفتی محمودؒ پاٹ میں بدستور مقیم رہے، جہاں ان کی اولاد زمانہ حال تک موجود ہے۔ حالانکہ ان میں سے اکثر جدید تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے حیدرآباد، کراچی اور دیگر بڑے شہروں میں سرکاری عہدوں پر فرائض انجام دینے کی وجہ سے وہیں مقیم ہوگئے ہیں۔

سہون شریف میں متصل مزار حضرت لعل شہباز قلندر مخدوم دین محمد کے زمانہ سے آج تک ان کی اولاد کے گھر آباد ہیں۔ المختصر اب بھی اس خاندان کے کچھ افراد سہون اور پاٹ میں رہائش پذیر ہیں۔ یہ سہوانی اور پاٹائی کہلاتے ہیں۔ اس خاندان میں سے مخدوم عبدالواحد صغیر سیوستانی بن مخدوم دین محمد بہت بڑے عالم گذرے ہیں۔ فقہ اور فتاویٰ نویسی کی وجہ سے آپ کو ''نعمان ثانی'' کہا جاتا ہے۔ فتویٰ میں آپ کی چار جلدوں پر مشتمل کتاب ''بیاض واحدی'' بہت مشہور اور مقبول ہے۔ آپ نے خواجہ صفی اللہ مجددی کے ہاتھ پر بیعت ہوکر نقشبندی سلسلہ اختیار کیا۔ عربی اور فارسی زبان کے شاعر بھی تھے۔ ۱۲۲۴ھ/۱۸۰۹ء میں آپ نے وفات کی۔

اس خانوادہ مسیح الاولیا سے اور بھی کئی عالم اور عارف پیدا ہوئے۔ مثلاً مخدوم فضل اللہ پاٹائی، مخدوم محمد شفیع پاٹائی، مخدوم علی گوہر پاٹائی، مخدوم حسن اللہ پاٹائی، مخدوم محمد عارف سیوستانی، مخدوم محمد مجذوب سیوستانی، میاں صاحب احمدی قاضی آف پاٹ، مخدوم بصر الدین سیوستانی حکیم محمد حسن، مخدوم حکیم محمد مراد وغیرہ وغیرہ۔

راشد برہانپوری نے یہاں ان خطوط کے تبادلہ کا ذکر کیا ہے، جو برہانپور سے پاٹ شریف اور سہوان (سیوستان) میں موجود اولاد نرینہ حضرت مسیح الاولیا شیخ عیسیٰ جنداللہ پاٹائی ثم برہانپوری سے کیا۔ آپ لکھتے ہیں:

''محمد صاحب و بسم اللہ صاحب نے سندھ میں پتہ چلاکر وابستگان اخلاف (یعنی اولاد نرینہ) مسیح الاولیاء سے خط و کتابت کی اور برسوں یہ سلسلہ قائم رہا۔''

اس بات کے کافی شواہد موجود ہیں کہ حضرت مسیح الاولیا کی اولاد موجود برہانپور اور پاٹ سندھ کے درمیان تعلق ابتدا ہی سے قائم تھا۔ ممکن ہے مفاصلہ کی دوری ایک دو پشت میں سلسلہ منقطع ہونے کا سبب بنی ہو۔

حضرت بابا فتح محمد کی سندھ آمد کے بعد اغلب یہی ہے کہ شیخ طٰہٰ سندھی پاٹ سے برہانپور میں کچھ عرصہ رہے ہیں۔ شیخ طٰہٰ کے ذکر میں راشد برہانپوری نے محضر نامہ (۱۰۶۹) پر جس شیخ طٰہٰ بن شیخ عیسیٰ کے دستخط کا احوال دیا ہے، یہ شیخ طٰہٰ ابن شیخ عیسیٰ مسیح الاولیا نہیں، بلکہ شیخ طٰہٰ بن شیخ عیسیٰ ثانی پاٹائی بن مخدوم حسن قاری بن شیخ شہر اللہ رمضان بن مسیح الاولیاء شیخ عیسیٰ جنداللہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ برہانپور میں شیخ طٰہٰ کا مزید کوئی احوال معلوم نہیں ہوتا۔ مزید یہ کہ حضرت مسیح الاولیا کی قد آور اور بابرکت شخصیت کا اسم مبارک ''محضر نامہ'' میں محض ''شیخ طٰہٰ بن شیخ عیسیٰ'' نہ لکھا جاتا۔ بلکہ آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے ''مسیح الاولیا'' یا ''جنداللہ'' وغیرہ ضرور تحریر کیا جاتا۔

حضرت بابا فتح محمد برہانپوری سندھی اور شیخ طٰہٰ سندھی کے بعد ہمیں حضرت مخدوم عبدالواحد کبیر پاٹائی کا ذکر ملتا ہے، جنہوں نے دلی میں اورنگزیب سے ملاقات کے بعد برہانپور میں اپنے جد مسیح الاولیاء کے روضہ کی زیارت کا شرف حاصل کیا۔ المکتوب الحبیب قلمی میں اس کی صراحت اس طرح ملتی ہے:

«حضرت مخدوم فخر الدين عبدالواحد ڪبير مفتي قدس اسرارهم هو، جنهن جو لاڳاپو اولادي مسيح الاوليا سان شرعا ثابت ۽ تسليم وارو هئڻ تہ حاڪمن ۽ عالمن هند ۽ گجرات ۽ دکن وغيره سان پڌرو هليو آيو آهي. حتيٰ ڪہ گهڻن فرمانن زر افشانن بادشاه اورنگزيب جيم ڪي زمينون بشرط منصب افتاجي ۽ ڪي بلا شرط خاص فضل اولادي مسيح الاوليا جي طفيل ان جي ڪٽس جاگيرون معاف هيون ۽ هن وقت ۾ ذيڪاري ٿو فرمان زر افشان انهي عهد شاهن اسلام جيجو تہ ڏهہ هزار جريب جي زمين خاص طفيل اوليا مٿين جي سنڌ

پاٽ موضع رسول آباد ۾ متصل جاگير سندس سوٽ مولانا شيخ عبدالله جي امداد هئي. اهڙيون سندون لکليون نہ آهن. هن وقت جي سرڪار بهادر جي دفتر ۾ داخل آهن ۽ فائدا قديمي آبروئي تي قديمي، خانداني موجب مليا ويا آهن. بلڪ سندن نقل انگلش ۾ گزٽ تائين شايع آهن. تصديقن مير صاحبن ۽ وڏن عملدارن هن سرڪار بهادر سان. ١٠٧١ هه مقدس ۾ پاٽ يعني مفتي مخدوم عبدالواحد ڪبير چند علما سنڌ جي سان درويشي لباس ساڻ سياحت بلاد الله جيم هوندا هئا. ڪن عالمن جي گڏجاڻي سان دهلي شهر ۾ سلامي بادشاهه سان تي هئڻ ۽ ڪن عقدن مالا ينحل مسائل فقه جيم علمائن پين کان حل ڪرڻ ۾ سبقت ڪئي هوائون. جنهن ڪري بادشاهه سندن شاگردي مڃي هئي. اورنگ آباد وارو صاحب سجاده بابا شاهه جو مخدوم غلام جيلاني صديقي لکن ٿا تہ مخدوم عبدالواحدؒ سنڌي پاٽائي کي هند ۾ استاد شاهي لقب ساڻ سڏين ٿا. اتي مشهور آهي تہ سنڌ ۾ مسيح الاوليا جي اولاد مان هئا ۽ اورنگزيب شاهه سندن وطن سنڌ مان پڇيو هون جواب ۾ چيائون تہ پاٽ ۾. بادشاهه تبسم ڪري ڪلام ڪيو تہ عجب پاٽ جهڙي تنگ صنحک بارهاڪن اتي جي ماڻي سگهيا آهيو. ورندو مخدوم جواب ۾ پيش ڪيس تہ اهو عجب نہ آهي تہ اسان جو بادشاهه بدولت ۽ رعايا سميت تنگ گلو دلي ۾ ٿا ماپن. اسين تہ رعايا صنحک ڪشادي منهن ۾ ماپيل آهيون.

بادشاهه ڪٹن مفتي الاسلام پرگنه پاٽ جي تي معين فرمايو هو جو ١٠٧٢ هجري کان منصف افتا جي جا هلائيندڙ هئا. سندن مهر افتاحي ۾ هي نشان هو:
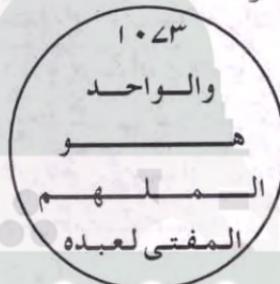
جن ڏينهن ۾ شاهي حاضري کان واندا ٿيا. هٿا بادشاهہ سندن حاضري تي محضر نامون لکي سندن نسب حضرت شيخ شهاب الدين صديقي سهروردي ثاني پاٽائي تائين لکيو هو. پوءِ اچي زائر روضہ جد مبارڪ مسيح الاوليا جا برهانپور ۾ ٿيا هٿا. اتي جي علمائن جهڙوڪ حضرت عظيم الدين صاحب معز الدين صاحب وغيره نقل شاهي خط جيجو پاٽ وٽ رکيو هو ۽ پاٽ بہ پنهنجي مهرن سان سندن نالي کان ثاني شهاب الدين تائين نشان کري حوالي مفتي جي کيو هٿائون. جو هن ٽاٽي ۾ بدستخط مهر افتا مخدوم عارف بالله سيوهاٽي جي اسان جي مرشدن جي قرابت اولادي وٽ موجود آهي.

مولانا دین محمد وفائی تذکرہ مشاہیر سندھ میں مفتی عبدالواحد کبیر پاٹائی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ بڑے فقیہ اور عالم تھے۔ سلطان اورنگزیب کے زمانہ میں پاٹ کے زرخیز علاقے کے فیصلے اور فتوے ان کے سپرد تھے۔ ایک دفعہ سلطان عالمگیر کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے تھے۔ جہاں بادشاہ نے خوش طبعی کے طور پر ان سے پوچھا کہ: مولانا! آپ کہاں رہتے ہیں؟ جواب میں عرض کیا: پاٹ سندھ میں۔ سلطان نے کہا: پاٹ جیسے چھوٹے برتن (تنگ صخک) میں کیسے سماتے ہو؟ مفتی صاحب نے عرض کیا: جس طرح مرشد عالم اپنی اسلامی فوج سمیت دلی (تنگ گُلو) جیسے چھوٹے برتن میں تشریف فرما ہیں۔ بادشاہ کو یہ پر لطف جواب بہت پسند آیا۔ اس کے بعد جب یہ پاٹ واپس آئے تو ٹھٹہ کے گورنر میر ابوالمکارم کی طرف سے ذریعہ معاش کے طور پر ان کو دو ہزار جریب اراضی اور کچھ پختہ کنوؤں کا پروانہ جاگیر کے طور پر ملا۔ جاگیر پاٹ کے نزدیک دیھ رسول آباد میں تھی۔ یہ پروانہ میں نے مخدوم میاں محمد حسن صدیقی کے کتبخانہ میں دیکھا ہے جو زر افشان کاغذ پر تحریر ہے اور اسی پروانہ میں مفتی عبدالواحد کو شیخ عیسیٰ جنداللہ کی اولاد میں شمار کرتے ہوئے، ان کی علمی فضیلت کی تعریف کی ہے۔'' (تذکرہ مشاہیر سندھ)

پیر حسام الدین راشدی نے نہ صرف ''برہانپور کے سندھی اولیاء'' کے پیش لفظ لکھے، بلکہ تذکرہ مشاہیر سندھ کا حواشیہ بھی تحریر فرمایا۔ اس کتاب میں ''مخدوم عبدالواحد کبیر'' کے حواشیے میں ان کا شجرہ مبارک دیتے ہوئے ان بزرگوں کے سن پیدائش اور وفات بھی فراہم کئے ہیں۔ حواشیہ میں آپ رقمطراز ہیں:

''میرے پاس شجرہ اس طرح ہے: مفتی الاسلام فخر الدین عبدالواحد کبیر (سنہ ۱۰۴۷-۱۱۲۳ھ) (ان کو دس ہزار جاگیر بیگہ رسول آباد میں شیخ عبداللہ صدیقی کے قریب ملی) بن مولانا محمود سہروردی (سنہ ۱۰۱۹-۱۰۸۵ھ) ابن شیخ عیسیٰ ثانی پاٹائی (سنہ ۱۰۰۴-۱۰۷۰ھ) ابن مخدوم حسن قاری (۹۹۰ھ-سنہ ۱۰۸۲ھ) ان کی تعمیر کردہ مسجد اور کنواں بڑی پاٹ میں موجود ہے۔ ابن شہر اللہ رمضان (سنہ ۹۷۶-۱۰۱۷ھ) ابن شیخ عیسیٰ مسیح الاولیا (سنہ ۹۶۲ھ-۱۰۳۱ھ) ابن شیخ قاسم پاٹائی برہانپوری (سنہ ۹۳۳-۹۸۱ھ) ابن شیخ الاسلام یوسف سندھی پاٹائی (متولد ۹۱۰ھ) ابن شیخ رکن الدین (سنہ ۸۷۵-۹۵۲ھ) قبر پرانی پاٹ میں ہے۔ واضح رہے کہ کچھ کتب کوہ مکلی بتاتے ہیں۔ ابن شیخ معروف پاٹائی (سنہ ۸۴۴-۹۰۷ھ) بڑے پاٹ میں جھیل ان کے نام پر ہے۔ ابن شیخ شہاب الدین سندھی پاٹائی المشتہر صدیقی سہروردی ''مسیح الاولیا'' نے ان کو 'عین معانی' (۹۸۹ھ) میں شہابی سہروردی لکھا ہے۔ یہ پاٹ شہر کے بانی ہیں۔ (۸۰۲-سنہ ۸۹۴ھ) ان کی قبر بکھر میں بتائی جاتی ہے۔ ابن نور الدین (سنہ ۷۸۶-۸۴۹ھ) بن شیخ سراج الدین (۷۲۶-۷۸۱ھ) ابن شیخ وجیہ الدین (سنہ ۶۹۹-۷۸۰ھ) ابن شیخ مسعود (سنہ ۶۷۹-۷۴۸ھ) ابن شیخ رضی الدین (سنہ ۶۲۲-۶۹۵) ابن شیخ قاسم (۵۸۹-سنہ ۶۵۲ھ) ابن شیخ محمد معروف بہ شیخ احمد عماد الدین (سنہ ۵۸۹-۶۵۲ھ) ابن شیخ ابو حفص عمر شہاب الدین کبیر (سنہ ۵۳۹-۶۳۲ھ)۔''

ڈاکٹر ہوتچند مولچند گربخشانی سندھی ادب میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ آپ سنہ ۱۹۱۵ء میں ڈی۔ جی سندھ کالج کراچی میں پروفیسر آف پرشین تھے۔ انہوں نے مخدوم عبدالواحد کبیر کے نام اورنگزیب عالمگیرؒ کے ''فرمان شاہی'' کا اصل نسخہ سے انگریزی زبان میں ترجمہ کرکے ۱۰ اپریل سنہ ۱۹۱۵ء کو سندھ گزیٹ میں شایع کیا۔ آپ کا انگریزی ترجمہ مع اردو ترجمے کے ساتھ یہاں پیش کرنا بے محل نہ ہوگا۔

SIND GAZETTE

A true copy of the translation of the document granted by the Emperor Aurangzeb to two former members of the Still existing family of Pat in Sind Published in the Sind Gazette issue of the 10th April 1915. With a note from the Editor.

"A Sind Souvenir of Aurangzeb Preservation of an ancient document Sind antiquarians will be interested in the translation which we publish below of an original letter of the Emperor Aurangzeb to two former members of the Still existing family of Pat in the Larkana District of Sind. It is specially interesting to note that Makhdoom Abdul Karim who is in Possession of the original letter, is one of the old Boys of Sindh Madressah." (Editor)

"The officers of the Present time as also the time to come holding their offices in the District of Sevostan (Sehwan) and Pat are hereby apprised that in accordance with the august injunction of the most fortunate and glorious of the Sovereign of time and earth, the Divine medium of all Security and Protection the exhibitor of Heavenly Grace, the Shadow of God, issued on the most auspicious day of His Majesty's Coronation fifty one rupees have been assigned as the daily allowance to be paid to Makhdoom Shaikh Abdul Wahid, Late chief Justice and the holy Gnostic Sheikh Abdul Kadir, the Son and nephew respectively of the Saint of God the pole of poles, the essence of the Divine Sheikh Issa Kassim Sidiki (May the Mercy of God be Upon him) from the treasury Since the mind of the Government is in its entirety get upon the furtherance of both the material and .Spiritual advancement of the kingdom and where as the Government ardently desires that Persons of high breeding and noble birth should be maintained in a fortunate and happy plight so as to spantanneously pour forth a devout wish and prayer for the prosperity of the State and the welfare of the Divine representative of God on Earth, the Government is pleased to confer ten thousand bigas of Land as a Substitute for his daily allowance of Rs. 25-8-0 on the holy and the most virtuous of Gnostic Makhdoom Abdul Wahid Sidiki to Serve as a resource of income for his

maintenances. The officers in charge of the District are ordered to deem it incumbent upon them to act in accordance with the above orderes and entrust the afore- Said amount of land to the Same most glorious Makhdoom in the District of Pat. He is to be Considered as exempt from all the Political matters of the state and no contrary wise measures against the above ammand are under any circumstances to be adhered to."

The hereby Certify that the above is a Correct rendering of the original Persian document.

(sd) H.M.
GURBXIHN, M.A,
Professor of Persian

D.G. Sindh College, Karachi
March 1915.

اردو ترجمہ

سندھ گزیٹ

صحیح نقل ترجمہ دستاویزات سلطان اورنگزیب عطا کردہ گذشتہ دو اشخاص اب تک موجود خاندان پاٹ سندھ- شائع شدہ سندھ گزیٹ مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۱۵ء مع الفاظ/نوٹ مدیر:

''اورنگزیب کا سندھ سوویئنر قدیم دستاویزات سندھ کو محفوظ کرنا اور اس کا ترجمہ متعلقہ افراد کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگا۔ سلطان اورنگزیب کا اصل فرمان پاٹ لاڑکانہ سندھ (موجودہ دادو ضلع) کے گذشتہ دو اشخاص کے متعلق ہم نیچے شائع کر رہے ہیں۔ یہ امر دلچسپی کا باعث ہے کہ مخدوم عبدالکریم جن کے پاس اس فرمان کا اصل موجود ہے۔ وہ سندھ مدرسہ کے پرانے طالب علم ہیں۔''

فرمان شاہی

موجودہ اور آنے والے حویلی سیوستان اور پاٹ کے حکام بالا کو فرمان عالی سے مطلع کیا جاتا ہے کہ مظہر خدا، خلافت پناہ، بادشاہ سلطنت عظیم ارض و زمان، بحکم (مورخہ ۲۹ جلوس) بروز مبارک دن تا جپوشی ۵۱ روپیہ یومیہ، مخدوم و شیخ عبدالواحد اور مفتی شیخ عبدالقادر، اولادش و خواہر

زادہ اولیاء اللہ عزوجل قطب الاقطاب شاہ جند اللہ شیخ عیسیٰ قاسم صدیقی علیہ الرحمۃ کے بطفیل خزانہ سے ادا ہوگا۔ جیسا کہ سرکار مملکت کی روحانی اور مادی ترقی کے لئے خواہاں ہے اور وہ شدت سے چاہتی ہے کہ باوقار خاندانی لوگ جو اعلیٰ مقام و درجہ رکھتے ہیں۔ وہ اپنے شایان شان زندگی گذار سکیں، تاکہ وہ دلی طور پر مملکت کی خوشحالی اور ظل سبحانی کی بھلائی کے لئے دعاگو اور خواہشمند رہیں۔ بحکم سرکار دس ہزار بیگہ زمین بطور نعم البدل روپیہ ۲۵-۸-۵ روز مرہ خرچ کمالات دستگاہ مخدوم عبدالواحد صدیقی کو معاشی گذر بسر کے لئے عطا کی جاتی ہے۔ متعلقہ ضلع کے حکام کو حکم کیا جاتا ہے کہ شاہی فرمان بالا کے مطابق عمل کیا جائے اور پرگنہ پاٹ میں مخدوم صاحب کو حکم کی گئی اراضی دی جائے اور انہیں ہر طرح کی مملکتی و سیاسی امور سے بالاتر سمجھتے ہوئے شاہی فرمان بالا پر ہر حال میں عمل کیا جائے۔

میں تصدیق کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا ترجمہ اصل فارسی دستاویز سے لیا گیا ہے۔

دستخط

ہوتچند مولچند گربخشانی

ایم-اے پروفیسر آف پرشین

ڈی-جی سندھ کالج

کراچی مارچ ۱۹۱۵ء

اخلاف مسیح الاولیا میں سے بابا فتح محمد محدث کا برہانپور سے پاٹ شریف آنا اور پاٹ سندھ سے حضرت مخدوم عبدالواحد کبیر کا زائر روضہ جد شیخ عیسیٰ ہونے کا مختلف روایات اور تحریروں سے ثابت ہوتا ہے۔

مخدوم عبدالواحد کبیر پاٹائی نے سہون کے مشہور عباسی خاندان سے عقد ثانی کیا اور اللہ تعالیٰ جل شانہ نے آپ کو فرزند صالح مخدوم دین محمد صدیقی عطا کیا۔ آپ کی اولاد حضرت لعل شہباز قلندر کے مزار سے متصل آباد ہے، اس خانوادہ میں کئی اہل اللہ، متقی، قطب زمان، مجذوب، شاعر، مفتی اور حکما پیدا ہوتے رہے ہیں ہنوز آج تک یہ محلّہ آباد اور علاقہ میں عزت و آبرو کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ جس طرح شیخ طاہر محدث نے اپنے اوپر مقبرہ بنانے سے منع فرمایا تھا، خانوادہ کی اس شاخ میں اس روایت پر سختی سے عمل ہوا ہے۔

تقویٰ، پرہیزگاری اور نیک نامی کی وجہ سے زمانہ قریب تک مزار لعل شہباز کی انتظامی اور سجادگی میں ان کا مشورہ لازم سمجھا جاتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ بدعات اور شرک کی رسومات کی وجہ سے اس خانوادہ کے بزرگان اپنے آپ کو الگ کرتے گئے۔ خانوادہ کی سہوانی شاخ کے مؤسس اعلیٰ

مخدوم دین محمد سیوہانی (۱۱۰۱-۱۱۷۸ھ) مشیر مذہبی امور کلہوڑا حکمران کا ذکر تاریخ تحفۃ الکرام میں موجود ہے۔علی شیر قانع لکھتے ہیں:

''قاضی دین محمد دکائی مخدومان میں سے بزرگانہ اخلاق اور فضیلت کے صاحب ابھی تک تاحیات ہیں۔'' (تحفۃ الکرام)

لفظ ''دکائی'' دال کو زبر یا زیر لگانے سے اپنا مفہوم و معنیٰ بدل دیتا ہے۔ اگر صاحب تحفۃ الکرام کی مراد دَکائی ہے تو اس کی نسبت حیدرآباد دکن سے کی جائے گی۔ مخدوم دین محمد سہوانیؒ کے والد ماجد مخدوم عبدالواحد کبیرؒ کچھ دن برہانپور میں مقیم رہے اور واپس آکر سہون شریف میں عقد ثانی کیا اور وہیں مستقلاً رہنے لگے۔ جبکہ آپ کے فرزند کلان مخدوم مفتی محمود پاٹ میں ہی مقیم رہے۔ اس خانوادہ کے لئے یہ بھی مشہور تھا کہ یہ مسیح الاولیاء کی اولاد ہیں اور وہ برہانپور منتقل ہوگئے تھے اور وہیں ان کی مزار مرجع خلائق ہے۔ مخدوم عبدالواحد اولاد مسیح الاولیاء اور اس خانوادہ کے دیگر بزرگ دکن (برہانپور) سے ہیں اس لئے دکائی ہیں۔ عام سندھی شہر برہانپور کو دکن کی طرف کا کوئی شہر سمجھ کر اس خانوادہ کے کچھ امراء کے ساتھ دکائی لفظ جوڑ کر اس تعلق کو دہراتے رہے ہیں۔ واضح رہے کہ شاہجہان نے برہانپور کو ''باب دکن'' کا نام دیا ہے۔ سندھی زبان کے اپنے خد و خال کی وجہ سے دکنی کی جگہ دکائی لفظ عام ہوا۔ اور یہ تاثر عام تھا کہ خانوادہ کے کچھ افراد مخدوم عبدالواحد کبیر کے ایام میں پاٹ سے سہون آکر رہے۔ لیکن اس سے پہلے یہ بزرگان اصل دکن کی طرف مدفون مسیح الاولیاء کی اولاد یعنی دکائی بزرگان ہیں۔

دوم: ان دنوں میں یہ عام رواج تھا کہ صاحب ثروت لوگ اپنے گھروں کے احاطہ میں یا گھروں سے باہر عام راستے سے کچھ بلندی یا اوچائی پر فرش ڈلواتے تھے، جس پر چارپائی وغیرہ رکھ کر مہمانوں کے ساتھ محفل کی جاتی تھی۔ اسے ''اوپن ایئر ڈرائینگ روم'' کہہ سکتے ہیں۔ جسے عام سندھی زبان میں ''دِکو'' یا اوچی جگہ کہا جاتا ہے۔ لفظ ''دِکے'' کا ایک اور نعم البدل ''تھلھا'' یا ''تھلھو'' بھی ہے۔ یہ لفظ ڈیرا یا بیٹھک کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ آج بھی سہون میں مخدوم حکیم محمد مراد کا ''تھلھا'' مشہور ہے۔ جب مخدوم عبدالواحد صدیقی کبیر پاٹائی نے سہون میں عقد ثانی کیا۔ ان ایام میں عباسی خاندان کے کچھ افراد دِکائی مخدوم کے لقب سے زبان زد عام تھے۔ مخدوم دین محمد صدیقی ان کے گھرانے کے داماد ہوئے اور انہیں کے ساتھ آپ کا محلّہ آباد ہوا۔

خدا معلوم صاحب تحفۃ الکرام نے مخدوم دین محمد صدیقی کو ''دِکائی'' لکھنا چاہا ہے یا ''دَکائی''۔

درگاہ فیض رساں مسیح الاولیاء پر جب بھی کسی کو تولیت و سجادگی سے سرفراز کیا جاتا تو جو اجازت نامہ یا وصیت لکھ کر دی جاتی، اس کی ایک نقل اپنے چچا زاد بھائیوں کو پاٹ شریف بھیجی جاتی، تا کہ وہ اس تبدیلی سے مطلع رہیں۔ جب شیخ عبدالستار کی پانچویں پشت میں سے سجادہ نشین شاہ عطا علی صاحب کو نرینہ اولاد نہ ہوئی، تو انہوں نے اپنے بھانجے محمد غفنفر صاحب کو سجادہ مقرر کیا۔ اور انہیں تمسک لکھ کر عنایت کیا گیا۔ جس کی ایک نقل اولاد مسیح الاولیاء موجودہ پاٹ شریف کو بھی اطلاع کے لئے بھیجی گئی۔ اس طرح ایک دوسرے کو مطلع رکھنے کا سلسلہ بھی عرصہ دراز تک جاری رہا۔ یقیناً یہ سب یکطرفہ نہیں تھا۔ یہاں سے بھیجے گئے احوال کی تصدیق صرف راشد برہانپوری نے ۱۳۰۰ یا اس کے قریب کے زمانہ میں سندھ سے خطوط یا خطوط کے جواب سے کی ہے۔ کیونکہ جب اس سے قدیم زمانہ کے ملفوظات مراسلے اور کتب کی بات آتی ہے تو وہ برہانپور میں بڑی آگ کے عظیم سانحہ ۱۲۶۵ھ میں سب کچھ بھسم ہوجانے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

شیخ یوسف، شیخ طاہر، شیخ عیسیٰ ان کی اولاد موجود برہانپور و سندھ اور ان سے متعلقہ اہم تصانیف اور معلومات کا برہانپور میں زمانہ حال میں عدم موجودگی کا قصوروار اس عظیم سانحہ کو ہی بتایا جاتا ہے۔

واضح رہے کہ یہ وہی زمانہ ہے جب شیخ عبدالستار اور بابا فتح محمد کی اولاد نرینہ میں سے سجادگی و تولیت رفتہ رفتہ منتقل ہوکر ان کے احفاد میں چلی گئی۔ یعنی ''خانوادہ صدیقی'' سے ''خانوادہ سید'' میں۔

المکتوب الحبیب قلمی (۱۳۳۲ھ) میں حضرت عطا علی صاحب کے تمسک کا نقل درج ہے، جو یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ تمسک اور منسلکہ معلومات دیارِ سندھ میں موجود خانوادہ مسیح الاولیا کی شاخ کا برہانپور میں موجود اپنے چچا زاد بھائیوں سے مستقل تعلق کی ایک اور واضح دلیل ہے۔

نقل تمسک حضرت شاہ عیسیٰ جنداللہ علیہ الرحمۃ من اللہ (عطا علی قادری)

بر کل صغار و کبار مردمان قبائل و عشائر و منسلکان خاندان ایں فقیر پیدا و ہویدا باد۔ وقتیکہ من مقر مذکور نطاق سفر برمیان عزم سمت دار الخلافت مصمم بست خیال بعدم اعتبار نقطہ حیات در حرف دنیا بے ثبات بر ورق خاطر نشست بناء علیہ خرقہ خلافت و سجادہ نشینی روضہ منورہ و خانقاہ مطہرہ حضرت مسیح الاولیا کہ از والد ماجد خود بود بلا مشارکت و مزاحمت احدی کہ یافتہ ام بہ برخوردار محمد غفنفر کہ ہمشیرہ زادہ حقیقی این فقیر ست خلافت و سجادہ نشین درگاہ فیض جاہ بلا اشتباہ حضرت مسیح الاولیا رحمۃ اللہ علیہ دادہ قائم و مقام خود گردانیدہ شد کہ موافق معمول و مستمر من مقر مذکور مراسم عرس و صندل حضرت و

دیگر عرائس بزرگان علیہم والغفران بہ موجب تفصیلی مرقومہ الذیل مسلوک ومرعی میداشتہ باشد در مدخل ومخارج موضع بھنبارہ و موضع رائیکانون وحویلیہا واراضی وغیرہ حصہ مشروط مخارج درگاہ مبارک بہ موجب مرضی و بشرط احکم حضرت والدہ ماجدہ اینجانب دخل نماید دلی استفراج حضرت موصوفہ سرمو تفاوت و انحراف نہ ورزد ونیز این شرط است کہ فاتحہ ہمہ بزرگان موافق تفصیل مرقومتہ الذیل ماہ بہ ماہ می نمودہ باشد و در مخارج کسی معمول کفایت و بہتان نہ درزد و فاتحہ بزرگان این است۔

عرس بحر مواج معارف حضرت شاہ لشکر محمد عارف روز عیدالفطرست عرس شیخ قاسم پدر بزرگوار حضرت مسیح الاولیا در ماہ شوال بتاریخ ششم است۔

عرس حضرت مسیح الاولیا در ماہ شوال بتاریخ چار دہم عرس و سیز دہم صندل مقرر است۔

عرس شیخ ابوالقاسم سرمست فرزند شیخ عبدالستار در ماہ شوال بتاریخ ششم۔

عرس حضرت عبدالستار فرزند کلان حضرت مسیح الاولیا در ماہ جمادی الثانی بتاریخ چہار دہم عرس شیخ محمد مراد ابن شیخ ابوالقاسم سرمست۔ در ماہ ذیقعد بتاریخ بیست و ہشتم وفاتحہ درگاہی صاحب برادر حقیقی جد شریف بتاریخ بیست ہشتم۔

فاتحہ شیخ نظام الدین صاحب ابن شیخ محمد مراد مغفور جد حقیقی این فقیر بتاریخ ششم ماہ صفر فاتحہ شاہ مراد اللہ صاحب والد ماجد این فقیر در ماہ جمادی الاول بتاریخ بیست و پنجم۔

فاتحہ حضرت بی بی خدیجہ اہلیہ حضرت مسیح الاولیاء در ماہ رجب بہ شب بیست و ہفتم۔

عرس شاہ بخش صاحب بندہ شاہ یحییٰ مدنی رحمۃ اللہ علیہ در ماہ ذیلحج روز عیدالضحیٰ مرقد شریف ایشان در محلّہ لوہار منڈی۔

فاتح پھوپھی صاحبہ حقیقی این فقیر مسماۃ حسینی بیگم بنت فاطمہ بیگم بتاریخ ششم ماہ ذی الحج۔

فاتحہ جدہ این فقیر مسماۃ فاطمہ بیگم در ماہ ذی الحج بتاریخ دوم۔

فاتحہ حضرت شاہ یحییٰ مدنی صاحب رحمۃ اللہ اور شب بیست و ہفتم ماہ رجب۔

فاتحہ شاہ یحییٰ صاحب فرزند شاہ بخش صاحب موصوف قدس سرہ ہفد ہم ماہ صفر۔

فاتحہ امین صاحب ومخدوم صاحب برادران حقیقی والد ماجد این فقیر سیز دہم ماہ صفر۔

فاتحہ مامانصاحب نیت برہان الدین خان والدہ حقیقی جد شریف این فقیر ہفت دہم ماہ صفر۔

و فاتحہ این فقیر مسمّی عطا علی شاہ ابن مراد اللہ صاحب مغفور۔

از آمدنی حصہ درگاہ مبارک دہم حصہ پھوپھی صاحبہ مستورہ مسماۃ حسینی بیگم کہ حصہ خود بمن ہبہ نمودہ اند سال بہ سال بہ طریق معقول باید کنانید کہ چہار کس فقیر را برسد۔ تحریر فی التاریخ پنجم ماہ ذی الحجہ ۱۲۲۹ھ یکہزار دوصد و بیست و نہ ہجری۔"

اپنی شرائط، پابندی سے اکثر سجادہ نشین برہانپور لکھتے رہے ہیں، جن پر مہریں طغرائی لگی ہوئی ہیں۔ جس طرح محمد غضنفر صاحب کی اور محمد معز الدین اور مہر مفتی خادم الشرع المتمسک محمد فضل اللہ الرحمٰن مسیح الدین خان مفتی ۱۲۷۹ھ اشہد بمافیہ محمد مقیم ۱۲۷۶ گواہ شد محمد نظام الدین ۱۲۷۶، محمد قطب الدین ۱۲۸۰ھ، وصی النسا ۱۲۹۳ھ، محبوب بی زوجہ محمد معز الدین ۱۲۹۲ھ، ماھو المستور حق محمد قاضی جمیل ۱۲۴۹ھ، شہد بما فیہ عرف اللہ والہ سید محمد جمال الدین گواہ شد۔ مقبول شاہ سر گروہ جمع پاک لطیف صاحب گواہ شد، غریب حسین ست گروہ جمع، شاہ غلام حسین خواجہ گواہ شد، رتن پٹیل (گجراتی الفاظ میں) گواہ شد، اونلا پٹیل (گجراتی الفاظ میں) گواہ شد، کالو پٹیل (گجراتی الفاظ میں) یہ تینوں پٹیل بور گاؤں خود تحصیل کھانڈو ضلع نماڑ میں تھے۔"

پیش کردہ تمسک کے بعد المکتوب میں آگے لکھا ہے کہ سجادنشین برہانپور حال ہی میں بہ زمانہ ۱۳۳۵ھ ہجری پاٹ شریف اور سیوہن سے ہوکر گئے۔ جنہوں نے حضرت مخدوم بصر الدین سیوستانی علیہ الرحمۃ کے سر پر سجادگی مسیح الاولیا کی دستار مبارک باندھی۔

خانوادہ پاٹ شریف وسہوان کے بزرگان جو مہریں استعمال کرتے تھے، ان میں شجرہ حضرت مسیح الاولیا۔ تک جا کر منتہیٰ ہوتا یا "اولادش" حضرت مسیح الاولیا لکھا جاتا۔

مہر کے الفاظ:

۱۲۹۸ھ

من فضل اللہ نقشبندی

خادم الفقراء نظام الدین صدیقی

من اولادت شاہ عیسیٰ پاٹائی ثم برہانپوری۔

بسم اللہ صاحب نے جب سندھ میں پتہ چلا کر وابستگان اخلاف (اولاد نرینہ) مسیح الاولیا سے خط و کتابت کی تو یہ برسوں سلسلہ قائم رہا، جو محمد صاحب کے وصال کے بعد ان کے جانشین محمد منور صاحب کے عہد تک جاری رہا۔ مطیع اللہ راشد برہانپوری ان خطوط کے مطالعہ سے خود مستفیض ہو چکا ہے۔

زمانہ حال میں ''خانوادہ مسیح الاولیاء'' کی کتب، دستاویزات، اسناد اور شجرات سہوان میں مخدوم حکیم محمد حسن صاحب اور پاٹ کے حوالے سے ڈاکٹر حبیب اللہ صدیقی صاحب اور بندہ کے پاس موجود ہیں۔ میاں صاحب احمدی پاٹائی آنرری مجسٹریٹ (المتوفی ۱۹۲۳ء) کے ذاتی دستاویزات میں ایک قدیم خط جس کا ورق سمیٹ کر رکھے جانے کی وجہ سے اوپر اور نیچے کے دو حصے کٹ کر الگ ہو گئے ہیں، درمیانی تحریر سے برہانپور سے لکھے جانے کا گمان ہوتا ہے۔

خط

''در وقتیکہ مخدوم علی گوہر سلسلہ تحصیل اسنادات سرکاری بمبئ تشریف آوردند در آن حال برائی زیارت درگاہ جد امجد خود مسیح الاولیا بسوئی برہانپور رفتند۔ ولیکن بعدہ مدت مدید گذشتہ رابطہ و اطلاعی ہیچ ندارند۔

در سلسلہ اختلافات پیرامون مسئلہ سجادگی وتولیت دل خوفزدہ می ماند۔ مشاغل علمی ہمہ برو تعطل گذاشتند پاسدارئی و روایات اسلاف ہم معطل شدند۔ من در جناب میاں صاحب علی گوہر عرض واشتم کہ شما نجیب الطرفین از اولاد مسیح الاولیاء ہستید از خانوادۂ خود کسی لائق وفائق ہستی رابر مسند برہانپور مامور و معین فرمائید بریں بنا این فقیر وحقیر سبکدوش ازین بارگران می شود۔

شما جناب دربارۂ اولاد مسیح الاولیاء سوالات وارد کردہ اید۔ دریں صدد عرض می داشتم کہ ہمہ اسنادات فرمودات شاہی شجرات ہائ، محضر نامہ ہائی رسالات ومکتوبات و کتب ہائی کثیرہ نذر آتش شدہ بودند۔ زیرا کہ در ہمہ شہر آتش ناگہانی افتادہ بود۔

از روئی روایات اسلاف کہ سینہ بسینہ منتقل می شوند معلوم می شود کہ اولاد مسیح المنقبت کہ از زوجہ اول بود پاتر سندھ مقیم بودند و مسند نشین بودند و تعلقات و روابط متواتر وغیر متواتر از روئی تحریر با اولاد شیخ عبدالستار و فتح محمد داشتہ بودند ولیکن تحریرات مذکورہ ہم غیر موجود و غیر میسر ہستند۔

بریں بنا ماخود را لائق وضاحت مزید نمی شماریم اگر شما دریں بارہ احوال و اطلاعات داشتہ باشید مارا ہم مستفید فرمائیں ۔۔۔۔۔۔''

۱- خط میں ذکر کیے گئے بزرگ مخدوم علی گوہر صدیقی سے زمانہ کا تعین ہوتا ہے۔ آپ ۱۸۹۸ء میں وفات پا گئے تھے۔
۲- مخدوم علی گوہر جب بمبئی گئے تھے تو برہانپور میں اپنے جد مسیح الاولیا کے روضہ کے زائر ہونے کا شرف حاصل کیا تھا۔
۳- خط کے زمانہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید سید عزیز الدین صاحب نے سہون میں مخدوم محمد صاحب کو لکھا ہے۔
۴- حالات کی وجہ سے سجادہ نشین برہانپور (غالباً یہ عزیز الدین) اپنی ذمہ داری سے دستبردار ہونا چاہتے تھے۔

برہانپور اور سندھ میں موجود اخلاف مسیح الاولیا میں ربط کی ایک اور دلیل جو رکارڈ پر محفوظ ہے۔ سید عزیز الدین صاحب کا ۱۹۰۹ء میں پاٹ اور سہون تشریف لانا ہے۔ آپ کی آمد کے وقت خاندانی شجرہ میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے: ''در حال خواہر زادہ و مرشدی سید عزیز الدین ساکن حیدرآباد دکن محلّہ مغلپور حیات است۔''

حضرت بابا فتح محمد محدث کی اولاد میں سے مسیح الدین خان شہابی سہروردی صدیقی جو برہانپور چھوڑ کر حیدرآباد دکن میں آ کر مقیم ہوئے۔ پاٹ اور سیوہن سندھ میں موجود اولاد مسیح الاولیاء سے ملاقات کرنے تشریف لائے، پھر ایک رسالہ تحفۃ الاذکیاء فی بیان مسیح الاولیاء تصنیف کیا۔ جو حیدرآباد دکن سے مطبع ابو العلائی نے شایع کیا۔

تعلیق (۱۰): یہ شیخ عبدالواحد ''متقی'' نہیں۔ شیخ و مخدوم عبدالواحد مفتی ہیں۔ جو غالباً کتابت کی غلطی سے ''متقی'' ہوگیا ہے، ان کا پورا نام ''حضرت مخدوم فخر الدین عبدالواحد کبیر مفتی صاحب کشف الاسرار'' لکھا جاتا ہے۔ یہ وہی بزرگ ہیں، جن کا مختصر ذکر گذشتہ اوراق میں کیا گیا ہے۔
ان کا شجرہ دیتے ہوئے مولانا دین محمد وفائی، تذکرہ مشاہیر سندھ میں رقمطراز ہیں:

> ''مفتی عبدالواحد بن مولانا عبدالرحمٰن قاری (متوفی ۱۰۸۰ھ) بن محمود سہروردی (متوفی ۱۰۷۰ھ) بن شیخ عیسیٰ پاٹائی بن مخدوم حسن قاری پاٹائی (متوفی ۱۰۱۷ھ) بن شیخ رمضان شہر اللہ بن شیخ عیسیٰ جند اللہ پاٹائی برہانپوری (المتوفی ۱۰۳۱ھ)۔ مفتی عبدالواحد سہوانی اور پاٹائی مخدوموں کے دادا ہیں۔ جن کے فرزند دین محمد سیوہن میں آ کر رہنے لگے اور کچھ پاٹ ہی میں رہے، جن سے اس نسل کی دو شاخیں نکلیں۔''

تعلیق (۱۱): مخدوم محمد ابن مخدوم محمد عارف صدیقی ابن مخدوم محمد حسن ابن مخدوم عبدالواحد کبیر پاٹائی، مجذوب طبع، صاحب کرامات اور بڑی فضیلت والے بزرگ تھے۔ خواجہ محمد حسن جان سرہندی، تذکرۃ الصلحاء میں آپ کے لئے رقمطراز ہیں:

''حضرت المخدوم محمد المجذوبؒ جناب ایشان از فحول علماء و سرآمد صلحاء وقت بودند اما آثار جذب کہ از ابتداء حالتش رفیق بود در اواخر عمر شریفش زیادہ تسلط بہم رسانید سکونت ایشان در شہر سیوستان مشہور بہ ''سیون'' کہ از بلاد معروفہ سندھ است بود و در جوار مزار حضرت شیخ مخدوم عثمان مشہور بہ لعل شہباز قلندر خانۂ داشتند ازان سبب حضرت مخدوم خود راقلندری میگفشد ملاقات فقیر با حضرت مخدوم در حدود سنہ یکہزار و سہ ۳ صدودہ واقع شدہ بود وتا حدود سہ یکہزار و سہ ۳ صد و شانزدہ امتداد کشید و در این اثناء چند مراتب بہم اتفاق ملاقات افتادہ صاحب سوز و گداز بود بعضی اوقات در حالت مستی خوارق عادات از ایشان بظہور می آمدند و مردم آن دیار معتقد ایشان بودند۔''

مولانا دین محمد وفائی نے تذکرہ مشاہیر سندھ میں آپ کے متعلق تحریر کیا ہے: ''ان کے وقت میں ہزارہا حاجتمند افراد ان کی خدمت میں دعاؤں کی طلب میں آتے تھے۔ ان کی زبان مبارک سے جو بھی الفاظ نکلتے وہ اس وقت قبول ہوجاتے تھے۔ سیوہن کے قریب دریا میں غوطہ لگاتے تو کوٹڑی کے پاس جا نکلتے تھے۔ اکثر اڑل نہر سے وضو اور غسل کرکے پھر نماز پڑھتے تھے۔ مجذوبی کی حالت کی وجہ سے کبھی کبھی نماز میں سندھی زبان میں مناجات پڑھتے اور دعائیں مانگتے اور کبھی صرف ایک رکعت نفل پڑھ کر بھی اٹھ جاتے۔

اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کے نام سے ان میں بڑا جوش جذبہ اور جلالت پیدا ہوجاتی تھی۔ جس کی وجہ سے جس شخص کے نام میں یہ اسم پاک ہوتا، اس کو بدل کر پکارتے تھے۔ مثلاً میرے استاد حاجی حسن اللہ پاٹائی، جو ان کے قریبی عزیز تھے۔ ان کو حسن الدین کہہ کر پکارتے تھے۔ (یہ واقعہ مجھ سے خود استاد محترم نے بیان فرمایا ہے)

''تذکرۃ الصلحاء'' میں مذکور ہے کہ مخدوم مجذوب جب سیوہن سے حج کے ارادہ سے نکلے تو اس وقت ان کے پاس ایک ٹکہ یعنی دو پیسے تھے وہ پیدل گھر سے حالت جذب میں نکل پڑے۔ مگر قدرت نے توکل اور ہمت کی وجہ سے ان کے لئے ایسے اسباب پیدا کردیئے کہ وہ بمبئی پہنچے اور وہاں سے جہاز پر سوار ہوکر حج کیا۔ مدینہ شریف کے لئے سفر زیارت کیا اور پھر خیریت سے اپنے گاؤں واپس آگئے۔ سیدوں، عالموں اور بالخصوص حضرت امام ربانی شیخ احمد

سرہندیؒ کی اولاد کا بہت ادب اور خیال رکھتے تھے۔ ہندو اور مسلمان ان بزرگ سے یکساں طور پر عقیدت رکھتے تھے اور مانتے تھے اور ان کی دعاؤں کے طالب رہتے۔

انہوں نے دو شادیاں کیں، ایک اپنے عزیزوں یعنی صدیقی خاندان میں اور دوسری خاندان سے باہر آخری عمر میں۔ پہلی سے ایک فرزند مخدوم احمد تولد ہوئے، جن کے فرزند مشہور مخدوم بصر الدین علیہ الرحمۃ گذرے ہیں۔ دوسری سے میاں محمد صادق (راقم تعلیقات کے نانا حضور) پیدا ہوئے۔ آپ جید عالم، صوفی بزرگ اور سیوہن کی قضاۃ کے مالک تھے۔ مگر تصوف کے غلبے کی وجہ سے فتویٰ یا شغل قضا کم ہی جاری رکھتے تھے۔

حضرت استاذی حاجی حسن اللہ پاٹائی کی روایت ہے کہ: ایک دفعہ مخدوم حاجی فضل اللہ پاٹائی مخدوم محمد کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ایک آدمی آیا اور پوچھا: کنویں میں کوا مرا ہوا پڑا ہے، کتنا پانی نکالا جائے؟ جب تک حاجی صاحب جواب دیتے مخدوم محمد صاحب نے فرمایا کہ: حدیث میں آیا ہے کہ **الماء طاهر لا ينجسه شيء**. یعنی کہ پانی پاک ہے اس کو کوئی چیز پلید نہیں کرسکتی۔ آخر میں حاجی صاحب نے خود مسئلہ کا جواب اس طرح دیا، جس طرح فقہ کی کتابوں میں ہے، مگر ان بزرگ کا راستہ جدا اور بالکل سیدھا ہوتا تھا۔

تالپروں کے دور میں جس طرح ان کے دادا بزرگ مخدوم عبدالواحد سیوستانی اور ان کے والد مخدوم محمد عارف کے لئے نذرانے اور تحائف آتے تھے، اسی طرح ان کی اوائلی جوانی میں میر حسن علی خان تالپر حیدرآبادی نے پچاس روپے بطور نذرانہ ان کی خدمت میں بھیجے اور درج ذیل خط بھی ارسال کیا:

> ''مخدوم صاحب مہربان، ولایت و کرامات نشان، غواص بحر و عرفان، شناور دریائے ایقان، مخدوم محمد ساکن سیوستان، خدا جل شانہ آں ولایت نشان را ابدا برفیض مامور فرمودہ است لہٰذا امید واریم کہ درین وقت متوسل حضرت سید قلندر لعل شہباز علیہ الرحمۃ مدام مدد دعاء خیر و عافیت در حق این جانب ارزان فرمائیند۔ مبلغ پنجاہ روپیہ درجہ خیرات نذرانہ ارسال خذمت است و امید کہ خواہد رسید، و بموجب اشارہ آں ولایت نشان ہر انفاس متبرکہ را خدائے تعالیٰ آفریدہ، این جانب از آن بامنیت، خاطر بطمانیت دارند از جانب احمد علی سلام دعا دعا بدرجہ اجابت رسند- ۱۲ شعبا ۱۲۸۱ھ - میر محمد حسن علی''

مخدوم صاحبؒ کو جب یہ خط ملا، اسی وقت پڑھ کر پچاس روپے واپس کرتے ہوئے فرمایا کہ: رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام کے دشمن کا نذرانہ نہیں چاہیئے۔

یہ باکمال عارف کامل نقشبندی طریقے کے بزرگ ۱۵ رمضان شریف ۱۳۱۶ھ میں ۷۶ سال کی عمر میں وفات پاگئے اور سیوہن میں ان کے خاندانی مقبرہ میں سپرد خاک ہوئے۔" (تذکرہ مشاہیر سندھ)

تعلیق (۱۲): اس زمانہ میں واقعی حضرت مسیح الاولیا کی اولاد پاٹ اور سیوہن کے علاقوں تک محدود تھی۔ لیکن آنے والی دھائیوں میں سرکاری ملازمتوں اور جدید طرز تعلیم حاصل کرنے کے ذوق میں رفتہ رفتہ بڑے شہروں حیدرآباد اور کراچی میں آباد ہونے لگی۔ زمانہ حال میں اس خانوادہ کے افراد اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ اعلیٰ سرکاری اور نیم سرکاری عہدوں پر فائز ہیں۔ ان میں سے اکثر انہی شہروں میں مستقل مقیم ہوگئے ہیں۔ جبکہ چند گھر پاٹ اور سہون میں اب بھی آباد ہیں۔

حبیب اللہ سہوانی اور حبیب اللہ پاٹائی کی شخصیات کا ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا۔ یہ دونوں نیک انسان ایک ہی خانوادہ کے فرد ہونے کے باوجود زمانہ اور زاد بوم میں فرق رکھتے ہیں۔ اول الذکر سہون شریف میں پیدا ہوئے آپ نہ صرف عالم و فاضل شخصیت تھے۔ بلکہ خاندانی شجراہ، قلمی مسودات، شاہی فرامین اور اسلاف کی تحریر کردہ کتب کو جمع کرنے میں خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ اس ضمن میں آپ نے نہ صرف مختلف مقامات سے حوالے حاصل کیے بلکہ برہانپور اور حیدرآباد دکن یں موجود خاندان کے افراد سے خط و کتابت جاری رکھا۔ مولانا دین محمد وفائی نے تذکرہ مشاہیر سندھ میں آپ کے مسودات سے استفادہ کیا ہے۔ کرسی نامہ میں آپ کی پیدائش اور والدین کا ذکر ان الفاظ میں تحریر ہے: 'المذنب والعاصی فقیر زادہ باب اللہ حبیب اللہ عفی عنہ تولد در۱۲۶۴ ہجری مقدس، ابن الحاج الراسخ والخاشع مرحوم ومغفور مرید اللہ تولد در۱۲۳۰ھ وفاتش در۱۳۰۷ھ قبرہ در بین قبلتین مکہ معظّمہ مدینہ ومنورہ زاد اللہ شرفا وتعظیمہ ابن مخدوم محمد مراد علی قادری ہربز القابی تولد در۱۱۹۰ھ وفاتش در ۱۲۷۲ھ بوقوع آمد، ابن مخدوم محمد حسن حیدری القادری تولد ۱۱۶۰ وفات ۱۲۲۰، وحضرت نعمان ثانی صاحب البیاض سیوستانی عبدالواحد صغیر تولد ۱۱۵۰ وصال بحق ۱۲۲۴۔۔۔۔۔۔۔۔"

آپ مخدوم محمد مجذوب کے داماد تھے۔ اور سہون سے اکثر شہر حیدرآباد میں مریدوں کے پاس آکر ٹھرتے اپنے آبائی وطن سہون میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہیں۔

جبکہ ڈاکٹر حبیب اللہ ولد میاں قاضی کریم بخش صدیقی پاٹائی ۱ جنوری ۱۹۳۷ع کو پاٹ شریف میں تولد ہوئے دینی علوم کے ساتھ دنیاوی علوم میں مہارت رکھتے ہیں۔ تعلیمی ادارہ میں اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ انہیں بھی ابتدا میں خانوادہ کے تاریخی دستاویزات اور کتب پر کام کرنے کا شوق دامنگیر ہوا اور "تاریخ باب الاسلام" تحریر فرمائی اس کے علاوہ انگریزی اور سندھی

ہیں کئی کتب تحریر کیں۔ جن سے آپ کی علمی قابلیت اور جانکاری کا پتہ چلتا ہے۔ آپ کی دیگر کتب میں ''ایجوکیشن ان سندھ پاسٹ اینڈ پریزنٹ''، ''علامہ آءِ آءِ قاضی کی سوانح''، 'دریا اور ان کے کنارے حیات''، دوشعری مجموعے اور کئی مقالے تحریر فرما چکے ہیں۔ ابھی تک حال حیات ہیں اور معہ نیک فرزندان و دختراں جام شورہ میں مقیم ہو گئے ہیں۔ آبائی وطن صرف زمینات کی دیکھ بھال کے لئے جانا ہوتا ہے۔

تعلیق (۱۳): علامہ دھر، حضرت مخدوم فضل اللہ سیوستانی ثم پاٹائی، میر کرم علی تالپر کے عہد میں سہون/سیوستان میں ۱۲۲۴ھ/ ۱۸۰۹ء میں پیدا ہوئے۔ آپ مخدوم عبدالواسع کے فرزند تھے۔ جو بہت بڑے شاعر تھے۔ اس زمانہ میں پاٹ اور سہون کا یہ ''صدیقی'' خانوادہ علم، ادب، تقویٰ، حکمت اور تصوف کی وجہ سے بڑی شہرت وعزت کا حامل تھا۔ بلکہ قضا کا عہدہ بھی پشت در پشت منتقل ہونے کی وجہ سے یہ شہر کے قاضی بھی کہلاتے تھے۔

مخدوم فضل اللہ نے ابتدائی تعلیم اپنے عم مکرم مخدوم محمد عارف سیوستانی سے حاصل کی۔ آپ کے بھتیجے مخدوم حسن اللہ شاہ صدیقی پاٹائی مفتی اعظم سندھ سے اپنے شاگرد رشید پیر آ قا غلام مجدد صاحب سرہندی ٹیاروی علیہ الرحمۃ کی دستار بندی اور مختلف علوم کی تکمیل کے وقت جو ''سند'' (سرٹیفکیٹ) اپنی مہر سے جاری کیا، اس کی ابتدا میں مخدوم صاحب نے اپنے علمی سلسلہ کا ذکر اس طرح کیا ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

''قرء الفقیر حسن اللہ عفی عنه و عن اسلافه آمین العلم العربی فی الابتداء 'الفوائد الضیائیه' و قدرا من الفقه والتفسیر والمنطق والمعانی من العلامة حافظ القرآن المجاهد فی سبیل اللہ مولانا (مخدوم) محمد شفیع الصدیقی الباتائی علیه الرحمة والغفران وهو قرءَ العلم من عمی الفاضل غواص بحر العرفان مولانا الحافظ الحاج محمد فضل اللہ علیه الرحمة والرضوان وهو قرء من عمه مولانا المرحوم المخدوم محمد عارف السیوستانی وهو من عمه مولانا مخدوم عبدالواحد سیوستانی صاحب البیاض الواحدی المعروف بین الانام............''

۱۸۴۳ء میں پاٹ شریف کے ''قاضی'' میاں صاحب احمدی صدیقی کبیر ابن مخدوم سعید ابن مخدوم مسعود ابن مفتی محمود ابن مخدوم عبدالواحد پاٹائی کبیر نے وفات پائی تو شہر کو ناقابل تلافی

نقصان ہوا۔ ایک طرف مختلف قبائل کی شورش کی وجہ سے بدامنی نے جنم لیا تو دوسری جانب علمی اور مذہبی مشاغل ماند پڑنے لگے۔

ان حالات میں میاں صاحب سعید اور چند عزیزان کرام نے باہمی مشورہ سے حضرت مخدوم فضل اللہ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ نہ صرف سہوان سے پاٹ منتقل ہوں بلکہ یہاں رہ کہ مدرسہ کو اپنی نگرانی میں چلائیں۔ آپ اس بات پر راضی ہوگئے اور اس شہر کی علمی رونقیں دوبارہ لوٹ آئیں۔

آپ نے حضرت مخدوم محمد عارف سیوستانی کی دختر نیک اختر جو اس رشتہ سے حضرت مخدوم محمد مجذوب سیوستانی کی ہمشیرہ تھیں، سے عقد کیا۔ بی بی صاحبہ عابدہ زاہدہ اور تہجد گذار خاتون تھیں۔ آپ کے تقویٰ اور پرہیزگاری کے کئی قصے مشہور ہیں۔ آپ کے بطن سے ایک فرزند ارجمند مخدوم نظام الدین (اول) اور ایک بیٹی بی بی اللہ اوبھائی خاتون ہوئیں۔ حضرت مخدوم نظام الدینؒ (اول) کو نرینہ اولاد نہ ہوئی۔ لیکن بی بی اللہ اوبھائی زوجہ مخدوم علی گوہر صدیقی پاٹائی (اول) کے بطن سے ایک فرزند میاں صاحب احمدی (ثانی) پیدا ہوئے، جو بہ زمانہ انگریز پاٹ کے آنرری مجسٹریٹ تھے، جن کا ذکر گذشتہ اوراق میں ہو چکا ہے۔

حضرت مخدوم فضل اللہؒ کے زمانے کے سندھی معاشرے میں مکتب کے طالب علم کو شرعی احکام ابیات کی صورت میں پڑھائے جاتے تھے۔ مخدوم صاحب کی اکثر تحریریں ''الف اشباع'' کی صورت میں موجود ہیں۔ آپ کے اشعار میں کہیں مکمل داستان بیان نہیں کی گئی، بلکہ واقعات کے اشارتی اور تمثیلی انداز کو قائم رکھا گیا ہے۔ آپ کو عربی، سندھی اور فارسی کا بڑا شاعر کہا جاسکتا ہے۔ ہر چند کہ آپ کا زیادہ تر کلام غیر مطبوعہ ہے۔ آپ کی مندرجہ ذیل تحریریں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ صورت میں موجود ہیں:

۱ – **اصلاح المصلح والمفتاح:** آپ کی یہ تصنیف ''مصلح المفتاح'' کا اضافہ اور اصلاح کہی جاسکتی ہے۔ مصلح المفتاح کے مصنف سید علی محمد شاہ اس کتاب کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں:

> ''آپ کا ایک جاننے والا درس عبدالملک پلی پوٹہ کتاب 'مفتاح الصلوٰۃ' (جو بابا فتح محمد نے تحریر کی تھی) اس کے سندھی ترجمہ کو بڑے ذوق سے پڑھا کرتا تھا۔ یہ سندھی ترجمہ مخدوم انور نے کیا تھا۔ مگر اس میں مسائل کے اختلاف کو سمجھنا اس کے بس کی بات نہ تھا۔ اس لئے سید علی محمد شاہ سے استدعا کی کہ اس سندھی ترجمہ کو مزید آسان بنائیں۔ مفید عام اور ثواب کی خاطر سید علی محمد شاہ نے اصل فارسی کتاب مفتاح الصلوٰۃ کا سندھی ترجمہ بروز سنیچر تاریخ ۲۵ ربیع الثانی

۱۲۷۷ھ کو اس کتاب کا جلد اول بزبان سندھی مکمل کیا، جو بعد میں 'دائرے والوں کی سندھی' مشہور ہوا۔"

کتاب کی اہمیت کے مدنظر سید علی محمد شاہ کے ہمعصر عالم باعمل مخدوم فضل اللہ پاٹائی نے اس سندھی کتاب کا فارسی ترجمہ کیا۔ آپ مقدمہ میں رقمطراز ہیں:

"سید علی محمد شاہ متقدمین اور متاخرین کی مشہور تصانیف اور سندھ کے محقق فقہا کی اسناد سے مفتاح الصلوٰۃ کے اشتباہ کو رفع کیا اور اختلافات کو مختصر بحث میں سموکر اس کتاب کا نام "مصلح المفتاح" رکھا۔ یہ کتاب اہل سندھ کے لئے مشعل راہ بنی۔ مگر غیر سندھی اس کی مٹھاس سے محروم رہے۔ شمالی علاقہ (سندھ) کے رہنے والے ایک شخص شرافت نصاب مروت مآب میاں غلام حیدر جو حرمین شریفین کے سفر پر نکلے ہوئے اتفاقاً 'پاٹ' آئے اور اس فقیر زادہ (فضل اللہ) کے فرزند میاں نظام الدین کے پاس علم کی تحصیل کے لئے ٹھہر گئے اور اتفاقاً اس کتاب (سندھی مصلح المفتاح) کا اسے علم ہوا، تو اس کے مطالعہ کی طرف راغب ہوا۔ مگر سندھی زبان کی مشکلات اس کے ذوق کی راہ میں مانع ثابت ہوئیں۔ اس لئے احقر فضل اللہ نے اس کا فارسی ترجمہ کیا، تاکہ مشکل آسان ہو اور اس کا نام 'اصلاح المصلح والمفتاح' رکھا۔"

حضرت مخدوم فضل اللہ نے اس کا فارسی ترجمہ ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۸ء) میں مکمل کیا۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ سے ثابت ہے:

شکر ز انعام حق نسخہ ای شد بے بدل
ترجمہ ای فارسی آمدہ فیاض کل
سال تمامیتش جست دلم از سروش
گفت کہ "شد ترجمہ مصلح الاصلاح دل"

اس ترجمہ کا نام "اصلاح المصلح والمفتاح" اس لئے رکھا کہ ترجمہ کے ساتھ ساتھ بابا فتح محمد سندھی برہانپوری کے اصل کتاب "مفتاح الصلوٰۃ" اور "مصلح المفتاح" کے کچھ مسائل کے اختتام پر مخدوم صاحب نے اپنی طرف سے "تنبیہات" اور اختلافی رائے کا اظہار کیا ہے۔ اور بعض جگہوں پر ترامیم اور اضافے کئے ہیں۔ آپ کی دیگر کتب کے نام یہ ہیں:

۲- نکاح نامہ ۳- معجزہ
۴- وحدت نامہ ۵- سمندری سوداگر

٦- زیور نامہ　　　　٧- ترتیب الصلوٰۃ
٨- چالیس احادیث　　　　٩- حجاز نامہ
١٠- تصوف نامہ　　　　١١- بیاض فضل اللہ
١٢- متفرق فتوائیں

مخدوم صاحب ٢٥ ربیع الاول ١٢٩٤ھ میں وفات پاگئے۔ آپ کے داماد حضرت مخدوم علی گوہر صدیقی (اول) نے آپ کی مزار پر عالیشان گنبذ بفض نفس کھڑے ہوکر تعمیر کروایا۔

تعلیق (١٤): راشد برہانپوری نے کراچی سے برہانپور خط لکھ کر ان خطوط اور دستاویزات کی نقلیں منگوائیں جو برہانپور کے سجادہ نشینوں اور پاٹ وسہون سندھ میں موجود اولاد مسیح الاولیاء کے درمیان لکھے گئے۔ تاکہ وہ کتاب ہٰذا میں ان کا تذکرہ کرسکے۔ غالباً حکیم لاڈلے صاحب نے کسی صاحب کو یہ کام سپرد کیا، جس نے ان تمام زبوں بوسیدہ مگر نایاب ٹکڑوں کو ملاکر کچھ مواد نقل کیا اور راشد برہانپوری کو کراچی روانہ کردیا۔ جن کا ذکر ''آخری چیز شجرہ'' کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نقل کرنے والے صاحب نے غیر ذمہ داری سے مختلف بوسیدہ ٹکڑوں کو ملاکر مواد کو خلط ملط کردیا ہے اور شجرہ کے ناموں کے تسلسل کو بھی ذمہ داری سے نقل نہیں کیا۔ افسوس کہ راشد برہانپوری نے اس غلطی کی ذمہ داری سندھ سے خط لکھنے والے حبیب اللہ سندھیؒ کے سر لگاتے ہوئے ذرا بھی تامل سے کام نہیں لیا۔

راشد برہانپوری جب یہ کتاب کراچی میں بیٹھ کر لکھ رہے تھے تو تحقیق کے معیار کو پورا کرتے ہوئے اگر پاٹ اور سہون کے کتب خانوں پر ایک نظر ڈالتے تو انہیں اپنی اور برہانپور سے موصول شدہ نقول میں موجود غلطیوں کا احساس ہوتا۔

حبیب اللہ سہوانی سندھی کی تمام تحریریں میری نظر سے گذری ہیں۔ المکتوب الحبیب اور کحل الجواہر کے علاوہ ان کے تحریر شدہ حواشیے آج تک محفوظ ہیں۔ ان میں یہ تمام امور زیر بحث آچکے ہیں، لیکن راشد برہانپوری کی بیان کردہ فرد گذاشتیں کہیں موجود نہیں۔

١- مولانا عبدالقادر مفتی مکہ کو کہیں بھی مسیح الاولیاء کا فرزند نہیں دکھایا گیا ہے۔

٢- نقل کرنے والے صاحب نے مخدوم عبدالواحد مفتی کا شجرہ بھی غلط تحریر کیا ہے۔ واضح رہے کہ مخدوم عبدالواحد نام کی دو شخصیات دادا اور پوتے ہیں۔ یعنی مخدوم عبدالواحد کبیر پاٹائی اور مخدوم عبدالواحد صغیر ہیں۔ ان دونوں شخصیتوں کو ایک ہی دکھایا گیا ہے۔ ان کی پیدائش اور وفات کے سن بھی خلط ملط کردیئے گئے ہیں۔ نیز سلسلہ نسب غلط بیان کیا گیا ہے جو سندھ میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتب چاہے وہ جدید ہوں یا قدیم میں اس طرح

درج ہے:

''مخدوم محمد حسن سیوہانی (یہ مخدوم عبدالواحد صغیر ''صاحب البیاض'' کے بھائی ہیں) بن مخدوم دین محمد بن مخدوم عبدالواحد کبیر پاٹائی مفتی بن شیخ عبدالرحمٰن ابن شیخ محمود ابن شاہ عیسیٰ (ثانی) بن مخدوم حسن قاری بن شیخ شہر اللہ رمضان پاٹائی ابن شاہ عیسیٰ جنداللہ ابن شاہ قاسم علیہ الرحمۃ بن مخدوم یوسف سندھی۔''

مخدوم عبدالواحد کبیر کا ذکر گذشتہ اوراق میں موقعہ کی مناسبت سے ہوچکا ہے۔ یہاں ان کے پوتے مخدوم عبدالواحد صغیر صاحب البیاض کی سوانح پیش کی جاتی ہے۔ تاکہ ہر دو اشخاص کے متعلق پڑھنے والوں کو مغالطہ نہ رہے۔

مخدوم عبدالواحد سیوستانی

مخدوم عبدالواحد سیوستانی صاحب البیاض کو مخدوم عبدالواحد صغیر بھی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ آپ کے جد امجد، دادا، مفتی عبدالواحد تھے۔ انہیں مفتی عبدالواحد کبیر کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ بعض نے آپ کو دادا جان سے ملتے جلتے نام کی وجہ سے عبدالواحد ثانی لکھا ہے اور آپ کے دادا جان کو عبدالواحد (اول) کے نام سے یاد کیا ہے، جو پاٹ سندھ کے مشہور عالم اور مفتی تھے۔

مخدوم عبدالواحد صغیر سہون (سیوستان) میں رہنے کی وجہ سے سیوستانی کہلائے، کچھ لوگ

مخدوم عبدالواحد سیوستانی کو محمد احسان یا قاضی محمد احسان کے نام سے بھی جانتے ہیں۔ لیکن کئی ایک مصنفین آپ کے اس نام سے واقف نہیں۔ جس طرح بابا فتح محمد محدث کے اصل نام عبدالرحمٰن سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔

آپ فقہ حنفی میں مہارت رکھنے کی وجہ سے امام ابو حنیفہؒ کی نسبت سے نعمان ثانی بھی کہلائے (امام ابوحنیفہ کا اسم مبارک نعمان بن ثابت تھا) اس طرح آپ کا پورا اسم مبارک یہ بنتا ہے: ''مخدوم عبدالواحد (قاضی محمد احسان) سیوستانی، نعمان ثانی، صاحب البیاض، الصغیر۔''

آپ کی ولادت با سعادت ۱۱۵۰ھ بمطابق ۱۷۳۷ء میں ہوئی۔ سن ولادت ''فرخ سیر'' سے نکلتا ہے۔

مخدوم سیوستانیؒ کا بچپن اپنے والد حضرت مخدوم دین محمد کے سایۂ عاطفت میں گذرا۔ آپ کے والد بزرگوار شاہان کلہوڑا کی طرف سے مفتی اور وزیر مذہبی امور تھے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مخدوم عبدالواحد صغیر کو اللہ تعالیٰ جلشانہ' نے ایسے خانوادہ میں تولد فرمایا، جس کو دینی مقام اور دنیوی عزت و وقار اور وقعت بھی حاصل تھی۔

جس وقت حضرت مخدوم کی ولادت ہوئی، سہون (سیوستان) علم و فضل کا گہوارہ تھا۔ بڑے بڑے علماء اس شہر میں جلوہ گر تھے اور خود آپ کا خاندان بھی علماء وصوفیاء سے بھرا ہوا تھا۔ مخدوم دین محمد بھی اپنے وقت کے بلند پایہ عالم اور صوفی بزرگ تھے اور سندھ کے مشہور صوفی بزرگ شاہ عبداللطیف بھٹائی سے بڑے گہرے دوستانہ مراسم رکھتے تھے۔ سندھ کا اس وقت کا حاکم میاں نور محمد کلہوڑا آپ پر بڑا اعتماد اور بھروسہ رکھتا تھا۔

مخدوم عبدالواحد سیوستانی نے تمام ظاہری علوم اپنے والد محترم مخدوم دین محمد سے حاصل فرمائے اور قلیل عرصے میں وہ کمال حاصل کیا جو اس وقت سندھ کے فقہاء کا معیار تھا۔ مخدوم صاحب کو فقہ حنفی میں کامل مہارت حاصل تھی۔ مذہب کے کئی مسائل حنفی قانون کو سامنے رکھ کر اپنے اجتہاد سے حل کرتے تھے اور اس وقت کے علماء بغیر کسی حیل و حجت کے بے چون و چرا آپ کے فیصلوں کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کردیتے تھے۔ علوم ظاہری کو اپنے کمال پر پہنچایا اور فقہ حنفی میں وہ درک اور مقام حاصل کیا کہ ''نعمان ثانی'' کے لقب سے یاد کیے جانے لگے۔

آپ جو بھی فتویٰ تحریر فرماتے تھے، اس کو آپ کے ایک شاگرد مولانا محمد افضل نقل کرلیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ فتاویٰ جمع ہوتے ہوتے تین ضخیم جلدوں کی صورت اختیار کرگئے۔ اور اس بیش بہا علمی خزانہ کا نام ''جمع المسائل علیٰ حسب النوازل'' رکھا گیا۔ جو آجکل ''بیاض واحدی'' کے نام سے مشہور ہے۔

علوم ظاہری کے ساتھ ساتھ علوم باطنی میں بھی آپ بلند مقام رکھتے تھے اور علم باطن کی تکمیل آپ نے خانوادہ مجددیہ کے چشم و چراغ، حضرت خواجہ صفی اللہ مجددی رحمۃ اللہ علیہ سے کی، انہیں سے آپ بیعت ہوئے اور انہیں سے اجازت و خلافت حاصل کی۔

آپ کی بیعت کا واقعہ اس طرح سے ہے کہ حضرت خواجہ صفی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے حج بیت اللہ کا ارادہ فرمایا، راستہ میں آپ کا گذر سہون سے ہوا۔ یہاں جب آپ نے قیام فرمایا، تو رات کو خواب میں آپ کو سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زیارت ہوئی، جو آپ سے فرمارہے تھے کہ ہمارے فرزند عبدالواحد کو اپنے سلسلہ طریقت میں داخل کرو۔ چنانچہ جب صبح مخدوم عبدالواحد آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو آپ نے حضرت ابوبکر صدیق کی تعمیل ارشاد کرتے ہوئے، ان کو بیعت فرمایا۔

روحانیت میں آپ کے کمال اور ارفع و اعلیٰ مقام کا اندازہ آپ کے مرشد کے اجازت نامہ سے ہوتا ہے، جس میں انہوں نے آپ کے لئے فرمایا کہ اس عظیم امانت کو ہم اس کے اہل کے سپرد کررہے ہیں۔

خواجہ فضل اللہ مجددی قندھاری اپنی تصنیف عمدۃ المقامات میں آپ کی رفعت و منزلت کا یوں اعتراف کرتے ہیں:

> ''مخدوم عبدالواحد سیوستانی مشہور بہ مخدوم محمد احسان صاحب فضائل و کمالات صوری و معنوی از خدمت ایشان اجازت داشت۔''

تذکرہ مشاہیر سندھ میں لکھا ہے کہ: آپ کے زمانے میں حیدرآباد کے تالپروں میں سے میر کرم علی خان اپنے عروج پر تھا، سہون سے باہر اس کی ایک شکار گاہ تھی، جہاں وہ شکار کھیلنے کے لیے آتا تھا۔ اس وقت اسی جگہ ''کرم پور'' نام کا ایک قصبہ ہے۔ مخدوم صاحب اور سہون کے علماء سے ملاقات کے لئے وہ مجلس بھی منعقد کرتے تھے۔ جن میں علمی بحث و مباحثہ ہوا کرتے تھے۔ اس میں علمی اور اختلافی مذہبی موضوعات بھی زیر بحث آئے۔ ایک روز اسی محفل میں میر کرم علی نے خلافت راشدہ کا مسئلہ چھیڑ دیا اور چونکہ وہ شیعیت کی طرف مائل تھا، اس لئے اس نے کہا کہ در اصل حضور اکرم ﷺ کے بعد خلیفہ برحق تو حضرت علی تھے اور یہ حق بھی انہی کا تھا، لیکن دوسرے خلفاء نے زبردستی اس منصب خلافت پر قبضہ جمالیا۔ اس پر میر محمد عباسی نے جواب میں صحیح مسلم کی حدیث پیش کی کہ ''رسول اللہ ﷺ نے قبل از وفات بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ: اپنے والد ابوبکر صدیقؓ اور اپنے بھائی کو بلا لاؤ کہ میں ان کے لئے لکھ دوں مبادا (میرے بعد) کوئی دعویدار دعویٰ کرنے لگے کہ میں مسلمانوں کا خلیفہ ہوں! حالانکہ اللہ تعالیٰ اور

مؤمن بھی اس سے انکاری ہیں کیوں کہ ابوبکرؓ کے علاوہ دوسرے کی خلافت، اللہ کو پسند نہیں۔'' میر صاحب نے یہ حدیث سن کر غصہ میں کہا کہ: صحابیوں میں ہر حالت میں افضل حضرت علیؓ ہیں۔ جس پر ایک دوسرے حاضر مجلس عالم نے جواب میں یہ حدیث پیش کی کہ: **ما طلعت الشمس ولا غربت علی احد افضل من ابی بکر الا ان یکون نبیاً**۔ یعنی پیغمبر کے بعد حضرت ابوبکرؓ سے بڑھ کر افضل نہ کسی شخص پر سوج طلوع ہوا اور نہ غروب۔ اس پر میر صاحب نے کچھ ایسے لفظ کہے کہ ناراضگی کی وجہ سے مجلس برخواست ہوگئی۔ اس کے بعد میر کرم علی خان جو شاعر بھی تھا، ایک غزل فارسی میں لکھ کر مخدوم عبدالواحد سیوستانی کو بھیجی۔ غزل یہ تھی:

غزل

عافیت یار، یار خواہد شد ... دل دشمن، فگار خواہد شد

می خروشی چرا، تو اے بلبل ... موسم نو بہار خواہد شد

گرچہ بلبل بہ باغ می نازد ... بستہ زلف یار خواہد شد

جان من، در قیامت صغریٰ ... پیش مہدی نثار خواہد شد

نام مشکل کشا علی ولی ... روز محشر حصار خواہد شد

کرم از مہر مرتضٰی بہ نجف ... زائر آں دیار خواہد شد

جواب از مخدوم عبدالواحد سیوستانی

عاقبت یار، یار خواہد شد ... دشمنم بے قرار خواہد شد

چونکہ دلدار در کنار آید ... ہجر ہم برکنار خواہد شد

چوں برون آید از نقاب رخش ... عاشق آں دم نثار خواہد شد

دانہء اشک در غمش آخر ... گوہر شاہوار خواہد شد

کشتہء عشق را، مگر مردہ ... زندہ و پائدار خواہد شد

ہر کہ دارد سعادت ازلی ... دوستدار چہار خواہد شد

خاتم چار یار، صاحب نجف ... از حوادث، حصار خواہد شد

ہمہ اصحاب، یار یکدگراند ... دشمن شان خوار خواہد شد

روز محشر کہ چوں حساب شود ... رافضی شرمسار خواہد شد

میر من گر براہ راست رود بے گمان رستگار خواہد شد
واحدی گرچہ شعر مخفی گفت عاقبت آشکار خواہد شد

کہتے ہیں کہ ان کے اشعار اس طور پر آشکار ہوئے کہ میر صاحب کی وفات کے بعد ان کی قبر سے دھواں نکلتے ہوئے دیکھا گیا۔ پیر غلام محی الدین مجددی قندھاری اس زمانے میں حیدرآباد سے حج کے ارادہ سے گذرے تو ان کی دعاؤں کے نتیجے میں یہ واقعہ ختم ہوا۔ (تذکرہ مشاہیر سندھ)

آپ نے ساری زندگی درس و تدریس، رشد و ہدایت اور عقائد باطلہ کے خلاف برسر پیکار رہ کر گذاری۔ آپ نے تصنیف و تالیف کے ذریعہ کس قدر مخلوق کو فیض پہنچایا، اس کا اندازہ آپ کے ان شہہ پاروں سے ہوتا ہے جو آج بھی مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں، جو تصانیف معلوم ہوسکیں وہ یہ ہیں:

۱- تحریر المسائل علی حسب النوازل مشهور به بیاض واحدی (یہ تین ضخیم جلدوں میں ہے)
۲- حاشیه اشباه و النظائر
۳- رش الانوار حاشیه الدر المختار
۴- کشف الکامن فی علم الباطن
۵- تهدید الغافر فی تعذیب الکافر
۶- تیسیر القدیر فی اضحیة الفقیر
۷- القول الجلی فی تذکیر البغی
۸- رساله در کسب و توکل
۹- جبر السکین فی تسلیمة المسکین
۱۰- تسهیل الصعب فی ابیات الکعب
۱۱- ارشاد الصواب لمن وقع فی بعض الاصحاب
۱۲- لطف اللطیف فی اعطاء الرغیب
۱۳- اربعین فی رشد الطالبین
۱۴- السیر المطلوب
۱۵- ایضاح العاقبة فی طلب العافیة

١٦- نص السارب فی قطع الشارب

١٧- رسالہ در عدالت امیر معاویہ

١٨- رسالہ در حرمت دخان

١٩- دیوان واحدی

٢٠- انشاء واحدی

٢١- اصدق التصدیق بافضیلۃ الصدیق

٢٢- الازھار المتناثرہ فی الاخبار المتواترہ

٢٣- مراۃ الحلیۃ

٢٤- اربعین فی فضل المجاھدین

٢٥- طریق السداد فی وجوب الاعتداد

٢٦- انوار الفیوضات الباطنیہ فی امتیاز اھل الباطن من الباطینۃ

٢٧- ازالۃ الاشتباہ فی قطع ھمزۃ یا اللہ

٢٨- القول الجلی

٢٩- جبر التسکین فی کسر التنوین

٣٠- سبط المقال فی حل الاشکال

٣١- غایۃ الصراحۃ فی تحریم النیاحۃ

٣٢- حسن الفھم والتعقل فی جمع الکسب والتوکل

٣٣- فضائل ربیع

٣٤- اربعین بروایت سراج المسلمین

٣٥- الاستدراک للدوراک

٣٦- البراھین الغر فی منع بیع المحر

٣٧- جودۃ الطبع فی کثرۃ السبع

٣٨- السبیل الواسطین

آپ ۱۴ رمضان المبارک ۱۲۲۴ھ کو خالق حقیقی سے جا ملے۔ اس دنیائے فانی سے علم و معرفت کا آفتاب اپنے پیچھے تحریر وتصنیف کی عظیم روشنی چھوڑ کر غروب ہوگیا۔ ’’آفتاب دین بود و باد بار رحمت‘‘ سے آپ کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔

آپ اپنے زمانہ کے امام ابو حنیفہ ثانی مشہور تھے۔ اس عظیم فقیہ، عالم باعمل، محقق و مدقق، مفتی و صوفی اور صاحب کشف و کرامت بزرگ پر سینکڑوں بلکہ ہزاروں معتقدین، عالیشان گنبذ تعمیر کروانے پر بضد تھے۔ مگر آپ کی وصیت کے سامنے کسی کی ایک نہ چلی۔ آپ کی مزار سادہ کچی کھلے آسمان کے نیچے خاندانی قبرستان میں چھٹو امرانی سہون بائی پاس کے نزدیک موجود ہے۔ یہ وہی وصیت تھی جو ان کے آباؤ اجداد میں شیخ طاہر محدث اور دیگر باشرع بزرگان کرتے آئے ہیں۔

خلیفہ غلام محی الدین سیوستانی نے آپ کے وصال پر ایک قطعہ تاریخ کہا، جس میں آپ کو ''نعمان ثانی'' (امام ابو حنیفہ کا اسم مبارک) کے لقب سے کچھ اس طرح یاد کیا ہے:

قطعہ

پیر عبدالواحد ثانی نعمان در جہاں
جنت الفردوس بادا جائے او اندر بہشت
چوں جنید اندر طریقت ہمچوں نعمان در شرع
چاردہم ماہ رمضان دارِ دنیا را بہشت
او مجدد مائۃ ثانیۃ این بود ثانی عشر
فقہ را تعمیر کردہ چوں در در سلک سُفت
جستم از ہاتف کہ ہاں تاریخ وصلش را بگو
آفتاب دین بود و باد با رحمت بگفت
۱۲۲۴ھ

آپ کی کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ صرف تین صاحبزادیاں تھیں جو سب دینی علوم سے آراستہ اور پیراستہ تھیں۔ چونکہ آپ کا کوئی صاحبزادہ نہیں تھا، اس لیے آپ نے اپنی زندگی میں ہی اپنے داماد اور بھتیجے یعنی اپنے بھائی مخدوم محمد حسن کے صاحبزادے مخدوم محمد عارف کو علم و معرفت سے آراستہ کر کے اپنا جانشین مقرر کر کے تصوف، فتویٰ، رشد و ہدایت، درس و تدریس سب انہی کے سپرد کر دیا تھا۔ سہون کے صدیقی انہی کی اولاد ہیں۔

آپ نے اپنی دوسری صاحبزادی پاٹائی عزیز میاں صاحب حافظ و عالم احمدی المتوفی ۱۸۴۳ء کے عقد میں دی۔ میاں صاحب ٹالپر حکومت کے دوران علاقہ پاٹ میں قضا کے عہدے پر فائز تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مخدوم زادہ قاضی کے لقب سے بھی یاد کیے جاتے ہیں۔ آپ کے دو فرزند مخدوم علی گوہر (اول) اور مخدوم محمد شفیع صدیقی ہو گزرے ہیں۔

حضرت مخدوم عبدالواحد۹ نے اپنی تیسری بیٹی سھون کے مشہور عباسی خاندان میں بیاہی تھی۔ جن کی پشت سے حکیم فتح محمد سیوہانی، قاضی محمد اکبر سابق وزیر تعلیم وغیرہ جیسی معروف شخصیات نے جنم لیا۔ یہ خاندان صحافت اور میڈیا کے حوالہ سے حیدرآباد میں بہت معروف ہے۔

جب دونوں بھائیوں مخدوم علی گوہر اور مخدوم محمد شفیع کے والد محترم نے وفات کی تو یہ انگریزوں کے سندھ فتح کرنے کا ابتدائی زمانہ تھا۔ یہ دونوں بھائی ۸ اور ۹ برس کے صغیر ہونے کی وجہ سے موروثی جاگیر کی اسناد کو سرکار سے تصدیق نہ کروا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ مغلوں کے زمانہ سے ملی ہوئی جاگیر کا بہت بڑا حصہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ فرزند کلاں مخدوم علی گوہر جب بڑے ہوئے تو کراچی اور ممبئی سرکار سے کچھ حصہ اسناد کی بنیاد پر واپس لینے میں کامیاب ہوئے۔ اس سفر کے دوران آپ اپنے جد حضرت مسیح الاولیا کے روضہ کی زیارت کو بھی گئے۔ جس کا مختصر ذکر گذشتہ اوراق میں ہو چکا۔ آپ حضرت مخدوم فضل اللہؒ کے داماد ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی سماجی اور علاقہ کے بااثر شخصیت تھے۔ آپ کے فرزند میاں صاحب احمدی (ثانی) کا مختصر ذکر بھی گذشتہ اوراق میں ہو چکا۔ انہیں تین فرزند مخدوم میاں نصر اللہ، قاضی محمد امین اور میاں صاحب حاجی عبدالقادر ''شاعر'' ہوئے۔ قاضی محمد امین کے علاوہ فرزند کلان اور فرزند صغیر کی اولادیں موجود ہیں۔ جو نہ صرف علم کے زیور سے آراستہ ہیں بلکہ بہت سے اعلیٰ سرکاری نیم سرکاری عہدوں پر فائز ہیں۔ چند کی تصاویر کتاب ھذا میں دی گئی ہیں اور ان کے ناموں کی تفصیل خاندانی شجرہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

مخدوم محمد شفیعؒ: آپ مخدوم علی گوہر (اول) کے چھوٹے بھائی تھے۔ عالم، فاضل شاعر اور وقت کے بڑے صوفی بزرگ تھے۔ ابتدا میں حضرت مخدوم فضل اللہ پاٹائی کی خدمت میں رہ کر تحصیل علم کی اور اس کے بعد آپ محمد یوسف کھنیاری والے سے علم حاصل کرنے گئے لیکن وہاں سے ان کی پیاس نہ بجھی۔ پھر آپ نے حضرت مخدوم بلاولؒ کی مزار پر استخارہ کیا۔ تو اگلے دن چوراہی پر ملنے والے شخص کے مرید ہوجانے کا واضح اشارہ ملا۔ اگلے دن آپ کی ملاقات بخارہ سے آئے ہوئے شاہ محمد سے ہوئی۔ آپ ان کے مرید ہوئے اور انہیں اپنے مہمان خانے لے آئے۔ وہ آپ کے پاس ایک سال رہے۔ آپ نے ان کی اپنے اشعار میں بہت تعریف بھی کی ہے۔

آپ ہمیشہ دین اسلام کے احکامات کو نافذ کرنے اور ان کے ابلاغ میں دن رات لگے رہتے تھے۔ اور دینی امور میں اسقدر سخت جان تھے کہ حق بات کہنے میں کسی طاقت سے نہیں ڈرتے تھے۔ تذکرہ مشاہیر سندھ میں مولانا دین محمد وفائی رقم طراز ہیں: ''مجھ سے میرے استاد

مخدوم حاجی حسن اللہ پاٹائی نے بیان کیا ہے کہ انگریزوں کی حکومت کے ابتدائی دور میں میاں محمد شفیع کی نوجوانی کا زمانہ تھا۔ اور خیر پورناتھن شاہ تعلقہ میں ان کی زمینداری تھی جب ان کے پاس لگان کی چٹھی پہنچی تو محصول دینے سے انکار کرتے ہوئے فرمایا کہ اہل کتاب یعنی عیسائیوں پر ہمارا حق ہے کہ ان سے جزیہ وصول کریں جیسا کہ قرآن شریف میں ہے کہ ''حتیٰ یعطوا الجزیہ عن یدوہم صاغرون'' یعنی کہ اہل کتاب مطیع ہوکر جزیہ دین اس ضد کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان صاحب کی زمین لگان کی وصولیابی میں نیلام کردی گئی، مگر انہوں نے اس کی قطعی پرواہ نہ کی اور اپنے ارادے پر مضبوط رہے۔''

بہت سارے امیر لوگ اپنی بیٹیوں کو بیاہے بغیر بٹھا دیتے تھے محض اس ڈر سے کہ کہیں دولت کے بٹوارے نہ ہو جائیں۔ جب آپ کو یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ کسی بڑے آدمی کے گھر میں نوجوان لڑکیاں بیٹھی ہیں تو ایک مختصر جماعت لے کر اس کے دروازے پر دھرنا مار کر بیٹھ جاتے اور اس وقت تک نہ کھاتے پیتے تھے جب تک وہ لڑکیوں کے ورثاً سے ان کی شادی کا پکا وعدہ نہ لے لیتے تھے۔ چنانچہ کئی نوجوان لڑکیاں آپ کو خطوط لکھ کر مشکل کشائی کے لئے کہتیں۔

آپ نے اسلام کی تبلیغ نہ صرف عوام کو کی بلکہ سرکاری اہلکاروں کو خط لکھ کر بھی اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتے۔ اس زمانہ میں ہندو آفیسر بھی فارسی کے قابل اہل قلم ہوتے تھے۔ لہٰذا ان کو جو دعوت نامے بھیجے گئے وہ زیادہ تر فارسی نظم میں ہیں۔ خیر پور ناتھن شاہ کے کاردار مولچند کو سب سے پہلے اسلام قبول کرنے کے لئے لکھا۔ بعد ازاں اس تعلقہ کے دوسرے کاردار دیوان گیانچند کو ایک خط لکھا۔ گیانچند نے اس سلسلے میں خیر پورناتھن شاہ کے دیندار مولوی مصری شاہ سے مشورہ کیا۔ جنہوں نے کہا کہ یہ بزرگ نیم مجذوب ہیں۔ لہٰذا تمہیں جواب نہیں دینا چاہئے۔ لیکن آپ نے دوسری مرتبہ بھی آپ کو خط لکھا وہ کچھ اس طرح تھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ
شکر خدا کہ این نبی کرد پاک و صاف
از امتش ہزار گناہ و خطا معاف
باترک این باطل یک کلمہ ہر کہ خواند
از شرک ما تقدم بر گردش نہ ماند
برہندو ان . فتاد یا حسرت العباد
قومے ست بے حیا کے کے آن چناں نباد

دیدند از جمال مہا دیو باکمال
از نقص عقل خویش دروراہ گم شدند
این نامہ شد نوشتہ بنام گیان چند
گر عاقل ست می نشودش پند ما پسند
اے کاردار جلد مسلمان شو بیا
این است بخت و دولت، اقبال و کیمیا
منکر مشودکہ بر جسد آفت ہمی رسد
اے البلاء اعظم من آفت الحسد
بکشائے چشم عبرت راہ خدا بگیر
یعنی کہ دین ملت اسلام را پذیر
ارے بنور عقل اگر نیک بنگری
کار پیمبر است نہ کاری ست سرسری
دیدے کہ مولچند ز انکار دین چہ دید
اسپش بجز خرید بیاید خو خرید
بر شاہ مصری و پریل آرد اعتماد
آخر دکان ایشان یک فائدہ نداد
زین پیش نامہ بنو شتم بسوئے تو
تا مدت سہ ماہ نیامد جواب او
میں بایدت نوشت زلا و نعم جواب
برما بلاغ بود و بر خدا حساب

(٦ ذی القعد ١٣٠١ھ)

پھر ١٢ ذی القعد ١٣٠١ھ کو میہڑ کے مختیار کار دیوان پنیہ مل کو اسلامی دعوت کا فارسی میں خط لکھا اور آخر میں سندھی زبان میں تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:

«پنیا پروڙج اکر کو اسلام جو
بھرو بھشتي ونج کلمي کلام جو
ڏرم چڏي وٺ دين سچو محمد جام جو
جو شافع مشفع آھي ڏينھن قيام جو»

دیوان پارومل کو آپ ایک منظور تحریر میں لکھتے ہیں:

"اے قلم کاتب وحی خدائے
دعوت اسلام بگو جا بجائے
است حقے تو بمشک و عبیر
وائے کہ دز دے بتو سازد دبیر
پابدت کہ نامہ بہ پارو نوشت
تا مگر ایندر سقر در بہشت
ایکہ کنی نوکری انگریز
یاد کن از واقعہ دستخیز
دین یقین کہ مسلمانی ست
ملت ہندو ہمہ نادانی ست

مخدوم صاحب نے قصیدہ بردہ شریف کا منظوم سندھی ترجمہ ۱۳۰۲ھ میں کیا۔ ترجمہ کے آخر میں کاتب کے الفاظ یہ ہیں:

'تمام شد بتاریخ ہفتم ماہ جمادی الثانی سنہ ۱۳۰۲ در مسجد مبارک حضور پرنور حضرت آثار شریف لوہری در جوار محلّہ مجاوراں والحمدللہ علیٰ ذالک۔ مترجم قاضی زماں، علامہ دھر، مفسر القرآن، حضرت مخدوم شیخ المشائخ، محمد شفیع صدیقی الپاٹائی"۔

مخدوم صاحب نے نہ صرف قلم سے بلکہ عملاً بھی جہاد جاری رکھا۔ آپ کی تمام کوششیں ایک تحریک کی صورت اختیار کرتے جا رہے تھے۔ بلکہ یہ سب اس خدائی تحریک کا حصہ تھے جس کا مقصد قانون خدا کو ہندستان میں قائم کرنا تھا۔ جو لوگ اسلامی حکومت کھو بیٹھے تھے ان کو بڑا انتظار تھا کہ کسی طرح غیر اسلامی حکومت ختم ہو اور دوبارہ مسلمانوں کی بادشاہت قائم ہو جائے۔ ان ایام میں دوسری افغان جنگ کے زمانے میں افغانستان بہت نازک صورتحال سے گذر رہا تھا۔ انگریزوں کے معاون دوست محمد کی وفات کے بعد امیر شیر علی تخت پر بیٹھے جس کے بعد امیر یعقوب تخت افغانستان پر بیٹھے۔ ان ایام میں امیر ایوب خان کی انگریز دشمنی عوام میں مقبولیت حاصل کرتی گئی۔ اس نے ایران میں جلا وطنی کے دن بھی بتائے۔ سندھ میں میاں محمد شفیع آپ کی جماعت اور دیگر ہم خیال جو انگریز نظام سے نفرت رکھتے تھے، اس انتظار میں تھے کوئی ایسا مرد مجاہد پیدا ہو جو دوبارہ اسلامی نظام کو رائج کرے۔ چنانچہ مخدوم صاحب نے امیر ایوب خان کابلی کی تعریف میں ایک قصیدہ فارسی میں لکھا۔ جس میں فرماتے ہیں:

خسرو عالیجناب، آمدہ ہمچو عقاب
حکم نصاریٰ شد خراب، گردید از عالم نہاں

آمدہ ایوب خان
صوفی صافی صفات، ناصر صوم و صلوات
باد ہمیشہ حیات زندگیش جاودان۔
آمدہ ایوب خان
کرد نصاریٰ وداع بنگل ہائے و قلاع
کا مدار شجاع بچہ شیرژیان
آمدہ ایوب خان

امیر ایوب خان کو تو مطلوبہ مقاصد میں کامیابی حاصل نہ ہوئی لیکن مخدوم صاحب نے اپنے نیک مقصد کو اس قصیدہ میں بیان کر دیا۔ آپ کے فارسی کلام میں بڑی پختگی پائی جاتی ہے۔ میاں خیر محمد جونیجو پاٹائی کو آپ نے منظوم خط تحریر فرمایا:

غریبم و بیکسم اما خوشم بر بوریا اینجا
نہ قارونم نہ خضرم تابیابی کیمیا اینجا
بباغستان شدی محرم بطاؤ سان شدی ہمدم
مہنم چون فاختہ در شورہ ذارے گیاہ اینجا
دلم دوری نمی خواہد، بیاد توہی کاہد
مکان بی طمع اینجا، مقام بے ریا اینجا
اگر ہر سیم بر راسیم وزر باید عجب حال ست
شمارا کارسیم آنجاوکار سیمیا اینجا۔
ازان این نور چشم تیز بین گشتی الحمد اللہ
مکمل . ساختیم چشمت بمیل طوطیا اینجا
"شفیعا" دوستان راباد دائم حب روحانی
چہ باشد جسم خاکی گر ربود آنجاؤ یا اینجا

آپ کی تصانیف میں تفسیر الم، تحفہ الھند کا سندھی ترجمہ قصیدہ بردہ کا منظوم ترجمہ، اور کچھ سندھی، فارسی، عربی اور سرائیکی میں شاعری موجود ہے۔ آپ سے جن علما نے فیض حاصل کیا ان میں افقہ افقہ فی السند مخدوم حسن اللہ شاہ صدیقی پاٹائی کا نام سرفہرست ہے۔ آپ نے ۶۳ برس کی عمر میں ۱۸۹۸ع میں وفات پائی۔ جب حضرت مولانا امروٹی ؒ آپ کی مزار پر دعا کے لئے تشریف لائے تو تقریر کرتے ہوئے۔ فرمایا کہ یہ اس صدی کے بہت بڑے موحد تھے۔"

آپ نے پسماندگان میں دو فرزند حکیم محمد احسان اور مولانا عبدالواحد چھوڑے۔ حکیم محمد احسان کے فرزند پروفیسر شفیع محمد تھے، جو ۱۹۰۲ء میں تولد ہوئے۔ پروفیسر احمد سعید کی کتاب ''بزم اشرف کے چراغ'' مطبع مصباح اکیڈمی لاہور میں انہں مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ''مجاز صحبت'' دکھایا ہے۔ راقم ایک عرصہ تک آپ کی صحبت میں رہا۔ اور اس ولی وقت کو عالم باعمل اور شریعت پر سختی سے عمل کرنے والا پایا۔ کچھ عرصہ NJV اسکول کراچی میں عربی کے پروفیسر رہے۔ پروفیسر ہوتچند، مولچند، گربخشانی اور ڈاکٹر داؤد پوٹہ آپ سے نہ صرف محبت کرتے تھے۔ بلکہ آپ کی صحبت میں رہنے کو غنیمت جانتے تھے۔ ڈپٹی انسپکٹر اسکولس کے علاوہ گورنمنٹ کالج حیدرآباد میں ۱۹۵۲ - ۱۹۵۷ء تک عربی کے پروفیسر رہے۔ آپ کو چار فرزند ہوئے (۱) پروفیسر عبدالواحد یہ ولی صفت نیک انسان پولیٹیکنک کالج حیدرآباد سے عربی پروفیسر کی حیثیت سے رٹائر ہوئے آپ کی اولاد موجود ہے۔ (۲) پروفیسر عبدالاحد بھی عربی پروفیسر رٹائر ہوئے آپ کی اولاد بھی موجود ہے (۳) پروفیسر عبدالوحید جسٹس اسلامی شریعت کورٹ آف پاکستان اسلام آباد کے علاوہ دیگر اہم سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ عالم فاضل اور اہل قلم ہیں۔ آپ کی اولاد بھی موجود ہے۔ (۴) سب سے چھوٹے محمد احسان۔

حضرت شیخ عبدالستار ابن حضرت مسیح الاولیاء قدس سرہٗ

آپ حضرت مسیح الاولیاء کے اولین(۱) فرزند ہیں۔ آپ کی ولادت سے متعلق مولانا اسماعیل فرحیؔ نے مسیح الاولیا کی یہ روایت درج کی ہے۔ مسیح الاولیاء نے فرمایا کہ ایک شب بحالت معاملہ مجھے مشاہدہ ہوا کہ آقائے نامدار رسول مختار صلی اللہ علیہ وسلم مغرب کی جانب سے مشرق کی طرف تشریف لے جارہے ہیں، لوگوں کا ہجوم ہمراہ ہے۔ میں بھی ہجوم میں شریک ہوں اور آنحضرت ﷺ سے زیادہ قریب ہوں، مجھے مہر نبوت کی زیارت ہوئی۔ غور سے دیکھا یہی سمجھ میں آیا کہ اس مہر مبارک میں بالوں اور مسوں کی کثرت ہے۔ میں دیکھ ہی رہا تھا کہ اس میں سے مسہ کا ایک دانہ گرنے لگا۔ میں نے اس کو اٹھا کر منہ میں ڈالا اور نگل لیا۔ جب میں بیدار ہوا، بے ساختہ میرے دل میں یہ بات پیدا ہوئی کہ مسہ کا یہ دانہ یقیناً فرزند کی بشارت ہے جو اللہ تعالیٰ مجھے عنایت فرمائے گا۔ کچھ عرصہ بعد بابا عبدالستار پیدا ہوئے جو واقعۂ خواب کے زمانہ میں بطن مادر میں تھے۔

فرحیؔ کے الفاظ یہ ہیں:

میفر مودند کہ شبے در معاملہ دیدم کہ حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم از جانب مغرب بطرف مشرق تشریف می برند و مردم بسیار در خدمت آنسرور اند و فقیر از ہمہ نزدیک تراست، دریں اثناء نظر من بر مُہر نبوت افتاد۔ در نقش آن مُہر مویہا و مسہا ہمچو دانہ دانہ بود، ناگاہ یک دانہ مسہ در افتاد، من اور ابر گرفتہ در دہن انداختہ و فرد بروم، چوں بیدار شدم در خاطرم دارد گشت کہ مراد ازیں دانہ مسہ فرزندے باشد کہ حق تعالیٰ مرا عنایت کند۔ بعد از یک چند بابا عبدالستار کہ در آن وقت در شکم مادر بود متولد شد۔ (کشف الاحقائق قلمی ص۴۴)

افسوس کہ فرحی نے اس تقریب کی تاریخ درج نہیں کی تاہم واقعات کے تطابق سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ غالباً یہ ولادت باسعادت ۹۸۳ھ میں واقع ہوئی ہوگی جبکہ مسیح الاولیا کا آغاز شباب کا زمانہ تھا اور آپ مرید نہیں ہوئے تھے، بلکہ پیر کی جستجو میں سفر بھی نہیں کیا تھا جو ۹۸۵ھ میں واقع ہوا تھا۔

مولودِ مسعود کی ابتدائی تعلیم حسبِ معمول حضرت ملا احمد کے پاس شروع ہوئی اور مجوزہ نصاب ختم کر کے حضرت شیخ طاہرؒ کے درس میں حدیث و تفسیر کی تعلیم حاصل کی ۱۰۰۴ھ میں ان کا وصال ہو گیا تو مسیح الاولیا نے ہونہار فرزند کی تعلیم اپنے ذمہ لے لی۔ اُس وقت منجملہ دیگر مشائخ زادوں کے شاہ باجنؒ کے پوتے شیخ فرید بھی آپ کے درس میں شریک تھے۔ غوثی لکھتے ہیں کہ:

''مسیح الاولیاء اپنے بڑے بیٹے عبدالستار اور شیخ فرید کی تعلیم و تربیت یکساں فرماتے ہیں۔''

نحو کی تعلیم کے سلسلہ میں آپ نے شیخ عبدالستار کے لئے مولانا جامی کی شرح ضیائیہ پر نہایت مفید حاشیہ لکھا اور علمِ نحو میں دسترس کامل عطا کر دی۔ تصوف کی وقیع و معرکتہ الآرا کتب بھی اپنی نگرانی میں درساً حل کرائیں اور اعمال و مجاہدات پر کاربند کرایا۔ جب ابتداً آپ کو چلہ نشینی کا حکم دیا تو اس خیال سے کہ اعمالِ جمالی کے اذکار میں فروگذاشت یا لغزش خطرناک ہوتی ہے مسیح الاولیاء خود روزانہ آخرِ شب آپ کے حجرے میں تشریف لاتے رہے۔ فرحی نے اس واقعہ سے متعلق کشف الحقائق میں طویل عبارت لکھی ہے جس کا مفہوم یہ ہے:

حضرت مسیح الاولیاء نے مجھے بابا عبدالستار اور چند طالب علموں کو چلہ میں بٹھایا۔ میرے وظائف میں حضرت شیخ عبداللہ صوفی کا رسالہ اورادِ صوفیہ تھا۔ جس کا ایک مرموز مقام مجھ سے حل نہ ہوا تو میں بابا عبدالستار کے پاس گیا اور ان سے حل کرنا چاہا تو اُنہوں نے جواب دیا کہ مجھے اس پر عبور نہیں ہے۔ حضرت قبلہ آخر شب ہر روز تشریف لاتے ہیں، ان سے دریافت کر کے بتاؤں گا۔ چنانچہ دوسرے دن فرحی کو جواب باصواب مل گیا۔ (ترجمہ از کشف الحقائق ص ۵۷)

۱۰۰۹ھ میں برہانپور میں انقلاب سلطنت کا سانحہ پیش آیا۔ فاروقی بادشاہ بہادر شاہ کی بدقسمتی سے دو سو برس تک نہایت عظمت و طنطنہ کے ساتھ شہرت پذیر سلطنت درہم برہم ہو گئی قلعہ اسیر و برہانپور کے فلک فرسا برجوں پر فاروقی پرچم کے بجائے اکبری علم لہرانے لگا۔ انقلابِ سلطنت معمولی بات نہیں ہوتی، پھر اکبر جیسا ضدی و توہم پرست بادشاہ اس بات پر اور بھی جھنجھلایا ہوا تھا کہ ہندوستان کے اکثر و بیشتر مضبوط و مستحکم محاذ تو خادمان درگاہ یا شہزادوں نے تھوڑے عرصہ میں بآسانی مسخر کر لئے، لیکن معمولی سی فاروقی سلطنت کو مسخر کرنے پورے ہندوستان کی فوجی طاقت کے ساتھ خود بہ نفس نفیس موجود رہ کر بھی گیارہ ماہ کے طولانی محاصرے، مکر و فریب اور رشوتوں کی پیشکش بھی بیکار ثابت ہوتی رہی ہے۔ ضعیف الاعتقادی سے یہ بات اُس کے دل میں جم گئی کہ یہاں کے مشائخ اور صوفیائے عظام فاروقی بادشاہ کے لئے وظیفے پڑھتے ہیں۔ اس لئے فتح نہیں ہوتی۔ چنانچہ ملک پر تسلط ہوتے ہی برہانپور کو تاراج کرنے کے علاوہ مقبولِ انام مشاہیر صوفیا و مشائخ کو چن چن کر اپنے ہمراہ آگرہ لے گیا۔

مسیح الاولیاء بھی اس افتاد سے دوچار ہوئے۔ آپ کی غیر موجودگی میں شیخ عبدالستار ہی کو خانمان کے کاروبار سنبھالنے پڑے اور امن وسکون ہونے کے بعد مسیح الاولیاء کی واپسی تک آپ نے خانقاہ اور مدرسہ کا انتظام درس وفقراء کی سرپرستی کو بوجہ احسن انجام دیا۔

آگرہ سے واپسی کے بعد مسیح الاولیاء نے آپ کو مزید عارفانہ رموز واسرار سے بہرہ ور فرمایا اور مریدین و طالبانِ حق کی تعلیم میں آپ سے مدد لینے لگے، چنانچہ مرید عورتوں کی دامنی لکھنے کا کام عموماً شیخ عبدالستار ہی انجام دیتے تھے۔ الغرض حضرت مسیح الاولیا کی زندگی ہی میں آپ جملہ علوم ظاہری و باطنی و نیز اخلاق واطوار میں اپنے والد محترم کے نقش ثانی ہوچکے تھے۔ حضرت کے وصال کے بعد سجادہ نشینی آپ کو تفویض ہوئی اور آپ نے مسیح الاولیاء کی جانشینی کے فرائض بوجہ احسن انجام دیئے۔

خواجہ ہاشم کشمی مجددی نقشبندیؒ نے زبدۃ المقامات میں بسلسلۂ تذکرہ حضرت شاہ عبدالاحد قدس سرہٗ لکھا ہے۔

شیخ عبدالستار کہ صاحب سجادہ است جوانِ قابل و فاضل و صاحبدل است۔

آپ فطرتاً نہایت سیر چشم اور فیاض تھے، بسا اوقات حاجتمندوں اور سائلوں کو اس قدر دے ڈالتے کہ متعلقین کو عسرت کا سامنا ہوجاتا۔ ایک مرتبہ آپ کے ہمدرس اور محبِ خاص شیخ فرید نے فیاضی میں احتیاط کرنے کا مشورہ بھی دیا، لیکن آپ ہاتھ روکنے پر قادر نہ ہوسکے، عسرت سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن آپ نے کچھ پروانہ کی حضرت شیخ برہان رازِ الٰہی کے ملفوظات میں یہ واقع اس طرح مذکور ہے۔

میفرمودند کہ بابا عبدالستار را کہ شیوۂ سخاوت بسیار بود میاں شیخ فرید منع سخاوتِ بسیار نمودند و فرمودند کہ چنین مکنید کہ اثر تفرقہ قلوب سائلان بدل جمع شما اثر کند۔ آخر الامر چنانکہ میاں شیخ فریدی فرمودند ہماں شد و تفرقہ عظیم وے داد۔

(روائح الانفس قلمی ص۹۲ رائحہ ص۱۷۶)

آپ مسیح الاولیاء کی حیات میں سب سے زیادہ ان کے ہمدم و ہمراز رہے ہیں۔ حضرت کے بعض فیض رساں اعمال و دیگر خلفاء آپ ہی سے معلوم کیا کرتے تھے۔ چنانچہ جب مسیح الاولیاء کے فیضانِ مسیحائی کا شہرہ ہوا اور انبوہ در انبوہ لوگ مریضوں کی شفایابی کی دعا کے لئے حاضر ہونے لگے۔ آپ پانی پر دم کرکے دے دیا کرتے اور ہر مرض کا قلع قمع ہوجاتا۔ ایک روز فرحی نے بابا عبدالستار سے دریافت کیا کہ حضرت کیا پڑھ کر پانی پر دم کیا کرتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ اپنے پیر کا اسم گرامی۔ فرحی نے بڑی سادگی سے یہ واقعہ ان الفاظ میں تحریر کیا ہے۔

روزے این ضعیف بہ حضرت بابا عبدالستار کہ فرزند کلاں حضرت پیر دستگیر بودند پرسید کہ حضرت ایشان برائے بیماران بر آب چہ میخواندر۔ فرمودند کہ نام پیر خود خواندہ بر آب فف میکنند۔ (کشف الحقائق قلمی ص۳۲)

آپ کو حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ سے بلا واسطہ کسب فیض کا باسعادت شرف حاصل تھا۔ فرحؔی نے یہ واقعہ اس طرح لکھا ہے:

روزے بابا عبدالستار بحضرت پیر دستگیرؒ عرض نمودند کہ امروز در بیداری حضرت اسداللہ الغالب ومظہر العجائب حضرت علی کرم اللہ وجہہ در بیداری بحجرۂ من تشریف فرمودہ تا دیر نشستند وبہ علوم عجیب وغریب مستفیذ ساختند۔ بعد شنیدن آنحضرت فرمودند کہ اول پیشِ من تشریف آوردہ در مکالمت بودند بعد ازاں در وقت برخاستن من التماس نمودہ بشما فرستادم۔ (کشف الحقائق ص ۸۷)

آپ اپنے علم وفضل عمل وریاضت، سخاوت وہمدردی سے تا زندگی عوام وخواص وطالبانِ حق کو دینی دنیوی وروحانی فیض پہنچاتے رہے اور ہمہ اوقات اپنے عالی منزلت اب وجد کے نقشِ قدم پر گامزن رہے۔ وصال کا سن معلوم نہ ہوا۔ ۱۴ جمادی الثانی کو عرس ہوتا ہے۔ آپ کا مزار کھلے صحن میں حضرت مسیح الاولیاء کے مقبرہ کے عین مقابل جانب جنوب واقع ہے۔ مزار کے سرہانے صرف ایک محراب دار دیوار تعمیر ہے جس کا طول وبلندی ونقش ونگار قطعاً گنبد کی دیوار کے مماثل ہیں۔ مسجد میں کھڑے ہوکر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ مسیح الاولیا کے مقبرے کے پائین جانب اسی نمونہ کا دوسرا گنبد بنا ہوا ہے۔ یہ مقام آپ کا حجرۂ عبادت تھا۔ آپ کے مزار سے بھی نیازمندوں کو مرادیں ملتی ہیں۔ چونکہ احاطۂ درگاہ میں داخل ہوتے ہی آپ کا مزار پیشِ نظر ہوتا ہے۔ اس لئے ہر زائر بلا ارادہ پہلے یہاں فاتحہ پڑھنے پر بے اختیار عازم ہوجاتا ہے۔ نیز خاص بات یہ بھی ہے کہ حضرت مسیح الاولیا کے روضہ میں داخل ہوتے وقت طبیعت پر ایک خاص قسم کی ہیبت سی طاری ہوتی ہے، لیکن بابا عبدالستار کے مزار پر فاتحہ پڑھ کر روضۂ شریف جانے پر کوئی گھبراہٹ نہیں ہوتی۔ یہاں سے فارغ ہوکر آگے بڑھنا گویا حصول اجازت ہے۔ یہ چیز بے شمار لوگوں سے معلوم ہوئی اور نیازمند راقم الحروف کے تجربہ میں ہمیشہ یہی ثابت ہوا۔ یقین نہ کرنے والے آج بھی تصدیق کر سکتے ہیں۔

آپ کے وصال کی تاریخ صحت سے نہ معلوم ہوسکی، لیکن یہ تحقیق ہے کہ اس وقت آپ کے فرزند شیخ ابوالقاسم سرمست جو مجذوب الحال ہونے کے علاوہ سنِ شعور کو نہیں پہنچے تھے اور جد و پدر کی مسند رشد و ہدایت کو بوجہ احسن سنبھالنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ اسی لئے خانقاہ کے طالبان حق کو جن کے درجات قریب التکمیل تھے بابا فتح محمد محدثؒ نے حضرت شیخ برہان الدین راز الٰہی کی طرف رجوع کردیا تھا۔

☆

تعلیقات

تعلیق (۱): مسیح الاولیا شیخ عیسیٰ جنداللہ کو منکوحہ اول سے شیخ عبدالستار پیدا ہوئے۔ ان کی زاد بوم اور تاریخ پیدائش کے متعلق گلزار ابرار اور دیگر تذکرے خاموش ہیں۔ حتیٰ کہ بیس بیس سال حضرت مسیح الاولیا کی صحبت اور محفل میں آنے کا دعویٰ کرنے والے بھی ان کی زاد بوم کا ذکر نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ سال پیدائش کے علاوہ وفات کا بھی انہیں ٹھیک اندازہ نہیں۔

مسیح الاولیا شیخ عیسیٰ جنداللہ کی ابتدائی زندگی، ان کی منکوحہ اول کا پاٹ سے تعلق، اور آپ کا مخدوم عباس کی رحلت ۹۹۸ھ کے وقت با استحاق رشتہ داری جانشین ہونے کے علاوہ مقامی روایات شیخ عبدالستار کی زاد بوم پاٹ شریف سندھ ہونے کا واضح اشارہ کرتی ہیں۔

آپ اور شیخ شہر اللہ رمضان یکے بعد دیگرے جب منکوحہ اول کے بطن سے پیدا ہوئے، تو شیخ عیسیٰ کی عمر عزیز بیس سال سے زائد نہیں تھی۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے ہمیں چند اہم باتوں کو ذہن میں رکھنا پڑے گا:

۱- اس زمانہ میں کھاتے پیتے مذہبی گھرانوں میں پندرہ سے بیس سال تک کی عمر میں شادی عام تھی۔ اب بھی ایسی مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ خاص کر کے آپ کا گھرانہ جس نے علم وعرفان کی جستجو کے لئے سفر کو اپنی حیات مستعار کا حصہ بنالیا وہ تو زندگی کے ان جھمیلوں سے فوری طور آزاد ہونے کی نیت سے اپنے فرزندوں کا جلدی عقد کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔

۲- مسیح الاولیا کی نوعمری میں شادی کی وجہ سے آپ کی حیات میں ہی سندھ میں آپ کے پوتے بلکہ پڑپوتے جنم لے چکے تھے۔

۳- شیخ عبدالستار اور ان کے والد محترم میں ۲۰ سال یا اس کے قریب کا فرق محسوس کرنے سے ہی یہ حقیقت بھی سمجھنے میں مددگار ہوگی کہ جب ۱۰۰۸ھ میں شیخ عیسیٰ ۴۵ سال کے تھے اور انہیں اکبر اپنے ہمراہ آگرہ لے گئے تو شیخ عبدالستار کم از کم ۲۵ برس کے تو ہوں گے کہ خانقاہ کے امور کو بطریقہ احسن انجام دیتے رہے۔

۴- جب حضرت مسیح الاولیا ۱۰۳۱ھ میں وفات پاگئے تو شیخ عبدالستار بھی جلد ہی اپنی طبعی عمر کو پہنچ کر وفات پاگئے۔

۵- ۱۰۳۱ھ میں شیخ عبدالستار کی عمر عزیز اوپر بحث کئے گئے حساب سے ۵۱ سال یا اس کے قریب ہوتی ہے۔ اگر اللہ رب العزت کا فضل شامل حال ہو، جوکہ یقیناً چہرہ پر سکون کی عجیب کیفیت اور طبیعت میں اطمینان کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور جسمانی صحت بھی ٹھیک ہو تو ۵۱ سال کی عمر کے انسانوں کو جوان کہا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب صاحب ''زبدۃ المقامات'' خواجہ محمد ہاشم کشمی صاحب برہانپور تشریف لائے اور آپ کی ملاقات شیخ عبدالستار سے ہوئی تو ان کے متعلق لکھا کہ: شیخ عبدالستار کہ صاحب سجادہ است جوان قابل و فاضل وصاحب دل است۔

شیخ عبدالستار اور نقشبندیہ سلسلہ

حضرت مسیح الاولیا شیخ عیسیٰ جنداللہ سلسلہ شطاریہ کے بہت بڑے بزرگ تھے۔ انہوں نے اپنے مرشد شیخ لشکر محمد عارف کی خانقاہ کا صحیح صحیح جانشین ہونے کا ثبوت دیا۔ بلکہ آخر زمانہ میں سلسلہ شطاریہ میں ان کا ثانی پورے ہندستان میں ملنا مشکل ہے۔ لیکن خاندانی قلمی ذرائع اور سلسلہ نقشبندیہ کی مختلف کتب اس بات کے واضح دلیل پیش کرتی ہیں کہ آپ سلسلہ شطاریہ کے ساتھ ساتھ قادریہ اور نقشبندیہ کی ترویج میں بھی حصہ لیتے رہے۔ حالانکہ آپ نسبی طور سہروردیہ خانوادہ کے بزرگ ہیں۔

المکتوب الحبیب قلمی میں لکھا ہے:

«پر انهيءَ راهہ (نقشبندي) جي فوقيت جي سخبري حضرت مسيح الاوليا کي هئي ۽ انهي طرق جي خاصگي جا عادل شاهد هئا. جنهن کان صاحب زبدت المقامات فيض گير حضرت مجدد امجد جو ۽ خليفه اجل حضرت خواجه سيد نعمان نقشبندي برهانپوري قدس اسرارهم جو شڪر گذار يا چمار هو يعني عادل شاهد انهيءَ طرق جي فوقيت جو شروعات انتشار ۾ هڪڙو حضرت مخدوم عبدالاحد والد امجد حضرت مجدد جو سرهند مان ۽ ٻيو عادل شاهد حضرت امام المحدثين مسيح الاوليا پاڻائي برهانپوري النقشبندي القادري الشطاري العشقي قدس اسرارهم هند ۾ هئا. ڏسو زبده المقامات تذڪره خواجگان نقشبندين جي ۾. جن ڏينهن ۾ اجا راهہ نقشبنديءَ جي پوري پڪڙيل نہ هئي،

تن ڏينهن ۾ مسيح الاوليا جا ڳڏيات راهہ نقشبندي ۾ بہ هئا پر
گهٽو ڪري پاڻ حضرت قدس سره پيشوائي راهہ شطار پاڪ جا
هئا. اها راهہ پنهنجي متي خصوصيت تي ڏيڪاري عرفان حق
جيجي هي اهو مخصوص طرق هو جو حضرت مجدد امجد بہ
انهي بحار جي فيض ڪان سيراب هئا، جن ڏينهن ۾ حضرت
نعمان خليفہ حضرت مجدد امجد اجازت گير تي برهانپور شهر ۾
راهہ نقشبندي جي پکيڙ تي ڪئي تن ڏينهن ۾ بہ پيرا موتيا ويا.
وريو وريو مرشد جي خدمت ۾. چوتہ ترويجي طرق جي نہ تي
سگهي هئي. قادرين ۽ شطارين جو اڪمل شغل هو ۽ ڪي
ڪتاب چون ٿا تہ طرق نقشبندي چلت برهانپوري ڏيہ ۾ مسيح
الاوليا جي ترغيب تحريص ساڻ زور ورتو هو. اهڙا عنوان
ڪتاب زبده المقامات مان چونڊي ڏسو ۽ تاريخ برهانپور مان
بہ. حضرت مجدد امجد ۽ مسيح الاوليا قدس اسرارهم جي پاڻ
۾ ڪمال محبت هئي. جو منظور صحبت مسيح الاوليا جو هو
سوئي منظور حضرت مجدد وٽ هو.»

المکتوب الحبیب کے اس بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ شروع میں حضرت مخدوم عبدالاحد والد امجد حضرت مجدد علاقہ سرہند میں اور حضرت مسیح الاولیا پاتائی ثم برہانپوری برہانپور میں اس طریقہ کے بزرگ تھے۔

ایک اور قلمی کتاب ''الناطق بالحق'' جو مخدوم محمد عارف صدیقی سیوستانی المتوفی ۱۲۵۸ھ کی فرمائش پر لکھی گئی، جس میں مندرجہ ذیل اہم باتیں درج ہیں:

(۱) هر هڪ سرهند ۽ ڪن ياڳن افغانستان ۽ ديار هند
مان حضرت قدوت الواصلين مخدوم عبدالاحد قادري
فاروقي والد امجد حضرت مجدد بادشاهہ نقشبندي
سرهندي فرخ شاهہ شهاب الدين حاڪم ڪابلي بمشرب
طرق سهروردي نسل مان.

بيو سنڌ ديار مان هندستان خاص شهر دارالسرور برهانپور ۾
حضرت قطب الاقطاب مسيح الاويا عين العرفان جندالله

شيخ عيسيٰ سنڌي قادري شطاري عشقي نسبا شهابي السهروردي اصل ۾ ساڪن قبه الاسلام پاتر آخرا برهانپور ۾ هي حضرت پنهنجي اوائل حياتي ۾ نقشبندي طرق جو مخبر هو....

آگے لکھا ہے:

(۲) «الحمدلله والسلام علي عباده الذي اصطفيٰ انهن حضراتن ۽ برگزيدن بزرگوارن کان ابتدا جوهر شناسي راهه نقشبندي جي خلق ۾ ناشي هوي گويا مٿن پانگن زمين جيتي اهيي ۽ سڳورا پيشوي ۽ ترغيب بخش هدايت راهه سڳوري جا هوا تي. اطراف اڪناف ۾ رغبت ۽ محبت سلسله نقشبندي جي پيدا تي چڪي هئي.» (الناطق بالحق)

المکتوب الحبیب اور الناطق بالحق کے بیانات کی تصدیق زبدۃ المقامات سے ہوتی ہے۔ اس کتاب میں بعنوان ''حضرت مخدوم عبدالاحد کی سیر و سیاحت'' کے تحت لکھا ہے:

''حضرت مخدوم (عبدالاحد) نے دوسرے سلسلوں کا سلوک طے کیا تھا اور اُن طریقوں کی برکتوں سے بہت عالی نسبتیں حاصل کی تھیں۔ لیکن سلسلہ نقشبندیہ سے بہت زیادہ خلوص اور اشتیاق تھا۔''

صاحب زبدۃ المقامات آگے لکھتے ہیں:

''راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ جب میں نے حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ سے یہ حکایت سنی تو میں اپنے دل میں کہنے لگا کہ کیا دیگر مشائخ سلاسل پر بھی حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کی نسبت کا جمال جلوہ گر ہوا تھا۔ یا وہ صرف حضرت مخدوم تک مخصوص تھا؟ چنانچہ جب میں حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کی خدمت سے رخصت ہوکر برہانپور پہنچا تو حضرت شیخ عیسیٰ سندھی جوکہ اُس علاقے کے عظیم مشائخ میں تھے حال وقال کے جامع اور تفسیر انوار کے مصنف تھے، شیخ لشکر محمد کے خلیفہ تھے اور وہ شیخ محمد غوث کے خلیفہ تھے۔ انشاء اللہ ان بزرگوں کا حال مجمل طور پر چوتھے مقالے میں آئے گا۔ میرے پہنچنے سے ایک سال قبل ۱۰۳۱ھ میں انتقال فرما چکے تھے تو میں بطور تعزیت ان کے فرزندوں کے پاس گیا۔ اُن کے بڑے فرزند شیخ عبدالستار جو سجادہ

نشین ہیں، قابل و فاضل اور صاحب دل بھی ہیں، کہنے لگے کہ ہمارے والد اور شیخ اپنی آخری عمر میں فرمایا کرتے تھے کہ: "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام سلسلوں کی نسبتوں کا خلاصہ نسبت نقشبندیہ ہے اور ہم بھی اب خود اسی نسبت پر قائم ہیں۔"

میں نے دل میں کہا کہ اس نسبت کے لیے یہ دوسری شہادت حاصل ہوئی اور مدعا کے لیے یہ دو شاہد عادل مل گئے۔ الحمدللہ والمنۃ۔"

(زبدۃ المقامات)

زبدۃ المقامات سے شیخ عیسیٰ جنداللہ کے سلسلہ نقشبندیہ کے بھی شاہد عادل ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ اس کے علاوہ الناطق بالحق سے تو ان کے شروع ایام میں بھی دوسرے سلاسل کے ساتھ سلسلہ نقشبندیہ کے شاہد عادل ہونے کی وضاحت ملتی ہے۔ خانوادہ مسیح الاولیا کی پاٹ سندھ میں رہنے کی تاریخ علم و عرفان کی اعلیٰ مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔ باوجودیکہ یہ خانوادہ نسلاً شیخ الشیوخ شہاب الدین السہروردی بغدادی سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن دیگر سلاسل تصوف کی افادیت کا منکر نہیں رہا۔ ان کی فیوض و برکات سے ہر دور میں مستفیض ہوتا رہا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اس زمانہ میں اکثر بزرگان حق چاروں سلاسل میں اجازت یافتہ ہوتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ تاریخ میں ان کا نام کسی ایک سلسلے سے منسلک ہوکر شہرت حاصل کرچکا ہو یا خود بزرگ نے کسی ایک پر زیادہ توجہ مرکوز کی ہو۔

شیخ ابو نجیب عبدالقاہر سہروردی خود سلسلہ سہروردیہ کے بہت بڑے بزرگ اور خانقاہ کے شیخ تھے۔ ان کی علمی حیثیت کسی سے پوشیدہ نہیں۔ لیکن حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے صحبت کا تعلق نہ صرف خود قائم رکھا، بلکہ اپنے جانشین بھتیجے شیخ الشیوخ عمر بن محمد شہاب الدین السہروردی کو بھی طالب علمی میں ان کی صحبت کا فیض لینے کیلئے خود لے گئے۔ حضرت مسیح الاولیا بھی جب حضرت شیخ لشکر محمد عارف کے جانشین مقرر ہوئے تو برہانپور میں سلسلہ سہروردیہ کی شاخ شطاریہ کے شغل کی طرف زیادہ متوجہ رہے اور ان کا اسم مبارک بھی اس سلسلہ سے منسلک ہوگیا۔ لیکن آپ سلاسل قادریہ اور نقشبندیہ کے بھی شاہد عادل تھے۔ یہی اشارہ آپ کے والد گرامی عم مکرم اور دیگر افراد خاندان کا ملتا ہے۔ عرفان کے ساتھ ساتھ علم کی دنیا میں بھی ان کی حیثیت مسلم حقیقت ہے۔ شیخ طاہر عم مکرم مسیح الاولیا، حضرت غوث گوالیاری کے خلیفہ تھے، لیکن وہ ایک محدث کی حیثیت سے زیادہ معروف ہیں۔ حضرت شیخ قاسم، شیخ بہاء الدین ثانی سہروردی سے بیعت تھے۔ لیکن آپ بھی محدث کی حیثیت سے تاریخ کی کتب میں جانے جاتے ہیں۔

نیشنل آرکائیوز کراچی کلفٹن میں ایک نسخہ تفسیر یعقوب چرخی موجود ہے، جس کی کتابت ۹۷۷ھ میں امۃ اللہ المسماۃ حبیبہ سلطان بنت محمد قاسم محدث نے کی ہے۔ مولانا یعقوب چرخی رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۸۵۱ھ حضرت بہاء الدین نقشبند قدس سرہ کے خلیفہ تھے۔ آپ کی شہرت آج بھی آپ کی تفسیر کی وجہ سے ہے، اس کی ۹۷۷ھ میں کاتبہ بنت (شیخ) قاسم محدث یعنی حضرت مسیح الاولیا شیخ عیسیٰ جنداللہ کی بڑی بہن ہیں۔ نقشبندیہ سلسلے کے بزرگ کی تفسیر کی کتابت ان افراد کے سلسلہ نقشبندیہ کی طرف رجحان کو ثابت کرتی ہے اور حضرت شیخ قاسم محدث شیخ بہاء الدین ثانی سہروردی سے بیعت ہونے کے باوجود سلسلہ نقشبندیہ سے بھی تعلق میں تھے۔ لیکن یہ بحث اوپر ہوچکی کہ ان بزرگان کے عرفانی دنیا کے کئی پہلو انسانی آنکھ سے پوشیدہ ہیں۔

تصوف کا سلسلہ نقشبندیہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور ان کے پوتے سیدنا امام شیخ قاسم بن محمد سے مروج ہے۔ برصغیر میں اس سلسلہ کی ترویج خواجہ خواجگان بہاء الدین نقشبند ۷۱۸-۷۹۱ھ/ ۱۳۱۸-۱۳۸۹ء سے ہوئی۔ جن کے بعد یہ سلسلہ نقشبند مشہور ہوا۔

سرہند کے فاروقی صوفی بزرگان کی کاوشوں سے اس سلسلہ کو ہندستان میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ حضرت امام شیخ احمد بن عبدالاحد فاروقی سرہندی المعروف امام ربانی مجدد الف ثانی (۱۵۶۳-۱۶۲۴ء) حضرت خواجہ رضی الدین محمد باقی باللہ سے دست بیعت تھے۔ ہندستان میں آپ کی تبلیغ کا عرصہ قلیل تھا۔ تاہم حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ اوران کے خلفا شیخ تاج الدین، شیخ الہداد، خواجہ محمد نور اور مرزا حسام الدین نقشبندی نے اس سلسلہ کو ہندستان میں عام کیا اور اکبر کے دین الٰہی کے اثرات کو زائل کرنے میں کامیاب گئے۔

ہندستان کے دو ہمعصر درخشندہ صوفی، مسیح الاولیا شیخ عیسیٰ بن قاسم پاٹائی برہانپوری صدیقی اور شیخ احمد بن عبدالاحد فاروقی سرہندی مجدد الف ثانی اکبر کے دین الٰہی کے مخالف سمجھے جاتے ہیں۔ سید عبدالقادر بدایونی اکبری دور کے مورخ بھی شدید مخالفین میں شامل تھے۔ جب اکبر نے ''اسیر گڑھ'' کے قلعہ کو فتح کرکے برہانپور کو مغل سلطنت میں ضم کیا تو مسیح الاولیا کو نظر بند کرکے آگرہ لے آئے۔ حضرت مسیح الاولیا برہانپور کے شطاری خانقاہ کے شیخ تھے، جو آپ کے مرشد شیخ لشکر محمد عارف کی وصیت کے مطابق آپ کے سپرد تھی اور یہ سلسلہ غوث گوالیاری کے ارشاد کے مطابق قائم تھا۔ وہ خود بھی اکبری دربار سے بے نیاز ہوکر گوالیار میں وفات پاگئے۔ حضرت مجدد الف ثانی نے اکبر آباد میں نقشبندیہ خانقاہ قائم کی۔

یہ آپ کے مرشد خواجہ باقی باللہؒ کے ارشاد پر قائم کی گئی۔ اس خانقاہ کے افراد بھی اکبر کی سرپرستی کے متمنی نہیں تھے۔

اگر غور کیا جائے تو اکبر کے دینِ الٰہی سے کہیں بہتر انداز میں اسلامی تصوف ہندو۔مسلم مسئلہ کو ختم کرنے میں کامیاب گیا تھا۔ کئی ہندو مسلم صوفیا کی صحبت اور کردار کی وجہ سے ان کے ہوکر رہے۔ معاشرہ میں باہمی قرب اور امن کی فضا قائم ہوئی۔ ایک ہندو رتھبان کا مسیح الاولیا کو یہ کہہ کر مسلمان ہونا کہ ''آپ میری رتھ پر سوار ہوں اور میں کافر رہ جاؤں۔'' مسلم صوفیا کی کرشماتی شخصیت اور کردار کے ہندو معاشرے پر اثرات کو واضح کرتا ہے۔

اکبر کی ناراضگی کی وجہ سے مسیح الاولیا کے لئے کچھ لوگوں کا یہ کہنا کہ اگر حاکم ناراض ہیں تو آپ مکہ معظّمہ وغیرہ کیوں نہیں چلے جاتے۔ اور آپ کا جواب کہ ''یاد رکھو! ہر شخص کا ضمیر اللہ کی مرضی کا تابع ہے۔ اگر میں کہیں چلا جاؤں اور وہاں کا حاکم بھی مجھ سے ناراض ہوجائے تو؟''

شہنشاہ اکبر نے جب مشائخ اور صوفیا پر برہانپور کے فاروقی حکمرانوں کی حمایت کا الزام لگا کر نظر بند کرنا شروع کیا تو مسیح الاولیا کی عام شہرت کے پیش نظر انہیں پیغام بھیجا کہ ''آپ کی ذات گرامی تو فیوض و برکات کا سمندر ہے۔ یہاں محض چند عقیدتمندوں کو فائدہ پہنچانے سے بہتر ہے میری فوج کے لاکھوں ہدایت کے طالبان کو سیراب کیجئے۔'' یوں کہہ کر آپ کو آگرہ منتقل کیا گیا اور آپ نے بارگاہ الٰہی میں دعائیں مانگنا شروع کیں کہ اس انداز کے قید و نظر بندی سے رہائی نصیب ہو۔ بالآخر آپ کی دعائیں مستجاب ہوئیں اور آپ کو برہانپور جانے کی اجازت ملی۔

اکبر کی وفات ۱۶۰۶ء تک مزید کوئی کارروائی نہیں ہوئی، لیکن جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد حالات یکسر بدلنے لگے۔ حضرت مجدد الف ثانی کو دربار میں طلب کیا گیا اور آصف جاہ کے ایما پر ان کو بادشاہ وقت کے آگے ''سجدہ تعظیم'' کا حکم ہوا۔ انکار پر انہیں گوالیار کے قلعے میں قید کیا گیا۔ دین کے خلاف اس گستاخی سے نفرت کرتے ہوئے کابل کے گورنر مبارک خان نے علم بغاوت بلند کیا اور جہانگیر کو قید کردیا گیا۔ جسے بعد میں حضرت مجدد کے حکم سے آزاد کرادیا۔ بدلہ میں حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کو بھی آزاد کرنا پڑا۔ یکا یک صوفیا کی کوششیں ایسا رنگ لائیں کہ آنے والے سالوں میں جہانگیر حضرت مجدد کی صحبت سے مستفیض ہوتا رہا اور شاہجہان بھی آپ کا معتقد ہوا۔

مغلیہ سلطنت کی شان و شوکت عروج پر تھی، لیکن برہانپور کی شطاری خانقاہ نے اکبر کے دینِ الٰہی کے آگے سر نہیں جھکایا۔ آخرکار مسلمان صوفیا کے آگے اپنے زمانے کی بہت بڑی طاقت نے سر تسلیم خم کیا۔ اکبری فوج کے سپہ سالار ''فاتح سندھ'' عبدالرحیم خان خانان برہانپور کی شطاری خانقاہ کا معتقد ہوا۔ شاہجہان اور اورنگزیب بھی اس خانقاہ کے معتقد رہے۔ لیکن اس زمانہ میں مسیح الاولیا وفات پا چکے تھے۔ تھوڑے عرصہ کے لئے آپ کی فرزند شیخ عبدالستار مسند نشین ہوئے اور وہ بھی وفات پا گئے۔ برہان الدین راز الٰہی خلیفہ مسیح الاولیا شطاری خانقاہ کے شیخ بنے۔ ان کے دور میں اورنگزیبؒ کا اس خانقاہ پر بہ نفس نفیس حاضری دینا اور دعاؤں کے لئے عرضداشت پیش کرنا تاریخ برہانپور کی روایات کا ایک حصہ ہیں۔

☆
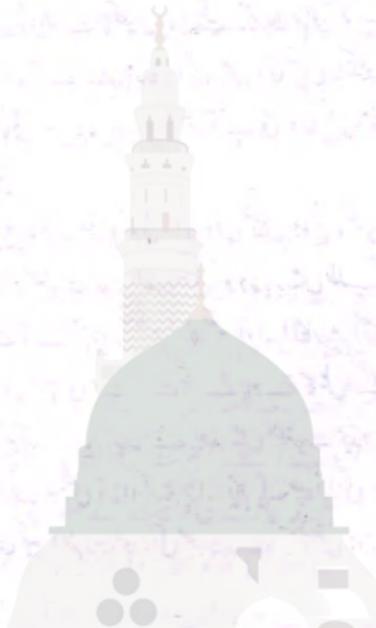
حضرت بابا فتح محمد کا تقسیم نامہ

جو انہوں نے حجاز مقدس جانے سے قبل اپنے ورثا کے لئے بطور وصیت و وراثت چھوڑا تھا۔ نیز بعد کے احکام اور فرزندوں کے باہم معاہدات

....

بسم اللہ الرحمن الرحیم والصلوٰۃ والسلام علی النبی الکریم.

وصیت نامہ

آنکہ غرض ازیں تحریر آنست کہ حضرت قبلہ گاہی وقت روانہ شدن کعبہ معظمہ تقسیم دیہات چنین مقرر فرمودہ کاغذ تقسیم بدستخط مبارک خویش بدین تفصیل نوشتہ روانہ کعبۂ معظمہ شدہ بودند کہ اولاً یکجہانت غلہ وقتے کہ سال کمال باشد بجہتِ خویشان صلۂ رحم طلباء لمرضات اللہ جدا نمودہ نصف قریہ کول کھیڑہ محمد رحیم معہ الفقراء ایشان...... روپیہ کہ بہ محمد علی دادہ ایم باشد ونصف کول کھیڑہ و دو حصہ بورگام بفرزندی شیخ شہاب الدین ومحمد عیسیٰ کہ ہر دو کلن (؟) وخویشان محل کلان باشد بایں تفصیل کہ یک صد و بست روپیہ ازین ہر دو موضع حصہ شیخ شہاب الدین کہ ہمراہ فقیری آید نگاہ دارند تازمانے کہ در حرمین باشدو......... بیاید موافق حصۂ شیخ محمد عیسیٰ بگیر دوانچہ بعد ازاں باقی ماند آنرا دونیم حصہ بکنند یک حصہ پاوبالا شیخ محمد عیسیٰ باعیال خود بیگرند و یک حصہ ہر دو کلن بہ تقسیم خماسی یعنی دو حصہ زن مرحومی عبدالقدوس دسہ حصہ زن مرحومی ابو یوسف معہ دختر خود بگیرند وربع حصۂ......... کنند عبدالغنی طغائی محل کلاں و یک حصہ حلیمہ دختر محمد رحیم و یک حصہ باقی علیٰ وجہ التثلیث و دو حصہ ابو محمد ویک حصہ نجیبہ للذکر مثل حظ الانثیین ہر دو نبیسہ را تقسیم کنند وقریہ اولتی را چہار و نیم حصہ نمایند یک ونیم محمد رحیم مع الفقراء خویش علی الطریقۃ السابقۃ بگیرند و یک حصہ شیخ شہاب الدین ویک حصہ محمد عیسیٰ و یک حصہ ہر دو کلن بتقسیم سابق بگیرند وایں تقسیمات مذکورہ تاوقتے است کہ دیہات مقرر باشند۔ اگر برتقدیر فتورے باشد وانچہ باقی ماند بہ تقسیم سابق مقیسوم سازند ونصف قریہ پاتودی کہ بنام فقیر است بہ فقیر ومحل خورد ومع فرزندان الیشان مقرر

نموده شد تا زمانے کہ در قید حیات فقیر باشد بعد ازیں نصف دیہہ یا ہرچہ باقی ماند تمام یا بعض بنام محل خورد و فرزندانِ ایشیان مسلم باشد ایں دو کلمہ وصیت مواضع وانند دیگر واضح باشد کہ فقیر باغ در کول کھیڑہ و در بور گام کردہ است انچہ ازان حاصل شود سہ حصہ نمایند یک حصہ بجمیع سادات و خویشان صلۃ الرحم وفقرا علی وجہہ الاستحقاق رسانند و یک حصہ جمیع فرزندان بتقسیم متقدم متصرف شوند و یک حصہ تا فقیر زندہ است ہمراہ زر پاتوندی بفقیر رسانند بعد ازان ثلث بہ فرزندان محل خورد معہ والدہ بدہند و ثلثان باقیان در چہار عرس یعنی آن سرور علیہ وسلم و سلطان العارفین و حضرت غوث الاعظم و حضرت صاحب صرف نمایند۔

ایں چند کلمہ بطریق حجت نوشتہ شد ہر کہ از فرزندان عمل میکت۔ عنداللہ وعند رسولہ واولیاءٗ مقبول است و اگر خلاف کند پیش ہمہ مردود است روز قیامت داخل عاقان خواہد شد۔ حق سبحانہٗ تعالیٰ فرزندان را توفیق عمل وہد تا چہار سال بہمیں تقسیم ہر یک حصہ خود گرفت۔ بعدہ چوں شیخ شہاب الدین و محل خورد از مکہ معظمہ آمدند و کاغذ وصیت وگر آوردند بدیں مضمون کہ:

فقیر فتح محمد بن عین العرفا بفرزندانِ خود محمد رحیم و شیخ شہاب الدین و محمد عیسیٰ بطریق نصیحت ووصیت نوشتہ ی شود کہ حق تعالیٰ را حاضر و ناظر دانستہ در قسمت مربع علی السویہ للذکر مثل حظ الانثیین تقصیر بوجہہ من لوجوہ لکنند وانچہ باہم فرزندان وانچہ باسم فقیر است بماندہ ہلا زیادہ دلا رعاریت تقسیم کنند و اگر توفیق بشود و اصحاب قسمت ہمہ راضی بشوند خمس اول بکشند ازان نصف ہر دو کلن بدہند۔ ونصف دیگر باہلِ استحقاق الاقارب وخویشان وفقرا بدہند و بر تقدیرے کہ اہلِ قسمت برخمس راضی بناشند وقطعاً و جزماً ہر دو کلن صاحبِ حق اند انہار اثمن از انچہ پیدا شود موافق خرچ تقسیم کردہ بدہند تا محروم نمانند کہ از روئے مسئلہ حق دار ہستند۔

دیگر آنکہ ہر کہ از فرزندان برین زنِ غریب یعنی امتہ الغنی مہربانی کند وجنبہ کردہ حق او بر ساند چنانکہ من بمادرِ عارضی خود رسانیدم فقیر از وراضی است وحق تعالیٰ ازو راضی است وحصہ ایشاں ورائے فرزندان ثمن است آنرا بایشاں رسانند کہ حکم حق است ہر کہ بریں وصیت عمل کند مرا راضی کردو خدا تعالیٰ را راضی کرد۔

فقیر محمد رحیم بموجب درود حکم عالی موافق وصیت در جمیع امور بلا جبر واکراہ برضا ورغبت قبول کردم وفقیر شیخ شہاب الدین و محمد عیسیٰ نیز بموجب وصیت انچہ حکم است قبول دارد وما جمیع وارثان متفق شدہ حصہ ہا مقرر ساختیم حصہ ہر یک فرزند مقرر شد۔ یک صد وشصت روپیہ و نیز ما ہمہ متفق شدہ قرار دادیم کہ اول اختیار بحضرت والدہ بدہیم کہ از دیہات اول ایشان خوش کردہ

بگیرند ایشان در حصہ ثمنِ خود و در حصہٗ دختران خود...... موضع پاتوندی برضا ورغبت بلا جبرہ اکراہ چیدہ گرفتہ پنجاہ عدد روپیہ کہ سوائے این ہر دو حصہ پاتوندی زداید برآمد قبول کردند کہ ماہر سال بلا نقصان خواہ آفت شود یا نشود پنجاہ عدد روپیہ ہر سال میدادہ باشیم۔

بعدہٗ بہ محمد عیسیٰ مخبر کردیم۔ ایشان در حصہ خود بورگام بلا شرکت وبلاجبر کہ فتنہ بعدہ ماندہ نصف روپیہ وادلتی و کول کھیڑہ میاں محمد رحیم بہ شیخ شہاب الدین اختیار دادند کہ شما خوش کردہ بگیرید۔ مشار الیہ میاں محمد رحیم اختیار دادند کہ شما اختیار کردہ بگیرید۔ بعد از رد و بدل ہر یک با اختیار و رغبت خود بلا جبر و اکراہ حصہ خود گرفت۔ میاں محمد رحیم نصف روپیہ وادلتی و میاں شیخ شہاب الدین کول کھیڑہ و حصہ خود گرفتند و ہفتاد عدد روپیہ سالانہ بلا مشارکت خواہ آفت شود خواہ نہ شود قرار اوند کہ واپسی...... ہم این ہفت در روپیہ و پنجاہ روپیہ پاتوندی جملہ یکصد وبست روپیہ شد۔ ازان ہشتاد روپیہ کلنان مقرر شد دسی روپیہ بخویشان واہل استحقاق مقرر شد۔ وباغہائے کہ در کول کھیڑہ وبود گام است موافق نوشتہ حضرت ایشاں مقسوم است ونیز مقرر ما ہمہ وارثان کردیم کہ تازمانے کہ دیہات مقرراند بہ تقسیم مذکور موضع خود را قابض باشد وخدانکند اگر آفت سماوی شود...... طالع صاحب موضع کس ہیچ مجرائی نخواہد داد و خدانکند اگر تغیر موضع شود می باید کہ صاحب آن موضع حتی الامکان والمقدور سعی نماید وچوں بسعی وتلاش آں صاحب حصہ اہیچ اثر نمی شود انچہ حصہ او مقرر باشد از ہمہ حصہ ہا موافق تقسیم براوردہ بدہند۔ ہمہ اعزہ با اختیار ورغبت خود ازیں تحریر رضامنداند وجوار کہ حکم حضرت ایشان است تقسیم برین مواضع مقرر نمودہ شد کہ برکول کھیڑہ چہار ماپ و برپاتوند چہار ماپ و بربورگام دو ماپ وبرادلتی دو ماپ دریں حصہ ہا ہمہ راضی اند بجانب ہیچ یکے ہیچ رعایت کس نیست ہرکس برغبت خود حصہ خود قبول کرد و بلا رعایت و بلا احسان این چند کلمہ بطریق سند بتاریخ نہم شہر رمضان المبارک نوشتہ شد ثانی الحال عند الحاجت حجت باشد۔ یک ہزار وشصت وہشت ۱۰۶۸ھ

بعد از[1] دو سال حضرت والدہ جیو گفتند کہ حصہ ثمن از ہمہ دیہہ باید ہند و ہر دو ہمشیرہ گفتند کہ امۃ الرحمٰن و بی بی فاطمہ باشند کہ مایاں نابالغ بودیم کہ حصہ ہا کردہ بود بذالحال در دیہہ شما زیادہ می آید باید کہ حصہ ہا از سرِ نو کنیم۔ آچھوں بی بی را از دیہہ مایاں چیزے ندہانید۔ بعد از رد و بدل بسیار قرار دادند کہ برضا ورغبت خود چہل روپیہ آچھو بی بی و دختر اور اسال بسال در اول تحصیل موضع پاتوندی می رسانیدہ باشیم وتتمہ بیست روپیہ میاں شیخ شہاب الدین در کول کھیڑہ خود بدہند خواہ آفت سماوی باشد یانہ ایں شصت روپیہ از ہر دو جا بایشان رسانند ومن بعد امۃ الغنی

[1] یہاں سہو کتابت واقع ہوا ہے۔ ۱۰۶۸+۲=۱۰۷۰ ہوتی ہے دوازدہ ہونا چاہئے۔ تب سن وقوعہ ۱۰۸۰ ثابت ہوتا ہے۔

مشار الیہا و دختران وفرزندان امۃ الرحمٰن و فاطمہ مشار الیہما با برادران و فرزندان ایشان ہیچ وجہ من الوجوہ مناقشہ ودعوی وطلبی وتقاضاے بناشد در دنیا ونہ در آخرت و ہر کہ ازیں قرار برگرد و عنداللہ و عندالرسول وعند اولیا مردود ونا مقبول است و اگر حجت کاغذی بر آید مقبول ومعتبر نیست اگر چہ حجت شرعی باشد ما دیدہ ودانستہ ہمہ را قبول کردیم۔ تحریر فی التاریخ یاز وہم رجب المرجب سہ یکہزار و ہشتاد۔

بتاریخ ۱۹ شہر شوال ۱۰۸۰ھ مسمی محمد حسین ولد شیخ اولیا ابن شیخ جمال محمد کور اور حالتے کہ وکیل مطلق است از قبل مسماۃ بی بی امۃ الغنی بنت شیخ اولیا مذکور زوجہ غفران پناہ میاں شیخ فتح محمد و مسماۃ امۃ الرحمٰن و مسماۃ فاطمہ دختران بی بی امۃ الغنی مذکورہ ثابت البکالہ (؟ ثابت الوکالہ) بگواہی شیخ ابو محمد ولد شیخ محمد طاہر ومحمد عبداللہ ولد شیخ عبدالرحمٰن بحکمہ علیہ عالیہ بلدۂ برہان پور آمدہ اقرار نمود کہ چوں پیش ازیں معاملہ دیہہ ہائے وغیرہ مد دمعاش از بابت آن مغفرت پناہ مشخص ومقرر گردیدہ بود دینولا امۃ الغنی مذکورہ مینمود کہ حصہ ثمن از ہمہ دیہما بدہید و بی بی امۃ الرحمٰن و بی بی فاطمہ می گفتند کہ مایاں نا بالغ بوند کہ حصہ ہا کردہ بودند الحال در دیہہ شما زیادہ می آید باید کہ حصہ از سر نو کنند با آچھو بی بی از دیہہ مایاں چیزے ندہانند۔ بعد از رد و بدل بسیار چناں مصالحہ وقرار کردند کہ برضا و رغبت چہل روپیہ بہ آچھوں بی بی و دختر اور اسال بسال در اول تحصیل موضع پاتوندی میر سانیدہ باشند و بعد ازاں اچھوں بی بی و دختر او ہر کہ را ایشاں بدہانند موکلات ماڑا ہیچ عذر نیست زیرا کہ ایں چہل روپیہ خمس حق مستحقان است ہیچکس را دریں دخل نیست و چہار ماپ جوار برائے قسمت خویشاں نیز میرسانیم خواہ آفت سماوی باشد یا نباشد ومن بعد موکلات من و فرزندان و دختران ایشان با برادران وفرزندان ایشان ہیچ وجہ من الوجوہ در ہیچ چیزے دعوے وطلبی وحقے وتقاضائے ندارند۔ از جمیع دعواے خود گذشتہ ابرا عام وتام کردہ اند و دیگر خانہ کہ بعوض مہر امۃ الغنی را رسیدہ است آنرا اگر او بدست داماد خود مؤکلۂ من فروشد یا ہبہ نماید و با بوجہ وراثت بآنہار سد ایشان بغیر از برائے نماز وطلب علم از درے کہ سوئے سجداست آمد و رفت نکنند زیرا کہ آن مرحوم نیز برائے نماز و درس ایں طرف دروازہ گردہ بودند قدیم نہ بود اگر بدست دیگرے فروشند دروازۂ درونی بستہ کنند باقی ہرچہ باشد حسبۃً للہ داخل خانقاہ است و ہر کہ ازیں قرار برگدد عنداللہ وعندالرسول وعند اولیاء اللہ مرد و نامقبول است و اگر حجت شرعی کاغذ برآرند مقبول ومعتبر نیست اگرچہ حجت شرعی باشد دیدہ ودانستہ ہمہ را قبول کردہ اند واعتبار برہمیں کاغذاست کاغذہاے دیگر منسوخ اند۔

☆

حضرت بابا فتح محمد محدث (۱) ابن حضرت مسیح الاولیاء

قدرہ سرہٗ العزیز

آپ کا نام عبدالرحمٰن اور کنیت ابوالمجد ہے لیکن فتح محمد کے لقب سے مشہور و معروف ہیں یہاں تک کہ اصل نام اور کنیت شاذ ہی کسی کو معلوم ہے یہ مقبولِ انام لقب آپ کو والدِ محترم سے ملا ہے۔ حضرت مسیح الاولیا آپ کو پیار سے بابا فتح محمد کہا کرتے تھے۔ چنانچہ یہی لقب یا پیار کا نام عرف عام میں مشہور ہوگیا۔

آپ شیخ عبدالستار سے عمر میں چھوٹے ہیں سنہ ولادت متحقق نہیں، پھر بھی عمروں کے تفاوت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ دونوں بھائی کسی بھی تعلیم میں ہم سبق نہیں ملتے۔

سنہ ۱۰۱۷ھ جب کہ آپ اعلیٰ علوم فقہ حدیث و تفسیر کی تعلیم کے سلسلہ میں مسیح الاولیاء کے درس میں تھے۔ اُس وقت بابا عبدالستار جملہ علوم عقلی و نقلی سے فارغ ہوکر خانقاہ کے طالبان حق و مریدین کے معاملات میں والد محترم کی اجازت و ہدایت کے مطابق خدمات انجام دینے پر مامور ہوچکے تھے۔ حضرت مسیح الاولیا نے ان ہی دنوں آپ کی تعلیم کے لئے علم تفسیر سے متعلق ایک نادر کتاب لکھی اور آپ کے لقب فتح محمد کی نسبت سے اس کا نام فتح محمدی رکھا۔ یہ وہی زمانہ ہے جب شیخ بُرہان الدین حضرت مسیح الاولیاء کی خدمت میں مرید ہونے کی غرض سے حاضر ہوئے تھے۔ چونکہ شیخ مذکور کچھ عرصہ قبل حضرت شیخ حسین بنبائیؒ کے مرید ہوچکے تھے۔ نیز جوان العمر تھے۔ مسیح الاولیاء نے ان سے کہا عزیز من اگر تم جاگیر و یومیہ کی تمنا رکھتے ہو تو صاف کہو حاکم شہر سے اچھے مراسم ہیں سفارش کئے دیتا ہوں اور اگر تحصیل علم کا شوق ہے تو بابا فتح محمد کی رفاقت میں جو چاہو پڑھ سکتے ہو۔ انہوں نے کہا دونوں چیزوں کی خواہش نہیں۔ خدا طلبی کا ذوق رکھتا ہوں۔ میری دلی تمنا ہے کہ حضور مجھے چلہ میں بٹھادیں۔ ملفوظات میں یہ مقام ان الفاظ میں ملتا ہے۔ جو شیخ برہان الدینؒ کے الفاظ کی ترجمانی کے طور پر مذکور ہوا ہے۔

چوں بخدمت مسیح الاولیاء رسیدم پرسیدند کہ اگر قصد یومیہ واراضی ہست بصدر شہر کہ آشنا است سفارش وصدارت نمایم۔ واگر قصد طلب علم است بہ رفاقت

بابا فتح محمد ہر چہ میخو اہید بخوانید۔ گفتم ازیں ہر دو ہیچ نمیخواہم طلب حق دارم میخواہم کہ اربعین بہ نشینم (رواح الانفاس قلمی ص ۱۳)

آپ انتہائی ذکی و ذہین تھے۔ پھر مسیح الاولیاء کے طرزِ تعلیم کا اعجاز مسیحائی۔ تھوڑے عرصہ میں جملہ علوم متعارفہ پر عبور کامل اور دسترس کلی حاصل کیا۔ ریاضی اور علمِ عروض میں منتہیانہ استعداد بہم پہنچائی۔ تصوف تو خاندانی میراث تھی۔ علاوہ ازیں اس عارفانہ علم کی مخصوص اور سنگلاخ کتابیں مسیح الاولیا سے درساً پڑھ کر ان کے نکات و اسرار کے ہر گوشہ پر عرفان و وجدان کی منازل عملاً طے کیں، علومِ ظاہر میں حدیث و فقہ سے آپ کو مخصوص دلچسپی تھی اور درس سے خصوصی رغبت۔ جس طرح حضرت مسیح الاولیاء نے شیخ عبدالستار کو خانقاہ نشینوں کی تعلیم و تربیت پر متوجہ کیا ہوا تھا۔ اسی طرح اپنی زندگی میں بعض شاگردوں کی اعلیٰ تعلیم آپ کے سپرد فرما رکھی تھی۔ اور آگے چل کر تو خانقاہ کا جملہ نظم ونسق شیخ عبدالستار کے ذمہ اور مدرسہ کی تعلیم و تربیت بابا فتح محمد کے حوالہ تھی۔ یہی انتظام مسیح الاولیاء کے وصال کے بعد بھی قائم رہا۔ آپ نے مدرسہ کے متعلقہ امور میں یہاں تک دلچسپی لی کہ اس مستحسن فرض منصبی کی جز و زندگی قرار دے لیا۔ یہاں تک کہ حضرت مسیح الاولیا کے وصال کے تھوڑے ہی عرصہ بعد شیخ عبدالستار بھی عالم جوانی میں واصل بحق ہوگئے۔ ان کے فرزند شیخ ابوالقاسم سرمست کمسن تھے۔ دیگر برادران بھی علوم طریقت میں اس پایہ کی صلاحیت نہ رکھتے تھے کہ خانقاہ کے نظم و نسق کے ساتھ ساتھ قریب تکمیل طالبانِ حق کے ذوق کی سیرانی فرماتے۔ چنانچہ مسیح الاولیاء کی اولاد میں صرف آپ کی ذات ہی ایسی تھی کہ خانقاہ کے معاملات کو سابقہ نظام کے مطابق قائم و برقرار رکھ سکتے۔ لیکن آپ نے اپنے علمی مشاغل اور درس و تدریس کے انہماک میں اس نئی مصروفیت کو اپنے ذمہ لینا مناسب خیال نہ کیا اور خانقاہ کے اکثر طالبانِ حق کو معہ لوازمات حضرت شیخ برہان الدین راز الٰہی کی طرف رجوع فرمادیا۔ جو حضرت مسیح الاولیاء کے ممتاز ترین خلیفہ تھے اور آپ نے مسیح الاولیاء کی دوسری فیض رسان یادگار مدرسہ کی ذمہ داریاں خود سنبھالیں۔ چنانچہ مسیح الاولیا کے رحلت فرمانے کے بعد بھی پینتیس سال سے کچھ زائد عرصہ تک طالبان علوم کو فقہ، تفسیر، حدیث وغیرہ کی عربی فارسی ادق و اہم کتابوں کا درس دیا اور اس زمانہ میں متعدد کتابیں مختلف موضوعات پر تصنیف کیں۔ فقہ میں منجملہ دیگر کتب کے مفتاح الصلوٰۃ کو ہر زمانہ میں قبول عام حاصل رہا ہے۔ یہ کتاب فارسی زبان میں نماز کے فرائض، واجبات اور سنن کی تفصیلات پر مبنی ہے۔ کسی سندھی بزرگ کے حرفی اشارات میں تین شعر مشہور تھے اور اس قدر مشہور کہ تعلیم یافتہ گھرانوں میں مستورات کو بھی از بر تھے اور وہ اپنی اولاد کو صغر سنی ہی میں یاد کرادیا کرتی تھیں۔ خود حضرت شیخ فتح محمد نے بھی اپنی والدہ محترمہ سے سیکھے تھے جیسا کہ مفتاح میں مذکور ہے۔

بزرگے از علمائے سندھ فرائض و واجبات و سنن را در سہ بیت بحروف اشارت کردہ است کہ اکثر اوقات حضرت مآ صاحب تعلیم میفر مودند۔ این است

فرائض- فرائض ندانی شوی در قلق
انجسِ نوقِ تتقِ رسق

واجبات- چو واجب ندانی شوی در خطر
فصت تقت لقت جسر

سُنن- چو سنت بدانی شوی مقتدا
روشت تبت تست دوا

چونکہ مفتاح الصلوٰۃ (۲) انہیں اشعار کے اشارات کا تفصیلی حل ہے۔ اور بابا فتح محمدؒ نے نہ صرف ان اشارات کو حل کر دیا، بلکہ ہر ایک رکن کے متعلق فقہ حنفی کی مستند کتابوں سے احکام اور حوالے ایسی سیر حاصل وضاحت سے لکھے ہیں کہ ہر اجمال دلنشین طریقہ در مفصل مسئلہ کی شکل میں آ گیا اور سب کا مجموعہ تقریباً ڈیڑھ سو صفحات کی کتاب بن گئی۔ اس کتاب کی بے شمار قلمی نقول اب بھی جگہ جگہ موجود ہیں اور اپنی ہمہ گیر قبولیت کے پیش نظر مختلف مطابع سے وقتاً فوقتاً متعدد اشاعتیں چھپ بھی چکی ہیں، لہٰذا تفصیلات کے لئے اہلِ ذوق اصل کتاب ملاحظہ فرمائیں۔ البتہ یہاں بطور نمونہ اجمال حل پیش کرنا بے محل نہ ہوگا۔

ظاہر ہے کہ نماز مذہب اسلام کا بنیادی رکن ہے اور پھر نماز میں فرائض واجبات اور سنن بھی وارد ہیں اور اس تاکید اکید کے ساتھ کہ فرائض کی واقفیت حاصل کرنا۔ فرض اور واجبات سے باخبر ہونا۔ واجب اور سنن کو جاننا سنت ہے۔

مسئلہ ہے کہ نماز میں تیرہ فرض ہیں۔ سات نماز کے باہر اور چھ نماز کے اندر۔ شاعر نے پہلے شعر میں آگاہ کیا ہے کہ اگر تم نماز کے فرائض سے آگاہ نہ ہوگے تو شاید تمہیں قلق ہوگا۔ سنو فرائض یہ ہیں:

۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۱۱	۱۲	۱۳
ا	ج	ج	س	ن	و	ق	ت	ق	ق	[illegible]	س	ق

اور یہ حروف مفرد در اصل ہر ایک فرض رکن کا پہلا حرف ہیں۔ یعنی (ا- اندام پاک) (ج- جائے پاک) (ج- جامہ پاک) (س- ستر عورت پوشیدن) (ن- نیت نماز) (و- وقت شناختن) (ق- قبلہ شناختن) (ت- تکبیر اولیٰ گفتن) (ق- قیام نمودن) (ق- قرأت خواندن) (ر- رکوع کردن) (س- سجدہ کردن) (ق- قعدۂ آخر نشستن)

اسی طرح دوسرے شعر کے حروف واجبات نماز- اور تیسرے شعر کے حروف- نماز میں کیا کیا چیزیں سنت ہیں ان کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ لیکن ہر ایک جزو کا تفصیلی حل جیسا کہ عرض کیا گیا ہر ایک مسئلہ کے تمام جزئیات پر شرح و بسط کے ساتھ حاوی ہے۔ اس کتاب کا سن تصنیف ۱۰۶۳ھ ہے۔

اس سے قبل ۱۰۵۰ھ میں آپ نے اسی موضوع پر عربی زبان میں ایک کتاب فتح المذاہب الاربعہ کے نام سے لکھی تھی۔ جو اس قدر مفصل تھی کہ آپ کی نگاہ میں مفتاح الصلوٰۃ با ایںہمہ تفصیلات بھی مجمل ہے۔ چنانچہ مفتاح الصلوٰۃ میں اسی کتاب کی طرف رجوع کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

بدانکہ در مسائلِ وضو و تیمّم و مسح خفین و آبِ وضو وغیرہ از مقدمات نماز اختصار واقع شد۔ ہر کہ خواہد مستوعباً معہ دلائلہ و مسائلہ کما یحق و ینبغی ہمہ را مطالعہ نماید فعلیہ بملاحظہ فتح المذاہب الاربعہ للکاتب فانہ کان فی المسائل التفصیلیۃ ووافٍ للمطالب العلمیہ انشاء اللہ تعالیٰ۔

مفتاح الصلوٰۃ میں آپ کے ایک اور رسالہ کا ذکر ملتا ہے اور یہ رسالہ رسالہ جہۃ الکعبہ ہے۔ اس کا ذکر ضمناً اس بیان میں آ گیا ہے، جہاں آپ نے مفتاح الصلوٰۃ میں موسم کے تغیر سے سایہ کے فرق کو نہایت مدلل طریقہ سے بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

تحصیل سایہ اصلی برہان پور و اطراف آن این حقیر در رسالہ جداگانہ بیان کردہ است چنانچہ حاصل آن درین ابیات آوردہ

ابیات

از حمل دونیم پاسوئے شمال است دائما — وزثور گرد و یک قدم جوز ابود در استوا

از نصف سرطاں یک قدم سوئے جنوبی میشود — تا آخرش آن محو شد گشت از اسداں آسایہا

در سنبلہ گرد و قدم دو نیم ازاں میزاں شود — دز عقرب آن سہ ونیم شداز قوس پنج و نیم پا

در نصف جدی آن ہفت شد طرفِ شمالی پیش نہ — از دلوشدآن شش قدم تا نیمہ اش بیں پنج را

در پانزدہ یک ناقص است درحوت چارا ے یارِ من — تا آخرش نقصان براں اے جان من یک و نیم را

بازاز حمل دو نیم ہست گر عاقلی عامل بشو

بہر خدا گفتم بتو اے عیسوی این نظم را

اس نظم میں سایۂ اصلی کا موسمی اختلاف کے عالم میں رخ بدلنا اور ان تبدیلیوں کے اندازے کا تعین آفتاب کے مختلف برجوں میں دخل و اخراج کے اعتبار سے مذکور ہوا ہے۔

اس سے بھی قبل ۹۵۷ھ میں آپ نے ایک ضخیم رسالہ فتوح الاوراد لکھا تھا۔ یہ کتاب اپنی نوعیت کے اعتبار سے اوراد وظائف کی مستند ترین اور عجیب کتاب ہے۔ آغاز عربی مختصر خطبہ سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد فارسی مقدمہ میں وجہ تالیف، دعا مانگنے کا طریقہ، مسنون و مستحب دعائیں۔ پھر ان ادعیہ و اوراد کے ماخذ کہ وہ کن ائمہ۔ مشائخ و دیگر بزرگانِ سلف کی کن کتابوں سے حاصل کئے گئے ہیں۔ ایسی تفصیل اور شرح وبسط کے ساتھ کہ پورے سال کے ہردن رات میں بلکہ نماز پنجگانہ میں سے ہر نماز کے بعد پڑھنے کے لئے کن بزرگوں کی کس کتاب میں کونسا وظیفہ درج ہے اور اس کا طریقہ اور تعداد ورد کیا ہے۔ نیز اس کا مخصوص افادہ وغیرہ سب ہی کچھ تحریر فرمادیا ہے۔

روحانیت کی دنیا میں تکمیل و ترقی کے خواہش مند مشائخ و طالبان حق نے اس کتاب کو اپنے مسلک کی ممد و معاون پاکر اپنے معمولات ریاضت میں داخل رکھا اور ہمیشہ حسبِ دلخواہ روحانی فوائد حاصل کئے۔ کتب اوراد و ظائف میں اس کتاب کی ہمہ گیر افضیلت و افادیت کی خاص وجہ یہ بھی ہے کہ محدث صاحب نے بزرگانِ سلف کے ورد وظائف میں سے ان چیزوں کو چُن چُن کر جمع فرمایا ہے جو ان بزرگوں کو تجربہ میں ہمیشہ مفید درکار ثابت ہوئیں۔ نیز ان کے حوالے درج کئے ہیں۔

حسنِ اتفاق ہی نہیں میں تو اس کو خوش نصیبی اور اپنی سعادت طالع سمجھتا ہوں کہ ان سطور کی تسطیر کے موقعہ پر اس کا ذکر لکھتے وقت کتاب فتوح الاوراد کا ایک نہایت قدیم قلمی نسخہ میرے پیشِ نظر ہے جو محقق سندھ پیرزادہ جناب سید حسام الدین صاحب راشدی کی عنایت سے برائے مطالعہ بہم پہنچا ہے۔ ۷×۹ سائز کی کتاب تعداد اوراق ۲۶۹۴ سطری مسطر پر گنجاں باریک رواں خط کی از ابتدا تا انتہا یکساں تحریر۔

کتاب کو اکثر اوراق میں کہنگی کے باعث اور درمیان میں دیمک خوردگی سے کچھ چشم زخم پہنچ گیا ہے، تاہم مکمل نسخہ ہے۔ آخری ورق کا بھی کچھ حصہ تلف ہوگیا ہے ممکن ہے مکمل ورق ہوتا تو کاتب کا نام اور سنہ کتابت کا علم ہوسکتا موجود حصہ میں سنہ تصنیف اور مصنف کا نام ترقیمہ کی اس عبارت میں موجود ہے۔

تم بحمدالله...... مؤلفه خادم الفقراء فتح محمد بن عين العرفا فی وقت السحر ليلة الجمعه الليل التاسع...... ذی القعده سنه سبع و خمسين بعد الالف و كان...... السنة مع المشاغل التی...... الحمدلله حمدا كثيراً والصلوٰة علی رسوله سيد الخلق...... المصطفیٰ باطنا و

ظاھراً وعلی آلہ و بارک وسلم تسلیماً کثیراً کثیرا البررۃ...... الاصفا من اھل النقیٰ. ومن تبعہ دائما الی یوم الدین آمین آمین والحمدللہ رب العالمین.

کسی چیز کی حقیقت جس قدر اس کے بجنسہ معائنہ سے واضح ہوتی ہے صرف اس کے ذکر سے اس قدر وضاحت نہیں ہوتی۔ فتوح الاوراد کا بھی یہی حال ہے، جب تک کتاب نہیں دیکھی تھی ذکر ہی سنا تھا تو خیال ہوتا تھا کہ یہ درود وظائف کی ایک اچھی کتاب ہے۔ لیکن جب کتاب سامنے آئی تو آنکھیں کھل گئیں اور مطالعہ کے لطف و لذت سے متاثر ہوکر بے اختیار جی چاہنے لگا کہ ع

دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلادوں

لہٰذا مختلف مقامات سے چند نمونے اخذ و ترجمہ کی صورت میں پیش کرتا ہوں کہ اس کے بغیر اس نادر کتاب کی اہمیت واضح کرنا ممکن بھی نہیں ہے۔ مقدمہ کا آغاز ہے کہ مشائخ سلف رحمہم اللہ علیہم کا طریقہ ہے حضرت رسولِ اکرم ﷺ کی اتباع پر قائم رہنا۔ طالبِ حق کا پہلا قدم صحت توبہ کے بعد آپ کے اعمال کی پیروی۔ دوسرا قدم آپ کے اخلاق کی اتباع۔ تیسرا قدم- آپ کے احوال کے نمونہ پر اپنے حالات کا تطابق اور احوال بمنزلہ روح کے ہیں اور اخلاق مثل دل اور اعمال عبارت ہیں دیگر اعضا سے، چونکہ احوال جو تمام سعادتوں کی انتہا ہیں، اخلاق پر استقامت کئے بغیر میسر نہیں آسکتے اور اخلاق تک رسائی بغیر اعمال کے ممکن نہیں ہے۔

اصل عبارت یہ ہے:

> بدانکہ طریقۂ شیوخ سلف رحمۃ اللہ علیہم استقامت است بہ متابعت مہتر عالم ﷺ - اول قدم طالب در متابعت بعد از تصحیح توبہ بر اعمال او صلی اللہ علیہ وسلم۔ و مرتبۂ دویم متابعت بر اخلاق او صلی اللہ علیہ وسلم- و مرتبۂ سوم یافت احوال ہمچوں او صلی اللہ علیہ وسلم۔ و نہایت کار استقامت است بر احوال و آن صفتِ روح است و اخلاق صفتِ دل۔ و اعمال صفت جوارح و استقامت بر احوال کہ نہایت ہمہ سعادتہا است ممکن نہ گرد و الابعد از استقامت بر اخلاق و استقامت بر اخلاق میسر نہ شود الابعد از استقامت بر اعمال۔

(مقدمہ فتوح الاوراد)

حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال۔ اخلاق۔ احوال کی اتباع کے فوائد اور مدارج مختلف دلائل وتمثیلات پیش کرکے پابند رہنے کی تاکید کے بعد شریعت کے مطابق بارگاہ

الٰہی میں دعا اور التجا پیش کرنے کی نوعیت اور بزرگان سلف کی مخصوص ہدایات لکھ کر ان مخصوص و مستند کتب کے نام جن سے اوراق اخذ کئے گئے ہیں درج فرمائے جو حسبِ ذیل ہیں بایں الفاظ

پس این تذکرۂ مبارک است مرکتابہارا کہ برآوردم و ازان کتابہا- یکے صحاح ستہ مسمیٰ بجامع الاصول شیخ ابن اثیر الجلبی۔

دوم- جمع الجوامع۔ امام سیوطی۔ سوم- منہاج العمال شیخ علی متقی چہارم مشکوٰۃ المصابیح شیخ ولی الدین تبریزی۔ پنجم عمل الیوم واللیل حافظ جلال الدین اصلاحی ششم اذکار نووی ہفتم قول بدیع حافظ ابوالخیر السخاوی۔ ہشتم حصن الحصین امام الجزری۔ نہم فضائل الاعمال حافظ ابونعیم الاصفہانی۔ وہم غنیۃ الطالبین۔ غوث الثقلین محی الدین الجیلانی۔ یازدہم وظائف النبی۔ شیخ عبدالنبی۔

این یازدہ کتب است از کتب حدیث۔ اما از کتبِ مشائخ یکے ازاں عوارف شیخ شہاب الدین سہروردی۔ دوم فتاوائے صوفیہ شیخ فضل اللہ خلیفہ شیخ رکن الدین ولد شیخ بہاء الدین زکریا۔ سوم خزانۂ جلال شیخ احمد خلیفہ سید جلال الدین بخاری چہارم جواہر جلالی شیخ فضل اللہ عباسی خلیفہ مذکور۔ پنجم اوراد مخدوم شیخ بہاء الدین ذکریا۔ ششم شرح اوراد مذکور مسمیٰ بہ کنز العباد للشیخ احمد فوری خلیفہ شیخ رکن الدین۔ ہفتم خالصۃ الحقائق شیخ ابوالقاسم فاریابی۔ ہشتم اوراد مخدوم شیخ زین الدین مسمّٰی بہ ورد الاوراد اصحیح الاسناد۔ نہم جواہر خمسہ الشیخ محمد غوث۔ دہم اوراد صوفیہ شیخ عبداللہ شطاری خلیفہ شیخ مذکور۔ یازدہم مفتاح الجنان شیخ محمد غوث۔ دوازدہم اوراد صوفیہ شیخ...... خلفائے سلسلۂ سہروردی۔

پس ایں دوازدہ کتب است از کتب مشائخ وسوائے آن نیز نقل از کتابہائے دیگر از حدیث و فقہ گرفتہ شدہ۔ وقتے کہ در اکثر کتب آوردہ است بگویم اشارۃ باین اور اواست وقصد نہ کردم باین جمع مگر از جہت عمل خود وعمل اولاد خود وعمل دوستانِ خود بروجہے کہ لائق تر وافضل تر نزد من۔ واللہ ولی التوفیق۔ (مقدمہ فتوح الاوراد)

اس کتاب کی ترتیب و تدوین کا یہ اہتمام اور وہ بھی نام ونمود اور شہرت و اشاعت کے لئے نہیں بلکہ خود اپنے اور اپنی اولاد و احباب میں جو آپ کی نگاہ میں لائق تر اور افضل تر ہو اس کے عمل کے لئے۔

کتاب کے عنوانات میں باب کے بجائے فتح اور فصل کے بجائے ذکر مندرج ہے۔ لہٰذا عبارت یا مفہوم بھی فتح و ذکر کے حوالہ سے پیش کرتا ہوں۔

مقدمہ کے الفاظ سامنے ہیں اور ان کا یہ مفہوم و تاکید بھی کہ مشائخ کا طریقہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال و اقوال و احوال کی اتباع پر قائم رہتا ہے۔ اس پوری کتاب میں یہ التزام اس پابندی و اہتمام کے ساتھ ملتا ہے کہ جملہ عبادات درود وظائف اور دعاؤں میں آنحضرت ختمی مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے عملیات، طریقۂ طہارت، نمازوں میں قرأت کی نشاندہی و مقدار یہاں تک کہ حرکات وسکنات اور ہر رکن کی جزئیات تک کی اتباع کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور ہر چیز کے متعلق مستند حوالے پیش کئے ہیں۔ مثلاً فتح اول ذکر ہشتم۔

اس ذکر میں مسجد میں داخل ہونے اور باہر آنے کے آداب و اعمال کا بیان ہے۔ فرماتے ہیں مسجد میں داخل ہوتے وقت پہلے داہناں پاؤں اندر لے جائے اور اس وقت یہ دعا پڑھے۔

اعوذباللہ العظیم. ووجھه الکریم وسلطان القدیم من الشیطان الرجیم. کہ عمل پیغمبر بود صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور حضور نے فرمایا جو شخص ایسا کرتا ہے اُس دن وسواس شیطانی سے محفوظ رہتا ہے۔ (رواہ ابوداؤد)

و مر فوماً بعدة الصلواة والسلام علیک یا رسول اللہ بسم اللہ و السلام علی رسول اللہ اللھم اغفرلنا ذنوبنا وا فتح ابواب فضلک و رحمتک و سھل لنا ابواب رزقک کہے کہ احادیث حسنہ صحیح میں وارد ہے۔

اور جب مسجد سے باہر آنا چاہے پہلے بایاں پاؤں جانماز پر سے اُٹھائے اور جب مسجد سے باہر نکلنے لگے پہلے بایاں پاؤں مسجد سے باہر کرکے اپنی نعلین کے اوپر رکھے، پھر داہنا پاؤں باہر کرکے اس میں جوتہ پہن لے اس کے بعد نعلین پر سے بایاں پاؤں اُٹھا کر اُس میں بھی جوتہ پہن لے اور اس اثناء میں زبان سے کہے **بسم اللہ والسلالم علی رسول اللہ اللھم اغفرلی ذنوبی وافتح لی ابواب فضلک** کہ عمل آں سرور است صلی اللہ علیہ وسلم۔

یہ صرف مسجد میں جانے اور باہر آنے کے آداب و احتیاط کا ذکر تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کی اتباع ہے۔ مسجد کے اندر کن باتوں کو ملحوظ رکھنا ضروری اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عقلی تقلید و تاکید کے مطابق ہے۔

دوسری فتح کے ذکر اول میں مذکور ہے کہ مسجد میں جا کر سب سے پہلے دو رکعت تحیۃ مسجد ادا کرے کہ اس نماز کی بڑی فضیلت ہے (خصوصاً ظہر کے وقت) اور اس کے متعلق یہ تاکید ہے کہ اگر جماعت کا انتظار یا کچھ پڑھنا ہو تو یہ دوگانہ ادا کئے بغیر نہ بیٹھے۔ رواہ البخاری ومسلم وابن حبان وبحر الرائق۔ لیکن وقت کی تنگی کے سبب وقت نہ پائے تو اس کا بدل بھی ہے کلمۂ تمجید پڑھ لے کہ (ایسی صورت میں) یہی تحیۃ مسجد کا قائم مقام عمل ہے۔ اور امام نووی کے بقول کلمۂ تمجید

چار مرتبہ پڑھے۔

اور اگر مسجد میں خس و خاشاک نظر آئے تو صاف کردے۔ اور ایذا دینے والے حشرات ہوں تو انہیں دور کردے۔ اس کی جزا بہشت ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو معاف فرماتا ہے۔ رواہ ابوالشیخ۔

یہ حرکات مسجد میں ممنوع ہیں۔ مسجد میں سے رہ گزر نہ قرار دے۔ تلوار بے غلاف نہ کرے۔ کمان نہ کھینچے۔ اور تیروں کو منتشر نہ کرے۔ بچوں اور دیوانوں کو مسجد میں آنے سے باز رکھے۔ مسجد میں خرید و فروخت نہ کرے۔ کسی سے جھگڑا نہ کرے۔ بلند آواز سے نہ بولے۔ حدیں قائم نہ کرے۔ کچا گوشت مسجد میں نہ لے جائے (کہ ابن ماجہ کی روایت کے مطابق حدیث میں وارد ہے) بے ضرورت گفتگو نہ کرے اور ابن ماجہ اور ابن مسعود کی روایت ہے کہ مباح گفتگو بھی مسجد میں ممنوع ہے۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ آخر زمانہ میں مسجد میں لوگ فضول گوئی کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کا مسجد میں آنا پسند نہیں فرماتا۔ رواہ ابن حبان۔

اس کتاب کے اسلوب کی خوبی اور ترتیب کی ندرت یہ ہے کہ عملیات اور ورود وظائف کے سلسلہ میں محدث صاحب نے مستند حدیثوں اور مصدقہ اقوال کے حوالوں کے ساتھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ہر پہلو کی تمام تر جزئیات اس شرح و بسط سے قلمبند فرمائی ہیں کہ صرف اسی کتاب کو سامنے رکھ کر روشن دماغ اہل قلم آنحضرت ﷺ کی مفصل و مبسوط سیرت مبارک مرتب کرسکتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کا انداز گفتگو، طرزِ تخاطب، کھانے پینے، پہننے، چلنے، بیٹھنے، سونے کے طریقے، طہارت کی ترتیب، عبادتوں میں ہر نماز میں مقدار قرأت دعائیں، ورد، ادائے ارکان وظائف و اعمال جو مومن اور خصوصاً مشائخ کا لازمہ حیات ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال و اقوال، و احوال کی پیروی کریں۔ پوری کتاب اس دعوے کی دلیل اور بین ثبوت ہے۔

یہ بھی مقدمہ میں ہی مذکور ہے کہ ان اوراد و عملیات کی ترتیب کا مقصد (نام و نمود نہیں بلکہ) خود اپنی ذات اور اپنے قابل ترین فرزندوں و احباب کے لئے تزکیہ نفس و قرب الٰہی کا سامان کرنا ہے۔ چنانچہ فتح اول ذکر بستم میں آپ اپنا ایک واقعہ تحریر فرماتے ہیں کہ

حضرت مسیح الاولیاء نے مجھے حصن حصین کا درس دیکر اس کے عمل کی ہدایت فرمائی اُس وقت میری عمر بارہ سال کی تھی، خود حضرت کا معمول یہ تھا کہ جو ورد اور دعائیں احادیث صحیح سے ثابت ہیں پڑھنے کے بعد نود و نہ نام باری تعالیٰ سات مرتبہ اور چہل اسم اعظم پڑھتے تھے اور ہر نماز کے بعد بھی ایک مرتبہ ورد کرتے تھے اور اس کے بعد دعائے سیفی معہ تمام دعاؤں کے اور کبھی دعائے سیفی معہ دعائے المغنی پڑھتے تھے اور یہی میرا بھی معمول ہے۔ پھر مسبعات عشر اور وقت

ملتا تو مشائخ کے معمول کے مطابق آیۃ الکرسی اسی ترتیب سے پڑھتے تھے اور وقت نہ ملتا تو درمیانی وقفہ میں نماز اشراق کے بعد پڑھتے تھے اور اس اثنا میں کسی سے گفتگو نہ کرتے تھے۔

جس سال آپ کا وصال ہوا، اسی سال ماہ شعبان میں مجھ پر خاص عنایت ہوئی یعنی اپنی اولاد میں سب سے پہلے مجھے آیۃ الکرسی کے عمل کا طریقہ تعلیم فرمایا (اور میں آپ کی ہدایت کے مطابق اس کا عامل ہوا) آپ کے وصال کے بعد میرے بڑے بھائی شیخ عبدالستار صاحب نے مجھ سے عمل مذکور کا طریقہ دریافت فرمایا۔ میں نے بتادیا اور وہ بھی عامل ہوگئے۔ پھر دیگر احباب نے بھی مجھ سے معلوم کرکے عامل ہوئے۔ خدا کے فضل وکرم سے یہ عمل تمام دینی و دنیاوی مہمات اور ظاہری و باطنی ترقیات اور دین و دنیا کی حاجات برلانے کے لئے مجرب ہے۔ لیکن مرشد کی اجازت کے بغیر فائدہ نہ ہوگا۔

اب یہ پورا عمل خاص ترتیب سے درج ہے۔ کیا چیزیں کس ترتیب و مقدار سے پڑھی جائیں۔ اسماء و آیات کے حروف کا وصل و فصل، اعضا کی حرکات وسکنات طریقۂ نشست وغیرہ کا مفصل حال اس دلنشین طریقت سے لکھا ہے کہ عامل آسانی سے اس پر کاربند ہوسکتا ہے۔ لیکن مرشدِ کامل و عامل کی اجازت؟

آپ اس درجہ کے عامل نہ صرف مشائخ زادہ بلکہ اپنے عہد کے برگزیدۂ اعمال شیخ تھے، لیکن پھر بھی آپ نے خانقاہ کے مقابلہ میں مدرسہ کو کیوں ترجیح دی، حالانکہ خانقاہ کا نہایت منظّم کاروبار شیخ عبدالستار کی ناوقت رحلت کے بعد خود ہی آپ سے متعلق ہوگیا تھا۔ جس کو آپ نے اپنے والد کے ممتاز ترین خلیفہ شیخ برہان الدین راز الٰہی کی طرف رجوع کردیا اور آپ مسیح الاولیا کے مدرسہ کی خدمت انجام دیتے رہے۔ اس کا جواب بھی فتوح الاوراد سے ملتا ہے اور وہ بھی اتباعِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی غرض و غایت سے۔ فتح اول ذکر بست ودوم میں علم اور درس کی فضیلت، نیز بیکاری سے احتراز کا بیان ہے۔ فرماتے ہیں:

حضرت مسیح الاولیاء اشراق تک کے عمل و وظائف سے فارغ ہوکر مدرسہ میں تشریف لاتے اور تکیہ لگاکر فرش پر بیٹھ کر درس دینے میں مشغول ہوجاتے۔ فرماتے ہیں اگر یہ شغل میسر آئے مبارک ہے۔ منہج العمال میں ہے فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے **ساعۃ من عالم متکی علی فراشہ ینظر فی علمہ خیر من عبادۃ العابد سبعین عاما. رواہ الدیملی فی الفردوس عن جابر وایضا فیہ مرفوعا فضل العالم علی العابد کفضلی علی ادنکم. ان اللہ وملٰئکتہ واھل السمٰوٰت والارضین حتی النملۃ فی حجرھا وحتی الحوت فی لابحر یصلون علی معلم الناس الخیر رواہ الترمذی عن ابن امامۃ. وایضا فیہ مرفوعا العلماء ورثۃ الانبیاء یحبھم اھل السماء ویستعفر لھم الحیتان فی البحر اذا ماتوا الی یوم القیمۃ.**

اور فرماتے ہیں تین علوم افضل العلوم ہیں، جیسا کہ حدیث میں وارد ہے: **العلم ثلثتہ وما سوی ذلک فهو فضلة آية محكمة. او سنة قائمة او فريضة عادلة. رواه ابو داؤد وابن ماجة وغيرها.**

فرماتے ہیں کہ فریضۂ عادلہ سے مراد علم فقہ ہے جو کتاب وسنت سے معدول کیا گیا۔ کسی نے خوب کہا ہے:

علمِ دیں فقہ است و تفسیر و حدیث
ہرکہ خواند غیر ایں گردد خبیث

فرماتے ہیں اگر درس دینے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو بقدر ضرورت ان علوم کی طالب علمی کرے کہ حدیث شریف میں ہے: **طلب العلم فريضة على كل مسلم ومسلمة. رواه ابن ماجه وبيهقي وغيرهما. الى عشرة من المحدثين - وايضاً فى الحديث مرفوعاً طلب العلم افضل من عندالله من الصلوٰة والصيام والحج والجهاد فى سبيل الله عزوجل رواه الديلمى فى الفردوس وايضاً مرفوعاً الناس رجلان عالم ومتعلم ولا خير فى سواهما رواه الطبرانى. وايضاً مرفوعاً ان المؤذن اذا تعلم بابا من العلم عمل به اولم يعمل به كان افضل من ان يصلى الف ركعة تطوعاً رواه ابن اول كل دلك من منهج الاعمال وفى جمع الجوامع مسئلة واجدة يتعلمها المومن خير له من عبادة سنة ومن عتق رقعة رواه الرافع وغيره مرفوعاً وفى مشكوٰة المصابيح عن الحسن البصرى قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من جاء ه الموت وهو يطلب العلم ليحيى به الاسلام فبينه وبين النبيين درجة واحدة رواه الدارمى مرسلاً.**

چونکہ یہ ذکر ہی فضیلت علم اور درس کی عظمتوں کے بیان سے مخصوص ہے، اس سلسلہ میں اور بھی متعدد حدیثیں اور بزرگوں کے اعمال اقوال نقل کئے ہیں۔ نیز حضرت مسیح الاولیاء کا یہ تاکیدی حکم کہ: جس نے ضروری علم حاصل کرلیا ہے۔ اس کے لئے درس کا شغل درجہ نبوت رکھتا ہے اور یہ مرتبہ دوسری عبادتوں سے میسر نہیں آسکتا۔ حضرت نے مکرر تاکید فرمائی کہ طالبِ حق کو فرائض اور واجبات کا علم حاصل کرنے کے بعد شریعت کے آداب کے مطابق عمل کرنے میں قلب کو مشغول رکھنا چاہئے اور اگر ذکر قلبی میں فتور واقع ہوتا ہو تو ذکر لسانی مخفی پر عمل کرے۔ اگر اس میں بھی نفس کاہلی کرے تو نماز (نوافل) میں مشغول ہوجائے یا قرآن شریف و دعائیں پڑھنے میں مصروف ہوجائے، نفس کو کسی حالت میں معطل نہ رہنے دے کہ وہ گمراہی کی طرف رجوع ہوجاتا ہے۔ البتہ عیالداری ہو تو کسبِ حلال میں مصروفیت مناسب ہے۔

مسیح الاولیا کا دستور تھا کہ درس کے بعد اسی جگہ دو رکعت صلوٰۃ ضحٰی پڑھتے تھے اور کبھی دولت خانہ میں جا کر تازہ وضو سے صلوٰۃ پڑھتے تھے۔ فرماتے ہیں میرا بھی یہی دستور ہے صلوٰۃ ضحیٰ کی نیت سے (دو یا چار رکعت) جتنی توفیق ہوتی ہے، پڑھتا ہوں، کیونکہ دوپہر تک درس کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ آخری جملے یہ ہیں:

فقیر نیز درہمیں وقت بہ نیت ضحیٰ ہر چہ توفیق شود می خواند۔ بسبب مشغلہ درس کہ تا دوپہر می کشد۔ (فتوح الاوراد۔ فتح اول ذکر بست ودوم)

ایک اور مقام پر فتح چہارم ذکر ششم میں حلقۂ ذکر بعد نماز مغرب کا بیان لکھتے ہوئے اس شغل کی پوری تفصیل بیان کر گئے ہیں کہ حضرت مسیح الاولیاء طالبان حق کو کس طرح بیٹھنے کا حکم فرماتے تھے زانو کس زاویہ سے پاؤں کی کونسی انگلیاں وضع میں ہاتھ اور کندھے کس حالت میں اور پھر کلمات ادا کرتے وقت کس خاص حرف پر زور دینا۔ سر کتنا جھکانا وغیرہ وغیرہ۔ آپ جن کو کچھ بھی فرق کی حالت میں دیکھتے اپنے ہاتھ سے برابر کر دیتے۔ شغل کے دوران میں کسی سے تقدیم و تاخیر یا فرق کا مظاہرہ ہوتا تو دستک کی آواز سے متوجہ فرما دیتے۔ ذکر ختم ہونے پر حضرت شیخ قاسم اور شیخ طاہر قدس سرہما کی ارواح کو فاتحہ پہنچاتے، اپنے پیر و مرشد حضرت شاہ لشکر قدس سرہٗ کی روح کو ثواب بخشتے، پھر دعا مانگتے۔ عموماً آپ کی دعا یہ ہوتی کہ حصول مرادات دینی و دنیاوی حاضرین مجلس کی سلامتی و عشق و اطاعت الٰہی کی زیادتی اور فسق و فجور اور معصیت سے نجات اور ظاہری و باطنی دشمنوں کی مقہوری ہو۔ فاتحہ کے اول و آخر درود شریف پڑھتے اور اپنے پیر کے نام پر ختم فرماتے۔

شغل سے فارغ ہوتے ہی آپ کو (بابا فتح محمد کو) اور دیگر مردوں کو انوار الاسرار (تفسیر مصنفہ مسیح الاولیا) یا عین المعانی کا درس دیتے، یہاں تک کہ نماز عشاء کا وقت آجاتا۔ اور یہ دستور بزرگانِ سلف کے اس دستور العمل کے مطابق کہ مغرب وعشاء کے درمیان مقررہ تین اشغال میں سے کسی ایک شغل میں مشغولیت ضروری ہے اور وہ اشغال ثلاثہ یہ ہیں: ۱- دینی علوم کا درس دینا۔ ۲- قرآن مجید کی تلاوت کرنا۔ ۳- ایسے علم وعمل کا مطالعہ کرنا جس کا تعلق اعمالِ خیر سے ہو۔ حتیٰ کہ عشاء کا مستحب وقت آجائے۔

قابلِ لحاظ یہ نکتہ ہے کہ یہاں بھی اشغال ثلاثہ میں درس کو اولیت حاصل ہے۔ چنانچہ آپ نے درس کا شغل اختیار کیا اور حضرت مسیح الاولیاء کی رحلت کے بعد سے ۳۵-۳۶ سال تک دلچسپی اور انہماک سے اسی میں مشغول رہے اور ہجرت کے بعد بھی مدینہ منورہ میں ۱۳-۱۴ سال بقید حیات رہے۔ ممکن ہے وہاں بھی یہی مشغلہ رہا ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

آپ کے درس کی شان اور علم وفضل کا رعب و دبدبہ کیا تھا۔ یہ ذکر روائح الانفاس کی ایک روایت میں ملاحظہ ہو۔ حضرت شیخ برہان الدین راز الٰہی قدس سرہٗ فرماتے تھے کہ:

ایک دن شاہ بچو جو ایک مجذوب ہیں مجھ سے ملنے آئے اور خاندیسی وضع پر سلام کیا اور دریچہ کی طرف دیکھ کر کہنے لگے اگر کوئی ایک بڑا سا پتھر اس دریچہ پر مار دے اور یہ اس سے زیادہ وسیع ہوجائے تو کیا ہو۔ میں نے کہا تم چاہتے ہو کہ یہ مکان زیادہ وسیع ہوجائے۔ وہ مسکرادیئے۔ کچھ دیر بعد کہا مجھے کوچہ گردی کی عادت ہوگئی ہے اگر اجازت دیں تو میں اپنے شغل میں مصروف ہوجاؤں۔ میں نے اجازت دیدی اور اُن کے ساتھی عبدالرحمٰن قلندر کو بھی تاکید کر کے روانہ کیا کہ وہ ان کے ساتھ رہے۔

عبدالرحمٰن نے واپس آکر بیان کیا کہ شاہ بچو یہاں سے روانہ ہوکر حضرت بابا فتح محمد کی خانقاہ کے دروازے پر پہنچے، وہ درس دے رہے تھے۔ شاہ بچو نے ارادہ کیا کہ خانقاہ کے اندر داخل ہوں۔ مگر فوراً ہی واپس ہوگئے اور مجھ سے کہا یہاں سے بھاگ چلنا چاہئے اور (بے ساختہ) ایسے بھاگ کھڑے ہوئے، جیسے کمان سے تیر۔

حضرت راز الٰہی فرماتے ہیں کہ میں نے عبدالرحمٰن سے یہ واقعہ سن کر کہا کہ ان (شیخ بچو) کا تعلق اہلِ مراقبہ سے ہے۔ علماء کی صحبت ان کے موافق نہیں آسکتی۔

یہاں قابلِ لحاظ یہ امر ہے کہ مجذوب کی قوت احساس معدوم ہوجاتی ہے۔ اس کو موسم کے شدائد، سردی، گرمی، رنج، راحت، اچھا، برا، دکھ درد کسی چیز کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ پھر حفظ مراتب اور پاسِ ادب میں تو کبھی صاحبِ ہوش سے بھی فروگذاشت ہوجاتی ہے۔ مگر یہ کیا ہے کہ شاہ بچو مجذوب ذرا توقف کے متحمل نہیں ہوسکتے اور بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس روایت کی اصل عبارت یہ ہے:

> میفر مودند روزے شاہ بچو[1] نام مجذ بے بملاقاتِ من آمد و برسم خاندیس سلام کردو بغرفہ خانگ نگران شد تا آنکہ گفت چہ شوداگر کسے سنگے کلانے بدیں غرفہ زند تا ازانچہ ہست فراخ ترآید۔ گفتم میخواہید کہ ایں خانہ وسیع تر گردد۔ تبسم نمود و بعد از ساعتے گفت کہ مراعادت کوچہ گردی معتا شدہ اگر رخصت دہند بکار خود باشم۔ مرخص نمودم و درویشے آزاد کیشے عبدالرحمٰن نام با او ہمراہ بود او را نیز

[1] شاہ بچو صاحب حال سالک تھے ان کے حالات کا وضاحت سے مستند طور پر علم نہ ہوسکا کہ ان کو کس خانقاہ سے روحانی تعلق تھا۔ مقامی طور پر مشہور ہے کہ آپ سپاہی پیشہ تھے۔ حضرت عالمگیر بادشاہ غازی کے توپ خانہ میں ملازم تھے اور بڑے نشانہ باز گولہ انداز تھے۔ حواس قائم رہنے تک شاہی فوجوں کے ساتھ قلعہ کشائی کی خدمات انجام دیں۔ جذب کی شدت ہوئی تو برہانپور کے کوچہ و بازار میں پھرا کرتے تھے۔ اور موٹا سا ڈنڈا اور ایک پتھر ساتھ رکھتے تھے۔ ان دونوں چیزوں کو کبھی اپنے سے جدا نہیں کیا۔ کہتے تھے یہ شاہ بچو کی توپ ہے اور یہ گولہ۔ پتہ نہیں آپ کا کب وصال ہوا۔ برہان پور میں راجپور دروازہ کے باہر آپ کے مزار پر بہت خوب صورت چھوٹا سا گنبذ بنا ہوا ہے، گنبذ کے اندر آپ کے مزار کے متوازی توپ کی بھی چھوٹی سی قبر بنی ہوئی ہے۔ سنگ خارا کی ایک بڑی سیل کو تراش کر تعویذ لحد بنایا گیا ہے اور اطراف خوش قطع چمن کے بھی آثار ہیں۔

رخصت نمودم کہ بشرط رفاقت و آئینِ مروت اند کے راہ موافقت کند۔ تا رسیدند بدر وازہ خانقاہ ہے کہ بابا فتح محمد محدث رحمۃ اللہ علیہ دریں میفر مودند شاہ بچو بمراتب قصد آن کرد کہ بخانقاہ در آید وباز پس گردید۔ پس روسوئے درویشے کہ ہمراہ دے بود آور دوگفت۔ از نیجا باید گر سخت چنان کہ زاغ از کمان چون درویش مرخص شدہ نزد من آمد حالت گذشتہ باز گفت۔ گفتم اوراز اہل مراقبہ است صحبتِ اہلِ مطالعہ اش موافق نیامد۔ (روائح الانفاس قلمی ص۹)

جہاں تک معلوم ہوسکا ہے آپ کی تمام تصنیفات مشغلۂ درس کے زمانہ ہی میں معرضِ وجود میں آئی ہیں، چنانچہ جو مشتہر اور متعارف ہیں ان کے علاوہ بھی بعض رسائل آپ کے ایسے ملتے ہیں جو زیادہ لوگوں تک نہ پہنچ سکے۔ مجھے ایسی جن چیزوں کا علم ہوا، ان میں ایک رسالہ ''مستحب وقتِ عشاء وظہر'' کا خود آپ نے فتوح الاوراد میں ذکر کیا ہے۔ نماز عشاء کے مستحب وقت کے تذکرہ میں فتح المذاہب کا حوالہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

کاتب از فتح المذاہب تفصیل حدیث و تحقیق آن نوشتہ است۔ بلکہ علی الخصوص بجہت مستحب وقت عشاء و وقت ظہر رسالہ جداگانہ نوشتہ اگر توفیق یا بد مطالعہ نماید۔ (فتوح الاوراد۔ فتح چہارم ذکر ششم)

اسی طرح رسالہ جہۃ الکعبہ جس کا ذکر مفتاح الصلوٰۃ کے سلسلہ بیان میں آچکا ہے، جداگانہ چیز ہے۔لیکن وہ بھی آپ کی فہرست تصانیف میں شریک نہیں پایا جاتا۔

اور بالکل اسی طرح آپ کی ایک صوفیانہ مختصر مثنوی ''بیان تنزل حق جل وعلیٰ بعقیدہ صوفیائے قدس اللہ تعالیٰ اروا حہم'' عجب طرح سے منصۂ شہود پر آئی۔ اور اس کے انکشاف کی سعی بلیغ کا سہرا میرے دو ہم وطن علم دوست احباب کے سر ہے، جناب شیخ فرید الدین ایم اے نے اپنے علمی ذوق کی جستجو میں احمد آباد گجرات کے ایک کتب خانہ کے مخطوطات سے اس کی نقل حاصل کی اور جناب مولوی بشیر محمد خان ایم۔اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ ایڈوکیٹ برہانپوری نے اس کو اپنے مقالہ میں منسلک کر کے رسالہ معارف ۶ جلد ۶۷ میں شائع فرمادیا۔

مذکورۃ الصدر مقالہ حضرت شیخ برہان الدین راز الٰہی قدس سرہٗ کے حالات پر مبنی ہے اور مثنوی مذکور بھی خوش فہمی کی بنا پر شیخ موصوف ہی سے منسوب کردی گئی ہے۔ لیکن اسی ضمن میں چند جملے ایسے بھی ملتے ہیں جن سے بے یقینی و مذبذب سا پایا جاتا ہے۔ مقالہ نگار فرماتے ہیں:

اس مثنوی میں کل ۱۵۳ اشعار ہیں۔ مگر تخلص کسی جگہ بھی نہیں ہے، البتہ ایک شعر میں حضرت عیسیٰ جنداللہ کی جانب جن کے آپ خلیفہ تھے، اشارہ ہے۔ وہ شعر یہ ہے:

عیسوی را عشق او بیخود نمود
عشق را بے سو بداں اے اہل خود

چونکہ محترم ایڈوکیٹ صاحب کو آ گہی نہ ہوسکی کہ عیسوی بابا فتح محمد رحمۃ اللہ علیہ کا تخلص ہے۔ جیسا کہ میں مفتاح الصلوٰۃ کی مندرجہ نظم میں پیش کر آیا ہوں۔ نیز حضرت راز الٰہی قدس سرہٗ کے اذکار جو میں نے مرتب کئے ہیں اس میں بھی اِس خوش فہمی پر روشنی ڈالتے ہوئے شیخ موصوف کا دو شعر پیش کیا ہے، جس میں برہان تخلص موجود ہے۔ نیز ہر دو حضرات کا بصمیم قلب شکریہ ادا کر کے ظاہر کر دیا ہے کہ یہ مثنوی بلاشبہ حضرت بابا فتح محمد محدث قدس سرہٗ کی ثابت ہو رہی ہے۔ لہٰذا میں ان کے ذکر میں مندرج کرنے میں حق بجانب ہوں۔ ایڈوکیٹ صاحب محترم نے ۱۵۳ اشعار کی نشاندہی کی ہے، لیکن معارف میں صرف ۱۸ شعر چھپے ہیں، مجھے خیال ہوا کہ یہ ایک گمشدہ چیز ہے حضرت محدث صاحب کے ذکر میں سب اشعار محفوظ ہوجائیں تو مناسب ہوگا۔ برہانپور خط و کتابت کی۔ عزیزم شیخ فرید الدین صاحب برہانپور سے باہر کہیں ملازمت پر ہیں۔ میرے ایک محبّ نے اس سے مثنوی طلب کی تو انہوں نے نقل کروادی، لیکن صرف ۹۲ اشعار ملے میں نے پھر لکھا کہ تمام ۱۵۳ شعر ہیں لکھ بھیجو، اتفاق سے شیخ فرید سے براہ راست ربط قائم ہوگیا۔ موصوف نے اپنی مصروفیتوں سے وقت نکال کر پوری نقل عنایت فرمادی، جس کو یہاں نقل کر رہا ہوں۔ احمد آباد کے مخطوطہ میں کتابت کی غلطیاں بڑی کثرت سے ہیں۔ اس نقل میں سہو کتابت کی حد تک درستی کرلی گئی ہے۔ لیکن جہاں مضمون خبط ہے یا مصرعے ہی غائب ہیں اس مقام کو علیٰ حالہٖ نقل کر دیا ہے۔ اس لئے کہ اس میں درستی کرنا دست اندازی میں داخل تھا، یہ جسارت مجھ سے نہ کی گئی۔ مثنوی حسب ذیل ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ والسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ سیماً علیٰ سیدنا المصطفیٰ وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین.

بیان تنزل حق جل وعلا بعقیدۂ صوفیا قدس اللہ تعالیٰ ارواحہم اجمعین۔

ذاتِ حق چوں بود اول بے نشان — نے تعین داشت نے نام و نشان
او وجود صرف بود و ذات بحت — زاں مصریٰ از حقیقت بود و نعت
از ظہور واز بطون و از صفات — او معرا بود از جملہ جہات
نیست از نعمت ونسب آن ذات راست — تاکہ اورا بے نشان گفتن خطاست
انبعاثے شدازاں دریائے جود — تاکہ ظاہر گشت ازوے این نمود

بے نشان اندر نشان زاں آمده   لا تعین در تعینہا شده
آمدش در علم ذات بحت خویش   انچہ قابل بود زان آمد نہ بیش
بر نشانِ بے نشانِ خود پدید   لا تعین در تعین شد پدید
گشت ظاہر در کمال خویشتن   انچہ اول بود و آخر ذوالمنن
عاشق آمد مر کمال خویش را   خواست تا جوید وصال خویش را
فیض بخشد خستہ و دل ریش را   تا بدست آرد دل درویش را
وحدتے ظاہر شده اجمال روا   قابل تفصیل بودستِ وشمار
جملہ شانہائے وجود خویش دید   غیراد اندر میان ناید پدید
این حقیقت شد شہ کونین را   زورسر ہر فیض بر ہر دوسرا
ہست اینہا ہیئت خیر جہاں   قاب قوسین است ایمالے ازان
ملک ادنیٰ اشارت زان بود   نزدِ اہل حق حقیقت آن بودا
وحدتش راد وصفت ضامن بود   زانکہ اورا ظاہر وباطن بود
باطن اور لاحد گویند نام   ظاہرش واحد بود عندالکرام
آن احد باشد منزه از صفات   ہست بے چون و معرا از جہات
واحد آمد متصف اوصاف را   جملہ دروے ہست بے چون و چرا
وحدتِ اولا بشرطِ شے بود   لیک ہردو قوس مرط شے بود
قوس ظاہر شرط کل شے رابدان   ہر دو عالم زوہمہ آرو نشاں
شرط اشیا جملگی در واحد است   ہم ثبوتی وصف صلبی بے شک است
قوس باطن شرط لاشے گفتہ اند   باز تجریدش مجرد کرده اند
یعنی آنجا نیست ثابت این صفات   بلکہ تجرید است وصف سلبِ ذات
چونکہ واحد خویش را تفصیل دید   واجب و ممکن درا سمش شد پدید
نام خود را غیر خود در خود نہاد   تا دہد اسمائے خود را خویش داد
ذاتِ واحد ہست از کثرت بری   اقتضائے اسمہا گرد آوری
ظاہر و باطن شد ایں واحد وجود   تانہ بیند وضعہا اندر شہود
خالق و مخلوق خود را نام زد   تاکہ واحد آمده اندر عدد
ظاہرش واجب شناس ووداں اللہ   باطنش ممکن بداں بے اشتباه
معنی ممکن بداں اے جانِ من   تاشوی آگہ ز سرِ ذوالمنن

ذات واحد چوں لباس اندر شود
بود باطن بحرِ عالم کا ندرد
مندرجہ دروے نشانہاے جہاں
جز و کل بے ظرف و بے مظروف ہم
عارضت غیر از عرض تو ہوشدار
وجہہ ظاہر ہست حقِ ذوالجلال
وجہہ باطن چوں بامکان داشت او
باشیوں فصیل این وجہیں بود
ناقص است اعیان عالم شرد فرد
نقص وے از بہر تفسیر است و بس
این تعز ہست در اوصاف او
ذات بے تغیر باشد دائماً[1]

....

این کمال و نقص زاسمایش رسد
زو ہزار ویک چنیں اسماء شمر
بل صفات او چوذاتش بیحد است
بہر تمثیلش بیارم زاں حدد
گرنبودے در جہاں ایں کفر و فسق
اسم ہادی طالب ایماں بود
جملہ اوصافش جمال است یا جلال
زین نمط اعیانِ عالم شد پدید
علم واجب چوں ہمہ راشد محیط
کرد اعیاں خواہش ہر چیز ما
گر ثواب است وعتاب است رازاں ازو
بعد ازانش قصدِ ایجادش شدہ
چوں جمال خویش پنہانی بدید

درمیانِ آن چنین ممکن بود
ہست تفصیل دو عالم رشحہ زہ
ہمچو بوے گل کہ اندروے نہاں
بلکہ بودند چوں عوارض ملتزم
تا اگر معلوم باشد ہم گزار
متصف دائم باوصاف کمال
جملگی اوصاف نقصان داشت او
واجب و ممکن ازد ظاہر شود
خویشتن را نقص بہر خویش کرد
ورنہ کامل ہست حق ور ہر نفس
شانہاے اوست آید کاندرد

....

چونکہ من وجہ ہوالکامل بود
زانکہ ہر اسمش تقاضا این بود
از صفات ایزدی ایں مژدہ خر
زان مظاہر ہاش بیحد و عداست
کز مثل واضح شود ہر نیک و بد
المضل رابا کہ بودے جذب و عشق
غافر الذنب باعثِ عصیان بود
تو ہمہ رازیں دو صد بشناس حال
ہر یکے صداقتضا بیروں کشید
موجبِ او حکم کردہ آن بسیط
داد ہم چون جملہ بیچون و چرا
جود حق کے بخل وارد اندرد
باد و عالم درمیان خیمہ زدہ
گنج مخفی خواست تا گردد پدید

[1] مخطوطہ میں دونوں اشعار کا ایک ایک مصرعہ ترک ہوگیا ہے۔

تاشود عارف بخود در مظہرش | کرد خود را بہر عالم مصدرش
کنت و کنزاً مخفیا از وے خبر | داد اہل علم را خیر البشر
زوز باطن یک نفس رحمان ازو | قائم است باحق چو ظل شمس تو
ظل حق نور است جودِ عام او | زانکہ نور شمس باشد ظل او
شد الم تر ربک اورابیاں | کیف مدالظل از و قرآن بخواں
عارضت ایماں بودے ہیچ افک | یوفکا عنہ لمن افک
آن وجودش ہست دائم زور نظر | ہست اعیان در قدم باقی صور
حکم و آثارش بروں گرد عیاں | زاں شود تغیر ایں ہر دو جہاں
قائم است با اصول چوں بانفس | ہست قائم حرفہاے گفتہ بس
دائما امثال مبدل میشود | تا ابداین حکم ظاہر می شود
جملہ اسرار جہانِ بے عدد | ہمچنیں گرد ظہورش تا ابد
منقطع گردد و چو از ما این نفس | حرف از نامے نپاید پیش و پس
می شود باطن نفس اندر مسفر | ہرچہ ظاہر بود از ماکروفر
حرف وصوتے نیست کاندر درمیاں | صد ثواب آمد برائے اہل آن
چوں شود فارغ ازیں دادوستد | ہر یک اذا سمش قدم بیروں نہد
جنت ونار است پیدا بہرآں | دائما قرآن ازو دارد بیان
اسم ہادی سوئے جنت می برد | المضل خود سُوی دوزخ می رود
ہنست در جنت نعیم ذوالجلال | در جہنم نعمتِ صاحب جلال
لیک حق راضی زفرق اول است | زانکہ این وصفش زمرضی دل است
میر سد انواعِ نعمت دائما | از جزاد از لقاء و از رضا
حد وعدے نیست این اقسام را | در عنان مرنا ورم اقلام را
گر بود اشجارِ این عالم قلم | در رقم ناید از ویک شمہ ہم
ہمت در قرآن ازین معنی خبر | زوبخواں الوان فی ارض شجر
فرقۂ ثانی باسم خود رسید | آمدازوصلش باد لذت پدید
لذت چون اہلِ دنیارا درآن | باشدار چہ ہست آن برو مرد مان
لیک این لذت بود چوں منقسم | پاک ساز و کل ایشان راز اسم
یعنی انواع خدا بش میر سد | تا کہ ہادی انتظام خود کشد

رفتہ رفتہ آن علم عادت کنند ‏ ‏ ‏ ‏ چون سمندر نار رار امت کنند
در خیال خویش لذت می کنند ‏ ‏ ‏ ‏ گرچہ باشد آن عذابِ مستمند
ہر دو فرقہ خالد اند اندر مقام ‏ ‏ ‏ ‏ نیست اینجا ہیچ شبہ والسلام
دائما ظاہر شود بر ہر فریق ‏ ‏ ‏ ‏ حکم اسمِ خویش فی...... الطریق
چون نہ دار و غایت ان اظہار او ‏ ‏ ‏ ‏ پس بروں آیم از اخبار او

این سخن پایاں ندارد گوش کن
سر اسرار خدارا ہوش کن

ولہٗ

یار آمد در لباسِ دیگراں ‏ ‏ ‏ ‏ این بود کنز خدا خوش بگرداں
بے نشان آمد نشانِ برنشان ‏ ‏ ‏ ‏ ہاں مشو غافل زروے دید آن
نور او پیدا تر است از آفتاب ‏ ‏ ‏ ‏ از رخ ہر ذرہ تا باں بے حجاب
جلوہ ہا دارد زذ راتِ جہاں ‏ ‏ ‏ ‏ مرنما ید عاشقان رابے گماں
روے او آمد دلیل روی او ‏ ‏ ‏ ‏ چشم بکشاؤ سبینش چار سو
ہیچ دانی چشم بکشا دست چُست ‏ ‏ ‏ ‏ در حجاب ناشوی ہرگز باتست
این حقیقت را مجو اندر کتاب ‏ ‏ ‏ ‏ زانکہ ازوے می نیاید یک جواب
سر این معنی بجواز اہل دل ‏ ‏ ‏ ‏ تانمانی در قیامت تو خجل
ہرکہ او از ما سوا فارغ بود ‏ ‏ ‏ ‏ اوبہ نزدِ اہلِ دل باحق شود
اہلِ دل راکا روانے دیگر است ‏ ‏ ‏ ‏ این جماعت را نشانے دیگر است
زانکہ ایشان فانی مطلق شدند ‏ ‏ ‏ ‏ محو دریاے وجود خود شدند
با خدا یست ہرکہ با ایشان نشست ‏ ‏ ‏ ‏ چونکہ ایشاں با خدا ہستند مست
یار آمد ازورائے ایں حجاب ‏ ‏ ‏ ‏ ہمچناں در میغ پنہاں آفتاب
چوں علاقہ نور انوار است جو ‏ ‏ ‏ ‏ اینما تولوا ثم وجہہ
یار بے اعناد ہست ایں خوبرو ‏ ‏ ‏ ‏ کل شیء ھالک الا وجہہ
گرہمی خواہی کہ یابی زونشان ‏ ‏ ‏ ‏ بے تعلق شوز جملہ خان وماں
گفت آن سلطانِ عرفاں اہل دل ‏ ‏ ‏ ‏ یک قدم باشد طریقِ پابہ گل
از خدا جل و علا پر سید مش ‏ ‏ ‏ ‏ چوں برفتم ہمچنیں بے دید مش

هر چه بنی خواست بیں تم السبق ‌ ‌ نفس خود را روبہل اے مرد حق
ہیچ دانی از خودی بیروں شدن ‌ ‌ لذت و شہوت بہ کل برہم زدن
خواہش اندر باطن از دنیا ودین ‌ ‌ جز لقاے حق بناشد بالیقین
چوں نصیبے از لقا حاصل شود ‌ ‌ در رضائے حق طلب کامل شود
از رضا حاصل شود عالی مقام ‌ ‌ تافنا ایں شیوه ماند والسلام
بعد ازاں از بود خود خالی شود ‌ ‌ وہم غیرت زدل برافگند
تاتوانی باتو بود اندر کیاں ‌ ‌ می نیابی نورہا از خود نشان
چوں برستی از خودی گشتی تو فرد ‌ ‌ درمیان عارفان ہستی تو مرد
بعد ازاں آں یار جلوه میکند ‌ ‌ شاخ ایں گلبن ثمر ہامی دہد
آزمودن یک ز خود راہِ بہل ‌ ‌ تابہ چینی صد گل از بستانِ دل
اعتقاد فرقۂ حق را گزریں ‌ ‌ عارفِ اسرارِ حق شو بالیقیں
چوں توئی در نقش علمی پس چرا ‌ ‌ خویش را ہستی بہر بے ماجرا
عارفِ آن ہست گشتی تاکہ تو ‌ ‌ جلوۂ اسما دہد ہر چار سو
عقل ہرگز این خودی برہم نزد ‌ ‌ چونکہ وہمش کرده است از راه رد
عاقلاں زاں گفتہ اند اے مرد راه ‌ ‌ کور جستن مانع است بے اشتباه
رو طلبِ کن عشق او تا ہیچ شے ‌ ‌ می نیا ید اندرونِ توز نے
زاں پمبر گفت دل حرم خداست ‌ ‌ غیر آید در حرم ایں کے رواست
عقل آمد راه مارا چوں عصیل ‌ ‌ عشق رہبر شد بما نعم الدلیل
حاصلِ ہر دو جہاں گویم تمام ‌ ‌ عشق باید عشق باقی والسلام
نافِ عشق از ما سوا فارغ شود ‌ ‌ جز بذکر ذاتِ حق دم در کشد
ذکر حق ازدل بسوز و جملہ را ‌ ‌ می نیابد اندرونِ ماسوا
عیسوی را عشق او بیخود نمود ‌ ‌ عشق را بے سودبداں اے اہل خود
عشق حق را در تنزل آورد ‌ ‌ باز عشقش در تعرج می برد
حرف از عشقش بیاں نار و زباں ‌ ‌ دم کشیدن بہتر است از گفت آن
گرز عشق او بپویم نیم گام ‌ ‌ عمرہا فانی شود نے ان تمام
مجملاً یک حرف زو گویم شنو ‌ ‌ عشق او اوراکشیده کوبہ
تاشده ظاہر جمالش درد و کون ‌ ‌ جذبِ عشقش می کنداندر شیون

حسن اورامی نماید تا ابد عشق اور امیر ساند تا بخود
چشم بکشاده بحسن خویشتن باز ظاہر شد بہ اطوار حسن
بے دلاں را از ولایش بہرہ شد تا جمالش ظاہر از ہر ذرہ شد
کے شدے مر عاشقاں رایا راو گر بنودے اینچنیں انوار او
چونکہ بے پردہ شود خوب است چوں اندرونِ پردہ است آن چوں نسوں
تابخود بر خود نظر انداختر ما ومن را پردہ خود ساختہ
کس نباشد درمیانِ ذوالمنن خود شدہ عاشق بروی خویشتن
درورونِ شہر اندر چار سو نیست گشتہ خود شدہ اسرار جو
در شریعت خود شدہ بالاے دار از انا الحق دم زند منصور وار
درمیاں ناید بجز او ہیچکس عاشقِ معشوق خود بود است و بس
عیسوی جز مشرب خود دم مزن ختم کن آخر ندارد ایں سخن
در عمل آرید یاراں والسلام اعتقادِ صوفیا گفتم تمام
خود چہ گویدش پیش خود آں بیمثل من نہ گویم سر اسرار ازل

اوست اول اوست آخر در جہاں
اوست ظاہر اوست باطن بیگماں

یہ مثنوی نقل درنقل میں کتابت کی بکثرت ناقابلِ فہم اغلاط کی وجہ سے اپنی اصل حالت سے بہت کچھ تبدیل ہوکر ہم تک پہنچی ہے۔ تاہم نفسِ مضمون کے لحاظ سے اپنی صوفیانہ عظمت کے آئینہ دار ہے۔ وحدتِ وجود کے سلسلہ میں نہایت عارفانہ رموز و کنایات سے سرتاپا مرصع ہے۔ او ان اشعار میں دو جگہ تخلص آیا ہے۔ اولین تخلص کے اشعار کا مصرعہ ثانی کاتبوں کی لاپروائی کے باعث ایسی صورت میں آ گیا ہے کہ اصل مصرعہ کیا ہوگا ذہن میں نہیں آتا۔ دوسری جگہ کاتب صاحب نے تخلص ہی پر ہاتھ صاف کیا تھا۔ یعنی اس طرح لکھ دیا تھا۔

این سخن آخر ندارد ختم کن
عشق دی از مشربِ خود دم مزن

ظاہر ہے کہ ''عشق دی'' یا ''عشق دے'' کوئی چیز نہیں۔ یہاں عیسوی کے سوا کوئی لفظ نہیں ہوسکتا۔ اس کے علاوہ کن اور مزن باہم قافیہ نہیں ہوسکتے۔ غور کرنے سے معلوم ہوا کہ پہلے مصرعہ میں تقدیم و تاخیر واقع ہوئی ہے، چنانچہ اس طرح تبدیلی کی گنجائش نظر آئی۔

ختم کن آخر ندارد این سخت
عیسوی جز مشرب خود دم مزن

حضرت موصوف کی عمر گرامی تمام تر دینی علوم کی سرگرم خدمات میں بسر ہوئی ہے اور عملی زندگی کا ہر پہلو محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ڈوبا ہوا تھا۔ آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال و اقوال کی اطاعت و پیروی کو فرض عین اور جزو ایمان سمجھتے تھے۔ یہ چیز ویسے تو آپ کے ہر ایک تصنیف میں کافی حد تک نمایاں پائی جاتی ہے، لیکن فتوح الاوراد تو آپ کی افتاد طبع اور عملی زندگی کا ایک مجلّا و مصفا آئینہ ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے آپ کے اعمال و عبادات کے پاکیزہ اشغال، عشق و محبت اور اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے والہانہ جذبات بیک نگاہ سامنے آجاتے ہیں۔ محبت رسول میں آپ کو فنا فی الرسول کا درجہ حاصل تھا اور انجام کار آپ نے اسی جذبہٗ محبت میں سرشار ہوکر وطن، اولاد اور جملہ علائق دنیوی کو ترک کرکے ہجرت فرمائی اور آخری عمر کے سولہ سال بارگاہ رسول میں گزار کر وہیں دفن ہونے کی سعادت ابدی حاصل کی۔

جب آپ نے برہانپور سے مہاجرت اختیار کی، اس زمانہ میں ملکی ماحول میں امن و خوشحالی کا دور دورہ تھا اور وطن میں آپ کو معیشت و معاشرت کی تمام و کمال سہولتیں، فراغتیں حاصل تھیں۔ خاندانی عظمت و وجاہت کے مطابق دور و نزدیک، خاص و عام میں عزت و قبولیت حاصل تھی۔ سعید و رشید قابلِ فخر اولاد تھی۔ صحت نہایت اچھی تھی۔ ایسی کوئی وجہ نہ تھی جو آپ کو شیخوخت کے قریب عمر میں وطن سے دل برداشتہ کرتی۔

پھر یہ بھی نہیں ہوا کہ آپ حج و زیارت کی غرض سے تشریف لے گئے اور حجازِ مقدس اور حرمِ رسولؐ کی ایمانی و روحانی دلچسپیوں سے متاثر ہوکر وہیں رہ گئے۔ یا خرابی صحت کے باعث واپسی کے قابل نہ تھے۔ اس لئے وہیں رہنے پر مجبور ہوئے۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی، بلکہ یہ صرف محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بے پناہ جذبہ تھا کہ آپ نے تمام آسائشوں کو ترک کرکے جوارِ پاک رسول ﷺ میں بقیہ زندگی گذارنے کا فیصلہ کیا اور اس پر عمل کرکے دکھادیا۔

یہ چیز تو آپ نے نہ صرف اپنے دل میں طے کرلی تھی، بلکہ اس کا واضح اور برملا اظہار کرکے نہایت اطمینان سے جملہ لواحقین اور اہلِ استحقاق، عزیز و اقربا کے تمام شرعی حقوق ادا کئے اور اپنا ارادہ سب پر ظاہر بھی فرمادیا کہ بقیہ عمر مدینہ طیبہ ہی میں بسر کریں گے، تاکہ کسی کا بفرض محال کوئی مطالبہ یا حق آپ کے ذمہ ہو تو وہ بے خبر نہ رہے۔ چنانچہ تشریف لے جانے سے قبل اپنی اولاد اور عزیزوں میں اپنا تمام ترکہ تقسیم فرمادیا اور احکامِ شرعی کے مطابق وراثت نامہ یا تقسیم نامہ اپنے قلم سے تحریر فرماکر اپنی اولاد کے سپرد فرمایا اور عملدرآمد کی تاکید فرمائی۔ اس سفر میں آپ

نے اپنے بڑے فرزند شیخ شہاب الدین اور محل خورد کو (روانگی کے وقت آپ کی دو حرم تھیں) ہمراہ لے گئے تھے۔ چار سال بعد ۱۰۶۸ھ میں جب شیخ شہاب الدین اور حضرت کی حرم خورد کی واپسی ہوئی، اُس وقت آپ نے مدینہ طیبہ سے ایک اور تاکید نامہ مذکورین کے ہاتھ ارسال فرمایا تھا۔ اس میں بھی سابقہ وصیت نامہ پر عمل کرنے کی تاکید کے علاوہ حرم بزرگ کے ساتھ صلۂ رحم اور خاص توجہ کی تمام ورثا کو تاکید لکھی تھی۔ اگرچہ یہ دونوں تحریریں ہمدست نہ ہوئیں، لیکن ایک اور کاغذ جس میں آپ کے مذکورہ بالا ہر دو وصیت ناموں کی تفصیلات اور بعد میں حرم بزرگ کا دعوائے اور اس کے فیصلہ کی کاروائی اور اس تمام پر سرکاری تصدیق درج ہے۔ حضرت سید اکرام الدین صاحب سجادہ نشین درگاہ حضرت شیخ برہان الدین راز الٰہی قدس سرہٗ کے پاس ہے۔ سجادۂ نشین صاحب موصوف نے میری استدعا پر از راہِ عنایت کاغذ مذکور کی نقل اور اس کا فوٹو لینے کی اجازت عطا فرمائی جو بجنسہ منسلک ہے۔ اس کاغذ کے مطالعہ سے چند نئی باتیں سامنے آگئیں جو یہ ہیں۔

آپ کی دو حرم تھیں۔ محل بزرگ امۃ الغنی بنت شیخ اولیا ابن شیخ جمال محمد ان کے بطن سے آپ کی دو لڑکیاں تھی۔ ۱- امۃ الرحمٰن۔ ۲- فاطمہ بیبی۔ یہ دونوں آپ کی ہجرت کے وقت کمسن تھیں۔

آپ کے تین لڑکے جوان العمر اور بعض (یا سب) صاحبِ اولاد بھی تھے۔ ۱- شیخ شہاب الدین۔ ۲- شیخ محمد رحیم۔ ۳- شیخ عیسیٰ۔ ان کی والدہ کے متعلق کوئی صراحت نہیں ہے۔ انہیں حرم بزرگ امۃ الغنی کے بطن سے ماننے میں اسلئے تامل ہے کہ آپ نے مدینہ منورہ کے تاکید نامہ میں انہیں فرزندوں اور دیگر ورثا کو ان کے ساتھ رحم اور مہربانی کرنے کی اپیل کے طور پر تاکید کی ہے۔ حقیقی والدہ کے ساتھ ایسی نیک خصال اولاد کو اس طریقہ پر تاکید لکھنے کی ضرورت نہ تھی، جبکہ ان سے بے اعتنائی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حرم بزرگ آپ کی پہلی بیوی نہ تھی، جبکہ ۱۰۶۴ھ میں ان کی دو ہی بچیوں کی تفصیل ملتی ہے۔ اور مذکورہ فرزندوں کو ان کے ساتھ مہربانی کرنے کی ترغیب میں خود اپنی مثال دی ہے کہ جس طرح میں اپنی مادرِ عارضی (سوتیلی ماں) سے حسنِ سلوک کرتا رہا ہوں تم لوگ بھی کرو گے تو میری خوشنودی اور خدا رسول کی رضامندی کا باعث بنو گے۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ حرم بزرگ امۃ الغنی آپ کے تینوں فرزندوں کی مادر عارضی تھیں۔ نیز ایک دوسری شہادت سے پایا جاتا ہے کہ آپ کی پہلی خانہ آبادی اوائل عمر میں ۱۰۱۷ھ تا ۱۰۲۰ھ ہوئی تھی اور شیخ شہاب الدین کی ولادت حضرت مسیح الاولیاء کے زمانۂ حیات میں واقع ہوئی تھی۔ فرحی نے اس خانہ آبادی کا ذکر کشف الحقائق میں آپ کی روایت کے مطابق اس طرح کیا ہے کہ

حضرت بابا فتح محمد فرمودند کہ درآں ایام (درعہد طالب علمی) کہ فقیر تازہ کارِ خیر کردہ بود بمقتضائے جوانی روزے لمس شہوت واقع شد چوں وقتِ ظہر بخدمت حضرت آمدم بوئے من دیدہ حضرت فرمودند کہ بہ مقبرۂ بندگی شیخ طاہر رفتہ توبہ کنید۔ فقیر بموجب فرمودہ آنجا رفتہ توبہ کرد۔ بتائید وتوجہ بزرگان ازاں بلا محفوظ ماند۔ (کشف الحقائق ص ۵۷)

ممکن ہے یہ تینوں فرزند انہیں محترمہ کے بطن سے ہوں اور ان کے انتقال کے بعد حضرت بابا نے حرم بزرگ امۃ الغنی سے عقد کیا ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

آپ کی دوسری محل حرمِ خورد اچھوں بی بی تھی جو حجاز مقدس کے سفر میں آپ کے ہمراہ تھیں، جیسا کہ تحریر مذکورۃ الصار سے ثابت ہے۔

پہلے وصیت نامہ کی رو سے آپ نے اپنی ملک قریہ کول کھیڑہ معہ باغ۔ بورگام معہ باغ۔ قریہ اولتی۔ قریہ پاتوندی اور کچھ نقد روپیہ (مقدار کاغذ پھٹا ہونے کے باعث معلوم نہیں ہوسکی) محمد علی کو دیا ہوا تھا۔ اس طرح تمام فرزندوں ہر دو محل اور دیگر اہلِ قرابت و مستحقین کو تقسیم فرمایا ہے۔

سب سے پہلے ایک چھانت غلہ (چھانت غلہ کا کوئی پیمانہ جو اس وقت رائج رہا ہوگا) سال ختم ہونے پر جملہ قرابت داروں کے لئے جو صلۂ رحم کے مستحق ہیں الگ کرلیا جائے۔

محمد رحیم کو جن کے ذمہ خانقاہ نشین فقرا، صوفیا کی نگہداشت تھی، نصف کول کھیڑہ اور وہ روپیہ جو محمد علی کو دیا ہوا ہے۔

شیخ شہاب الدین اور محمد عیسیٰ کو نصف کول کھیڑہ اور بورگام کے دو حصے کہ یہ دونوں کلن؟ اور محل کلاں کے خویشوں میں ہوتے ہیں اس تفصیل سے کہ ایک سوبیس روپیہ ان ہر دو مواضع کا شیخ محمد عیسے حاصل کرے۔ لیکن جب شیخ شہاب الدین واپس آئیں تو علی الحساب نصف اُنھیں ادا کرے اور اس کے بعد جو باقی رہے اُس کا نصف شیخ عیسیٰ مع اپنے عیال کے لے لیں۔ اور دوسرا حصہ تقسیم خمس کے لحاظ سے دو حصے مرحوم شیخ عبدالقدوس کی بیوہ کو اور بقیہ تین حصے مرحوم ابو یوسف کی بیوہ اور دختر کو دیا جائے۔

اور...... چار حصے کریں...... حصہ عبدالغنی محل کلاں کے مامون کو اور ایک حصہ محمد رحیم کی دختر حلیمہ کو اور بقیہ ایک حصہ باعتبار ثلث دو حصے ابو محمد کو اور ایک حصہ حسب للذکر مثل حفظ الانثیین دونوں نواسوں کو تقسیم کریں۔

قریہ اولتی کے ساڑھے چار حصے کریں۔ ڈیڑھ حصہ محمد رحیم مع اپنے فقراء کے حاصل کریں۔ ایک حصہ شیخ شہاب الدین اور ایک حصہ محمد عیسیٰ اور ایک حصہ ہر دو کلن بہ تقسیم سابق بانٹ لیں۔

نصف قریہ پاتوندی جو میرے (حضرت بابا فتح محمدؒ کے) نامزد ہے جب تک میں زندہ ہوں میرے اور محل خورد وان کے فرزندوں کے لئے رہے گا۔

اس کے بعد نصف گاؤں یا جو باقی رہے تمام یا کچھ محل خورد اور اُن کے فرزندوں کے حق میں قائم رہے گا۔

فقیر نے کول کھیڑہ اور بور گام میں باغ لگائے ہیں۔ ان باغوں سے جو کچھ حاصل ہو اُس کے تین حصے کریں۔ ایک حصہ سادات کرام، اقربا جو صلۂ رحم کے مستحق ہوں اور فقراء کو حسب استحقاق پہنچائیں۔ ایک حصہ تمام فرزندان مذکورہ تقسیم کے اعتبار سے حاصل کریں اور ایک حصہ پاتوندی کے ہمراہ فقیر کو تاحیات پہنچاتے رہیں۔

بعد ازاں (میرے فوت ہونے کے بعد) (آپ کے نامزد حصہ و رقم کے) تین حصے کریں ایک حصہ محل خورد کو معہ ان کے فرزندوں کے دیں اور بقیہ دو حصوں کو چار عرس کے موقعہ پر صرف کریں (چار عرس کی تفصیل یہ ہے) آنحضرت ﷺ، سلطان العارفین، حضرت غوث اعظم حضرت صاحب۔

چار سال تک اس وصیت پر عمل ہوتا رہا۔ ۱۰۶۸ھ میں محل خورد اور شیخ شہاب الدین واپس تشریف لائے اس وقت حضرت بابا فتح محمد نے ان کے ہمراہ ایک اور تاکید نامہ خود نوشت ارسال فرمایا۔ اس میں تینوں فرزندوں کو اپنی سابقہ تحریر پر عمل کرنے کی تاکید کے ساتھ یہ ہدایت بھی فرمائی کہ جو کچھ ہم نے جس کے لئے مقرر کر دیا ہے اس پر راضی و خوشنود رہیں اور اگر سب پسند کریں تو ایک ایثار یہ بھی کریں کہ خمس پہلے ہی نکال لیں۔ اس میں سے نصف ہر دو کلن؟ کو اور نصف دیگر اہلِ استحقاق اقربا و اعزا کر دیں۔ اور اگر بدقسمتی سے تمام حصہ دار راضی نہ ہوں تب بھی ہر دو کلن کو ثمن ضرور ادا کیا جائے کہ وہ قطعی طور پر آٹھویں حصہ کے مستحق محروم نہ رہیں۔

اور تینوں فرزند اپنی سوتیلی ماں محل بزرگ امۃ الغنی کے ساتھ مہربانی اور حسنِ سلوک روا رکھیں جیسا فقیر اپنی مادر عارضی کی خدمت بجا لاتا رہا۔ یہ حسنِ سلوک مجھے نیز خدا اور رسول کو خوشنود و راضی کرنے کا موجب ہوگا۔

اس تاکید پر فرزندانِ سعید نے نہایت خوش دلی سے عمل کیا۔ محمد رحیم نے لکھ دیا کہ:

”فقیر محمد رحیم بموجب ورود حکم عالی موافق وصیت در جمیع امور بلا جبر و اکراہ برضا و رغبت قبول کردم۔“

شیخ شہاب الدین اور شیخ محمد عیسیٰ نے بھی لکھدیا کہ:

”فقیر شیخ شہاب الدین و محمد عیسیٰ نیز بموجب وصیت انچہ حکم است قبول دارد۔“

آگے لکھا ہے:

ہم تمام ورثا نے متفق ہوکر اپنے حصے مقرر کیے۔ ہر ایک فرزند کا حصہ مقرر ہوا ایک سو ساٹھ روپے۔ نیز ہم سب نے متفق ہوکر تجویز کیا کہ حضرت والدہ صاحب (محل بزرگ) کو اختیار ہوگا کہ وہ دیہات کی آمدنی سے خوش ہوکر اپنے اور اپنی لڑکیوں کے حصوں کی رقم خود لے لیا کریں۔ اور موضع پاتوندی، پچاس روپیہ خواہ فصل اچھی ہو یا خراب بلا عذر ہر سال ادا کریں گے۔

اس کے بعد شیخ محمد عیسیٰ کو مخاطب کیا گیا، اُنہوں نے اپنے حصے میں بورگام کو بلا شرکت غیر رضا و رغبت سے قبول کرلیا اور بقیہ نصف (کول کھیڑہ) اور اولتی کے روپیہ کا محمد رحیم اور شیخ شہاب الدین کو اختیار دیا کہ آپ جو چاہیں کریں۔ انہوں نے (غالباً شیخ شہاب الدین نے) محمد رحیم کو اختیار دیا کہ آپ جو چاہیں عمل فرمائیں۔ آخر بہت رد و بدل کے بعد طے ہوا ہر ایک نے اپنا حصہ قبول کیا۔

میاں محمد رحیم نصف روپیہ واولتی۔

میاں شیخ شہاب الدین نے کول کھیڑہ اور اپنا حصہ لے کہ قبول کیا کہ ستر روپیہ سالانہ اپنی ذات سے خواہ فصل اچھی یا خراب پیش کریں گے۔

یہ ستر روپے اور پچاس روپیہ پاتوندی کے جملہ ایک سو بیس روپیہ ہوئے، ان میں سے اسی روپیہ ہر دوکلنان؟ کے لئے مقرر ہوئے اور تیس روپیہ اقربا واہلِ استحقاق کے لئے۔

ہر دو باغات کی آمدنی حضرت کی مجوزہ تقسیم کے مطابق رہے گی۔

ہم ورثاء نے یہ بھی معاہدہ کیا کہ اگر سال خراب واقع ہو یا زراعت میں خرابی کے باعث فصل نہ آئے تو یہ صاحب موضع کی قسمت، دیگر ورثاء پر اس کا اثر نہ ڈالا جائے۔

خدانخواستہ کوئی موضع سرکاری طور پر ضبط ہوجائے تو صاحب موضع کو حتی الامکان واگذاشت کے لئے کوشش کرنی چاہئے۔ اس پر بھی ناکامی ہو تو دیگر ورثاء کو الزام ہے کہ اپنے حصوں میں سے اس کے حق کے مطابق ملکیت الگ کر کے اس کو دے دیں۔

ہم تمام ورثاء نے رضا و رغبت سے اس تحریر سے اتفاق کیا ہے۔ جوار جیسا کہ حضرت کا حکم ہے مواضع پر اس طرح مقرر کی۔ کول کھیڑہ چہار ماپ- پاتوندی چار ماپ- بورگام دو ماپ- اولتی دو ماپ- ان حصوں پر سب راضی ہیں۔ یہ تحریر ۱۰۶۸ھ میں عمل میں آئی۔

آگے لکھا ہے:

بعد از دو سال (سہو کتاب ہے دوازدہ ہونا چاہئے تب ۱۰۸۰ھ صحیح آتا ہے) حضرت والدہ صاحبہ نے فرمایا کہ مجھے دیہات سے حصہ ثمن (ہشتم) دیا جائے اور ان کی لڑکیوں امۃ الرحمٰن

اور فاطمہ بی بی نے کہا کہ ہمیں دیہات سے کچھ نہیں ملا ہے جس وقت تم نے یہ حصے کئے ہم نابالغ تھیں، اب ان دیہات کی آمدنی بھی زیادہ ہے۔ لازم ہے کہ ہم از سر نو حصے مقرر کریں۔ اور ہمارے حصہ میں جو زمینات آئیں ان میں آچھوں بی بی (محل خورد) کو شریک نہ رکھیں۔

بڑی رد و بدل کے بعد طے ہوا کہ آچھوں بی بی اور ان کی لڑکی کو موضع پاتوندی سے شروع سال میں چالیس روپیہ ہر سال پہنچایا جائے گا اور باقی بیس روپیہ میاں شیخ شہاب الدین اپنے موضع کول کھیڑہ سے ادا کریں خواہ فصل اچھی ہو یا خراب۔ یہ مذکورہ ساٹھ روپے دو جگھوں سے ان کو پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد امۃ الغنی اور ان کی لڑکیوں کو آچھوں بی بی اور ان کے فرزندوں و برادران سے کوئی نزاع یا دعوائے نہیں رہے گا جو اس معاہدے کی خلاف ورزی کرے گا۔ خدا رسول، اور اولیاء اللہ کے نزدیک مردود و نامقبول ہوگا۔ اگر دلیل کے طور پر کوئی کاغذ بھی پیش کرے وہ ناقابلِ اعتبار اور رد سمجھا جائے گا، خواہ اُس میں شرعی دلائل ہی کیوں نہ ہوں۔ ہم سب نے دیکھ اور سمجھ کر مذکورہ تمام شرائط کو قبول کیا ہے۔ تحریر فی التاریخ ۱۱ رجب المرجب ۱۰۸۰ھ۔

اور آگے تحریر ہے:

بتاریخ ۱۹ شوال ۱۰۸۰ھ مسمّٰی محمد حسین ولد شیخ اولیا ابن شیخ جمال محمد نے بحیثیت وکیلِ مطلق منجانب مسماۃ بی بی امۃ الغنی بنت شیخ اولیا مذکور زوجۂ غفران پناہ میاں شیخ فتح محمد و مسماۃ امۃ الرحمٰن و مسماۃ فاطمہ دختران بی بی امۃ الغنی مذکورہ بذریعہ وکالت نامہ اور شیخ ابو محمد ولد شیخ محمد طاہر و محمد عبداللہ ولد شیخ عبدالرحمٰن کو گواہی سے بلدۂ برہانپور کی عدالت عالیہ میں پیش ہوکر اقرار (دعویٰ) کیا کہ اس سے قبل حضرت غفران پناہ (بابا فتح محمد) کے دیہات مد دمعاش جس طرح مشخص اور مقرر تھے۔ اب میری مؤکلات چاہتی ہیں کہ ہمیں تمام دیہات سے ثُمن ملے اور بی بی امۃ الرحمٰن اور بی بی فاطمۃ کہتی ہیں کہ جب یہ حصے مشخص اور مقرر کئے گئے ہم نابالغ تھیں، اب ان دیہات میں آمدنی زیادہ ہوتی ہے۔ لازم ہے کہ از سر نو حصے مقرر ہوں۔ اور اچھوں بی بی کو اور ان کی دختر کو ہمارے مواضع سے کچھ نہ دیا جائے۔

بہت سے رد و بدل کے بعد مصالحانہ طور پر یہ طے کیا گیا کہ آچھوں بی بی اور ان کی دختر کو چالیس روپیہ سالانہ موضع پاتوندی کی آمدنی سے دیا جائے گا اس کے علاوہ ان ہر دو کو اور کوئی کچھ بھی دے میری مؤکلات کو کوئی عذر نہ ہوگا، کیونکہ یہ چالیس روپے خمس مستحقوں کا حق ہے اس میں کسی کو دخل نہیں۔ اور میری موکلات چار ماپ جوار بھی اقربا کو حصہ رسد پہنچانے کے لئے پیش کریں گی۔ اس کے بعد میری موکلات کو اور نیز ان کے فرزندوں و دختروں کو بھائیوں اور ان کے فرزندوں سے کسی بھی چیز کا مطالبہ۔ حق یا دعوا نہ رہے گا۔ میری مؤکلات و جمیع ورثاء اپنے و عادی

سے دست بردار ہوکر تحریر ہذا کو قبول کرتی ہیں۔ دیگر یہ کہ وہ مکان جو مسماۃ امۃ الغنی کو بعوضِ مہر ملا ہوا ہے۔ اس مکان کو اگر وہ اپنے داماد کو فروخت کردیں یا ہبہ یا وراثتاً ان کو پہنچے تو وہ دروازہ جو مسجد میں کھلتا ہے بجز ادائے نماز یا طلبِ علم اس سے آمد و رفت نہ کریں اس لئے کہ مرحوم (بابا فتح محمد) نے اس طرف برائے درس و نماز دروازہ قائم کیا تھا۔ قدیم نہ تھا۔ اور اگر یہ مکان کسی غیر شخص کو فروخت کیا جائے تو اندر سے دروازہ کو بستہ کردیا جائے کیونکہ بقیہ زمین فی سبیل اللہ خانقاہ سے متعلق ہے۔

جو کوئی اس اقرار سے منحرف ہوگا، اللہ، رسول اور اولیاء کے نزدیک مردود و نا مقبول ہوگا۔ ہم سب اس تحریر پر اعتبار کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر کوئی شخص دوسری تحریر پیش کرے تو وہ منسوخ اور رد سمجھی جائے گی۔ خواہ حجت شرعی ہو۔

یہ کاغذ قریباً تین فٹ لمبا اور ایک فوٹ چوڑا ہے۔ اس میں روداد تو مفصل تحریر ہے، مگر کوئی مہر یا کسی کے دستخط نہیں ہیں، اس کا سبب غالباً یہ ہوگا کہ یہ وقتاً فوقتاً جملہ کارروائیوں اور انجام کار عدالتِ شرعی کی توثیق کے بعد اور متفقہ سمجھوتہ کی نقل ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ جملہ ورثاء اور اہل تعلق نے یاد داشت و یادگار کے طور پر اس کی ایک ایک نقل بیک وقت حاصل کی ہوگی اور صرف ایک اصل عدالت عالیہ (قاضی کی عدالت) کے دفتر میں ہوگی جس پر ورثا اور شاہدین اور وکیل کے دستخط ہوں گے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

نفس مضمون سے قطع نظر اس تحریر سے ثابت ہے کہ حضرت بابا فتح محمد نے ۱۰۶۴ھ میں ہجرت فرمائی اور ۱۰۶۸ھ جو عام طور سے مشہور ہی ہجرت نہیں کی بلکہ رفقائے سفر کی واپسی کی تاریخ ہے۔

آپ کے وصال کا ۱۰۸۲ھ مشہور ہے۔ یہ بھی اس تحریر سے ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ آپ کا سنہ رحلت ۱۰۸۰ھ ثابت ہوتا ہے۔ یہ چیز ورثا کے دعووں سے بھی ثابت ہوتی ہے کہ آپ کی وفات کے بعد وہ رقم اور جاگیر جو آپ کے نامزد تھی شرعی تقسیم کے مطابق ورثاء کو اس کا استحقاق پیدا ہوسکتا ہے۔ یہ دعوے بھی ۱۰۸۰ھ میں رونما ہوئے۔ نیز کارروائی کے بیانات میں آپ صریحاً مرحوم وغفران پناہ کے الفاظ سے یاد کئے گئے ہیں یہ ایسا ثبوت ہے جس میں ظن و اشتباہ کو دخل نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ آپ کا وصال ۱۰۸۰ھ میں بمقام مدینۂ منورہ ہوا اور آپ جنت البقیع میں دفن کئے گئے۔ ہجرت کے بعد آپ حجاز پاک وحرم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ۱۶ برس تک زندہ رہے۔ ظاہر ہے کہ وہاں علمی مشاغل کے سوا آپ کو اور کام ہی کیا تھا۔ واللہ اعلم اس طولانی عرصہ میں آپ نے کتنے دینی رسائل یا کوئی مستقل کتاب تصنیف کی ہوگی جس کا کوئی علم نہ ہوسکا۔

آپ کی حسبِ ذیل تصانیف شمار میں آتی ہیں جو برہانپور میں ہی مرتب ہوئیں اور ان میں سے کسی ایک کتاب یا رسالہ کا ذکر یا حوالہ دوسری کتاب میں مذکور ہے۔

(۱) فتوح الاوراد- اس کتاب سے کچھ اقتباسات تذکرۂ ہذا میں پیش کئے گئے ہیں اس کا سنہ تالیف ۱۰۵۷ھ ہے۔

(۲) فتح المذاہب الاربعہ عربی۔

(۳) مفتاح الصلوٰۃ یہ کتاب ۱۰۶۱ھ اپنے ہمشیر زادہ شیخ احمد بن سلیمان کی تعلیم کے لئے لکھی تھی۔

(۴) رسالہ جہۃ الکعبۃ (سایۂ اصلی برہانپور)

(۵) رسالہ مستحب وقتِ عشاء وظہر۔

(۶) مثنوی تنزل الحق جل وعلا بعقیدۂ صوفیا۔

☆

تعلیقات

تعلیق (۱): شیخ ابوالمجد عبدالرحمٰن عرف بابا فتح محمد، مسیح القلوب شیخ عیسیٰ جنداللہ پاٹائی ثم برہانپوری کے فرزند صغیر بی بی خدیجہ کے بطن سے برہانپور میں ۱۰۰۰ھ/۱۵۹۱ء کے قریب کسی سال پیدا ہوئے۔ آپ کے سن پیدائش کا گلزار ابرار یا کشف الحقائق میں ذکر موجود نہیں۔ جس طرح مسیح الاولیا کی ابتدائی زندگی اور آپ کے فرزند شیخ شہر اللہ کے احوال سے یہ تذکرے خالی ہیں۔

سن ۱۰۱۷ھ/ ۱۶۰۸ء میں آپ کو اپنے والد گرامی کے پاس اعلیٰ علوم فقہ، حدیث اور تفسیر پڑھتے دکھایا گیا ہے۔ اس لئے اس سال کو آپ کا سن بلوغت تصور کرتے ہوئے اندازاً سال ۱۰۰۰ھ کو آپ کا سال ولادت سمجھا گیا ہے۔ اس حساب سے والد گرامی کی وفات حسرت آیات کے وقت آپ کی عمر عزیز ۳۱-۳۲ یا اس کے قریب ہوگی۔ اس زمانہ میں آپ خانقاہ سے متصل مدرسے کے مہتمم تھے۔ حضرت مسیح الاولیا کے فرزند کلان شیخ عبدالستار کی وفات اور ان کے فرزند شیخ ابوالقاسم کو مجذوب قرار دینا آپ کی آنکھوں کے سامنے تھا کہ آپ بھی یکا یک والد کی مسند ارشاد ''شطاری خانقاہ برہانپور'' سے دستبردار ہوگئے۔ اپنے مشاغل دینی اور درس و تدریس کے علاوہ تصنیف و تالیف کو مدرسہ کی حدود تک محدود رکھا۔ یوں آپ نے اپنی عمر کے تیں پینتیس سال گذار دیئے۔ ۱۶۵۴ء میں مدینہ منورہ ہجرت فرمائی، وہیں وفات کی اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

آپ کا اپنے بھتیجے مخدوم حسن قاری پاٹائی کو بطور ہبہ کتب دینا اور ان میں سے ایک کتاب ''شرح مواقف'' کے آخری ورق پر اپنا شجرہ نسب لکھ کر دینا، گذشتہ اوراق میں بیان کیا گیا ہے۔ آپ کا سندھ میں موجود بھتیجے کے علاوہ اہل سندھ کے ساتھ تعلق ''المکتوب الحبیب'' کے علاوہ خود راشد برہانپوری کے پیش کردہ وہ تین اشعار ہیں جو آپ کے بقول ''کسی سندھی بزرگ کے حرفی اشارات میں تین شعر مشہور تھے اور اس قدر مشہور کہ تعلیم یافتہ گھرانوں میں مستورات کو بھی ازبر تھے اور وہ اپنی اولاد کو صغرسنی ہی میں یاد کرادیا کرتی تھیں۔'' ان ابیات کے متعلق المکتوب الحبیب میں لکھا ہے کہ:

«اهي بيت حضرت مولانا محمد زاهد علما سنڌ جا، جنهن مدرسي پاتر کان هئا، سي عالم سنڌ جا حضرات عبدالستار ۽ شيخ رمضان

شهر الله پاتري ۾ مخدوم عثمان محدث وغيره سندن اولاد امجاد
کي تعليم ڏيندا (پڙهائيندا يا درس ڏيندا) هئا. مدرسا پريل
برڪات جا گهٽا هئا. هڪڙي مدرسي جي نشاني هت ظاهر ٿي
ڏيکارجي.»

"نقل از کتاب 'مراح الارواح' مورخ ۹۷۲ھ (۱۵۶۵ء) الضعیف الحفیف الراجی الی (اعلیٰ) رحمة الله عزیز العلیم موسیٰ بن بدر الدین فی مدرسة مولانا واولینا وهو الزاهد الزاهدین واعظ الملوک والسلاطین مولانا فرید الحق والملة والدین سلم الله تعالیٰ وابقاء الی یوم الدین شیخ الاسلام پرگنه الانام المولیٰ الفاضل ذو الهمم نظاما مخدوما قاضی بن قاسم مدد الله عمره ونفعنا به الی یوم الدین وسائر المبتدین من الطالب الذین فی بلدة المبارکة قبة الاسلام "پاتر" سلمه الله تعالیٰ وصانها الله من الآفات والبلیات وقد تم الکتاب المسمی "مراح الارواح" من شهر العظیم المبارک شهر رمضان اثنین و سبعون (رمضان ۹۷۲ھ/۱۵۶۵ء) وتسمائة من الهجرة النبویة علیه افضل الصلوٰة واکمل التحیات وقد کتبت لاجل نفسی ونفخ غیری من ادعیٰ سواه بطل دعواه" (المکتوب الحبیب قلمی)

مرح الارواح کے اس قلمی نسخہ کی کتابت کے وقت حضرت مسیح الاولیا کی عمر مبارک دس سال تھی۔ المکتوب الحبیب نے اس نسخے سے لفظ بہ لفظ نقل کئے ہیں۔

تعلیق (۲): آپ کی وجہ شہرت وہ تحریریں ہیں، جو آنے والے نسلوں کے لئے رہنمائی کا باعث بنیں اور صدیوں تک نہ صرف ہند، بلکہ سندھ کے علما بھی ان سے مستفیض ہوتے رہے۔ آپ کی تصانیف میں سب سے زیادہ شہرت مفتاح الصلوٰۃ کو حاصل ہے۔ فارسی نسخہ کے آغاز میں بابا فتح محمد رقمطراز ہیں: "بزرگے از علمائے سندھ فرائض و واجبات و سنن را درسہ بیت بحروف اشارت کردہ است کہ اکثر اوقات حضرت ما (مان) صاحب تعلیم میفر مودند۔"

(۱) فرائض: فرائض نہ دانی شوی در قلق
انجس نوق تقق رسق

(۲) واجبات: چو واجب ندانی شوی در خطر
فضت تقت لقت جسر

(۳) سنن: چو سنت بدانی شوی مقتدا
روث تبت تست دوا۔

شاعر پہلے شعر کے ذریعے فرائض، واجبات اور سنتوں کے متعلق اہم نقطہ بیان کرتا ہے، پھر حروف مفرد جو فرائض واجبات اور سنتوں کے پہلے حرف کو لیکر تمام بات کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہر ایک شعر اور حروف کے مکمل الفاظ اور ان کا فارسی اور اردو ترجمہ کچھ اس طرح ٹھہرتا ہے:

(۱) فرائض

فرائض نہ دانی شوی قلق

(اگر نماز کے فرائض سے واقف نہیں تو پریشان ہوتے رہو گے)

اجس نوق تقق رسق

نمبر شمار	حرف	لفظ/ جملہ فارسی	اردو ترجمہ
۱	ا	اندام پاک کردن	نہائی اندام کا پاک کرنا
۲	ج	جای پاک کردن	جگہ کا پاک کرنا
۳	ج	جامہ پاک کردن	کپڑوں کا پاک کرنا
۴	س	ستر عورت کردن	ستر کرنا
۵	ن	نیت کردن	نیت کرنا
۶	و	وقت شناختن	وقت جاننا
۷	ق	مقابل قبلہ ایستادن	قبلہ رخ ہوکر نماز ادا کرنا
۸	ت	تکبیر اولی گفتن	تکبیر کہنا
۹	ق	قیام کردن	قیام کرنا
۱۰	ق	قراء خواندن	قراۃ کرنا
۱۱	ر	رکوع کردن	رکوع کرنا
۱۲	س	سجدہ کردن	سجدہ کرنا
۱۳	ق	قائدہ آخرین نمودہ	آخری قعدہ میں بیٹھنا

(۲) واجبات

چوں واجب نہ دانی شوی در خطر

(اگر واجب نہ جانو گے تو خطرناک حالت پیش آئے گی)

فضت تقت لقت جسر

نمبر شمار	حرف	لفظ/ جملہ فارسی	اردو ترجمہ
۱	ف	فاتحہ خواندن	فاتح پڑھنا
۲	ض	ضم سورۃ نمودن	فاتحہ کے ساتھ سورۃ ملانا
۳	ت	تعین قرأت در دو رکعت	فرض کی پہلی دو رکعت میں الحمد کے بعد قرآن کی تلاوت کرنا
۴	ت	تعدیل ارکان نمودن	نماز کے ارکان اطمینان اور سکون سے ادا کرنا
۵	ق	قعدہ اولی نشستن	پہلے قعدہ میں بیٹھنا
۶	ت	تشہد در ہر دو قعدہ خواندن	دونوں قعدوں میں التحیات پڑھنا
۷	ل	لفظ سلام آخرین گفتن	نماز ختم کرتے وقت آخر میں السلام علیکم کہنا
۸	ق	قنوت در وتر خواندن	وتر میں دعا قنوت پڑھنا
۹	ت	تکبیرات در ہر دو عید گفتن	عیدین کی نماز میں اضافی چھ تکبیریں کہنا
۱۰	ج	جہر خواندن در نماز جہری	جہری نماز میں (صبح، مغرب، عشاء، جمعہ، عیدین) بہ آواز بلند تلاوت کرنا
۱۱	س	سر خواندن قرأت در ظہر وعصر	ظہر وعصر میں آہستہ قرأت کرنا
۱۲	ر	رعایت ترتیب نمودن	ترتیب کی پابندی کرنا۔

(۳) سنن

چوں سنت بدانی شوی مقتدا

(سنتیں جانو گے تو لوگوں کے رہبر بن جاؤ گے)

روث تبت تست ددا

نمبر شمار	حرف	لفظ/ جملہ فارسی	اردو ترجمہ
۱	ر	رفع یدین در وقت تکبیر اول کردن	پہلی تکبیر (تحریمہ) کہتے وقت کانوں تک ہاتھ اٹھانا
۲	و	وضع یمین برشمال	دائیں ہاتھ پر بایاں ہاتھ رکھنا
۳	ث	ثنا یعنی سبحانک اللھم خواندن	ثنا یعنی سبحانک اللھم پڑھنا
۴	ت	تعوذ خواندن	اعوذ باللہ پڑھنا
۵	ب	بسم اللہ گفتن	بسم اللہ پڑھنا
۶	ت	تکبیرات انتقالات گفتن	ایک رکن ادا کرنے کے بعد دوسرے رکن میں جانے سے پہلے اللہ اکبر کہنا۔
۷	ت	تسبیح رکوع وسجود گفتن	رکوع میں سبحان ربی العظیم اور سجدہ میں سبحان ربی الاعلیٰ کہنا
۸	س	سمع اللہ خواندن	سمع اللہ لمن حمدہ کہنا
۹	ت	توقف در قومہ وجلسہ نمودن	رکوع کے بعد قومہ یعنی کمر سیدھی کرکے کھڑا ہونا اور سجدہ کے بعد جلسہ کرنا یعنی تھوڑا ٹھہرنا
۱۰	د	دعا خواندن	دعا مانگنا
۱۱	د	درود خواندن	درود پڑھنا
۱۲	ا	آمین گفتن	آمین کہنا

ان ابیات میں فقہی مسائل کو کچھ اس انداز سے حرفی اشارات اور الفاظ میں قید کر کے منظوم شکل دی گئی ہے کہ صغیر بھی انہیں زبانی یاد کر لے۔ حفظ کرنے کا یہ طریقہ قدیم زمانہ سے سندھ کے مدارس میں مقبول تھا۔ آج کل تو دنیا بھر میں مختلف تنظیموں اور معاہدوں کے طویل نام مخففات یا ہر لفظ کے پہلے حرف کو لے کر لایعنی لفظ کی شکل دی جاتی ہے۔ مفتاح الصلوٰۃ انہیں لا یعنی اشعار کے اشارات کا تفصیل ہے۔ مصنف نے یہ کتاب ۱۰۶۱ھ/۱۶۵۲ء میں مکمل کی۔ اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اس موضوع پر ایک اور کتاب بہ زبان عربی تصنیف کی۔ جس کا نام "فتح المذاهب الاربعة" ہے یہ ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰ء میں مکمل ہوئی۔ آپ لکھتے ہیں:

"بدانکہ در مسائل وضو و تیمم و مسح خفین و آب وضو وغیرہ از مقدمات نماز اختصار واقع شد۔ ہر کہ خواہد مستوعباً معہ دلائلہ و مسائلہ کما یحق و ینبغی ہمہ را مطالعہ نماید فعلیہ بملاحظہ فتح المذاہب الاربعہ للکتاب (بابا فتح محمد) فانہ کان فی المسائل التفصیلیۃ وواف للمطالب العلمیہ انشاء اللہ تعالیٰ۔"

مفتاح الصلوٰۃ کی سندھ میں مقبولیت کا اندازہ اس کے تراجم، شرحوں اور قلمی نسخوں کی موجودگی سے ہوتا ہے۔ اسلام کے اہم رکن "نماز" کے فرائض واجبات اور سنتوں کی وضاحت اور تشریح کی نقطہ نگاہ سے یہ کتاب جامع حیثیت کی حامل ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں سندھ کا کچھ علاقہ اسلامی قلمرو میں آچکا تھا۔ دربار خلافت سے ان علاقوں میں اسلامی قوانین کے اجراء و نفاذ کے لئے جن جن حضرات کا انتخاب عمل میں آیا ہوگا وہ یقیناً ممتاز اہل علم و فضل ہوں گے۔ جیسا کہ امیر المؤمنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا طریقہ تھا۔ اس سے قیاس کیا جاتا ہے کہ فاتح سندھ محمد بن قاسم ثقفیؒ نے جو جو شہر فتح کئے ہوں گے اور وہاں کا نظم و نسق برقرار رکھنے اور قوانین شرعیہ جاری کرنے کے لئے جن جن افراد کا انتخاب کیا ہوگا۔ وہ بھی یقیناً علم و فضل کے اعتبار سے ممتاز حیثیت کے حامل ہوں گے۔ ہمارے اس دعویٰ کی تائید ارباب تاریخ کے اس بیان سے ہوتی ہے کہ اروڑ کی فتح کے بعد وہاں کی قضا و خطابت کا عہدہ موسیٰ ثقفی کو دیا گیا۔ اس زمانہ سے سندھ میں علمی جستجو اور تحقیق کا تسلسل نظر آتا ہے۔ رفتہ رفتہ دیبل، منصورہ، بکھر، سیوہن علمی مراکز کی حیثیت حاصل کرتے گئے۔ سندھ کے علما نے تفسیر، حدیث، فقہ، رجال اور ادب کے مختلف شعبوں میں تحقیق کا ایک خاص معیار قائم کیا۔ بعض نے تو دیار سندھ کی حدود سے باہر بھی شہرت حاصل کی۔ ابتدائی دور کی عربی کتب میں ان کے احوال موجود ہیں۔ بلکہ بعض کی تحریریں آج بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ جس میں سے ابو جعفر دیبلی کا "مکاتیب النبی ﷺ" اور امام مسعود بن شعبہ بن حسن سندھی کا "مقدمہ کتاب

التعلیم'' معروف ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ایام سومرہ اور سمہ دور کے ابتدائی زمانہ کے بہت سارے علمی حقائق محقق کی رسائی سے دور ہیں۔ مگر جو چیدہ چیدہ نام ملتے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت بھی سندھ میں بڑے بڑے عالم اور فقیہ موجود تھے۔ سومرہ دور میں مولانا برہان الدین بکھری سندھی عظیم المرتبت عالم تھے۔ سلطان علاؤ الدین محمد شاہ خلجی کے عہد میں آپ کی شہرت ہندستان تک پہنچی۔ سمہ دور تک سندھ میں تعلیم اور درسگاہیں تسلسل سے قائم تھیں۔ مخدوم محمود فخر پوٹہ اور شیخ شہاب الدین السہر وردی ثانی پاٹائی (۸۹۲-۸۰۲) سمہ دور کے آخری ایام کے نام ہیں۔ مخدوم بلاول ایک اعلیٰ تعلیمی درسگاہ کے بانی تھے۔ قاضی ابراہیم دربیلوی، قاضی قاضن اور مخدوم محمد سیوستانی، قاضی شرف الدین عرف مخدوم راہو سیوستانی، قاضی دتہ، مخدوم رکن الدین عرف مخدوم متو یا میٹھا کی نشوونما سمہ دور میں ہوئی۔

جام نظام الدین سمہ کا زمانہ حکومت بہترین سمجھا جاتا ہے۔ اس خوشگوار ماحول میں کئی علماء اور فقہا نے سندھ کا رخ کیا۔ مخدوم عبدالعزیز ہروی ابہری کے علاوہ صاحب کتاب مفتاح الصلوٰۃ بابا فتح محمد کے جد امجد شیخ شہاب الدین سہروردی ثانی نے پاٹ کا علاقہ انہی ایام میں آباد کیا۔ سمہ حکومت کے آخری ایام میں علم فقہ کو تعلیمی نظام میں اہمیت ملنے لگی۔ بیاض واحدی جلد ثانی سے سمہ دور کے ایک بزرگ مخدوم و قاضی برہان الدین بن شیخ شہاب الدین سہروردی (صدیقی) کی فتواؤں کا پتہ چلتا ہے۔ شیخ شہاب الدین سہروردی ثانی پاٹائی کے ایک فرزند شیخ معروف پاٹ میں مقیم تھے۔ جبکہ یہ دوسرے فرزند کا مزار پاٹ سے ۲۵ کلومیٹر شمال-مغرب کی جانب ککڑ اور خیر پور ناتھن شاہ کے درمیان ''خانپور'' اور ''کلی'' کے قصبوں کی طرف جاتے راستے میں موجود ہے۔ مقامی روایات بھی آپ کے سمہ دور کے بزرگ ہونے کا عندیہ دیتی ہیں۔ آپ پر دولھ دریا خان نے مزار تعمیر کروایا۔ آپ کے نام کے ساتھ مخدوم و قاضی کے القابات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بزرگ زادہ مخدوم علاقہ ککڑ اور اس کے مضافات کے ''قاضی'' مقرر ہوئے تھے۔

سمہ دور میں علم فقہ کی ترویج کا اندازہ قاضی قاضن کے ابیات سے بھی ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ''کنز'' اور ''قدوری'' دینی تعلیم کے لئے بنیادی حیثیت کی حامل کتابیں تھیں۔ سمہ دور کے دو اور عالم خانوادہ مسیح الاولیا کے عظیم المرتبت فرد مخدوم عباس پاٹائی ثم ہنگورجائی اور مخدوم رکن الدین پاٹائی تھے۔ یہ بزرگ تفسیر، حدیث اور دیگر علوم کے بہت بڑے عالم تھے۔ سمہ حکومت کے خاتمے ۹۲۷ھ کے بعد سندھ کے عمومی حالات دگرگوں ہونا شروع ہوئے۔ تعلیمی نظام کا تسلسل ٹوٹ گیا اور اضطرابی کیفیت پیدا ہوگئی۔ مخدوم عباس کی وفات کے بعد شیخ عیسیٰ جنداللہ پاٹائی جو

پہلے ہی عم مکرم شیخ طاہر کے پاس ہندستان آتے جاتے رہے۔ عقد ثانی اور شیخ لشکر محمد عارف کے فیض صحبت نے آپ کو برہانپور میں مستقل اقامت پر مجبور کیا۔ برہانپور ہی میں آپ کو عقد ثانی سے بابا فتح محمد پیدا ہوئے۔

سندھ کا تاریخی اور مختصر علمی پس منظر پیش کرنے کا مقصد یہ تھا کہ یہ واضح ہوجائے کہ ''مفتاح الصلوٰۃ'' اس ہی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ سمہ دور کا علمی ماحول جو ایک خاص شعوری حد کو چھوچکا تھا، اس کی ترقی اور ترویج میں خانوادہ مسیح الاولیا کا کردار کسی طور بھلایا نہیں جاسکتا۔ یہ علمی خزانہ پاٹ سے برہانپور منتقلی کا سبب بنا جب مسیح الاولیا معہ چند احباب کے مستقلاً برہانپور منتقل ہوئے اور بابا فتح محمد نے وہاں پر سندھی علما کے حرفی اشارات پر مبنی اشعار انہیں مادر عارضی (جو پاٹ سے تھیں) سے سیکھے اور یہی اشعار اس عظیم کتاب ''مفتاح الصلوٰۃ'' کے لکھے جانے کا بنیادی سبب ثابت ہوئے۔

مفتاح الصلوٰۃ اور اہل سندھ

سندھ کے علماء نے نماز کے مسائل پر بیش بہا خزانہ چھوڑا ہے۔ جن میں سے چند کا ذکر اس سلسلے کو سمجھنے کے لئے ضروری ہوگا:

۱- علامہ رحمت اللہ سندھی نے مدینہ منورہ میں 'غاية التحقيق و نهاية التدقيق في مسائل ابتلىٰ بها اهل الحرمين الشرفين' تحریر کیا۔ اس میں نماز کے پانچ مسائل، اقتداء بالمخالف و جماعة ثانية وقت العصر وقرأة خلف الامام وسنة بعد الجمعة کے متعلق لکھا۔ آپ نے مدینہ منورہ میں ۹۹۰ھ میں وفات پائی۔

۲- علامہ رحمۃ اللہ کے بھائی علامہ حمید سندھی نے **القول الحسن فی جواز اقتداء بالامام الشافعي فی نوافل و سنن** تحریر کیا۔ یہ کتاب نوافل اور سنتوں میں امام شافعی کی تائید میں تحریر کی گئی۔ آپ ۱۰۰۰ھ میں زندہ تھے اور مدینہ منورہ میں مقیم تھے۔

۳- مفتاح الصلوٰۃ ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ مقدمہ مصلح المفتاح میں رقمطراز ہیں: ''یہ کتاب نماز کی کنجی، اوپر بیان کردہ (القول الحسن فی جواز اقتداء بلامام الشافعی فی نوافل وسنن) سے پچاس سال بعد ۱۰۶۱ھ میں سندھ کے برگزیدہ خانوادہ کے ہونہار فرزند مخدوم فتح محمد نے تحریر کیا ہے۔ مخدوم فتح محمد مشہور عالم شیخ عیسیٰ جنداللہ کے فرزند تھے۔ یہ بزرگ اصل پاٹ شہر کے تھے اور برہانپور میں اقامت اختیار کی۔ مخدوم فتح محمد کی یہ کتاب نہایت ہی مقبول ہوئی اور نماز کے مسائل پر اسے ماخذ ''سند'' کے طور تسلیم کیا گیا۔''

حدود سندھ اور اسے باہر اس کتاب کے مطالعے اور تحقیق پر خاص توجہ دی گئی۔ مصنف سید علی محمد شاہ نے اپنی کتاب (مصلح المفتاح) کی بنیاد اسی کتاب پر رکھی ہے۔ اس کے ۳۰ سال بعد سندھی زبان میں مقدمہ الصلوٰۃ ٹھٹھ کے ایک عالم ابوالحسن بن عبدالعزیز نے لکھی۔ اس پر مزید تحقیق مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی نے کی اور ''اصلاح مقدمۃ الصلوٰۃ'' تحریر کی۔

۴۔ ہالا پرانہ کے پیر محمد نے تحفۃ المہتدی کی شرح طرفۃ المہتدی تصنیف کی۔

۵۔ مخدوم ابوالحسن داہری نے ۱۱۶۲ھ میں سراج المصلی فارسی میں تصنیف کی۔ غالبًا سراج المصلی کی تتبع میں فتح المصلی لکھی گئی۔ اس کے مصنف مخدوم عبدالحکیم تھے، آپ نے یہ کتاب ۱۳ صدی ہجری کے نصف یا اس کے قریب کسی سال میں تحریر کی۔

۶۔ ترتیب الصلوٰۃ: بابا فتح محمدؒ کے خانوادہ کے ہی ایک فرد فرید مخدوم فضل اللہ پاٹائی نے ۱۳ صدی کے آخر نصف میں یہ کتاب نظم میں تحریر فرمائی۔ آپ کا مزار پاٹ شریف سندھ میں مرجع خلائق ہے۔

۷۔ تحفۃ الاسلام جلد ثانی: مولوی محمد عثمان ولد حافظ محمد مخدوم نورنگ زادہ نے یہ کتاب چار جلدوں میں تحریر کی۔ جلد ثانی ''پاکائی'' سے تعلق رکھتا ہے۔ جسے نماز کے رکن کا مقدمہ سمجھنا چاہئے۔ یہ کتاب ۱۳۰۵ھ/ ۱۸۸۸ء میں کراچی سے شایع ہوا۔

۸۔ رسالہ نماز فرائض سندھی: قاضی نور محمد بن آخوند محمد حسن قریشی سانونی ہالائی، سندھی نثر میں تحریر کیا۔ یہ کتاب آپ کی فرزند محمد متین الدین قریشی نے تاجر کتب لاڑکانہ نے ''مطبع حسینی'' بمبئی سے ۱۸۹۱ء میں شایع کیا۔

بیان کردہ کتب کے علاوہ بھی نماز کے متعلق سندھ کے علماء نے کافی کچھ لکھا ہے۔ مختلف بیاض اور فتویٰ کی کتب، اسلام کے اس رکن کے متعلق سوالات و جواب سے مزین ہیں۔ ''فتاویٰ واحدی'' یا ''بیاض واحدی'' اس کی واضح مثال ہے۔ لیکن حدود سندھ میں مفتاح الصلوٰۃ اور مقدمۃ الصلوٰۃ کو سب سے زیادہ اہمیت اور شہرت حاصل ہوئی۔ مفتاح الصلوٰۃ ابتدا ہی سے سندھ کے علماء کے زیر مطالعہ رہی۔ اس پر حواشیے لکھے گئے اور ترجمے ہوئے۔ بعض علماء نے اپنی استطاعت کے مطابق اس میں اضافے بھی کیے۔

مفتاح الصلوٰۃ کے متعلق مزید تحقیق

مخدوم فتح محمد سندھی برہانپوری کی کتاب مفتاح الصلوٰۃ کے علاوہ فتوح الاوراد بھی نہ صرف علمائے سندھ کے زیر مطالعہ رہی، بلکہ یہ دونوں کتابیں مدارس میں پڑھی اور پڑھائی جاتیں اور ان

کے کئی قلمی نسخے بھی تیار کیے جاتے۔ سب سے پہلے خود مصنف نے اس کتاب میں موجود نماز کے مسائل پر تعلیقات اور تصریحات تحریر کیں۔ جنہیں ''منہیات مفتاح'' کہا جاتا ہے۔ یہ منہیات بھی علمائے سندھ کے زیر مطالعہ رہیں اور اس کے ترجمے بھی ہوئے' اغلب یہی ہے کہ مخدوم انور وہ پہلے بزرگ ہیں، جنہوں نے اس کا سندھی ترجمہ کیا۔ مخدوم فضل اللہ پاٹائی نے اپنی تحریر ''اصلاح مصلح المفتاح'' کے مقدمہ میں اس ترجمہ کے متعلق رقم طراز ہیں:

''کتاب مفتاح الصلوٰۃ تصنیف مخدوم فتح محمد علیہ الرحمۃ در بیان مسائل عباداتی بزبان فارسی بودہ۔ پس مخدوم محمد انور لارائی اورا برای سہولیت مرد مان سند بزبان سندی ترجمہ نمودہ۔''

علماء کے نزدیک یہ ایک ناقص ترجمہ تھا۔ اس میں اصلاح کی ضرورت تھی۔ جس کے مد نظر سید محمد علی شاہ نے ۱۲۷۷ھ میں ایک اور ترجمہ بزبان سندھی کیا اور اس کا نام ''مصلح المفتاح'' رکھا۔ اس کتاب کو عرف عام میں ''دائرے والوں کی سندھی'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس کتاب نے علمی حلقے میں کافی شہرت حاصل کی۔

سید علی محمد شاہ کے ہمعصر عالم مخدوم فضل اللہ پاٹائی نے اس کا فارسی نثر میں ترجمہ کیا۔ اس کتاب کی آخر میں قطع تاریخ سے اس کے تکملہ کے سال کا پتہ چلتا ہے:

شکر ز انعام حق نسخہ ای شد بی بدل
ترجمہ ای فارسی آمدہ فیاض کل
سال تمامیتش جست دل از سروش
گفت کہ شد ترجمہ مصلح اصلاح دل
۱۲۸۴

اس ترجمہ میں شامل مختلف مسائل کی آخر میں مخدوم صاحب نے اپنی جانب سے ''تنبیہات'' اور اختلافی رائے کے علاوہ بعض مقامات پر ترامیم اور اضافے تجویز کئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا نام ''اصلاح المصلح المفتاح'' رکھا۔ اس میں نہ صرف مخدوم فتح محمد سندھی کی تصنیف ''مفتاح الصلوٰۃ'' بلکہ ''مصلح المفتاح'' کی بھی اصلاح کا تصور کارفرما ہے۔

مفتاح الصلوٰۃ کے قلمی نسخے اور تراجم

کسی بھی قدیم کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس کے تیار شدہ قلمی نسخوں اور تراجم سے بھی کیا جاتا ہے۔

(۱) محترم ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ صاحب نے مقدمہ ''مصلح المفتاح'' کے حواشیہ میں دو

نسخوں کا ذکر کیا ہے، جو آپ نے ہالا پرانہ میں دیکھے۔ اس کا کاتب محمد حافظ بن محمد محرم تھے۔ جس نے اس کی کتابت ۱۲۱۰ھ میں کی۔ جبکہ دوسرا نسخہ ۱۲۳۱ھ میں موسیٰ نے کتابت کیا۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''خود مصنف کے نسخہ سے سندھ میں دیگر نسخے تیار ہوئے، اس لئے اکثر نسخوں کے آخر میں یہ عبارت لکھی ہے: **تم مفتاح الصلوٰۃ بید مولفة فی سنة احدی و ستین بعد الالف من الهجرة**''

لیکن مذکورہ دونوں نسخوں سے بھی قدیم ایک اور نسخے کا ذکر کرتے ہوئے گرامی قدر ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''سندھ میں مفتاح الصلوٰۃ کا قدیم قلمی نسخہ ہالہ کنڈی کے کاتب کتبہ الخلیل نے ۱۱۵۷ھ کا کتابت کیا ہماری نظر سے گذرا۔''

(۲) راقم نے سندھالاجی جامشورہ میں تین قلمی نسخے دیکھے:

i- ایک نسخہ قدیم جس کی آخر میں لکھا ہے: ''۱۰۶۱ تم مفتاح الصلوٰۃ بید مؤلف۔''

ii- ایک اور نسخہ، جس کے آخری صفحہ پر کاتب کا نام محمد حسن ولد حافظ محمد عابد اور سن کتابت ۱۲۰۱ھ تحریر ہے۔ کاتب کی رہائش کے لئے ''ساکنہ دیہہ سوندہ'' کے الفاظ لکھے ہیں۔

iii- اس کے کاتب عبداللہ ولد مرحوم محمد عابد ۱۲۷۴ھ ہیں۔

حدود سندھ سے باہر بھی اس کے کئی ترجمے اور قلمی نسخے تیار ہوتے رہے ہیں۔ دارالسرور برہانپور کی عالمہ فاضلہ اہل علم و ذوق محترمہ حسینہ بیگم صاحبہ سے بذریعہ مراسلہ معلوم ہوا کہ ہندستان میں اس کے تین ترجمے ہو چکے ہیں۔

آپ ڈاکٹر شیخ فرید برہانپوری کی ہمشیرہ ہیں۔ اس لائق فائق انسان نے دیگر علمی کارناموں کے علاوہ ''فارسی ادب کے ارتقا میں برہانپور کا حصہ'' پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اس مقالہ کے حوالے سے بذریعہ خط ''مفتاح الصلوٰۃ'' کے متعلق معلومات حاصل ہوئی کہ (۱) شاہ سعید الدین (۲) قادر علی کمتر (۳) سید امام الدین علی دہلوی کے ترجمے شایع ہو چکے ہیں۔

اس کے قلمی نسخوں کے متعلق آپ نے (۱) کتب خانہ آصفیہ سالار جنگ میوزم (۲) کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد کے نام مرحمت فرمائے ہیں۔

حال ہی میں بندہ نے ذاتی کوشش لیکر اصل فارسی متن کا سندھی نثر میں مکمل ترجمہ کروایا ہے۔ جو امید ہے جلد شایع ہوگا۔ مترجم مولانا محمد انس راجپر صاحب ہیں۔

☆

حضرت شیخ طٰہٰ قدس اللہ سرہٗ العزیز

آپ مسیح الاولیاء حضرت شیخ عیسٰی جنداللہ کے تیسرے فرزند ہیں، آپ کے واضح اور تفصیلی حالات تو کجا مجمل بھی ... سے بہم نہ پہنچ سکے، جس کا بڑا قلق تھا۔ اور قیاسی تاویل کو میں روا نہیں رکھتا اس لئے یہ تذکرہ ... پ کے ذکر سے خالی رہا جاتا تھا۔ حسنِ اتفاق کہئے یا غیب سے آپ کی روح نے مدد فرمائی ... ایسی نادر چیز بے ساختہ سامنے آ گئی، جس نے بوجہ احسن اس خاص کمی کی تلافی کردی، چنانچہ یہ عرض کرتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہوں کہ حضرت کے اس تبرک نے تذکرہ کی شان کو دوبالا کر ... یا۔

یہ تبرک یا نادر و ... چیز حضرت شیخ طٰہٰ کی اہم تحریر ہے جس کا عکس نظر نواز ناظرین کرام سے ہے۔ وھو ہذا۔

بحضور فقیر طٰہٰ بن شیخ عیسٰی عصمت پناہ بی بی چھمو بموجب وصیت پسر خود غفران پناہ میاں شیخ محمد صاحب سجادگی نبیرہٗ خودرا کہ از شکم سیدہ منکوحہ شیخ مذکور متولداست باتفاق شریعت پناہ قاضی محمد شریف و میران سید شیر محمد داعزۂ عظام بہ مسمٰی شیخ فضل اللہ مقرر کردند و پیراہن...... غفران پناہ میاں شیخ محمد بجدوبہ پدر رسیدہ بود باین سجادہ پوشانیدند داین نیز مقرر است کہ ہر کہ صاحبِ سجادہ است تولیتِ روضہ وعرس کردن با وتعلق وارد۔

یہ مختصر تحریر ایک محضر پر ثبت ہے جو حضرت محمد بن فضل اللہ نائب رسول اللہ کے اخلاف میں تصدیق سجادہ نشینی سے متعلق ۱۰۶۹ھ کی ایک تقریب کے سلسلہ میں جاری ہوا تھا۔ تاریخ اجراء درج نہیں، لیکن زیادہ سے زیادہ ۱۰۷۲-۷۳ھ زمانہ اجراء ہونا چاہئے۔ محضر کے نفس مضمون کا یہاں کوئی تعلق نہیں، بجز اس کے کہ وہ کتنی دقیع دستاویز ہے جس کو حضرت نائب رسول اللہ کے پوتے نے جاری کیا ہے اور جس پر ۳۶ عمائدین مشائخ اور شہر کے متعدد سجادہ نشینوں، مقتدر علماء اور قاضی شہر کی تصدیقی تحریریں و مُہریں ثبت ہیں منجملہ ان کے پانچویں نمبر پر حضرت شیخ طٰہٰ کی مذکورۂ بالا تحریر ہے۔

اگرچہ یہ تحریر فی نفسہ ایک وقوعہ کی تصدیق ہے، جو آپ کے علم میں تھا، لیکن کیا اسی مختصر تحریر میں خود صاحبِ تحریر کی ذاتِ گرامی صفات کی چند جھلکیاں نمودار نہیں ہیں؟

ہیں اور ضرور ہیں جن پر مجملاً اس طرح روشنی ڈالی جاسکتی ہے۔

(۱) آپ کا شمار مشائخ میں تھا، کیونکہ نام سے پہلے آپ نے لفظ فقیر لکھا اور یہ طرز تکلم صرف مشائخ کے لئے مخصوص ہے۔

(۲) آپ ۱۰۶۹ھ کے بعد تک حیات تھے۔

(۳) آپ کی شخصیت اتنی بلند تھی کہ ایک مابہ النزاع مسئلہ کے فیصلہ میں آپ بھی منجملہ دیگر مشائخ، سجادوں، ممتاز و متدین عمائدین کے حکم قرار دیئے گئے۔

(۴) تحریر میں حسن کتابت اور عبارت کی جامعیت سے ظاہر ہے کہ آپ خوش قلم اور تعلیم یافتہ تھے۔

(۵) آپ کی بزرگ زادگی اور حکم ہونے کی صلاحیت کا ثبوت کہ آپ آداب وضوابط سجادگی سے کما حقہ واقف تھے۔ تحریر کے آخری فقرہ میں موجود ہے۔ ''این نیز مقرر است'' پر غور فرمایئے یہ جملہ کسی عامی شخصیت کا نہیں ہوسکتا۔

مذکورہ تحریر اور اس کے سرسری مطالعہ سے جو نتائج میں نے اخذ کئے، ناظرین کے پیش نظر ہیں، الحمدللہ والمنۃ کہ مسیح الاولیاء قدس سرہٗ کا یہ نامور فرزند جو معاصر تذکرہ نگاروں کی بے اعتنائی سے صدیوں تک گمنام رہا، آج تک مصدقہ حقیقت کے ساتھ اپنے اسلاف کی عظمتوں کی شان لئے ہوئے اسی صف میں جلوہ گر ہے۔

☆

تعلیقات

تعلیق (۱): راشد برہانپوری کے کشف الحقائق اور گلزار ابرار کے بعد تیسرے بڑے ذریعے جن کو انہوں نے کتاب ہٰذا لکھنے کے لئے بنیاد بنایا وہ تحریریں یا خطوط تھے جو انہیں برہانپور سے ان کی فرمائش پر نقل کر کے بھیجے گئے۔ کئی ایک نقل شدہ دستاویزات کا مطالعہ ثابت کرتا ہے۔ کہ کاتب کی ناواقفیت اور کاغذات کے ٹکڑوں کو جوڑ کر جو عبارت حاصل کر لی گئی۔ اس سے بہت ساری غلطیاں وقوع پذیر ہوئیں۔

مزید یہ کہ برہانپور سے جو خطوط اولاد مسیح الاولیا موجود سندھ کو لکھے گئے۔ اس میں معلومات المکتوب الحبیب میں شامل ہے لیکن کہیں بھی شیخ طٰہٰ کا ذکر موجود نہیں۔ واضح رہے کہ المکتوب الحبیب برہانپور کے سندھی اولیاء سے کئی دہائیاں پہلے لکھا گیا تھا۔

نقل کرنے والا اگر شجرات یا متعلقہ معلومات سے ناواقف ہے تو نام کی یکسانیت اور اس کے بار بار دہرائے جانے سے غلطی کا امکان قوی ہو جاتا ہے۔

شیخ طٰہٰ ابن شیخ عیسٰی کے متعلق بھی اس غلطی کا امکان موجود ہے۔ برہانپور یا ہندستان میں لکھی ہوئی کسی بھی تاریخ یا تذکرہ میں حتا کہ کشف الحقائق یا گلزار ابرار میں اولاد مسیح کا تذکرہ مفصل موجود نہیں۔ جس سے برہانپور میں موجود اولاد کا شجرہ مکمل کرنے میں مدد حاصل ہو۔

حضرت مسیح الاولیاء کے احوال میں راشد برہانپوری صاحب سے "طومار یا چادر شجرہ" کا ذکر کیا ہے جو اولاد مسیح الاولیاء نے برہانپور روانہ کی تھی۔ لیکن راشد برہانپوری نے کتاب ہٰذا تحریر کرتے ہوئے کراچی سے برہانپور خط لکھ کر اس کی نقل منگوانا چاہی تو انہیں "ازروئے خانہ پوری" ہر شاخ میں چھ سات نام لکھ کر بھیج دیئے گئے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اہل برہانپور کے پاس حضرت مسیح الاولیاء کا کوئی شجرہ موجود ہی نہ تھا۔ جو اہل سندھ سے شجرہ بھیجا گیا وہی خلط ملط نقل کر کے روانہ کر دیا گیا۔ کیونکہ راشد برہانپوری متر یہ لکھتے ہیں کہ "حالانکہ حبیب اللہ صاحب (سہوانی) کے مکتوب میں طومار یا چادر شجرہ روانہ کرنے کا ذکر ہے۔" جس میں گجرات پٹن، مکہ مکرمہ، پاٹ سندھ، سیوان سندھ اور برہانپور میں موجود اولاد مسیح الاولیاء کی مختلف شاخوں کا ذکر ہے۔

حیرت ہے! پھر راشد برہانپوری نے کس مستند شجرہ کی بنیاد پر اولاد مسیح الاولیاء کے اسماء کا تعین کیا ہے۔

جس محضر نامہ کی تحریر کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس مختصر تحریر میں بھی نقل کرنے والے کی غلطی کے امکان کو مسترد نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ حضرت مسیح الاولیاء شیخ عیسیٰ جنداللہ جیسی بلند و بالا شخصیت کا اسم مبارک صرف شیخ عیسیٰ لکھا جائے وہ بھی ان کے فرزند کے ہاتھوں یہ کسی طور ممکن نہیں جیسا کہ لکھا ہے ''بحضور فقیر طٰہٰ بن شیخ عیسیٰ۔'' کچھ خلاف آداب ہی معلوم ہوتا ہے۔

مزید یہ کہ المکتوب الحبیب قلمی میں ایک ایسے محضر نامہ کا ذکر موجود ہے۔ جس میں اولاد حضرت مسیح الاولیاء سے مخدوم عبدالواحد کبیر بعد ملاقات اورنگزیب جب سندھ واپس آتے ہوئے معہ بعض رفقا برہانپور اپنے جد مکرم کی مزار کی زیارت کو ٹھہرے تو تحریر میں لایا گیا۔ یہ واقعہ بھی ۱۰۷۲ھ کا ہی ہے۔

ایک شیخ عیسیٰ ثانی ہیں جن کا شجرہ اس طرح ہے شیخ عیسیٰ ثانی بن مخدوم حسن قاری بن شیخ شہر اللہ بن مسیح الاولیاء شیخ عیسیٰ جند اللہ۔
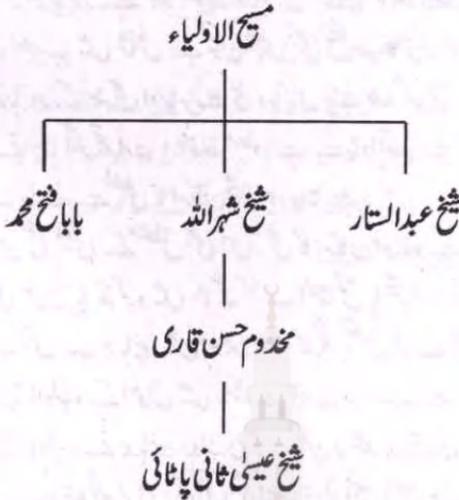
ممکن ہے مذکورہ شیخ عیسیٰ (ثانی) کے ایک اور فرزند شیخ طٰہٰ ہوں۔ اور وہ حضرت مخدوم عبدالواحد کبیر پاٹائی کے ہندستان کے سفر میں رفیق ہوں۔ دوران قیام برہانپور ان کی موجودگی باعث افتخار سمجھتے ہوئے ان سے دستخط لئے گئے ہوں تا کہ سجادگی کے معاملے میں مسیح الاولیاء کی پاٹائی اولاد کی شمولیت اور تصدیق بھی رکارڈ پر آجائے۔

واللہ اعلم

حضرت شیخ شہاب الدین ابن بابا فتح محمد محدثؒ

آپ مسیح الاولیا قدس سرہٗ کے پوتے ہیں۔ بڑے حسین وجمیل وجیہ وشکیل تھے، علم وفضل کے لحاظ سے بھی آپ علمائے عصر میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ آپ کا نام خود ایک لطیفۂ غیبی اور عارفانہ رموز وکنایات کا دلچسپ مظہر ہے۔

جب آپ کی ولادت باسعادت عمل میں آئی ۱۰۳۰ھ کا اختتام یا ۱۰۳۱ھ کا آغاز تھا۔ خادمہ نہالچہ میں لپیٹ کر مسیح الاولیاء کے پاس لائی کہ حضرت پوتا مبارک ہو، اس کا نام تجویز فرمادیجئے۔ آپ نے نظر شفقت سے دیکھا اور حکم دیا شیخ برہان کے پاس لے جا۔ اس بچہ کا نام وہی رکھیں گے۔ حضرت راز الٰہی رحمۃ اللہ علیہ مسیح الاولیاء کے ممتاز ترین خلیفہ تھے۔ جب خادمہ وہاں پہنچی تو موصوف پان کھا رہے تھے۔ پیغام سُنا اور بچہ کو قریب طلب کر کے محبت سے سر پر ہاتھ پھیرا اور تھوڑا سا چبایا ہوا پان بچہ کے منہ میں دیکر کہا لے جاؤ۔ خادمہ نے نام رکھنے کی فرمائش کو دہرایا تو آپ نے جواب دیا کہ جاؤ نام رکھ دیا ہے۔ خادمہ مسیح الاولیاء کے سامنے واپس لے گئی، ماہ پیکر ننھے کا مُنہ پان کی سرخی سے شہاب ثاقب نظر آرہا تھا۔ آپ دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا خوب! میرے برہان نے اس کا نام شہاب الدین رکھا ہے۔ یہ ہے عارفانہ رموز وکنایات کا لطیفۂ غیبی، جس سے آپ شہاب الدین موسوم ہوئے۔[1]

آپ کی ولادت کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد مسیح الاولیاء کا وصال ہوگیا، لیکن گھر میں علمی ماحول موجود تھا، آپ کی تعلیم وتربیت نہایت معقول طریقہ پر ہوئی کم سنی ہی میں قرآن مجید حفظ کیا۔ حفظ قرآن مجید اس خاندان کا وہ مخصوص وصف ہے، جو اسلاف میں کئی پشت اوپر سے متواتر آپ تک پہنچا اور آپ کے بعد اخلاف میں نسلا بعد نسل آج تک علی التواتر افراد خاندان اس فیضان ایزدی سے مستفیض ومستفید ہوتے چلے آئے، حتیٰ کہ احفاء میں بھی یہ نعمت عظمیٰ عام رہی ہے۔ جس کی تفصیل نام بنام مسیح الاولیاء کے ذکر میں پیش کر چکا ہوں۔

---

[1] یہ روایت حضرت سید ریاض الدین صاحب سجادہ نشیہ درگاہ حضرت راز الٰہی قدس سرہٗ نے بیان فرمائی۔ اور درج تذکرہ کرنے کی اجازت دی۔

آپ علم قرأت سے بہرہ ور تھے سن شعور کو پہنچے تو حضرت شیخ برہان الدین رازِ الٰہی نے آپ کو اپنی خانقاہ کے متصل تعمیر کردہ مسجد میں امامت پر مامور[1] فرمادیا۔

آپ نے فقہ، حدیث و تفسیر کی تعلیم اپنے فقیہہ محدث، مفسر والد بزرگوار سے حاصل کی اور ان کے مدینہ منورہ کو ہجرت کر جانے کے بعد حضرت شیخ برہان الدین راز الٰہی سے تکمیل و سند حاصل کی نیز تصوف میں بھی انہیں کے زیر نگرانی قدم بڑھایا اور ریاضت و مجاہدات انجام دے کر خاندانی مسندِ ارشاد و ہدایت پر متمکن ہوئے۔ اپنے اسلاف کی طرح آپ بھی صاحب تصنیف ہیں، رسالہ تحفۃ الاوراد آپ کی مقبول عام تالیف ہے یہ رسالہ آپ نے اپنے فرزندوں شیخ بہاء الدین اور شیخ علاء الدین کی تعلیم کے لئے مدون کیا تھا، جس میں مسائل نماز اور احکام شرعیہ کا نہایت سریع الفہم مدلل و مفصل بیان ہے۔ نیز بزرگوں کے معمولہٗ اوراد و ظائف بھی بالاختصار نقل کئے ہیں۔

آپ کو اللہ تعالیٰ نے دینی و دنیاوی ظاہری اور باطنی نعمتوں سے پوری فیاضی کے ساتھ مالا مال کیا تھا۔ روحانیت میں صاحبِ کشف تھے۔ آپ سے اکثر خرقِ عادات و کرامات ظہور میں آئی ہیں، معاصر صوفیائے کرام و مشائخ عصر آپ کا بے حد اکرام فرماتے تھے۔ سلاطین وقت اور مقامی حکام بھی آپ کے ساتھ بکمال نیازمندی پیش آتے رہے۔ فتوحات اور نذرانوں کی اس قدر کثرت ہوتی کہ باوجود شاہانہ داد و دہش کے آپ کو خاصا تمول حاصل تھا۔ کثیر الاولاد تھے، پھر بھی بعدِ وصال اپنے کثیر التعداد پس ماندگان کو خوشحال و فارغ البال چھوڑا۔ آپ کے وصال کی تاریخ کا علم نہ ہوسکا۔ آپ کا مزار سنتِ اسلاف کے مطابق آپ کی خانقاہ کے حجرۂ عبادت میں بنایا گیا جو آپ کے مسکونہ محل کے عین مقابل چند قدم کے فاصلہ پر ہے، جہاں جلد ہی نہایت شاندار گنبذ تعمیر کرایا گیا۔ جو ہنوز اچھی حالت میں ہے اور زیارت گاہ خواص وعوام ہے۔ آپ کے مزار سے بھی ہنوز چشمۂ فیضان الٰہی جاری ہے۔ اہلِ ارادت عقیدت و نیاز کے ساتھ حاضر ہوتے ہیں اور مرادیں پاتے ہیں۔

آپ کی متروکہ املاک میں جاگیریں، باغ، مکانات، تکئے، قطعاتِ زمین اور نقد و جنس سب ہی کچھ تھا۔ آپ کے نبائر میں سے ایک صاحب نے جنہیں آپ کے ترکہ سے تقسیم در تقسیم کے بعد دسواں حصہ ملا تھا، اپنی ایک عزیزہ کو ایک وثیقہ کے ذریعہ جو غیر منقولہ جائداد تفویض کی ہے

---

[1] مولوی بشیر محمد خان ایڈوکیٹ برہانپوری نے آپ سے قبل اس مسجد کے تمام اماموں کی فہرست دی ہے جو حسب ذیل ہے: (۱) تعمیر ہوتے ہی بانی مسجد حضرت شیخ برہان الدین راز الٰہی قدس سرہٗ (۲) حضرت شیخ عبدالرحیم خوشنویس (۳) سید عبداللطیف جو حضرت کے داماد بھی تھے۔ (۴) حافظ احمد نہرہ شیخ ماہ (۵) حافظ محمد یوسف کشمیری (٦) شیخ شہاب الدین ابن فتح محمد محدثؒ۔ (معارف نمبر ۵ جلد ٦۷ ص ۳۸۹)

اس کی تفصیل اصل وثیقہ سے پیش کرتا ہوں۔ یہ وثیقہ سید ریاض الدین مغفور رحمۃ اللہ علیہ کے ذخیرۂ اسناد میں موجود محفوظ ہے۔ موصوف نے راقم الحروف کو منجملہ دیگر بیش بہا یادداشتوں کے اس وثیقہ کی نقل عطا فرمائی تھی جو حسب ذیل ہے:

سپردگی نامہ

باعث تحریر و موجب تسطیر این چند سطور صداقت منشور اینکہ منکہ مسمّٰی غلام محی الدین عرف میاں بھائی ولد شیخ معین الدین عرف شاہ جنگلی ابن شیخ بہاء الدین ابن حضرت شیخ شہاب الدین قدس سرہٗ نوشتہ میدہم و اقرار معیکنم کہ من مقر مذکور مدت مدید تولیت و عرس مبارک حضرت[1] شیخ انجام دارم ورنیولا منصب مذکور و متعلقات آن بہ مسماۃ فضل النسا بنت خوب صاحب ولد رحیم اللہ خطیب جامع مسجد تفویض کردم و مختار ساختم۔ تفصیل جائیداد مفوضہ برائے انتظام عرس۔ جاگیرات چہار موضع معلوم۔ و حصہ درگاہ کہ معمول است۔ و یک حویلی مسکونہ واقع سندھی پورہ و دیگر دو قطعۂ زمین معہ حوض واقع پرگنہ زین پور (زیناباد) بر کنارہ رود تپتی متصل مبقرہ رومی تا دیوار آہو خانہ کہ تکیہ ساختہ وزرخرید حضرت شیخ مغفرت مآب است و دیگر قطعۂ زمین شہاب الدین پورہ در آن منجملہ وہ حصہ کردہ ازان یک حصۂ زمین منمقر مذکور است کہ مشہود بہ باڑہ سانول است و قطعہ زمین دیگر متصل درگاہ حضرت شاہ ابراہیم کلہورای۔ و دیگر دو قطعۂ زمین افتادہ واقع محلّہ مذکور نزد خانقاہ مزبور۔ دیگر قطعۂ زمین واقع محلّہ خراطی بازار کہ مشہور بہ خانجہانی است......

(تحریر فی التاریخ چہارم جمادی الثانی ۱۲۲۸ھ)

اس تحریر سے ثابت ہوتا ہے کہ تاپتی ندی کے دوسرے کنارے پر شیخ شہاب الدین کی بہت زیادہ زمین تھی جو زین آباد سے متوازی دور تک پھیلی ہوئی تھی اور کافی حصہ پر آبادی بھی تھی جس کا نام شہاب الدین پورہ تھا۔ سانول باڑہ اب بھی موجود ہے اور اسی نام سے زین آباد کے پٹیل کے تصرف میں ہے۔ زمانۂ قدیم کی نہایت عریض اور بلند مٹی کی دیواروں سے محدود ہے اور آج بھی سانول باڑھ ہی کہلاتا ہے۔

---

[1] یہاں حضرت سے مراد حضرت شیخ شہاب الدین قدس سرہٗ ہے۔ اس دور کے آداب تحریر میں اس بات کا خاص التزام یہ تھا کہ واجب التعظیم نام کو تحریر کے ضمن میں نہیں لکھتے تھے بلکہ سب سے اوپر تحریر ہوتا تھا، چنانچہ اس اصل وثیقہ میں بھی پیشانی پر شیخ شہاب الدین تحریر ہے۔

اسی تحریر سے روی خان کے مقبرہ کا صحیح مقام بھی واضح ہوتا ہے جو تاریخ کی ایک اہم چیز ہے اور اس سے چند دیگر تاریخی مشاہیر کے مزارات کی نشاندہی وابستہ ہے۔ جو عام طور سے اہلِ جستجو کے لئے ایک مصدقہ انکشاف ہے۔

آپ کو فیاضِ ازل کی بارگاہ سے دینی و دنیوی سعادتوں کا وافر حصہ عطا ہوا تھا۔ عزت، وجاہت، دولت اور روحانی عظمت کے ساتھ ساتھ نیک اور نامور اولاد سے بھی خدا نے نوازا ہوا تھا۔ چار فرزند سعید و رشید عالم و فاضل و مقبول انام تھے اور ہر ایک علوم عقلی و نقلی سے بہرہ ور تھا۔ مقاماتِ سلوک طے کرانے کے بعد آپ نے وقتاً فوقتاً چاروں کو خرقۂ خلافت عطا فرمایا تھا۔ بڑے فرزند عبداللہ قدس سرۂ کو حضرت مسیح الاولیا کے روضۂ مبارک کی تولیت وسجادگی عطا کی۔ آپ کے وصال کے بعد اس شاخ مین ایک اور مسند خلافت وسجادگی قائم ہوئی۔ یہ آپ کے روضہ کی تولیت وسجادگی تھی جس پر حضرت محمد عبداللہ سجادۂ مسیح الاولیاء نے اپنے چھوٹے بھائی حضرت شیخ بہاء الدین کو سجادہ نشین کیا۔ یہ سجادگی ایک عرصہ تک علی التواتر ان کی اولاد میں قائم و جاری رہی اور یہ سجادے سجادگان شیخ شہاب الدین یا شیخ بہاء الدین کہلائے۔ اوپر جو سپردگی نامہ پیش کرآیا ہوں، وہ اسی درگاہ سے متعلق ہے اور واضح طور پر تحریر ہے کہ یہ املاک حضرت شیخ شہاب الدین قدس سرۂ کے عرس کے مصارف کے لئے سپرد کی جاتی ہیں۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آپ کا عرس ۱۲۲۸ھ تک کس مہتم بالشان اہتمام سے کیا جاتا تھا، جس کے لئے اس سستے اور برکت والے زمانہ میں صدہا روپیہ مخصوص تھا۔

☆

حضرت شیخ رحیم قدس سرہٗ

آپ حضرت بابا فتح محمد محدثؒ کے فرزند ہیں، والد کی تعلیم و تربیت سے پروان چڑھے۔ جملہ علوم عقلی و نقلی میں استعداد کامل بہم پہنچائی۔ تصوف کے اسرار و رموز ریاضت و مجاہدات سے حاصل فرمائے۔ درویش دوست اور تقویٰ شعاری مسلک تھا۔ حضرت نے خانقاہ نشینوں کی تعلیم و تربیت پر مامور فرمایا ہوا تھا۔ طالبانِ حق کو ان کی استعداد کے موافق روحانی ترقی کی منزلیں طے کراتے تھے۔

حضرت نے جب وطنِ مالوف سے حجازِ مقدس کے سفر کا عزم کیا اور مدینۂ طیبہ میں مستقل طور پر بقیہ عمر بسر کرنے کے قصد سے روانہ ہوئے تو ازروئے وصیت شرعی طور پر اپنا ترکہ ورثاء میں تقسیم فرمایا یا اس میں آپ کے حصہ کے ساتھ مصارف خانقاہ کے لئے مناسب حال رقم کی املاک کا اضافہ ملحوظ رکھا تھا، جس پر آپ نے کمال دیانت اور سعادتمندی سے عمل کیا اور تاحیات یہ ذمہ داری آپ کو تفویض رہی۔

خاندانی علم و فضل کا سلسلہ آپ کی اولاد میں بھی عرصۂ دراز تک جاری رہا، حفظ قرآن مجید اور علم قرأت جو مسیح الاولیا کے خاندان کا خاص جوہر ہے، اس سے آپ کے سعید اخلاف خاطر خواہ بہرہ ور رہے، چنانچہ آپ کے پوتے جو آپ کے ہمنام تھے، علومِ قرآنی پر عبور کے باعث جامع مسجد برہانپور کے خطیب مقرر کئے گئے تھے۔

☆

حضرت شیخ محمد عیسیٰ قدس سرہٗ

آپ حضرت بابا فتح محمد محدث قدس سرہٗ کے چھوٹے فرزند ہیں۔ علوم متعارفہ اپنے والد سے تحصیل کئے۔ تصوف میں بھی خاص دسترس تھا۔ سادگی پسند اور تقویٰ شعار تھے۔ حضرت بابا فتح محمد کی ہجرت کے وقت عنفوان شباب کا عالم تھا۔ محتاط اور قناعت کے جوہر سے آراستہ تھے۔ حضرت نے اپنی اولاد اور دیگر ورثاء کو جو ترکہ تقسیم فرمایا تھا، آپ کے حصہ کے علاوہ شیخ شہاب الدین کا اراضیات معانی کا حصہ بھی امانتاً آپ ہی کے سپرد کیا گیا تھا، کیونکہ شیخ شہاب الدین والد کے ہمراہ تشریف لے گئے تھے۔ جب وہ چار سال بعد ۱۰۶۸ھ میں واپس آئے تو آپ نے علی الحساب تمام رقم بلا طلب پیش کردی۔ حضرت بابا فتح محمد نے مدینہ طیبہ سے شیخ شہاب الدین کے ہاتھ ایک اور تاکید نامہ بھیجا تھا کہ تمام فرزند اپنی مادر عارضی کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آئیں۔

اس فرمان کی تعمیل میں آپ نے کمالِ سیر چشمی سے شیخ شہاب الدین کو اختیار دیدیا کہ آپ کو مجاز ہے۔ میرے حصہ میں سے جو چاہیں اس نیک مقصد کے لئے لے لیں۔

آپ کو نظم ونسق اور حسنِ انتظام کا بھی خاص ملکہ تھا۔ شیخ شہاب الدین کی عدم موجودگی میں بقیہ اہلِ خاندان کی آسائشوں اور نگہداشت کی خدمات آپ خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔

☆

حضرت شیخ محمد عبداللہ قدس سرہٗ

آپ حضرت شیخ شہاب الدین قدس سرہٗ کے بڑے فرزند ہیں۔ عالم و فاضل، زاہد و عابد متقی تھے۔ والد کی وفات کے بعد حضرت مسیح الاولیا قدس سرہٗ کی درگاہ سجادہ نشینی پر فائز ہوئے۔ صاحبِ حال بزرگ تھے۔ قناعت پسندی اور توکل پر تکیہ تھا۔ اپنے علم و فضل اور روحانی برکات سے بے شمار اہلِ نیاز کو فیض پہنچایا۔ چودہ خانوادہ کی خلافت حاصل تھی۔ بے شمار مریدین اور متعدد نامور خلفاء تھے۔ آپ کی تعلیمات کی خصوصیت یہ تھی کہ طالب کو مکروہات دنیوی سے اجتناب پر عامل کرکے خدا طلبی کی طرف متوجہ فرماتے کسبِ کمال کی ترغیب دیتے اور قوت بازو سے مسنون طریقہ پر حلال روزی کمانے کی تاکید فرماتے۔ آپ کے زیرِ تعلیم و تربیت درویش بھی مناسب حال پیشہ سے اپنی معاش حاصل کرتے تھے اور آپ کے فقراء بجائے کسی پر بار ہونے کے اپنے متعلقین کے لئے سہارا ہوتے تھے۔ فرخ سیر بادشاہ آپ کا عقیدتمند تھا، تخت نشین ہوتے ہی وہ خانقاہ کے مصارف کے لئے کچھ مواضع جاگیر مدد معاش پیش کرنا چاہتا تھا۔ آپ نے قبول نہ کئے اور اسی سنہ میں وصال فرمایا۔ فرخ سیر نے آپ کی بیوہ دختر مسماۃ امۃ الجلیل کو موضع کارکھیڑہ کی سند بھجوادی۔ یہ سند تو آج بھی سجادۂ حال حکیم لاڈلے صاحب کے پاس موجود ہے۔ جاگیر کی رقم بھی پچاس سال پہلے تک ان کے بزرگوں نے حاصل کی بعد میں جو حکومتوں کی تبدیلیوں کے باعث اِدھر کی اُدھر ہوگئی، دس بارہ سال قبل تک مقدمہ بازی ہوتی رہی جو بے نتیجہ رہی۔

☆

حضرت شیخ بہاء الدین قدس سرہٗ

آپ حضرت شیخ شہاب الدین قدس سرہٗ کے دوسرے فرزند ہیں۔ اعلیٰ علوم حدیث، فقہ کے عالم باعمل اور علوم عرفان وتصوف کے اسرار و رموز سے فیضیاب تھے، اپنے والد کی موثر تعلیم اور فیضانِ خدمت وصحبت سے دینی و دنیاوی اعزاز و کامرانی حاصل کی تھی۔ والد محترم اور بڑے بھائی شیخ محمد عبداللہ سجادہ سے بیعت وخلافت سے سرفراز تھے۔

حضرت شیخ شہاب الدین کے وصال کے بعد ان کے خلفاء و مریدین نے ان کا عرس نہایت شان و اہتمام سے کرنا شروع کیا تو برادر بزرگ شیخ محمد عبداللہ نے شہر کے ممتاز سجادگان و عمائدین کی مجلس منعقد کر کے، شیخ شہاب الدین کی درگاہ سے متعلق ایک مسند سجادگی قائم کر کے شیخ بہاء الدین کو سجادہ نشین کیا اور درگاہ کا اہتمام تمام وکمال ان کے سپرد کردیا۔ چنانچہ شیخ شہاب الدینؒ کی درگاہ کی سجادہ نشینی شیخ بہاء الدین کے بعد ان کی اولاد میں متواتر اور متوارث رہی اور عرس کے اہتمام میں روز افزوں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ ۱۲۲۸ھ کے ایک سپردگی نامہ کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اسی خاندان کے ایک سجادہ نے اپنی ایک عزیزہ کو شیخ مذکور کے عرس کے انتظامات سپرد کرتے ہوئے صدہا روپیہ آمدنی کی املاک بھی تفویض کی ہیں۔ یہ سپردگی نامہ (اقتباس) حضرت شیخ شہاب الدین کے ذکر میں نقل کیا گیا ہے۔

☆

شاہ غلام یٰسین عین اللہ وارث رسول اللہ
ابن شیخ شہاب الدین ابن بابا فتح محمدؒ

آپ کے حالات ولادت و وفات وغیرہ کا کوئی علم نہ ہوسکا، بجز اس کے کہ آپ بابا فتح محمد کے پوتے ہیں اور اپنے عالی گوہر اسلاف کی طرح جوہرِ علمی سے آراستہ و پیراستہ تھے۔ آپ کی ایک تصنیف کا قلمی نسخہ راقم الحروف کے پاس ہے۔ جس کا نام ''شرح آیاتِ سلیمانیہ'' ہے۔ یہ نسخہ خود آپ کے قلم کا مکتوبہ ہے، بلکہ قلم برداشتہ تحریر سے پایا جاتا ہے کہ یہ مکتوبہ مسودہ کی اولین کاپی ہے، کیونکہ اسی نسخہ میں حُسنِ خط کے نمونہ بھی موجود ہیں، جو آپ کے قلم سے ثبت ہوئے۔

کتاب کا موضوع نام سے ظاہر ہے۔ قرآن مجید میں جتنی آیات ہیں، حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر کیا ہے، آپ نے سب کو فراہم کر کے حضرت سلیمان علیہ السلام کے سوانح زندگی مربوط کردی ہے۔ آیات کی شرح سادہ فارسی زبان میں لکھی ہے۔

آغاز کتاب میں آپ نے اپنا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:

> ''شاہ غلام یٰسین عین اللہ وارث رسول اللہ الصدیقی الجعفری القادری النقشبندی العیسوی الفتحی الشہابی البرہانپوری۔''

خاتمہ پر ترقیمہ کی عبارت یہ ہے:

> ''مالک مجازی و مملوک حقیقی فقیر یٰسین عین اللہ وارثِ رسول اللہ شطاری البرہانپوری۔''

کتاب میں سنہ تالیف و کتابت کی تاریخ درج نہیں ہے تاہم یہ بات ظاہر ہے کہ آپ شیخ شہاب الدین کے سب سے چھوٹے فرزند ہیں، کیونکہ موصوف نے تحفۃ الاوراد کی وجہ تالیف میں صرف دو فرزندوں شیخ بہاء الدین اور شیخ علاء الدین کے نام لکھے ہیں کہ ان کی تعلیم کی غرض سے یہ کتاب تالیف ہوئی۔ چنانچہ اس زمانہ میں آپ پیدا بھی ہوچکے ہوں گے تو تعلیم کے قابل عمر نہ ہوگی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

☆

حضرت محمد انور خان قطب الدولہ قدس سرہٗ

آپ حضرت مسیح الاولیاء قدس سرہٗ کے سجادہ سوم حضرت شیخ محمد عبداللہ قدس سرہٗ کے فرزند ہیں۔ علوم متعارفہ سے آراستہ اور مشائخانہ اوصاف عالی سے پیراستہ تھے۔ لیکن جوشِ جوانی اور طبیعت کی اولوالعزمی کے باعث سپاہگری سے خاص شغف اور رغبت رکھتے تھے، فرخ سیر کے عہد میں شائستہ منصب اور خانی کے خطاب سے افتخار پایا۔

مآثر الامرا میں درج ہے کہ آپ کو شاہ نور اللہ درویش بہت عزیز رکھتے تھے۔ انہوں نے سادات بادشاہ گر سے سفارش کروادی۔ تب فرخ سیر نے آپ کو منصب پر مامور کیا۔ اصل عبارت یہ ہے:

ابتداً منظور نظر شاہ نور اللہ درویش کہ قطب الملک و حُسین علی خان را با دے اخلاص و اتحاد متحقق بود۔ بہ سفارش درویش مذبور سادات مذکور دستگیری نمدوہ در عہد محمد فرخ سیر بادشاہ بمنصب شائستہ و خطاب خانی سر بلند گردید۔

یہ روایت صداقت سے بعید معلوم ہوتی ہے۔ سادات بارہہ و نیز بادشاہ فرخ سیر کو خود اس خاندان والا شان سے ذاتی طور پر گہری عقیدت حاصل تھی۔ اسی فرخ سیر بادشاہ نے تخت شاہی پر جلوس فرما ہونے کے چند ماہ بعد ہی محمد انور خان کی ہمشیرہ محترمہ مرحومہ کے وابستگان کے لئے موضع کارکھیڑہ کی گرانقدر جاگیر مدد معاش عطا کی تھی۔ شاہی سند کی نقل یہ ہے:

درینوقت میمنت اقتران فرمان والا شان واجب الاذعان صادر رشد کہ موضع کار کھیڑہ متعلق پرگنہ زین پور صوبۂ خاندیس در بست بجمیع چہل و ہشت ہزار دام کہ پانصد روپیہ کسری حاصل آنست از پنج سدس خریف ئیلائیل در وجہ

مدد معاش مسماۃ امۃ الجلیل بنت محمد عبداللہ نبیرۂ قدوۃ الواصلین حضرت شیخ عیسیٰ قدس سرہٗ بلاقید اسامی وقسمت حسب الضمن مقرر باشد باید کہ حکام و عمال و متصدیانِ مہمات وجاگیرداران وکرزہان حال واستقبال موضع مذکور رابہ تصرف وابستہ ہائے مسماۃ مذبور باز گزارند و از جمیع عوارض ووجوہ معاف و مرفوع القلم شمارند ودرین باب ہر سال سند مجدد نہ طلبند۔

سوم محرم الحرام سال دوم از جلوس ولا نوشتہ شد

یہ سند سجادہ حال حکیم لاڈلے صاحب کے پاس ہنوز موجود ہے۔ آپ کے بزرگوں نے اس کے حاصل سے تمتع بھی حاصل کیا ہے۔ لیکن بعد میں مرہٹہ دَور آیا تو یہ جاگیر بھی ضبط ہوگئی۔ انگریزوں کے زمانۂ سلطنت میں بھی منجملہ دیگر جاگیرات کے کارکھیڑہ کی واگذاری کی بھی جدوجہد کی گئی۔ سالہا سال قانونی سہاروں پر کوشش کی گئی، لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ یہاں سند کے متعلق صرف اتنا ہی ذکر کافی ہے۔ مقصود تو یہ ثابت کرنا ہے کہ بادشاہ کو بلا کسی کی تحریک وسفارش کے اس خاندان کے جملہ افراد کی خدمت و امداد کا ذاتی طور پر خیال تھا۔ حتیٰ کہ سجادہ مغفور کی دختر مرحومہ کے فرزندوں اور متعلقین کا بھی۔

ہوسکتا ہے کہ با ایں ہمہ سادات برادران نے بھی سفارش کردی ہو اور سلطان نے قطب الدولہ کا خطاب انہیں قطب الملک کی دلجوئی کے لئے عطا فرمایا ہو۔ بہرحال وہ فرخ سیر کے عہد میں منصب پر مامور ہوئے اور کچھ ایسے مبارک وموزون وقت میں آپ منصب پر فائز ہوئے تھے کہ بادشاہتیں درہم وبرہم ہوئیں وزارتیں تبدیل ہوئیں ملک میں بغاوتیں اور انقلاب رونما ہوئے۔ لیکن آپ کے منصب امارت پر زوال نہیں آیا۔

۱۱۳۱ھ میں فرخ سیر کے قتل اور محمد شاہ کی تخت نشینی کے بعد جب نظام الملک نے دکن پر یورش کی۔ انور خان صوبہ دار برہان پور اور دکن کے بخشی تھے اور سادات کا بھتیجا عالم علی خان اورنگ آباد میں نائب ناظم تھا۔ عالم علی خان نے نظام الملک کے مقابلہ کی تیاریاں کیں۔ انور خان کو جو ان دنوں اورنگ آباد میں تھے، برہانپور قلعہ آسیر کی حفاظت کے لئے روانہ کیا۔

انور خان بڑے ذہین تھے۔ بُرہان پور آکر اُنہوں نے ہوا کا رخ دیکھ کر اندازہ کیا کہ نظام الملک کے سدِ راہ ہونے میں کامیابی کی کم امید اور پامال ہوجانے کا زیادہ اندیشہ ہے۔ نیز سادات کے مظالم کے پیشِ نظر ان کا زوال بھی قریب ہی نظر آتا تھا۔ چنانچہ اُنہوں نے نظام الملک کی آمد پر بجائے صفِ جنگ آراستہ کرنے کو اظہار مؤدت ومحبت کیا اور استقبال کرکے شہر و قلعہ حوالہ کردیا۔ نظام الملک پہلے ہی قدم کی اس عظیم ونمایاں کامیابی سے بہت مسرور ومتاثر ہوا۔

خود تو اسی رفتار سے عالم علی خان کے مقابلے کے لئے آگے بڑھ گیا اور برہانپور و قلعہ آسیر کے انتظام کے لئے قطب الدولہ کو اپنی جانب سے مامور کرگیا۔

معرکۂ کارزار میں عالم علی خان نے جم کہ مقابلہ کیا، مگر کچھ پیش نہ گئی اور میدانِ جنگ میں مقتول ہوا۔ یہ فیصلہ کن جنگ تھی۔ تمام صوبجات دکن پر نظام الملک کا تسلط ہوگیا۔ سادات برادران اس خبر سے بے چین ہوگئے اور پوری طاقت کے ساتھ بادشاہ کو بھی ہمراہ لے کر نظام الملک کے استیصال کے لئے دارالخلافہ سے نکل کر دکن روانہ ہوئے۔ لیکن راستہ ہی میں ایک بھائی قتل کردیا گیا اور دوسرا بادشاہ سے مقابلہ کرتے ہوئے اسیر و دستگیر ہوا۔ محمد شاہ نے سادات کے پنجۂ ستم سے نجات پاتے ہی نظام الملک کو وزیر الممالک کا منصب اور صوبجات دکن کی حکمرانی کا فرمان بھیج دیا۔ نظام دکن نے مطمئن ہوکر دکن کا نظم ونسق اپنی مرضی کے مطابق قائم کیا اور انور خان اپنے عہدہ ومنصب پر بحال رہے۔

ایک اور نازک موقعہ پر آپ نے نہایت فراست و دانائی سے خود کو بدنام یا معتوب ہونے سے محفوظ رکھا۔ جبکہ نظام الملک نادرشاہ کی آمد کے سلسلہ میں بادشاہ کی طلبی پر دارالخلافہ کو گئے اور اپنی نیابت میں اپنے فرزند ناصر جنگ کو قائم مقام کرگئے۔ ناصر جنگ نے میدان صاف پاکر ہاتھ پاؤں نکالے اور اپنی خودمختاری کا اعلان کردیا۔ اس موقعہ پر جو امیر ان کے مخالف رہے، وہ ناصر جنگ کے معتوب ہوکر معزول یا آوارۂ ادبار ہوئے اور جنھوں نے موافقت کی وہ نظام الملک کے کامیاب ہونے پر معطل ومعزول ہوئے۔ باپ بیٹوں کے اختلاف کے زمانہ میں آپ کے سپرد سابقہ منصب ہی رہا۔ آپ خاموشی سے اپنے مقامی مشاغل میں مصروف رہے، اختلاف بھی ظاہر نہیں کیا کہ ناصر جنگ مشتبہ ہوتا اور ایسی کوئی نمودار حرکت بھی نہ کی جس سے آپ کی موافقت ثابت ہوکر نظام الملک کی ناراضی کا باعث بنتی۔ البتہ نظام جب دہلی سے واپس آئے تو آپ نے پھر سد راہ نہ ہوتے ہوئے استقبال کرکے وفاداری کا ثبوت دیا۔ مآثر الامراء نے آپ کی ان مصلحت کوشیوں کو زمانہ سازی بتایا ہے۔ آپ باوجود دنیاوی وجاہت ومشغلۂ امارت کے بھی عبادت گذاری اور وظیفہ خوانی کے عادی تھے۔ بلند اخلاق تھے۔ ۱۱۷۱ھ میں انتقال ہوا۔ لاولد تھے۔ مآثر الامراء کی عبارت کے چند جملے ملاحظہ ہوں:

مطابق سنہ یکہزار و یک صد و ہفتاد و یک بعالم اُخروی شتافت۔ خلیق بود و بعبادت یومیہ مؤظف اما در زمانہ سازی یکتائی واشت از اولاد نہ بود۔

(مآثر الامر بحوالۂ تاریخ برہانپور ص۲۱۲)

برہانپور میں انتقال ہوا اور خاندانی قبرستان کے احاطہ میں بمقام سندھی پورہ دفن ہوئے۔

دورِ دوم

دیگر مشائخ وصلحائے سندھ

قدسہم اللہ اسرارہم
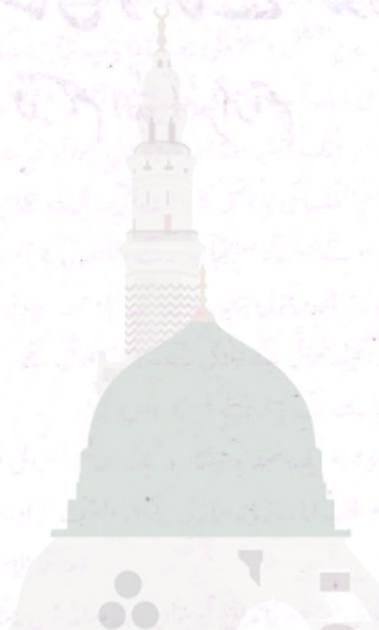
حضرت مولانا شیخ طیب ابن مخدوم ہارونی

(قدس سرہٗ)

آپ کے ذکر میں مولانا غوثی لکھتے ہیں کہ: ''مخدوم ہارون ایک بزرگ تھے، سندھ کی تمام زمین ان کے وجود سے روشن تھی۔ اور تھتہ کے تمام اطراف ان کی اولاد اور شاگردوں سے منور ہیں شیخ طیب انہیں مخدوم کے فرزندوں میں سے ہیں۔'' (گلزار ابرارص ۳۷۷)

آپ کی وطن سے ہجرت کا زمانہ اور خاص اسباب کا صراحت نہ کرتے ہوئے صرف اس قدر نشان دہی کی ہے کہ: ''تقدیر کے کرشمہ سے ناچار ہوکر آپ اپنے وطن سے دل برداشت ہوئے اور ایلچ پور برار کی طرف سفر اختیار کیا۔'' (گلزار ابرارص ۳۷۷)

یہ وہ زمانہ تھا جب شیخ طاہر محدث ایلچ پور میں درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے مشاغل میں مصروف تھے اور دونوں میں پہلے ہی نہایت مخلصانہ دوستی تھی۔ اس ملاقات سے دونوں بہت مسرور ہوئے اور پھر اس یکجائی میں ہی پوری عمر بسر کردی۔ شیخ طاہر بھی ایسے خلوص اور برادرانہ محبت سے پیش آئے کہ ناواقف لوگ دونوں کو حقیقی بھائی خیال کرتے تھے۔ اتفاق سے شیخ طاہر کے بڑے بھائی کا نام بھی شیخ طیب تھا، لیکن ان کا انتقال ۹۵۰ھ میں وطن مالوف ہی میں ہوچکا تھا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ لوگ ان کو حقیقی بھائی سمجھنے لگے تھے۔

شیخ طیب اپنے نامور عالم و فاضل والد کی خدمت میں اعلیٰ علوم سے فارغ التحصیل ہونے کے باوجود حضرت مُلا یونس مفتی سندھی کی شاگردی سے بھی شرف یاب تھے۔ نہ صرف آپ حافظ قاری اور عالم بے بدل ہونے کے اعتبار سے خود فیض یافتہ تھے، بلکہ اپنے سرچشمۂ علوم سے طالبانِ فضل و کمال کو سیراب کرنے کی فیض رسانی سے بھی دریغ نہ فرماتے۔ چنانچہ حضرت مسیح الاولیا فقہ اور کلام میں آپ کے شاگرد ہیں۔ نیز آپ عارفانہ علوم تصوف اور حدیث کے سلسلہ میں شارح اور حاشیہ نگار بھی ہیں۔ آپ کی تالیف سے رسالۂ غوثیہ کی مفید شرح اور مشکوٰۃ پر عمدہ عمدہ حاشیے یادگار ہیں۔

فاروقی بادشاہ نے حضرت شیخ طاہر کے علاوہ آپ سے بھی برہانپور تشریف لانے کے لئے اصرار کیا تو آپ بھی برہان پور آگئے۔ اور فیض رسانی خلق کے مشاغل پر دس سال سے زائد عرصہ تک یہاں بھی کاربند رہے۔ غوثی کا بیان ہے کہ دسویں صدی کے دسویں حصہ میں (یعنی ۹۹۱ھ کے بعد کسی سنہ میں) انتقال فرمایا اور شیخ ابراہیم ابن عمر سندھی کے خطیرے میں دفن ہوئے۔

☆

حضرت شیخ ابراہیم کلہورا قدس سرہٗ

سندھ سے ہجرت کرکے بُرہان پور میں وطن اختیار کرنے والوں میں آپ کو نسبتاً قدامت حاصل ہے۔ تفصیلات تو موجود نہیں، البتہ دسویں صدی ہجری کے آغاز سے آپ کا بُرہان پور میں موجود ہونا پایا جاتا ہے۔ آپ حصور تھے چنانچہ تجرد میں عمر بسر کی۔ آپ کے پیرانِ طریقت اور اساتذہ کے متعلق بھی کوئی صراحت نظر سے نہیں گذری، لیکن آپ علم و فضل کے جوہر سے آراستہ پابند شریعت اور تقویٰ شعار تھے۔ روحانی دنیا میں بھی آپ کو کمالِ عرفان حاصل تھا۔ دنیا داروں کی صحبت سے گریز فرماتے برہان پور میں شمالی جانب اُتاولی ندی کے متصل خانقاہ تھی، دستِ غیب کی لازوال آسمانی دولت سے سرفراز تھے اور درویشی میں سلطانی جود وسخا کا فیض آپ کے قلندرانہ دربار سے جاری رہا کرتا تھا۔ روزانہ پانچ سو روپیہ رائج الوقت خزانہ غیب سے پہنچ جاتے اور آپ انہیں ہر روز فقرا اور اہلِ استحقاق میں تقسیم فرمادیتے۔

ایک مرتبہ والی ملک مبارک شاہ فاروقی متوفی ۹۴۲ھ آپ کی خدمت میں زرِ کثیر برائے نذر لایا اور بہت اصرار کیا کہ آپ قبول فرمالیں مگر آپ نے یہ کہہ کر معذرت کی کہ جب ہماری لاحقہ ضروریات کا انتظام اللہ تعالیٰ کے خزانہ سے ہوجاتا ہے تو ہم اسے بیکار کیوں رکھ چھوڑیں۔ برائے نہادن چہ سنگ و چہ زر۔

آپ شاہ منصور مجذوب فاروقی برہانپوری کے معاصر تھے، جو فاروقی بادشاہ کے وزیر ملک جلال کے فرزند تھے اور حضرت شاہ بھکاری قدس سرہٗ کے ممتاز خلیفہ تھے اور ہمنامی کے لحاظ سے اپنے مرشد سے منصور کے مقام کی تمنا کی تھی، چنانچہ مجذوب ہوگئے تھے۔ دونوں بزرگوں میں ابتداً باہم ربط تھا۔ اتفاقاً شیخ ابراہیم کلہورا کی خانقاہ میں ایک سیاح وارد ہوا اور دریافت کیا کہ اس شہر میں شاہ منصور کہاں رہتے ہیں، میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ آپ نے پوچھا اُن سے کیا کام ہے اور تم اُنہیں کیسے جانتے ہو۔ سیاح نے کہا میں کچھ عرصہ مدینہ منورہ میں مقیم رہا ہوں، ہر جمعہ کو مسجد نبوی میں ایک لنگی بستہ شخص کو شریکِ نماز دیکھا۔ مگر بعد نماز بہت جستجو کرنے پر بھی ان سے ملاقات نہ ہوسکی، مجھے حد سے زیادہ مشتاق دیکھ کر ایک اہلِ نظر بزرگ نے بتایا کہ وہ بُرہانپور میں رہتے ہیں اور باطنی قوت سے نماز جمعہ کے لئے یہاں آتے ہیں، یہ معلوم کرکے مجھے اور اشتیاق

ہوا اور میں نے ان کی ملاقات کے شوق میں یہاں تک سفر کی زحمتیں برداشت کی ہیں۔ وہ مل جائیں تو ان کی باطنی قوت کا اندازہ کروں۔

آپ نے کہا وہ مجذوب ہیں، اُن کی راز جوئی مناسب نہیں۔ بہتر ہے کہ تم ان کے پاس نہ جاؤ مگر وہ اجل رسیدہ کہاں مانتا تھا، نخوت سے کہا مجذوب ہیں تو ہوا کریں میں تو ہوش میں ہوں۔ جب وہ شخص چلا گیا تو شیخ ابراہیم نے مریدین سے فرمایا کہ ایک شخص کی تجہیز و تکفین کا سامان تیار رکھو۔

زیادہ دیر نہ گذری تھی کہ سیاح مذکور تڑپتا اور کراہتا ہوا واپس آیا، جو شخص اس کے ہمراہ پہنچانے آیا تھا، اس نے بتایا کہ سیاح نے شاہ منصور کے ساتھ بے تکلف گفتگو میں افشائے راز کی جسارت کرتے ہوئے کہا کہ آپ تو منصور ثانی ہیں۔ شاہ منصور جلال میں آگئے اور غصے سے کہا۔ اُس منصور نے سر کٹوایا تھا اور یہ منصور سر کاٹتا ہے۔ اتنا سنتے ہی یہ شخص تڑپنے لگا اور میں بہ دشواری سہارا دے کر یہاں تک لایا ہوں۔ شیخ سیاح سے مخاطب ہوئے لیکن اس کو غیر حالت میں دیکھ کر فرمایا: اے نادان! اپنی فضیلت کے غرور میں ولایت، جان اور ایمان بھی گنوا آیا۔ اسی وقت اپنے مرید شیخ دھیان سندھی کو شاہ منصور کے پاس سفارش کے لئے بھیجا۔ وہ جواب لایا کہ اس کی زندگی تو ختم ہوچکی ہے، البتہ آپ کی سفارش سے ایمان سلامت رہے گا۔ سیاح اسی روز فوت ہوگیا اور آپ نے اپنی خانقاہ کے قرب میں اس کو دفن کرادیا۔

آپ کی خانقاہ شہر سے باہر کافی فاصلہ پر تھی۔ لیکن آپ اکثر صلحاء کی ملاقات کے لئے برہانپور میں آتے رہتے تھے۔ عام راستے پر محلّہ خرادیان میں شاہ منصور کا مکان تھا۔ جب ان کا جذب انتہا کو پہنچ گیا اور وہ عالم مدہوشی میں لباس اور ستر پوشی سے بے نیاز ہوکر مادر زاد برہنہ رہنے لگے تو آپ نے پاسِ شرع کے لحاظ سے وہ راستہ ترک کردیا۔ کیونکہ شاہ منصور عموماً اپنے دروازے پر بیٹھے رہا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ چند مریدین کے ہمراہ ایک تنگ کوچہ سے گذر رہے تھے کہ مقابل سمت سے شاہ منصور آ نکلے۔ کترا کر نکل جانے کا موقعہ نہ تھا۔ آمنا سامنا ہوگیا۔ شاہ منصور نے اشارے سے دریافت کیا کہاں چلے؟ آپ نے اپنی خانقاہ کی طرف اشارہ کیا۔ یعنی خانقاہ کی طرف جارہا ہوں۔ شاہ منصور نے زمین پر ہتھیلی رکھ کر زور سے جنبش دی۔ آپ نے ہاتھ بلند کرکے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ اس مختصر اور خاموش مکالمے کے بعد دونوں بزرگ اپنی اپنی راہ چلے گئے۔ شہر سے باہر شیخ ابراہیم کی راہ میں آب جاری کا ایک نالہ واقعہ تھا، جس میں ہمیشہ زانو سے نیچا ہی پانی رہتا تھا۔ لیکن اُس دن جب آپ نے نالہ کو عبور کرنا چاہا تو پانی کی تھاہ نہ تھی۔ آپ کا گھوڑا غرق ہونے لگا۔ اس خلاف توقع ناگہانی واقعہ سے تعجب اور پریشانی ہوئی، اپنے مرشد کی طرف روحانی توجہ کی اور درگاہ الٰہی میں تضرع و دعا کی برکت سے

آبِ نالہ حسبِ معمول پایاب پایا گیا اور آپ باطمینان عبور کر گئے۔ ہمراہی جنہوں نے یہ کیفیت مشاہدہ کی تھی گھبرا کر وجہ دریافت کرنے لگے۔ آپ نے فرمایا: شاہ منصور نے زمین پر ہاتھ رکھ کر یہی کہا تھا کہ میں تجھے غرق کردوں گا اور میں نے آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا کر جواب دیا تھا کہ اللہ نے چاہا تو نکل جاؤں گا۔

یہ روایت ملفوظات جلالی سے ماخوذ ہے۔ راقم الحروف کے مطالعہ میں جو مخطوطہ رہا ہے وہ ناقص الآخر تھا۔ شاہ منصور کا ذکر ختم نہیں ہوا۔ آئندہ اوراق میں کس قدر روایات ہوں گی خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ یا وہ جن کی نظر سے یہ مکمل کتاب گذری ہے۔

علامہ غوثی نے آپ کی نظر کیمیا اثر کے متعلق یہ روایت اپنی کتاب میں لکھی ہے کہ ایک مرتبہ کچھ لوگ اپنی مفلسی کی شکایت بیان کرکے کہنے لگے کہ گذشتہ زمانہ میں بعض بزرگوں کی یہ شان تھی کہ پتھر پر نگاہ ڈالتے تو وہ سونا بن جاتا تھا۔ آپ نے تبسم فرما کر سامنے پڑے ہوئے ایک پتھر پر نظر ڈالی، اسی وقت وہ پتھر سونے کا رنگ اختیار کرنے لگا۔ آپ نے زبان مبارک سے فرمایا اے پتھر میں نے یوں ہی تیری طرف دیکھ لیا ہے یہ مقصد زنہار نہیں ہے کہ تو سونا بن جائے۔ وہ پتھر اسی وقت اپنی اصلی حالت میں آ گیا۔

شیخ ابراہیم اپنے زمانہ کے بڑے فیض رسان بزرگ تھے۔ آپ کے فیضانِ صحبت اور تقریر کی تاثیر سے بہت لوگ رغبت وخلوص سے حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے۔ خدا نے آپ کو عمر طویل عطا فرمائی تھی۔ بے شمار خدا رسیدہ بزرگوں سے کسبِ فیض اور ملاقات کا شرف حاصل کیا تھا۔ ۹۵۶ھ میں آپ نے وصال فرمایا جب کہ آپ کی عمر ۹۵ سال کی تھی اور اپنی خانقاہ میں دفن ہوئے۔ یہ مقام برہانپور سے آسیر جانے والی سڑک سے داہنی طرف اتاولی ندی کے قریب واقع ہے۔ فضل الٰہی کے اعداد آپ کے سنہ وصال کے برابر ہیں۔ مزار کھلے میدان میں ایک مرتفع چبوترے پر ہے۔

ایک دلچسپ لطیفہ

برہانپور کے عوام لفظ کلہورا کے تلفظ کی صحبت اور اصلیت سے بیخبری کے باعث آپ کو ابراہیم شاہ کروڑے (یعنی کروڑ پتی) کہتے ہیں اور تاویل میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ آپ کروڑ پتی درویش تھے، جب ہی تو پچاس ساٹھ برس تک پانچ سو روپے روز محتاجوں کو تقسیم کرتے رہے اور کبھی اس معمول میں فرق نہ آیا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے دستِ غیب کی شہرت سے کسی خوش فہم آدمی نے مذکورہ عرفِ عام کو مربوط کرکے اُپنے ذہن کی رسائی کا مظاہرہ کیا ہے۔

☆

حضرت شیخ وہبان سندھیؒ

آپ حضرت شیخ ابراہیم کلہوڑا کے مرید ہیں۔ آپ کی ذات میں وحدت حقیقی اور غیرتِ ایزدی کی تجلیات کا ظہور بدرجۂ اتم تھا، ایک مرتبہ سرِ راہ کسی پیکر جمال نامحرم خاتون کی جانب نظر اُٹھ گئی۔ ضمیر کی طرف سے ملامت اور قلب روشن کی جانب سے خطاب ہوا کہ ابھی آنکھ غیر کے حسن پر نگاہ کرنے کی طرف مائل ہے! اسی وقت دونوں آنکھوں کی بصارت زال ہوگئی۔

اسی عالم میں آپ دل کو سوز و محنت اور جان کو شوق و غیرت سے مالا مال کئے گاتے پھرا کرتے تھے۔ فطری بات ہے کہ راہ چلتے ہوئے ہاتھ آگے پیچھے حرکت کیا کرتے ہیں: آپ کا ہاتھ نسبتاً زیادہ ہلتا تھا۔ فرمایا اے ہاتھ تو ہم سے پیشتر کہاں جانا چاہتا ہے؟ اُسی وقت ہاتھ مفلوج ہوگیا جنبش جاتی رہی۔

آپ کا انتقال برہانپور میں ہوا اور یہیں مدفون ہوئے۔

☆

قاضی عبدالسلام سندھی رحمۃ اللہ علیہ

آپ مخدوم شیخ عباس سندھی کے ارشدِ تلامذہ میں ہونہار اور ممتاز طالبعلم تھے۔ وطن میں جب تک رہے مخدوم کی خدمت میں تحصیل علوم میں مصروف رہے۔ علوم دینیہ میں اس قدر فضل و کمال حاصل کیا کہ آپ جب بعہدِ عادل شاہ فاروقی برہانپور تشریف لائے تو دین پناہ بادشاہ نے آپ کو قاضی القضاۃ کی مسند پر بہ اعزاز و اکرام متمکن کیا۔ اس پایہ کا فاضل اجل ہونے کے باوجود آپ نے حکیم عثمان بوبکانی رحمۃ اللہ علیہ کے دلنشین درس کا شہرہ سنا تو بصد ادب و نیازمندی زانوے ادب تہ کر کے ان کی شاگردی کا افتخار حاصل کیا۔ اپنے شفیق اساتذہ کا بہت احترام ملحوظ رکھتے تھے۔ اولین استاد حضرت مخدوم کا ذکر بڑی محبت سے کیا کرتے۔ ان کی نسبت فرماتے تھے کہ دین، دیانت، دانش و بینش طبیعت میں نرمی اور اختلاط میں گرمی یہ اوصاف یقیناً مخدوم کی سرشت میں داخل تھی۔

ہمیں افسوس ہے کہ قاضی صاحب برہانپور میں اپنے زمانہ کی اس قدر نمودار شخصیت ہونے کے باوجود ان کے مزید حالات پر دسترس نہ ہوسکی۔ وہ تو احسان ہے ملاغوثی رحمۃ اللہ علیہ کا کہ انہوں نے بضمن دیگر بزرگوں کے چند جملے قاضی صاحب کے متعلق بھی لکھدیئے جن کے سہارے سے یہ مجمل تعارف پیش کیا جاسکا۔

☆

حضرت شیخ ابراہیم ابن عمر سندھی رحمۃ اللہ علیہ

ہمایوں کی یورش سے جب سندھ میں ابتری کا دور دورہ ہوا تو آپ ترکِ وطن کر کے سیر کناں برہانپور تشریف لے آئے۔ بقید تاریخ آپ کے ورودِ مسعود کا صحیح زمانہ معین کرنے کے لئے کوئی مصدقہ شہادت موجود نہیں، البتہ بعض واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ۹۷۴ھ سے قبل مبارک شاہ فاروقی کے عہد میں برہانپور آ چکے تھے۔

افسوس ہے کہ آپ کے حالات ''گلزار ابرار'' کے سوا اور کسی تذکرے میں مذکور نہیں اور اگر کہیں ہوں تو نیاز مند راقم اس کے مطالعہ سے بہرہ ور نہ ہوسکا۔ چنانچہ اس صوفی صافی ضمیر اور پاک باز مرتاض بزرگ کا یہ مختصر تعارف علامہ غوثی حسن کے بیانات کی روشنی میں شریک تذکرہ کرنے کی عزت حاصل کرتا ہوں۔ نیز سعادتِ ابدی بھی۔

حضرت شیخ ابراہیم دنیا اور علائقِ دنیا سے قطعاً بے نیاز تھے۔ گمنامی پسندی اور گوشہ گیری آپ کا شعار تھا۔ حتیٰ کہ آبادی سے بھی آپ کو گریز رہا ہے۔ عزلت گزینی کے پیش نظر برہانپور میں بھی آپ نے آبادی سے دور اور شہر کے ہنگاموں سے الگ تھلگ شمالی جانب آسیر جانے والی سڑک سے کچھ ہٹ کر زاویہ تجویز کیا۔ اسی غیر آباد مقام کو بے سروسانی کے سرد سامان سے آباد کر کے یکسوئی کے ساتھ توکل و زہد و ریاضت کے اسلحہ سے نفس سرکش کو مغلوب کرنے میں مصروفِ مجاہدہ رہے اور تا زندگی اسی مسلک پر قائم رہے۔ عوام و خواص کسی طبقہ سے میل جول قائم نہ کیا۔ قوت بسری کا انتظام عالمِ غیب سے من جانب اللہ ہوتا رہا اور اسی عالم میں اپنے معبود حقیقی سے جا ملے۔ سنہ وفات بھی بہ یقین متعین نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ قرائن سے پایا جاتا ہے کہ آپ مبارک شاہ فاروقی متوفی ۹۷۴ھ کے عہد میں ہی وصال فرما چکے تھے، کیونکہ حضرت شیخ مبارک سندھیؒ جن کا وصال ۹۷۸ھ میں ہوا تھا آپ کے خطیرہ میں دفن کئے گئے ہیں، جیسا کہ علامہ غوثی حسن نے شیخ مبارک کے ذکر میں لکھا ہے:

''روز جمعہ ۹۷۸ھ نو سو اٹھتر ہجری کو ملکِ تقدس کی طرف روانہ ہوئے۔ خوابگاہ برہانپور شیخ ابراہیم ابن عمر سندھی کے حظیرۂ مقدس میں۔''

زندگی میں تو گوشہ نشینی کی بدولت ہجومِ خلق سے نجات رہی، لیکن خاصان خدا گمنامی کے پردہ میں خود کو کب تک چھپا سکتے ہیں۔ آپ کی ریاضت، تقویٰ، توکل، ترک لذات، خلوت پسندی، روحانی کمالات کی دلیل بن کر مشہور انام ہوئی۔ جس زاویۂ ریاضت وعبادت میں آپ نے زندگی بسر کی تھی وہیں دفن کئے گئے۔ مزار پر بادشاہِ وقت یا اہل ثروت عقیدتمندوں نے مقبرہ (شاندار گنبد) تعمیر کرادیا تھا، جو علامہ غوثی حسن نے ۱۰۰۴ھ میں بچشم خود دیکھا تھا۔ اس کا ذکر اُنہوں نے قاضی قاضن سندھیؒ کے تذکرہ میں بایں الفاظ کیا ہے:

"شیخ ابراہیم ابن عمر سندھی کی قبر کا قُبہ برہان پور سے قطب شمالی کی طرف ہے۔ آپ کے باعقیدت دوستوں میں سے تھے۔"

فی زماننا مزارِ مبارک پر قُبہ موجود نہیں کھلی چھت کی بارہ دری البتہ بنی ہوئی اور اب تو وہ بھی مائل بہ شکستگی ہے۔ آپ کے مزار کو بھی یہ رجوعِ خلق حاصل رہا ہے کہ اہل اللہ تک آپ کے ہمسایہ میں دفن ہونا اُفضل و مستحسن سمجھتے تھے، چنانچہ متعدد مشاہیر مشائخ آپ کے مزار کے قرب و جوار میں آسودۂ خاک ہوئے اور تدریجاً تھوڑے ہی عرصہ میں اس نواح کا یہ خاص حصہ ایک وسیع قبرستان بن گیا یہی نہیں بلکہ حضرت شیخ عبدالرحیم کپڑونجی جو حضرت شیخ ابراہیم مُرغ لاہوتی کے خلیفہ تھے گجرات سے برہان پور تشریف لائے تو بادشاہِ وقت عادل شاہ ابن مبارک شاہ فاروقی نے اتاولی ندی کے کنارے سیر حاصل مقام پر آپ کے قیام کا انتظام کردیا۔ ایک وسیع پختہ سرائے اور شاندار مسجد خانقاہ وغیرہ تعمیر کرادی۔ اکثر مشائخ وعلماء بھی وہیں آ بسے اور ان کے کثیر التعداد تلامذہ و ارادتمندوں نے بھی حسبِ استطاعت مکانات بنوالئے، جب اس نو آبادی کے ڈانڈے برہانپور کی آبادی سے جا ملے اور یہاں درس و تدریس وعظ و پند کا آوازہ بلند ہوا تو شیخ عبدالرحیم موصوف نے اس آبادی کا نام، اسی علم دوست فقرا نواز بادشاہ عادل شاہ فاروقی کی نسبت سے عادلپورہ مقرر فرمایا جو آج تک عادل پورہ کے نام سے متعارف اور تذکروں میں مذکور ہے۔ اور اسی آبادی (عادلپورہ) میں شیخ ابراہیم ابن عمر سندھی کا مقبرہ معہ متعلقہ مزارستان مدغم ہوگیا۔ یعنی آبادی اور انسانوں سے زندگی میں گریز کرنے والے تارک دنیا مرتاض عبادت وگذار کو مرنے کے بعد مردوں اور زندوں نے چاروں طرف سے بڑھ کر اپنے جھرمٹ میں لے لیا۔

☆

حضرت مولانا شیخ مبارک سندھیؒ

آپ مسیح الاولیا کے ہم وطن اور شیخ طاہر محدث کے مخلص دوست ہیں، سندھ کا موضع پات (پاٹ) جب مسیح الاولیا کے آباء کرام نے آباد کیا تھا اس آباد کاری میں شیخ مبارک کے آبائے کرام بھی متحد و شریک تھے اور شاید ترک وطن کے موقعہ پر بھی ان خاندانوں کے اخلاف کا اتحاد و عمل برروئے کار رہا۔

شیخ مبارک کی ولادت پات (پاٹ) میں ہوئی وہیں نشو ونما پائی۔ سندھ میں ہی حضرت مخدوم عباس ابن شیخ جلال سندھی کی شاگردی سے استادی کی سند حاصل کر چکے تھے جبکہ آپ وطن سے نکلے۔ کیونکہ احمد آباد گجرات میں ہم آپ کو مسجد ناصر الملک کے مدرسہ میں مسندِ معلّمی پر دیکھتے ہیں۔ قریباً یہ وہی زمانہ ہے جب شیخ طاہر محدث ایلچپور برار میں مقیم ہوکر مدرسی کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ شیخ مبارک نے چند سال احمد آباد میں بسر کئے۔ بعد میں دل برداشتہ ہوکر ایلچپور چلے آئے۔ ہم وطن مخلص دوست کا قرب تو حاصل ہوا ہی۔ ان کی تحریک سے والی برار نے مزید ایک مدرسہ جاری کر کے شیخ مبارک کو بھی مدرسی پر مامور کردیا اور آپ فراغتِ خاطر کے ساتھ فرضِ منصبی انجام دینے لگے۔

کچھ عرصہ بعد ملک برار کا ملکی نظام درہم برہم ہوگیا۔ شیخ طاہر محدث اور شیخ مبارک یکے بعد دیگرے برہانپور آگئے، کیونکہ محدث صاحب علم و فضل اور اثر انگیز درس کی شہرت سن کر محمد شاہ فاروقی بہت عرصہ سے بہ اصرار انہیں طلب کررہا تھا۔ برہان پور میں آتے ہی محدث صاحب شاہی مدرسہ میں معلّمی پر مامور کردئے گئے اور شیخ مبارک کو بادشاہ نے قصبہ چوپڑہ کا قاضی بنا کر بھیج دیا۔ شیخ قضاۃ کے عہدے پر چلے تو گئے، لیکن برہان پور کی روحانی دلچسپیاں، علمی صحبتیں اور خصوصیت سے شیخ لاڈ جیو سندھی کی نغمہ پردازی۔ سندھی لہجے میں کافی کے زمزمے آپ کو چوپڑہ میں تڑپاتے رہے۔ آخر کار وہ اپنے منصب سے مستعفی ہوکر برہانپور چلے آئے۔ بادشاہ نے آپ کے لئے بھی ایک مزید مدرسہ قائم کیا اور معلّمی قبول کرنے کی تمنا کی لیکن آپ نے قبول نہ کیا اور اپنے آزاد منشی

کے لحاظ سے پابند ہونے پر راضی نہ ہوئے۔ یہ ۸۳-۹۸۲ھ کا زمانہ تھا، جلد ہی حکیم عثمان بوبکانی کی برہانپور میں تشریف آوری ہوئی تو بادشاہ نے انہیں اسی تازہ اجراء مدرسہ میں درس پر مامور کیا۔

شیخ مبارک برہانپور آکر روحانی صحبتوں میں دلچسپیاں لیتے رہے اور حضرت شیخ لشکر محمد عارف سے بیعت ہوکر ان سے شرح قیصری کا مقدمہ اول سے آخر تک درساً تکمیل کو پہنچایا۔ اس اثناء میں وقتاً فوقتاً مسیح الاولیاء بھی شیخ مبارک سے بعض کتابوں کا درس لیتے رہے۔

۹۸۸ھ میں جمعہ کے روز دنیائے فانی کو رخصت کر کے ملکِ جاودانی کی طرف کوچ کیا۔ عادلپورہ برہان پور میں حضرت شیخ ابراہیم ابن عمر کے مزار کے نواح میں سپرد خاک ہوئے۔

اذکار ابرار میں آپ کے وصال کا ۹۷۸ھ نو سو اٹھتر لکھا ہے۔ یہ صحیح نہیں مترجم کا سہو یا کتابت کی غلطی ہے۔ بین دلیل یہ ہے کہ شیخ طاہر محدث ۹۷۴ھ تک برہانپور ہی میں نہیں آئے تھے۔ وہ پہلی مرتبہ ۹۸۱ھ میں برہان پور آئے۔ شیخ مبارک کی آمد کا بھی یہی زمانہ ہے۔ وہ ۹۸۱ھ کے آخر یا ۹۸۲ھ کے اوائل میں چوپڑہ کی قضاۃ پر مامور ہوئے اور اسی سنہ میں واپس آگئے۔ اس کے بعد بھی پانچ چھ سال تک زندہ رہے، لہٰذا ان کا سالِ وصال ۹۷۸ھ نہیں ہوسکتا۔ ۹۸۸ھ مذکورہ بالا شواہد کے اعتبار سے درست نظر آتا ہے۔ العلم عنداللہ.

☆
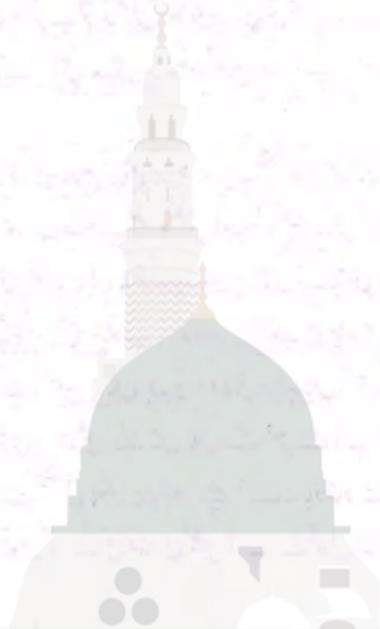
حضرت مولانا شیخ موسیٰ بوبکانیؒ

آپ حکیم عثمان بوبکانی کے ہم وطن اور ہمہ درس ہیں۔ قاضی محمود موریی قدس سرہ کے درس میں حکیم عثمان اور آپ نے علم نحو میں عربی کتابیں پڑھیں ہیں عادلپورہ برہانپور میں مدرس تھے۔

برہانپور میں دو عادلپورے ہیں جو عادل شاہ فاروقی نے بیک وقت آباد کئے تھے اور ہر جگہ ایک ایک وسیع سرائے اور ایک ایک وسیع اور شاندار مسجد تعمیر کروائی۔ مسجدوں اور سراؤں کی وسعت اور طرزِ تعمیر بالکل یکساں ہے۔ بادشاہ نے تورفاہِ عام اور وقف باللہ کی نیت سے یہ عمارات اور چند مشائخ کے لئے جو اس نواح میں مسافرانہ فروکش تھے خانقاہیں تعمیر کرادیں، لیکن ہر مقام کے مقتدر ساکنین نے اپنی آبادی کا نام عادلپورہ مقرر کرلیا جو اسی نام سے متعارف و مشہور ہوا۔ ایک عادلپور تاپتی ندی کے دوسرے کنارے پر متصل زین آباد واقع ہے۔ یہاں کی جدید جامع مسجد کی خطابت حضرت شیخ ماکھوؒ سے متعلق تھی۔ اس کو عادلپورہ زین آباد کہا جاتا ہے۔

دوسرا عادلپورہ وہ ہے جو برہان پور کے شمال میں متصل اتاولی ندی واقع ہے۔ اسی عادلپورہ میں بہت سے سندھی مشائخ بزرگوں کے مزارات ہیں اور حضرت شیخ موسیٰ بوبکانی اسی عادلپورہ میں مدرس تھے۔

شیخ کی تاریخِ وفات اور مزار کے متعلق کوئی صراحت نہیں ملی، البتہ جس عہد میں یہ عادلپورہ میں مدرس پائے جاتے ہیں وہ عادل شاہ فاروقی کا عہد ہے اور عادلپورہ مذکور کی آبادی و عرفیت کی دیگر شواہد سے ۹۵۰ھ کے قریب نشان دہی ملتی ہے۔ چنانچہ یہ بے کم و کاست صحیح ہے کہ وہ ۹۹۰ھ یا اس کے بعد عادلپورہ میں مدرسہ کی خدمت پر مامور ہوئے اگر ان کی وفات بھی چاہے جب ہوئی ہو برہان پور میں ہوئی ہے، جیسا کہ بعید از قیاس نہیں تو آپ کو مدفن کی زمین بھی عادلپورہ میں حضرت ابراہیم ابن عمر سندھیؒ کے قریب میں کہیں ملی ہوگی۔ جہاں اکثر سندھی مشائخ آسودہ خاک ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

حضرت شیخ ابراہیم قاری شطاری سندھیؒ

آپ کا آبائی وطن سندھ ہے۔ شیخ لشکر محمد عارف باللہ کے برگزیدہ خلیفہ ہیں، صاحب کیفیت بزرگ تھے، ظاہری و باطنی فضل وکمال سے آراستہ تھے، چند اقسام کے استادانہ خطوط لکھنے میں زبردست مشق بہم پہنچائی تھی، تجوید پر حیرت انگیز عبور حاصل تھا، دل گداز آواز سے قرآن مجید پڑھتے تھے تو سننے والوں کو عجیب لذّت و کیفیت حاصل ہوتی تھی۔ اہلِ طلب کو قرأت میں جبریلی لہجہ سکھاتے تھے۔ حضرت مسیح الاولیا اور آپ کے پیر شیخ لشکر علم قراءت میں آپ کے شاگرد تھے۔

احمد آباد گجرات میں غوث الاولیاء کی آمد اور فضائل و کمالات کا شہرہ سن کر حضرت شیخ لشکر نے ان کی خدمت میں بیعت ہونے کا فیصلہ کیا تو اپنے تمام مریدوں کو جمع کرکے فرمایا کہ احمد آباد میں ایسے عالی منزلت بزرگ وارد ہوئے ہیں، میں ان کی خدمت میں حاضر ہوکر فیض یاب ہونا چاہتا ہوں، تم لوگ آزاد ہو چاہے ان سے بیعت کرلو یا کہیں اور چلے جاؤ۔ مریدوں نے عرض کی کہ ہم نے آپ کے ہاتھ میں ہاتھ دیدیا ہے، آپ کو چھوڑ کر نہیں جاسکتے، آپ اپنی ذات کے لئے جو مناسب جانیں کریں، ہم لوگ ہر حال میں آپ کے خادم ہیں اور آپ ہی کو اپنا دستگیر سمجھتے رہیں گے۔ غرض کہ حضرت شیخ لشکر غوث الاولیاء کی خدمت میں حاضر ہوکر بیعت سے شرفیاب ہوئے۔ شیخ ابراہیم آپ کے ساتھ تھے۔ غوث الاولیا نے آپ کی نسبت دریافت کیا تو آپ نے شیخ کا اپنی ذات سے حسنِ اعتقاد، ان کے کمالات اور حسنِ خدمات کا ذکر کیا۔ غوث الاولیا کو قرأت سے بڑا شغف تھا، سن کر بہت خوش ہوئے اور تاکید کی کہ ہماری نمازوں میں قاری صاحب امامت کیا کریں اور جب تک مسیح الاولیا احمد آباد میں رہے، آپ ہی کی اقتداء میں نماز پڑھا کرتے تھے اور آپ کی خواہش لہجہ قرأت سے متاثر ہوکر مرغِ لاہوتی کا خطاب دیا تھا۔

خانقاہ غوثیہ میں پہنچنے پر شیخ ابراہیم نے اندازہ کیا کہ متوکل پیر اور دادا پیر حسرت سے دو چار ہیں، چاہا کہ کتابت کے ذریعہ کمائی کرکے نذر کیا کریں۔ لیکن اس خیال سے کہ اس پیشہ میں

آرام اور عزت ہے، فقر اور مسکینی کا تقاضا تو یہ ہے کہ مشقت و تحقیر گوارا کی جائے۔ چنانچہ آپ نے جنگل سے لکڑیوں کا بوجھ سر پر لانا شروع کیا اور سالہا سال تک نفس کشی کی اس ریاضت سے خانقاہ کے مصارف کی خدمت کی۔

برہانپور کے بادشاہ میران محمد شاہ فاروقی نے مولانا حافظ صدر سندھی کو بھیج کر استدعا کی کہ میرے پردہ نشینانِ حرم اصول قراۃ سے تعلیم قرآن کے خواہش مند ہیں۔ آپ چونکہ ضعیف العمر اور بہمہ صفات موصوف ہیں، یہ ذمہ داری قبول فرمائیں۔ آپ نے حافظ صاحب کو لطائف الحیل سے ٹال دیا۔ پیرانہ سالی میں آرام و اعزاز پر دل نہاد نہ ہوکر آپ نے پیر اور دادا پیر کی خدمت اور محنت شاقہ جاری رکھی۔

آپ تا زندگی نہایت سادہ اور بے تکلف، مواضع و متوکل، وضع پر قائم رہے۔ لباس میں بھی صرف ستر پوشی کی حد تک اہتمام رکھا۔ یہاں تک کہ سلسلے اور بے سلے کی بھی تخصیص نہ تھی۔ روحانیت میں آپ کا یہ پایہ تھا کہ ایک مرتبہ کسی نے کہا تھا کھانا کھاتے وقت روزی رساں رب کا نام یاد رکھنا چاہئے۔ آپ نے فرمایا ابراہیم کے نزدیک صوفی وہ ہے جو رازقِ حقیقی کے مشاہدے کے بغیر کھانے کی طرف ہاتھ نہ بڑھائے۔

آپ کے بہت مرید تھے، جن میں ممتاز خلیفہ شیخ عبدالرحیم کپرونجی ہیں، جنہیں آپ سے سلسلۂ شطاریہ میں خلافت حاصل تھی۔ آپ کی وفات ۹۹۱ھ میں ہوئی مادۂ تاریخ صاحب فیض ہے۔ شیخ ابراہیم ابن عمرؒ کے مقبرہ کے متصل عالدپورہ برہان پور مزار پرانوار زیارت گاہ و فیض بخش خلائق ہے۔

☆

حضرت سید ابراہیم بھکری قدس سرّہٗ

آپ کی زاد بوم بھکر ملک سندھ ہے۔ کتابی علوم کے اعلیٰ مدارج حضرت مولانا یونس لاکھ (لاکہ) کی خدمت میں طے کئے جو اپنے زمانہ کے جید عالم اور با فیض مدرس تھے۔ اور بقول علامہ غوثی مولانا کا درس تاثیر و بصیرت کے اعتبار سے حضرت قاضی عیسیٰ اور شیخ وجیہ الدین علوی رحمۃ اللہ علیہ کے درس کے مماثل تھا، چنانچہ آپ کے تلامذہ متعدد مشاہیر علماء وصلحا گذرے ہیں، منجملہ ان کے سید ابراہیم بکھری، شیخ نظام الدین ابن کبیر، ملا شیخ طیب سندھی، شیخ اسحٰق آسیری ممتاز مقام رکھتے تھے۔

حصولِ تعلیم کے بعد سید ابراہیم کی طبیعت میں خدا طلبی کا غلبہ پیدا ہوا اور آپ نے سیاحت اختیار کی۔ مختلف مقامات پر متعدد اہل اللہ سے فیضانِ صحبت حاصل کیا۔ لیکن بیعت کے لئے کہیں دل رجوع نہ ہوا، سیر کنان برہانپور آ پہنچے۔ یہ اولیا خیز شہر اس زمانہ میں مرکز اہل اللہ بنا ہوا تھا۔ جملہ خانوادوں کے طریقہ سے فیض رسانی خلائق کی بے لوث خدمات انجام دینے میں مصروفِ عمل تھے۔ سید صاحب نے اکثر بزرگوں کی مجلسوں میں حاضری دی اور بالآخر اپنی منزل کو پالیا۔ یعنی حضرت شیخ جلال متو قدس سرہٗ کے مرید ہوئے جو حضرت شیخ شرف الدین شہباز رحمۃ اللہ علیہ کے ممتاز خلیفہ تھے اور بادشاہ وقت میران مبارک شاہ فاروقی ان کا بڑا عقیدتمند تھا۔

غوثی لکھتے ہیں کہ سید ابراہیم بکھری کو اپنے پیر سے بڑی محبت تھی اور حسنِ اتفاق سے بادشاہ کو سید صاحب کی جانب خصوصی التفات و ارادت پیدا ہوگئی۔ ان وجوہ سے آپ نے برہانپور میں قیام کا ارادہ کرلیا اور پیر کی رہ گذر میں مکان اور خانقاہ بنواکر متاہل ہوئے۔

اطمینان و یکسوئی کے ساتھ پیر کی تعلیمات و خدمات سے فیض یاب ہونے کے ساتھ ساتھ ہمعصر بزرگوں کی مجلسوں میں نیاز مندانہ شرکت کو سعادتِ ابدی جانتے تھے۔ اس منکسرانہ خلوص اور پیر کی نظر توجہ نے آپ کو عرفان و وجدان کی اعلیٰ منزلت پر پہنچادیا تھا، چنانچہ آپ اپنے زمانہ کے بلند پایہ صاحبِ مقام شیخ تسلیم کئے جاتے تھے۔ جس طرح آپ ابتداءً معاصر بزرگوں کی خدمت میں خلوص و نیاز مندی سے حاضر ہوتے تھے۔ اُسی طرح جب خدا نے آپ کو بزرگی عطا فرمائی تو دیگر اہلِ فضیلت بھی آپ کے ہاں اُسی اخلاص و احترام سے آیا کرتے تھے۔ خصوصاً مسیح الاولیا قدس سرہٗ۔

علامہ غوثی کی روایت ہے: مسیح الاولیاء نے فرمایا ایک دن میں سید صاحب کی ملازمت میں بیٹھا تھا۔ اُنہوں نے فرمایا کہ میں نے شیخ لشکر عارف باللہ سے یہ ترانہ سُنا ہے جب کہ وہ عالمِ محویت میں گانے لگتے تھے۔

اطاعک العاصی فی عصیانک
وذکرک الناسی فی نسیانک

اگرچہ اس کو سُنے ہوئے عرصہ گذر چکا ہے، لیکن میرے دل میں ابھی تک وہ کیفیت و ذوق فوارہ کی طرح موجزن ہے۔

اور ایک مرتبہ مسیح الاولیاء سید صاحب سے ملنے کو جانے لگے تو ان کے پیر کے فرزند شیخ بایزیدؒ بھی ساتھ ہولئے۔ ابھی راہ میں ہی تھے کہ شیخ بایزید کے گھر سے کوئی شخص دوڑا ہوا آیا اور کوئی فکر مندانہ خبر سُنا کر انہیں بہت جلد گھر پہنچنے کی ترغیب دی، انہوں نے جواب دیا کہ ایسے بزرگ کی ملاقات کے ارادہ سے روانہ ہو چکا ہوں تو چاہے جو ہو ملاقات کرکے ہی گھر جاؤں گا۔ اور مسیح الاولیا کے ساتھ جا کر سید صاحب سے شرفِ نیاز حاصل کیا۔

اس روایت کے دونوں پہلو اہلِ نظر کے لئے اثر انگیز درسِ بصیرت ہیں۔ یہ کہ شیخ بایزید رحمۃ اللہ علیہ باوجود نوعمری و زمانۂ طالب علمی کے اتنے سعید اور ایسے راسخ العزم تھے کہ گھر سے اندوہناک اطلاع ملنے پر بھی اپنے ارادہ پر قائم رہے اور یہ بھی کہ سید ابراہیم بھکری قدس سرہٗ کس قدر باعظمت بزرگ تھے، اور ان کی ذات میں کس درجہ کشش تھی کہ ان کی طرف جانے والے کو مانع بھی روک نہ سکتے تھے۔

سید صاحب نے برہان پور میں کئی برس طالبانِ حق کو فیض پہنچایا۔ آپ کے بے شمار مرید اور متعدد خلفا تھے۔ خدا نے اولادِ نرینہ کی دولت سے بھی مالا مال فرمایا تھا۔ تین سعادت مند فرزند تھے۔ علامہ غوثی نے انہیں دیکھا تھا وہ لکھتے ہیں کہ ہر سہ برادران اپنے اسلام کی روش سے متصف ہیں۔ لیکن سید ابراہیم نے اپنے معاصر اربابِ فضل مشائخ کے طریقہ کے مطابق ایسے لائق اور ہونہار فرزندوں کی موجودگی کے باوجود اپنی جانشینی کے لئے شیخ نظام کو نامزد فرمایا جو اصطلاحاتِ تصوف اور علوم متعداولہ میں ممتاز درجہ رکھتے تھے اور کتابت کا پیشہ اختیار کیا ہوا تھا۔ پیر کی جانشینی کے بعد کتابت کی تمام آمدنی ان کے عرس میں صرف کیا کرتے تھے۔ شیخ نظام کے علاوہ شاہ امان اللہ امانی برہانپوری اور مولانا عبدالرزاق بانسوی بھی آپ کے ممتاز ترین خلفا تھے، سید ابراہیم بھکری کا وصال ۹۹۸ھ میں واقع ہوا اپنی خانقاہ میں دفن کئے گئے۔ مادۂ تاریخ ذوالکرام ہے۔ مبارک شاہ کے دوسرے فرزند میران راجے علی خان عادل شاہ فاروقی نے مزار پر شاندار گنبد تعمیر کرادیا جو متصل اتاولی ندی دولت میدان کے راستہ میں زیارت گاہ خلائق ہے۔

حضرت شیخ لاڈ جیو سندھی رحمۃ اللہ علیہ

آپ آغاز شباب میں اپنے وطن مالوف سندھ سے ہجرت کرکے برہانپور میں متوطن ہو چکے تھے۔ خدا نے حُسن صورت اور حسنِ سیرت کے ساتھ خوش گلوئی کی نعمت سے مالا مال فرمایا تھا۔ متاہل زندگی گذارتے تھے۔ نغمہ سنجی آپ کا فطری جوہر تھا۔ سندھی موسیقی میں کامل مہارت حاصل تھی۔ خصوصاً کافی جو سندھ کا مقبول عام راگ ہے اس درد وسوز کے ساتھ گاتے تھے کہ سامعین جھوم اُٹھتے اور خود بھی مست ہوجاتے تھے۔ کافی کی اثر انگیزی کا یہ عالم تھا کہ مولانا شیخ مبارک سندھی جو اپنے علم و فضل اور تقوے کے اعتبار سے والی برار کی استدعا پر ایلچپور کی مسندِ قضاۃ کو زینت بخش چکے تھے، شیخ لاڈ جیو کی نغمہ پردازی اور بعض مخلص احباب کے جذبہ محبت کی کشش کے باعث عزت وعظمت کے اس بلند منصب کو ترک کرکے برہانپور چلے آئے تھے۔

مجاز سے حقیقت کی طرف گام زن ہونا آپ کا مسلک تھا۔ عارف پاک نظر اور پاکباز تھے۔ حسنِ ظاہر کو بھی ہمیشہ رغبت کی نگاہ سے دیکھا۔ محلّہ سندھی پورہ میں حضرت مسیح الاولیاء کی ہمسایگی کا شرف حاصل تھا۔ قناعت وتوکل کو دوست رکھتے تھے۔ علامہ غوثی لکھتے ہیں کہ:

> آپ کا حجرہ حضرت مسیح الاولیاءؒ کی جامع مسجد کی شمالی دیوار سے ملا ہوا تھا۔ میرا گذر اس طرف وقتاً فوقتاً ہوتا تھا۔ میں نے آپ کے مکان میں اسباب خانہ داری کی کوئی چیز مطلقاً نہیں پائی۔

کم وبیش ستر سال کی عمر پائی۔ ایک ہزار سات ہجری میں وفات پائی اور حضرت شیخ ابراہیم ابن عمر سندھی کے مقبرہ کی ہمسایگی میں دفن ہوئے۔

☆

حکیم عثمان بوبکانی قدس سرہٗ

آپ شیخ عیسیٰ ابن شیخ ابراہیم صدیقی سندھی کے فرزند ہیں۔ آپ کی ولادت بقول ملا غوثیؒ مضافات سندھ کے ایک مقام بوبکان میں ہوئی تھی، آپ کو حصولِ علم اور خدا طلبی کا ذوق اوائلِ شباب میں کشاں کشاں مرکز علوم احمد آباد گجرات میں لے آیا جو ان دنوں مختلف علوم و فنون کے علما وفضلا کا مستقر بنا ہوا تھا۔

جب آپ طلب علوم کے ذوق میں عازم سفر ہوئے۔ متداول درسیات کے فارغ التحصیل اورعربی و فارسی ادب سے بہرہ ور ہو چکے تھے۔ احمد آباد میں سر آمد علما وصوفیا حضرت مولانا وجیہ الدین علوی رحمۃ اللہ علیہ کے درس میں علوم تصوف کا درس لیتے رہے اور وقت پاتے ہی شریعت مآب صوفی صافی ضمیر محمود مورپی کی خدمت میں تفسیر و حدیث و فقہ کی تعلیم میں حصہ گیر ہوئے۔ ان فاضل اساتذہ کی تربیت وتوجہ سے علومِ دینیہ میں تکمیل کی سندات حاصل کیں۔ منطق و معانی وفضیلت کا امتیاز پایا اور با ایںہمہ فضائل و تبحر، فاضل اجل حضرت شیخ حسین بغدادیؒ سے شرف تلمذ حاصل کر کے ریاضی اور حکمت کی تکمیل کی۔

حصولِ علم میں یہ کامرانیاں حکیم کے ذوق طلب کے علاوہ سندھ کے ایک باخدا بزرگ مخدوم نوح ہالہ کندی کی دعا کا فیض و اثر بھی ہیں۔ اس روایت کے راوی بقول صاحب گلزار ابرار خود حکیم عثمانؒ ہیں وہ لکھتے ہیں:

> حکیم عثمان بوبکانی سے روایت ہے کہ میں ایک روز مخدوم کی خدمت میں گیا اور چاہا کہ علمی کمالات حاصل ہونے کے واسطے دعا کے لئے التماس کروں۔ ہنوز ضمیر کی مخفی بات عبارت میں نہ آئی تھی کہ آپ نے فرمایا: **واتقوا اللہ یعلمکم** اس وقت سے میرا اتقا وعلم روز افزوں ہے۔ (اذکار ابرار ص۳۹۴)

جملہ علوم میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد آپ نے تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کیا۔ آپ کے علمی فضائل و کمالات کا شہرہ نزدیک و دور پھیل گیا اور جب ۹۸۳ھ میں برہان پور تشریف لائے تو بادشاہِ وقت محمد شاہ ابنِ مبارک شاہ فاروقی نے عزت و احترام کے ساتھ رکھا اور درس و فتویٰ نویسی کے اعلیٰ منصب پر آپ کو مامور فرمایا۔ نیز آپ کے شایانِ شان

نقد نذرانے کے علاوہ زرخیز اراضی کا ایک موضع جو برہانپور سے چند میل کے فاصلے پر ہے آپ کے نامزد کردیا۔

اس وقت سے بقیہ عمر تک کامل ستائش سال آپ نے درس وفتوے نویسی، تصنیف و تالیف کے ذریعے فیض رسانی کے دریا بہائے۔ ان فیوضیات سے سیراب ہونے والوں کی فہرست خاصی طویل ہے اور اس فہرست میں زبردست علماء عالی پایہ محدثین ومفسرین، یگانۂ آفاق مشائخ و اہلِ تصانیف کی اکثریت ہے۔

جب برہانپور میں آپ کا درس شروع ہوا ہے، اُس وقت مسیح الاولیاء شیخ عیسیٰ جنداللہ قدس سرہٗ برہانپور میں موجود نہ تھے وہ اپنے فاضل اجل چچا شیخ طاہر محدثؒ کے درس سے فارغ التحصیل ہوکر مزید حصول علم وکمال کی تلاش میں روانہ ہوچکے تھے اور مختلف علماء ومشائخ سے فیض یاب ہوتے ہوئے بمقام آگرہ حضرت شیخ جلال الدین ملتانیؒ کے خانقاہ میں مقیم تھے کہ آپ کو عم اکرم کا خط پہنچا۔ فرحیؔ نے مسیح الاولیاءؒ کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھا ہے:

> چوں ملا عثمان حکیم سندھی الصدیقی در شہر معمورہ برہانپور تشریف آور دند حضرت عموی بزرگوار بفقیر مکتوبے فرستادند کہ انجا ملائے متبحر چنانکہ شما میخواستید تشریف آوردہ اند باید کہ بدیدنِ این مکتوب مراجعت نمایند۔ پس بہ برہانپور آمدہ بخدمت حضرت والدہ وحضرت عمی استادی مشرف شدم و در درسِ ملا عثمان حکیم قرآۃ وسماع علوم عقلیہ ونقلیہ مینمودم (کشف ص۵)

مسیح الاولیاء کے تبحر میں کس کو کلام ہوسکتا ہے۔ شیخ طاہر محدث جیسے بافیض معلم کے درس کے فارغ التحصیل تھے۔ پھر مکتوب کے یہ الفاظ کہ ''جیسا تم چاہتے، ویسا معلم'' حکیم کے علمی پایہ کو واضح کرنے کے لئے کافی ہیں۔

گلزار ابرار کا مصنف مُلا غوثی کبھی کبھی برہانپور آنے والے بڑے فخر کے ساتھ لکھا ہے کہ:

> ''راقم گلزار ہیئت اور حکمت کی چند کتابیں آپ سے پڑھنے کا شرف رکھتا ہے۔''

قاضی عبدالسلام سندھی عادل شاہ فاروقی ۹۸۴ھ تا ۱۰۰۵ھ کے عہد میں برہانپور کی مسند قضاۃ پر متمکن تھے اور بجائے خود اس علمی منزلت سے فائز تھے کہ اُنہوں نے مختصر وقایہ پر مبسوط شرح لکھی ہے۔ حکیم عثمان کے شاگرد تھے۔

شیخ صالح سندھی جو شائستہ اطوار اور جوہرِ علم وعمل سے آراستہ تھے، آپ کے سعید و رشید شاگرد تھے۔ اور آپ نے انہیں فرزندی مین لے کر دامادی کا شرف بھی بخشا ہوا تھا۔

قاضی نصیر الدین ابن سراج محمد بنبانی برہانپور کے ممتاز عالم اور سر برآوردہ فرد تھے، حکیم عثمان کی شاگردی پر اظہارِ فخر ومباہات کیا کرتے تھے۔

شیخ سُکھ جی حضرت شیخ یوسف بنگالی کے داماد بھی حکیم کے شاگرد تھے جو اپنے خسر کی درس فارغ التحصیل ہوکر داخل درس ہوئے تھے۔ حضرت شیخ یوسف بنگالی کا مدرسہ برہانپور میں اعلیٰ علوم کی تعلیم میں ممتاز ومعروف تھا۔

یہ چند نام آپ کے ممتاز شاگردوں کے ہیں ۲۷ برس میں خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس سرچشمۂ علوم وفنون سے کتنی فرض رساں نہریں جاری ہوئیں اور کہاں اہلِ ذوق کی آبیاری کرتی رہیں۔ ملا غوثی حسن نے آپ کی تصنیفات کے متعلق صرف اس قدر لکھا ہے:

> ''آپ کی تصنیفات بہت سی ہیں منجملہ ان کے تفسیر قاضی بیضاوی کا حاشیہ اور بخاری کی شرح یہ دو کتابیں نہایت مشکل نما اور دشوار کشا ہیں۔''

(اذکار الابرار ص ۴۴۶)

آپ نے برہان پور میں تین فاروقی بادشاہوں کا زمانہ دیکھا اور ہر بادشاہ نے آپ کے منزلت ایک دوسرے سے زیادہ ہی کی۔ محمد شاہ فاروقی آپ کے تقرر سے ایک سال بعد فوت ہوگیا۔ اس کے بعد راجے علی خان عادل شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اس نے بھی منصب و وظیفہ کو اضافہ کے ساتھ برقرار رکھا۔ اس کے انتقال کے بعد ۱۰۰۵ھ میں بہادر خان بادشاہ ہوا۔ اس نے بھی اگرچہ ناگفتہ بہ حالات میں تخت نشین ہوا، آپ کے اکرام میں کوتاہی نہ کی۔

۱۰۰۸ھ میں آپ اپنی جاگیری موضع پر تشریف لے گئے تھے کہ اکبر نے تسخیر خاندیس کے عزم سے خود اقدام کیا۔ برہانپور اور قلعۂ آسیر کے اطراف افواج قاہرہ پھیلادیں۔ آپ اس تازہ شورش کی وجہ سے برہانپور واپس نہ آسکے اور اپنے موضع پر ہی مقیم رہے۔ چونکہ ملکی نظام معطل تھا، اس نواح کے رہزنی پیشہ کولیوں نے مسلح ہوکر اس موضع پر تاخت کی اور مال ومتاع لوٹ کر آپ کو بھی معہ سترہ رفقاء کے بیدردی سے شہید کرڈالا۔

غوثی لکھتے ہیں:

> ''خون بھری ہوئی جانمازیں ان کا کفن ہوئیں۔''

ادھر اکبری سطوت نے بہادر خان کو اس قدر بے بس کردیا کہ اس نے خود آبائی فاروقی سلطنت اکبر کے حوالہ کرکے خانہ بر انداز دشمن کی پناہ میں جانا منظور کرلیا اور بادشاہ سے مغل حکومت کا منصب دار بن گیا۔ نہ جاگیر دینے والا رہا نہ جاگیردار اور نہ جاگیر۔ رہے نام اللہ کا۔

آخر میں آپ کی تقویٰ شعاری و عبادت گذاری کی چند شہادتیں پیش کرتا ہوں کہ بغیر ان کے یہ ذکر تشنہ رہ جائے گا۔ ملا غوثی لکھتے ہیں: شیخ لشکر عارف فرمایا کرتے تھے کہ حکیم کے مثل سکون و آرام کے ساتھ عبادت گذار مجھ کو بس حکیم ہی نظر آئے۔ حضرت شیخ طاہر محمد ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ جیسی شکستگی خاطر، عاجزی اور گمنامی، نامی حکیم کی ہے میں نے عالموں میں کسی میں نہیں دیکھی۔ چالیس سال کے اندر کسی گھر کا لقمہ نہیں کھایا۔ کمال پرہیزگاری کے ساتھ زندگی بسر کی۔

حضرت شیخ اسحاق قلندر سندھیؒ

آپ مسیح الاولیا کے ہم وطن ہیں، سندھ سے آپ کی ہجرت کا زمانہ اور وجہ وہی ہے جو حضرت شیخ طاہر محدث کے ذکر میں مذکور ہوئی۔ محدث صاحب تو گجرات ہوتے ہوئے ایلچپور برار میں جا ٹھہرے اور وہاں سے برہان پور آ کر متوطن ہوگئے۔ لیکن قلندر صاحب چونکہ آزاد مشرب تھے، کہیں دل نہاد نہ ہوئے اور بلاتعین منزل جادہ پیمائی کرتے رہے اور کم و بیش دس برس تک سیاحی کر کے ۹۵۸ھ میں برار میں پہنچ کر شیخ طاہر محدث کی مصاحبت اختیار کی اور کسی عالم میں پھر ان سے جدائی پسند نہ کی۔ وہ برہان پور تشریف لائے تو آپ بھی ہمراہ تھے۔ صاحب گلزار آپ کی سیاحت اور مراجعت کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''جہاں پیمائی کرتے کرتے آپ کے پاؤں گھس گئے تھے۔ ہر ایک ویران اور آباد گوشے میں پہنچ کر ایک ملک کی خصوصیات سے آگاہ ہوئے۔ لیکن ہجری سنہ نو سو اٹھاون کے آغاز میں سیاحت ترک کر کے قدوۃ المحققین شیخ طاہر یوسف سندھی کی مصاحبت اختیار کر لی تھی۔ ہجری سنہ ایک ہزار تین اِن روحانی مصاحب (شیخ طاہر یوسف) کا سالِ رحلت ہے اس سال تک آپ نے شیخ کی ملازمت سے کبھی جدائی پسند نہ کی۔'' (ترجمہ گلزار ابرار ص ۴۲۵)

شیخ طاہرؒ محدث کا سال وصال ۱۰۰۴ھ ہے ترجمہ میں ۱۰۰۳ھ چھپا ہے۔ یہ مترجم یا کاتب کا سہو نظر ہے۔ قلندر صاحب اور محدث صاحب کی یکجائی اور بافیض صحبت سے صاحبِ گلزار ۱۰۰۲ھ میں بمقام برہان پور مستفید ہوا ہے جو اسی ضمن میں بہ صراحت لکھ دیا ہے۔ شیخ اسحاق قلندر کی رحلت ۱۰۱۰ھ میں ہوئی اور وہ حضرت محدث صاحب کے مزار کے قریب دفن کئے گئے اور پچاس سال کے طولانی عرصہ تک ہمدم و ہمراز یکجا زندگی بسر کرنے والے محبّ وحبیب قیامت تک کے لئے ایک دوسرے کے متصل آسودۂ خاک ہوگئے۔

☆

مولانا شیخ صالح سندھیؒ

آپ شیخ عثمان بوبکانی قدس سرہٗ کے شاگرد رشید اور داماد ہیں۔ علم وفضل اور تقویٰ وعمل میں بے نظیر تھے۔ اخلاق و اطوار کی شایستگی سے متاثر ہوکر فاضلِ اجل استاد نے اس ہونہار شاگرد کو فرزندی میں لے کر افتخار بخشا۔ شرفِ دامادی کے بعد بھی آپ تعلیم کی طرف متوجہ رہے اور جملہ علومِ عقلی ونقلی عقائد وتصوف وغیرہ میں دستگاہ کامل حاصل کی۔

استاد کی رحلت یا شہادت ۱۰۰۸ھ کے بعد آپ حضرت مسیح الاولیاء کی درویشانہ مجلسوں میں بڑی دلچسپی سے شریک ہوا کرتے تھے۔ علامہ غوثی نے ایک مجلس کا ذکر اس طرح درجِ گلزار کیا ہے۔

> مسیح الاولیاء سے روایت ہے۔ شعبان کا مہینہ ۱۰۱۳ھ تھا کہ خدیو نشاتین خداوند دولت دارین خانخانان سپہ سالار اکبر بادشاہ۔ دانش در سنجیدہ اطوار پسندیدہ اخلاق شیخ ابوالخیر مبارک۔ رکن فضیلت وعرفان مولانا صالح سندھی اور صدر آرائے شریعت وعدالت قاضی عبدالعزیز عیسیٰ قادری اجبنی۔ یہ چاروں اصحاب اس درویش کے مکان میں راز کی باتیں کررہے تھے۔ (ترجمہ گلزار ابرار ص۳۶۳)

اس سے آپ کی باعظمت شخصیت اور عارفانہ ذوق کا پتہ چلتا ہے کہ آپ کیسی مجلسوں میں بیٹھتے تھے اور ان بافیض مجالس کے عالی منزلت ارکان بھی آپ کو کس وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے کہ حضرت مسیح الاولیا جیسے برگزیدہ عالم و عارف نے ''رکن فضیلت وعرفان'' کے الفاظ کے ساتھ آپ کو مخاطب فرمایا۔

اس سے زیادہ آپ کے حالات معلوم نہ ہوئے۔ واللہ اعلم کب اور کہاں آپ کا وصال ہوا۔

☆

حضرت شیخ بابو سندھی رحمۃ اللہ علیہ

آپ حضرت شیخ لشکر محمد عارف قدس سرہٗ کے مرید اور حضرت مسیح الاولیاء کے پیر بھائی تھے۔ صاحب علم و عمل اور زہد و تقویٰ میں بلند درجہ رکھتے تھے۔ محلّہ سندھی پورہ میں حضرت مسیح الاولیا کی خانقاہ سے تھوڑی دور پر شمالی مغربی سمت کچی اور پست دیواروں کے ایک حجرہ میں آپ کی سکونت تھی۔ وہی حجرہ آپ کی خانقاہ یا عبادت و جہاد نفس کی جولا نگاہ تھا۔ آپ کی طبیعت میں بے انتہا سادگی اور قناعت تھی۔ نہایت مختصر سامان بلکہ بے سر و سامانی کے ساتھ عمر بسر کردی۔ یا یوں سمجھئے کہ آپ کی ہستی ہی اس حجرہ کی متاع گرانبہا تھی جب آپ نہ ہوتے تو وہاں کچھ بھی نہ ہوتا۔

محبت الٰہی میں فنا و بقا کی منزلیں تیز رفتاری کے ساتھ طے کرکے منزلِ مقصود سے فائز المرام ہوچکے تھے۔ عالم تحیرّ آپ پر اکثر و بیشتر طاری رہتا ایسے عالم میں اسباب راحت اور مکان کی نگہداشت کا ہوش کہاں۔ برہانپور کی شدید بارش سے حجرہ کی کچی دیواریں رفتہ رفتہ دونوں طرف سے گر گئیں۔ یہ ۱۰۰۳ھ کا واقعہ ہے۔ صاحب گلزارِ ابرار علامہ غوثی حسن ان دنوں برہانپوری ہی میں تھے اور آپ سے ملتے بھی رہتے تھے خیال ہوا کہ وہ ملیں تو ان سے مشورہ کرکے حجرہ کی دیواروں کی مرمت کا انتظام کیا جائے، لیکن قبل اس کے کہ علامہ غوثی سے ملاقات ہو، آپ نے سوچا کہ درویشانہ طور پر استخارہ تو کر دیکھیں۔ حضرت عطارؒ کی مثنوی منطق الطیر ہاتھ میں تھی، بطور تفاول کتاب کھولی تو یہ اشعار برآمد ہوئے۔

گلخن است این جملۂ دنیاے دوں	قصرِ تو چند است وایں گلخن کنون
قصرِ توگر خلد جنت آمدہ است	با اجل زندانِ محنت آمدہ است
گر نہ بودے مرگ را بر خلق دست	لائق افتادے درین منزل نشست

ان اشعار کے مضمون کو آپ نے غیبی ہدایت و تاکید خیال کرکے مرمت کا ارادہ ترک کردیا۔ اہلِ تعلق نیاز مندوں نے ہر چند اصرار و التماس کی آوازیں بلند کیں لیکن آپ نے قبول نہ فرمایا اور اس کے بعد بارہ برس تک اسی کھنڈر نما حجرہ میں باطمینان تمام عبادت و ریاضت میں

زندگی گزاری اور بعد وصال اسی حجرہ میں دفن ہوئے۔ علامہ غوثی نے آپ کا سال وصال ۱۰۱۵ھ لکھا ہے اور اس مناسب حال شعر پر آپ کا تذکرہ ختم کیا ہے۔

در این خانہ بے لوح است غوثی از خرد نبود
۲ ۸ ۹
پے و پاس متاعش رخنۂ دیوار بر بستن

کچھ عرصہ بعد آپ کے مزار کے ارد گرد کئی بزرگ اور مشاہیر صلحا دفن ہوئے۔ چنانچہ ایک بلند پختہ چبوترے پر بیسیوں مزار ترتیب سے بنے ہوئے موجود ہیں، انہیں میں سندھی پورہ کے ایک مقبول عام قاری حافظ گھانسی میاں اور ان کے چند مریدوں اور متعلقین کے مزار بھی ہیں۔ اب یہ محلّہ خاکی شاہ کا تکیہ کہلاتا ہے۔ کسی نے کتنا عبرت انگیز شعر کہا ہے:

مٹے نامیوں کے نشان کیسے کیسے
زمین کھا گئی آسمان کیسے کیسے

ملا محبؒ علی سمرقندی السندی البرہانپوری

ایک فرد واحد کی تین ایسی وطنی نسبتیں جن ممالک میں باہم وبعد المشرقین ہے۔ محلِ نظر اور قصہ طلب چیز ہے اور باعث حیرت بھی۔ اس کے متعلق مجملاً یوں عرض کیا جاسکتا ہے کہ ملا صاحب کے آباء واجداد کا وطن سمرقند تھا۔ اس نسبت سے سمرقندی اور آپ سندھ میں پیدا ہوئے اس لئے سندھی۔ سنِ شعور اور عمر گرامی کا بہت بڑا حصہ برہانپور میں بسر ہوا اور وہیں انتقال فرما کر برہان پور کی خاک میں ابدی آرامگاہ اختیار کی، اس لیے برہانپوری ان اجمال کی تفصیل مستند حوالہ جات کے ساتھ آئندہ سطور میں ملاحظہ سے گذریں گی اور دراصل ان اجمال کی تفصیلات ہی عبارت ہے ملا محبؒ علیؒ کی سوانح حیات سے۔

ملا صاحب تاریخ کے روشن عہد کے مجمع فضائل بزرگ ہیں۔ ممکن ہے کسی صاحب ذوق اہلِ قلم نے آپ کے حالاتِ زندگی پر کوئی مبسوط کتاب لکھی ہو، جس کے مطالعہ کا شرف میں حاصل نہ کرسکا۔ البتہ ان کی زندگی میں تالیف ہونے والی تین وقیع تاریخی کتابوں میں آپ کے بہت کچھ حالات ملتے ہیں جو یہ ہیں: ماثر رحیمی ۱۰۲۵ھ۔ بادشانامہ ۱۰۴۷ھ۔ عمل صالح ۱۰۶۵ھ اور میں زیادہ تر انہیں کتابوں کے مطالعہ کا حاصل ہدیہ ناظرین کروں گا۔

نیز ایک اور چیز میرے بزرگانِ سلف کی یادگار قلمی بیاض سے کچھ یادداشتیں ایسی پیش کروں جو ان ضخیم کتب میں موجود نہیں ہے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

ملا محبِ علی کی آبا واجداد کے سمرقندی ہونے پر سب تذکرہ نگار متفق ہیں۔ البتہ ان کے والد کا نام بادشاہ نامہ میں محمد صدر الدین لکھا ہے۔ اور مآثر رحیمی میں حیدر علی۔ یہ اختلاف ایسا نہیں کہ نظر انداز کردیا جائے۔ ایسی صورت میں ہر دو راویوں کے ماخذ کی تلاش ضروری ہے اور ظاہر ہے کہ بادشاہ نامہ کا مصنف ملا عبدالحمید ملا محبؒ علی سے اس قدر قریب نہیں پایا جاتا، جتنا کہ صاحب مآثر رحیمی! مؤخر الذکر نے اپنی تالیف ایسے زمانہ میں مرتب کی ہے جب کہ وہ ملا محبؒ علی کے ساتھ ہم پیالہ وہم نوالہ ہونے کی قربت رکھتا تھا۔ اس نے یہ کتاب از اول تا آخر ملا محبؒ علی کی موجودگی میں لکھی ہے۔ اس سے اپنے محترم رفیق کی ولدیت میں مغالطہ کی توقع نہیں کی

جاسکتی۔ چنانچہ اس کا بیان بمقابلہ بادشاہ نامہ کے زیادہ ذمہ دارانہ اور صحیح ماننا پڑے گا اور یہ کہ محبِ علی کے باپ کا نام حیدر علی تھا۔

مُلا محبّ علی کی ولادت ۹۸۲ھ میں واقع ہوئی مادہ تاریخ ولادت فضل[1] یزداں ہے۔ کمسنی میں والد کے سایۂ عاطفت سے محروم ہوگئے۔ سندھ اس زمانہ میں علوم وفنون کا گہوارہ تھا اور نانہال کے لوگ صاحبانِ علم و فضل تھے۔ باوجود یتیمی کے ملا صاحب کی تعلیم و تربیت کا معقول انتظام ہوسکا اور وہ سن شعور کو پہنچنے تک مرجع فضل و کمال و منبع علوم وفنون ہوچکے تھے۔ عربی فارسی ادب پر کافی عبور حاصل کرچکے تھے۔ با انیہمہ علم و فضل طبیعت کو تصوف سے فطری لگاؤ تھا۔ شاعری کا ذوق بھی طالب علمی کے زمانہ سے تھا۔ فارغ التحصیل ہونے تک کلام میں پختگی آچکی تھی، صوفیانہ مذاق کے پیش نظر عارفانہ کلام لکھتے تھے۔

آپ کی عمر ۱۷ - ۱۸ سال کی ہوگی کہ سندھ کی ترخانی سلطنت معرضِ زوال میں آ گئی۔ عبدالرحیم خان خانان نے دارالسلطنت ٹھٹہ کو مسخر کرلیا۔ والی سندھ مرزا جانی اکبر کی تمام فاتحانہ شرائط مان لینے پر مجبور ہوگیا اور ایک منصب دار کی حیثیت سے خود مختار فرمانروا کے بجائے زمرۂ اُمرا میں منسلک ہوگیا۔ خانخانان نے ٹھٹھہ میں جشن[2] فتح منعقد کیا۔ شعرا نے تہنیت نامے پیش کئے۔ خانخاناں کے ساتھ منجملہ دیگر شعرا کے شکیبی بھی تھا۔ شکیبی نے مُلا محبّ علی کے فضل و کمال کا شہرہ سن کر اُن سے ملاقات کی اور ایک دو صحبتوں میں اس قدر متاثر ہوا کہ انہیں بہ اصرار خان خانان کے پاس لے گیا اور نہایت اثر انگیز الفاظ میں ان کا تعارف کرایا۔ ملا عبدالباقی نہاوندی نے شکیبی کے ذکر میں اس تقریب کے موقعہ پر یہ الفاظ لکھے ہیں:

> ایشان را دریافتہ و اطلاع بر فضل و کمال و سلامت نفس و فقر و مسکنت ایں بہ سن خوردو بمعنی بزرگ پیدا کرد۔ (ماثرِ رحیمی جلد سوم ص ۴۹۰)

یہ واقعہ ۹۹۹ھ کے اخیر و ۱۰۰۰ھ کے آغاز کا ہے جب کہ سندھ پر حملہ ہوکر تسخیر ہوا۔ خانخاناں اس تازہ فتح عظیم سے بے انتہا مسرور تھا اور ویسے بھی فطرتاً اہل کمال کا بڑا قدر شناس تھا۔ مُلا صاحب کو زمرۂ مصاحبین میں شامل کرلیا اور بہ عزت و اکرام سفر و حضر میں ساتھ رکھنے

---

[1] مادہ تاریخ ولادت فضل یزداں ملا محب علی کی تاریخ وفات کے ضمن میں منظوم ہے۔ یہ قطعہ بہ سلسلہ مضمون اپنے مقام پر درج ہوگا۔ ایک شعر میں تاریخ ولادت بھی ہے اور تاریخ وفات بھی جو مذکورہ متن قلمی بیاض میں درج ہے۔

[2] اس جشن میں شکیبی نے جو قصیدہ پڑھا، اُس میں یہ شعر بھی تھا۔ ہمائے کہ بر چرخ کردے خرام۔ گرفتی و آزاد کردی زدام۔ خانخان نے قصیدہ سن کر شاعر کو ایک ہزار روپیہ صلہ عطا کیا۔ مفتوح شاہ سندھ مرز اجانی نے بھی ایک ہزار روپیہ عنایت کیا۔ اس پر خانخانان نے پوچھا تم کس چیز کا انعام دے رہے ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ شاعر نے مجھے ہما سے مثال دی ہے اگر یہ شغالے لکھدیتا تو میں اس کا کیا کرسکتا تھا۔ اس سے شاہ سندھ کی سخن فہمی کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

لگا۔ ملا صاحب کی درویشانہ آزاد و فطرت کسی پابندی کو گوارا نہیں کرسکتی تھی۔ مگر خانخانان کی مصاحبت کے لئے غیب سے اسباب پیدا ہوگئے۔ خانخانان کو جلد ہی تسخیر دکن و خاندیس کی مہم پر مامور کیا گیا۔ خاندیس کا دار السلطنت برہان پور ان دنوں بابِ دکن اور وہاں کا قلعہ آسیر کلیدِ دکن مانا جاتا تھا اور یہ دونوں چیزیں راجے علی خان عادل شاہ فاروقی کے تسلط میں تھیں۔ خانخانان نے حسنِ تدبیر سے عادل شاہ فاروقی بادشاہ کو دوست بنا کر اپنا مستقر بھی برہانپور کو مقرر کیا۔ یہ اولیا خیز شہر مشاہیر مشائخ، علما و صوفیا کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ملا محبّ علی جلد ہی اپنے صوفیانہ ذوق کے باعث ان بزرگوں کی صحبتوں میں دلچسپی لینے لگے اور کچھ ایسے بہل گئے کہ برہانپور ہی کے ہو رہے۔ ادھر خانخانان کے قیام کو طول ہوا فاروقی سلطنت کے درہم و برہم ہونے کے بعد وہ کم و بیش بیس سال تک برہانپور میں رہے۔ ان کا انتہائی عروج بھی برہانپور ہی نے دیکھا اور جب بُرے دن آئے تو انتہائی زوال بھی یہیں رونما ہوا جس کی تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں ہے۔ عروج و اقبال کا زمانہ طولانی ہے اس لئے خانخانان کی فیاضی، مجیر العقول، دریا دلی، حسنِ تدبیر، شجاعت، کارخیر، پاکبازی، سیر چشمی کے بے حد و شمار کارنامے برہانپور ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ نیز ان کی زندہ جاوید یادگاریں اب بھی برہانپور میں اس کثرت سے موجود و مشہور ہیں، جیسی اور کسی شہر میں نہ اب ہیں نہ کبھی تھیں۔

اول تو یہ یکجائی ایک طولانی عرصہ تک مُلا محبّ علی جیسے درویش منش آزاد فطرت صوفی منش کی وابستگی کا باعث رہی۔ دوسرے خانخانان خود اس طبیعت کا امیر تھا کہ اس نے مصاحبین پر حاضر باشی کی قید اپنی طرف سے کبھی عائد نہیں کی۔ ہر شخص آزاد تھا، خواہ خانہ نشین رہے یا بادشاہ و شہزادوں سے تعلق رکھے۔ ان وجوہات پر خانخانان نے کسی سے انقطاعِ تعلق نہیں کیا۔ جس کو جو وظیفہ، صلہ یا جاگیر مقرر کردی وہ بہرحال اس کا حصہ رہی۔ یہی وجہ ہے کہ مصاحبین کی فہرست میں ایسے امیر، شاعر، علماء، سپاہی نظر آتے ہیں جو اکبری و جہانگیری بھی کہے جاتے ہیں، جیسے عرفی، نظیری، حیاتی، دولت خان، خانجہاں لودی وغیرہ۔

ملا محبّ علی خان خانان کی مصاحبت کے ساتھ ساتھ برہانپور کے محدث و مشائخ کی درسگاہوں اور مجالس سماع میں بھی نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ایک روز مسیح القلوب حضرت شیخ عیسیٰ جنداللہ سندھی قدس سرہٗ کی خانقاہ میں ان کے پیر کا عرس تھا۔ اکابرِ مشائخ شریک مجلس تھے اور سب سماع کی لذت سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ

دریں اثنا نافع الخلق بے منت و بے روئے ریا ملا محبت علی با شخصے سخن آغاز کردن گرفت و آن بر بعضے مردم مزاحم در شنیدن سرد می شد حضرت ایشان

(مسیح القلوب) روے مبارک خود بجانب ملا محبّ علی تبسم کردہ فرمودند السماع کالصلوٰۃ ملا محبّ علی از شنیدن این حرف بغایت منبسط شدہ ترک سخن گرفتند۔

(ملفوظات کشف الحقائق قلمی ص ۳۵)

مسیح الاولیاء کے مرید اور خادمِ خاص نے آپ کا ملفوظ مرتب کیا ہے۔ مُلا محبّ علی کا نام کس محبت و احترام سے لیتا ہے جب تک نافع الخلق بے منت و بے ریا کے الفاظ ادا نہیں کرتا۔ آپ کا نام زبان قلم پر نہیں لاتا۔ پھر حضرت مسیح القلوبؒ ایسے موقعہ پر برہم ہونے کے بجائے مسکرا کر خطاب فرماتے ہیں۔ ان امور سے ظاہر ہے کہ ملا محبّ علی مقتدر مشائخ میں بھی کس قدر مقبول و مکرم تھے۔ ملا صاحب حضرت شیخ محمد ابن فضل اللہ نائب رسول اللہ کے مرید تھے بھی منجملہ دیگر خانوادوں کے چشتیہ سلسلہ میں بھی خلافت سے فائز تھے، لیکن آپ کو سماع سے میل نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کے مریدین بھی سماع کی طرف والہانہ رغبت نہیں رکھتے تھے۔ مگر سماع کے منکر بھی نہ تھے۔ چنانچہ مُلاّ محبت علی کا مجلس سماع میں موجود ہونا مگر آدابِ سماع میں بے احتیاطی اس بات کا بین ثبوت ہے۔

مآثر رحیمی کے مؤلف نے مُلاّ صاحب کو زمرۂ شعرا میں شریک کرتے ہوئے بڑی خوش اسلوبی سے پہلو بچالیا ہے۔ یعنی اُن کے درویشانہ مسلک اور علمی تبحر کی فضیلت کا بھی شایستہ الفاظ میں ذکر کردیا ہے۔ اگر وہ اس احتیاط سے کام نہ لیتے تو ملا صاحب کے ساتھ ناقابلِ تلافی زیادتی ہوتی، کیونکہ درحقیقت وہ پرگو، پختہ گو شاعر ہونے کے باوجود شاعر سے زیادہ عالم اور عالم سے زیادہ صوفی صفا کیش تھے۔ ملا صاحب کے ذکر سے وہ اپنی کتاب کو تشنہ نہیں رکھنا چاہتا تھا اور کتاب مذکور میں صرف خانخانان کے مداح شعراء ہی کے اذکار کی قید تھی، اس لئے وہ مجبور تھا کہ ملا صاحب کی ہمہ گیر و ہمہ رس شخصیت کو شعراء کی صف میں ان کی منزلت کے مطابق جگہ دے۔ مآثر رحیمی کے اعتذار و اعتراف کے الفاظ یہ ہیں:

اگر اورا بہ شعر و شاعری ستودن یوسف را بہ ریسمان خریداری نمودن است چون این خلاصہ مبنی بر ذکر احوال جمع است کہ مدح این ممدوح عالمیان گفتہ اند۔ نسبت شاعری بہ ایشان دادن لازم آمد والا مرتبہ و حالت ایشان را در اقسام حیثیات و استعدادت بہ تخصیص فقر و مسکنت کہ انسان کامل عبارت از جمع است کہ سر رشتہ بدست در آوردہ باشد آنست کہ راقم را ازین گستاخی باز میداشت۔

(مآثر رحیمی جلد سوم ص ۱۸۰)

ملا محبّ علی نوعمری میں بلند پایہ شاعر، علوم رسمی میں کامل و فاضل صفا کیش صوفی پائے گئے ہیں اور یہ تینوں فضائل ایسے ہیں جن میں سے ہر ایک صنف کے حصول کمال کے لئے متعدد ارباب فضل وکمال سے اکتسابِ علوم و فیوض کی نوبت آئی ہوگی یا کم از کم ہر ایک کے لئے ایک فاضلِ اجل کی شاگردی ضرور کی ہوگی، لیکن آپ کے اساتذہ بالخصوص کسبِ علوم اورفنِ شعر کے متعلق کوئی صراحت نہیں ملتی، البتہ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے۔ دسویں صدی ہجری کے آخر تک سندھ میں ایسی درسگاہیں اور ایسے متبحر معلمین موجود تھے، جنہوں نے ملا صاحب کو "سن خورد میں" بمعنیٰ بزرگ بنادیا تھا۔ پھر ایسے علمی ماحول میں کسی خدا رسیدہ صوفی کی صحبت نے آپ کی عارفانہ صلاحیتوں کو فقر وتوکل کے رنگ میں رنگ دیا، لیکن اس رنگ کو حضرت شیخ محمد ابن فضل اللہ نائبِ رسول اللہ نے نکھار کر پختہ اورشوخ بنادیا۔

حضرت محمد ابن فضل اللہ وہ بزرگ ہیں جو برہان پور میں عشق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شیفتگی میں شہرت رکھتے تھے اور دربارِ رسالت سے نائب رسول اللہ کا لقب عنایت ہوا تھا۔ محبّ علی تو فطرتاً صوفی منش اور فقر وتوکل والے انسان تھے۔ شاہجہاں بزمانۂ شہزادگی جب وہ نوجوان تھا جب برہانپور آتا، شیخ سے بکمال عقیدت وخلوص ملتا اور ان کی خانقاہ میں حاضر ہوکر ملتا اور ان ملاقاتوں سے وہ اتنا متاثر ہوا تھا کہ بادشاہ ہوجانے کے بعد بھی بار بار ان تاثرات کا ذکر کرتا تھا۔ مُلّا عبدالحمید لاہوری کی شہادت موجود ہے وہ بادشاہ نامہ میں لکھتے ہیں:

> مکرر بر زبانِ حقیقت بنیان خاقانی گذشتہ کہ از مرتاضانِ ہندوستان بہشت نشان دوکس را مرتقی بدرجۂ کمال یافتہ شد۔ میاں میر (لاہور) ومحمد ابن فضل اللہ کہ در برہانپور حل اقامت انداختہ بہ رہنمونی سالکان جادۂ حق طلبی اشتغال داشت۔ اعلیٰ حضرت در ایامِ میمنت انتظام شاہزادگی بمنزل شیخ تشریف فرمودہ ایشان را دریافتہ بودند۔ (بادشاہ نامہ جلد اول حصہ دوم ص ۳۳۱)

شاہ جہاں نے اسی خانقاہ میں مُلا محبّ علی کو دیکھا۔ تپاک سے ملا اور اس جوہرِ قابل کی قدر افزائیاں کرکے ربط وضبط بڑھایا۔ آئے دن ملتا رہا اور سیر وتفریح کے مواقع پر انہیں ساتھ رکھنے لگا۔ برہانپور ہی میں شاہجہاں نے تعمیرات میں مغلیہ آرٹ کی بنیادیں رکھیں۔ کرارہ کی سیر گاہ تعمیر کرائی۔ یہ مقام برہان پور سے ۶/۷ میل کے فاصلہ پر فاروقی سلاطین کی شکار گاہ اور تفریحی مقام تھا۔ یہاں انہوں نے ایک پہاڑی ندی کے راستہ میں چندفٹ اونچی مضبوط سنگین دیوار کھینچ کر مصنوعی آبشار کا پُر لطف منظر پیدا کیا تھا۔ ندی کی پوری چوڑائی میں دیوار کی ہموار سطح پر سے پانی کی چادر گرنے کا عالم بڑا دلکش ہوتا تھا۔ اس جگہ ندی کا عرض ۱۰۰ گز تھا۔

شاہ جہاں کو یہ چیز بہت پسند آئی اور اس نے اپنے مہتمم تعمیرات کو حکم دیا کہ موجود بند سے اوپر کی طرف ۸۰ گز کے فاصلہ پر ایک اور بند تعمیر کیا جائے تا کہ ۱۰۰×۸۰ گز کا وسیع حوض وجود میں آ جائے اور دوسری پانی کی چادر بلندی سے گرنے لگے اور حوض کے ہر دو پہلوؤں پر دو محل تعمیر کئے جائیں اور محلات سے ملحق و متعلق خوبصورت باغ کی داغ بیل ڈالی جائے۔[1]

ملا عبدالحمید لکھتے ہیں:

> موضع کرارہ کہ سیر جائیست دلکشا و نخچیر گاہیست مسرت افزا۔ کرارہ دہی است سہ کروہے از برہان پور و در نواحی آن رودخانہ ایست کہ از صفا چوں آئینہ جلی رونماست و از لطافت چو آبِ زندگانی گوارا و در مواضع عرض آن صدر گز بادشاہی است و در بعضے کمتر دراز منۂ سابقہ برابر کرارہ برآن رود بندے بستہ بودند بعرض صد گز و ارتفاع دو گزر دازردے آں آبشارے می ریخیت۔ فرمانروائے جہاں در ایام نیک فرجام بادشاہزادگی ہنگامے کی ماہچہ رایاتِ ظفر آیات برائے تنظیم مہماتِ دکن و تنسیق معاملات آں فروغ بخش خطۂ برہانپور بود در اثنائے شکار آں مقام بہجت انتظام دید حکم فرمودند کہ پیش بند سابق بند دیگر بفاصلۂ ہشتاوگز بندند تا میانِ ہر دو بند حوضے صد گز و ہشتاد گز بر روے کار آید و آبشار دیگر از روے این بند بریزد و دو سوے آن و دوست عمارت مطبوع بر افزاید۔ بامر بادشاہی در کمتر فرصت حوضے و آبشارے دیگر و دو منزل دلنشین برکنارۂ آں و باغیچہ متصل عمارت آں روے آب اتمام یافتہ حیرت افزائے دیدہ ورانِ دشوار پسند گشت۔ (بادشاہ نامہ جلد اول ص۳۳۲)

یہ تفریح گاہ آناً فاناً تیار ہوگئی۔ شاہجہان نے اس کی سیر سے لطف اندوز ہونے کے اولین موقعہ پر بھی ملا محبّ علی کو ساتھ رکھا تھا۔ تازہ محیر العقول تعمیر پھر اس کی شاہانہ آرائش ملا محبّ علی بے حد محظوظ و متاثر ہوئے اور اپنے تاثرات برجستہ اشعار کی صورت میں یادگار چھوڑے ہیں۔ یہ نظم معلوم نہیں کتنی طویل تھی یا یہ قصیدہ کے سلسلہ کے اشعار ہیں جو میری خاندانی قدیم بیاض میں ملا صاحب کے دیگر انتخابِ کلام کے طور پر جستہ جستہ درج ہیں۔ اس بیاض میں وقتاً فوقتاً سالہا سال کے تفاوت سے کئی کاتبوں نے خامہ فرسائی فرمائی ہے۔ آغازِ کتابت مسلسل کسی پاکیزہ خط کاتب نے نستعلیق خط میں شرجع کی تھی، بعد میں شکستہ نویس نسخ نویس رواں نویس وغیرہ وغیرہ نے

[1] یہ محلات و آبشار ہنوز کرارہ میں موجود ہے۔ باغ البتہ اُجڑ چکے ہیں۔ آئے دن برہانپور کے خوش فکر صاحب صاحبِ ذوق سیر و تفریحی شکار کھیلنے وہاں جاتے رہتے ہیں۔ عجیب خوش منظر مقام ہے، جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

نظم، نثر، عربی، فارسی، عبارات جہاں مزاج چاہا تحریر فرما رکھی ہیں۔ ایک خاص بات محل نظر اور توجہ طلب یہ ہے کہ ملا صاحب کا کلام جہاں لکھا ہے وہاں دعائیہ الفاظ ضرور لکھے ہیں۔ مثلاً میر محبّ علی سلمہٗ، ملا محبّ علی سلمہ، میر محبّ جلی خیر عمرہ وغیرہ۔ مذکورہ سیر گاہ سے متعلق سرخی اور اشعار یہ ہیں:

حبذا این منزل فرخندۂ شاہجہاں — در کرارہ مینما یہ جلوۂ باغِ جناں

مطلع برجستۂ تعمیر سلطانِ خورم — بر کنارہ حوض اکبر این دو کاخِ محترم

جفت لیکن طاق در سلکِ عمارات بدیع — ہر یکے چوں کوشک فردوس مطبوع و رفیع

چادرِ آبِ مصفا حیرت افزا آبشار — قلب ایں نظارہ گویا آبِ حیواں آشکار

میرو دمستانہ وار افتان و خیزاں میرود — چوں من شوریدۂ نالاں و گریاں میرود

کردم از نظارۂ این گلشنِ دائم بہار

سیرِ فردوسِ معلیٰ در حیاتِ مستعار

مطلع برجستۂ تعمیر کی بلاغت و ندرت کچھ وہی حضرات سمجھ سکتے ہیں، جنہوں نے یہ منظر دیکھا ہے۔ آبشار کے دونوں پہلوں پر یکساں عرض و طول اور یکساں طرزِ تعمیر کے عظیم الشان دیدہ زیب و باصرہ فریب دو محل ایک دوسرے کے مقابل ایک دوسرے کا اس قدر صحیح نمونہ کہ جس میں سرِ مو تفاوت یا تجاوز نہیں ہے۔ درحقیقت مطلع برجستہ تعمیران محلات کی منھ سے بولتی ہوئی تصویر ہے۔

اسی طرح ''جفت لیکن طاق'' کتنا برمحل تلازمہ ہے، جس کی داد نہیں دی جاسکتی۔ اور آبِ حیواں آشکار کہہ کر تو ملا صاحب نے اس آبشار کو حیاتِ جاوید عطا فرمادی ہے۔

چونکہ یہاں ملا صاحب کی شاعری پر تبصرہ نہیں ہے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ وہ شاعرِ غرا، برجستہ گو اور جملہ اصناف سخن پر بہمہ وقت یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ پھر بھی وہ شاعر سے زیادہ عالم اور عالم سے زیادہ صوفی تھے۔ ان کی شاعری سے لطف اندوز ہونے والوں کے لئے مآثر رحیمی، بادشاہ نامہ، عملِ صالح وغیرہ کے اوراق موجود ہیں اور یہ کتابیں چھپ چکی ہیں، البتہ اپنی بیاض سے چند مقامات کے اشعار نقل کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ مذکورہ کتب میں موجود نہیں ہے اور ان کے ذریعہ سے ملا صاحب کی مقبول شخصیت روشنی میں آتی ہے کہ وہ اپنے معاصر صاحبِ اقتدار حکام پر کتنا اثر رکھتے تھے۔

شاہجہان کے عہد میں عقیدت خان صوبۂ مالوہ کا بااختیار صوبہ دار تھا۔ ان دنوں پرگنہ بیر بھی مالوہ میں شامل تھا۔ پرگنہ بیر کے حاکم کا ایک بھائی عقیدت خان کے باڈی گارڈ میں ملازم تھا۔ اس کی تمنا تھی کہ وہ اپنے بھائی کے ہمراہ بیر میں تعینات کردیا جائے۔ لیکن خان موصوف اس

کو اپنے سے جدا نہ کرتا تھا، اس نے مُلا صاحب سے سفارش کی درخواست کی ملا صاحب نے عقیدتخان کو ایک رباعی لکھ کر بھیجی۔ بیاض میں یہ رباعی اس عبارت کے ساتھ درج ہے:

این رباعی را اخوند ملا محبت علی بعقیدت خان نوشتہ اند برائے سفارش شخصے کہ برادرش در پرگنہ بیر بود واین ہم میخو است کہ تعینات آنجا باشد۔ دوجا بیر بمعنی برادر آورہ اند۔

میر محبّ علی زیدہ عمرہ

در بیر فتاد ارچہ یوسف از بیر	لیک این زبرائے بیر میخواہد بیر
چوں ہیچ ازین باز نمی آید او	لطفے بکن و بیفگنش اندر بیر

بیر ہندی میں بھائی کو کہتے ہیں، بیرن کا مخفف ہے اور بیر عربی میں کنوئیں یا باولی کو بھی کہتے ہیں۔ نیز مطلوب مقام کا نام بھی بیر[1] ہے۔ کتنے سادہ الفاظ میں رباعی نظم ہوگئی۔ تجنیس کو خوبی اس پر مستزاد ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ:

یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کی وجہ سے کنویں کی مصیبت جھیلی، لیکن یہ شخص بھائی کے لئے بیر کی آرزو کرتا ہے، جب یہ کسی طرح اپنے ارادے سے باز نہیں آتا تو اسے کنویں میں ہی ڈھکیل دیجئے یعنی بیر پہنچا دیجئے۔

مُلا صاحب خانخاناں، اس کے فرزندوں، بلکہ شاہجہاں اور اس کے امراء سے بھی اہلِ حاجت کی سفارشیں کرنے میں بڑے دلیر تھے۔ چونکہ آپ مستحق لوگوں ہی کی سفارشیں فرماتے تھے، اس لئے وہ ہر جگہ قبول ہوئیں اور اہلِ استحقاق حاجتمند فائز المرام ہوتے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ نے آزاد فطرت اور بے ریا صوفی ہونے کے باوجود مذکورہ درباروں سے روابط مراسم قائم رکھے ورنہ وہ حقیقتاً کسی کے ملازم نہ تھے نہ ہو سکتے تھے۔ ہر دربار میں انہیں بیک وقت معزز مہمان یا باوقار مصاحب کی منزلت حاصل تھی۔ مزہ یہ ہے کہ اس عہد کے تذکرہ نگاروں میں سے ہر ایک نے انہیں اپنے ممدوح کا ملازم ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

مآثر رحیمی کا مصنف مُلا صاحب کو ۱۰۰۰ھ سے ۱۰۲۵ھ بلکہ ۱۰۳۶ھ خانخاناں کی وفات تک ان کا معزز صاحب اور ملازم لکھتا ہے۔ لیکن یہی شخص جب خانخانان کے فرزند اکبر میرزا ایرج کے ندیمانِ خاص کی فہرست پیش کرتا ہے تو اس فہرست میں بھی ملا محبت علی کا نام موجود ملتا ہے۔

---

[1] فی زمانہ بیر کھنڈوہ اور ہرسود کے درمیان جی۔ آئی۔ پی ریلوے کا ایک چھوٹا سا اسٹیشن ہے۔ اس دور میں بڑا اسیر حاصل مقام تھا۔ اب بیڑ لکھا جاتا ہے۔ نیز بیڑ نام کا ایک ضلع حیدرآباد دکن میں واقع ہے اور عقیدت خان یہاں بھی مامور رہ چکا ہے۔ ممکن ہے تبادلہ کے خواہش مند نے بیڑ دکن کے تبادلے کے لئے سفارش چاہی ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اسی طرح ملا عبدالحمید اور ملا محمد صالح کنبوہ کے بیانات ہیں۔ دونوں نے ملا صاحب کو اپنے ممدوح شاہجہاں کو ہمرکاب و حاضر باش ملازم ثابت کیا ہے۔ اس سلسلہ میں تینوں کتب کے اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

از تاریخ ۹۹۹ھ نہ صدونود و نہ تا امروز کہ ۱۰۲۵ھ خمس وعشرین[1] والف ہجری بودہ باشد در بندگی این خدیو ملک بے نیازی می باشد۔ (ماثر رحیمی جلد سوم ص ۴۹۰)

بادشاہ نامہ کی عبارت حضرت محمد بن فضل اللہ نائب رسول اللہ سے متعلق عبارت پہلے نقل کر چکا ہوں، اگر چہ اس سلسلہ میں مُلّا عبدالحمید نے مُلّا مُحبّ علی کے بارے میں کوئی صراحت نہیں لکھی، لیکن تاریخی واقعات شاہد ہیں کہ جہانگیر نے بھی اکبر کے تتبع میں شہزادوں کو قوی بازو امیروں کا داماد بنانے کی سیاست پر عمل کیا تھا۔ چنانچہ شاہجہاں کی شادی میرزا ایرج کی دختر (خانخاناں کی پوتی) سے کرکے اس کو برہان پور بھیجا تھا۔ یہ وہی وقت تھا جب کہ شاہجہاں حضرت نائب رسول اللہ کا خانقاہ میں نیاز مندانہ حاضر ہوتا تھا۔ ملا محبّ علی سے بخلوص ملتا تھا اسی دور میں اس نے سیر گاہ کرارہ میں آبشار، محلات، باغات تعمیر کرائے تھے۔ ناظرین اسی گلزار بہشت آثار کے جشنِ افتتاح میں ملا محبّ علی کو معزز مہمان اور مصاحب کی حیثیت سے محو گلگشت دیکھ چکے ہیں، ان کے تاثرات کا عکس بصورتِ اشعار ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اشعار سے باغات، محلات اور آبشار کی نزہت و نفاست کی خوبیاں تو ضرور معلوم ہوتی ہیں، مگر شہزادہ کی مدح بالکل نہیں اگر یہ مدحیہ قصیدے کے اشعار ہوتے تو ایک نمکخوار ملازم کی طرف حق نمک متصور ہوتا اور ملا صاحب کو شاہجہان کا ملازم تسلیم کیا جاسکتا تھا۔

شاہجہان بادشاہ ہوکر ۱۰۳۹ھ میں خانجہاں لودی کے استیصال کے سلسلہ میں برہانپور آیا تھا۔ اُس وقت البتہ ملا صاحب نے مدحیہ اشعار پیش کئے تھے۔ مذکورہ کتابوں کی ورق گردانی میں تو یہ بھی میری نگاہ سے نہیں گذرے میری بیاض میں یہ تین شعر درج ہیں جو عقیدت خان والی رباعی کے نیچے اس مختصر عنوان سے تحریر ہیں۔

ولہٗ بہ شاہجہان

تو باشی تاجہاں باشد پدیدار — جہاں شاہ و جہاں بخش و جہاندار
زپا افتادگاں را دست می گیر — بگو ایں خود جوان است واں دگر پیر
مسخر بادت ازمہ تابما ہی — ترابادا مبارک بادشاہی

[1] ۱۰۲۵ھ ماثر رحیمی کے خاتمے کا سن ہے۔ لیکن مؤلف بعد کے سنین کے حالات کا بھی اس میں اضافہ کرتا رہا ہے۔ چنانچہ شاہنواز خان ابن خان خانخاناں کے انتقال کا حال بھی مذکور ہے جو ۱۰۲۸ھ میں واقع ہوا تھا۔

یہ محض تقریب ملاقات تھی جو قدیم تعلقات اور اپنے دیرینہ مخلص محسن کو بادشاہی کا اعزاز حاصل ہونے پر ملا صاحب نے اخلاقاً تہنیت پیش کی۔ ملازمت یعنی نوکری کا اس سے کوئی لگاؤ نہیں۔ شاہجہاں نے بھی حسب سابق انہیں اپنے پاس ٹھہرالیا اور ہر ایک سیر و تفریح کے موقعہ پر ساتھ رکھا۔ اسی واقعہ کو بڑھا کر خوشامدانہ مبالغہ کے ساتھ ملا عبدالحمید لکھتے ہیں:

بدرگاہِ گیتی پناہ آمدہ شرفِ ملازمت اندوخت و مدتے مستلزم رکاب فیروزی نصاب بود۔ اکنوں از پیش گاہ مرخص گشتہ در برہان پور بہ پرستش ایزدی و دعائے دوام دولت گردوں صولت کامیاب است۔

(بادشاہ نامہ جلد اول ص۳۳۶)

مُلاّ محمد صالح عملِ صالح میں تحکم کا اندازہ اختیار کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

حسب الامر عالی بالتزام رکاب نصرت نصاب ارتکاب نمودہ ازاں وقت ہمہ جا بہ سعادت ملازمت فائز بودہ۔ (عمل صالح جلد سوم ص۳۶۸)

مُلاّ محبّ علی کو ان مورخین نے شاہجہاں کا ملازم ثابت کرکے اپنے ولی نعت ممدوح کی برتری اور تفویض کا مظاہرہ اور حقِ نمک ادا کیا ہے، ورنہ دلائل و قرائن سے پایا جاتا ہے کہ وہ آزاد فطرت انسان تھے۔ انہوں نے کبھی ملازمت کی پابندیوں کا بکھیڑا مول نہیں لیا۔ خانخاناں کی مصاحبت انہوں نے اوائلِ عمر میں شوقِ سیر و سیاحت کے پیش نظر قبول کی تھی اور برہانپور آتے ہی یہ شوق حد ذوق تک پورا ہوچکا تھا۔ خود بھی فقر و مسکنت کو فطرتاً عزیز رکھتے تھے۔ یہاں حضرت نائبِ رسول اللہ کے مرید ہوئے تو یہ رنگ اور نکھر گیا۔ البتہ خان خاناں سے تعلقات مصاحبت ضرور قائم رکھے۔ ان کے برہانپور میں موجودگی کے زمانہ میں شریک مجلس رہتے۔ تقریبات پر تہنیتیں پیش کرتے اور مستحق اہلِ حاجت کی سفارشوں سے خدمتِ خلق کا فرض انجام دیتے۔ آپ کی ضروریات نہایت مختصر تھیں، کہیں سے کسی تنخواہ کے تعین کی صراحت نہیں ملتی۔ وقتاً فوقتاً نذرانے، قصائد کے صلے آسمانی روزی تھی۔ اسی میں اپنی صوفیانہ بسر اوقات، پیر و مرشد کی خدمت اور محتاج و مساکین کی خبر گیری فرماتے اور درباداری کی شان و نمود بھی قائم رکھتے۔

خانخاناں جیسے لک بخش امیر کی مصاحبت اور بقول مؤرخین ملازمت میں ہوتے ہوئے بھی بحالت تجرد و بے رنگی آپ کی مالی حالت کا یہ عالم تھا کہ جب دل میں ادائے فریضۂ حج کی تحریک پیدا ہوئی تو اتنا روپیہ نہ تھا کہ سفرِ حج کو کافی ہوتا۔ خان خاناں کو کنایتاً اس اشعار میں توجہ دلائی:

قطعہ

سرورا بندہ بہ دل رازیست — کہ ہم از دل بدل دروں آید
ہیچگہ بر زبان نمے آید — کہ نہ از دیدہ جوئے خون آید
راز گفتن زدل سزونہ زلب — کہ ازاں وحی وزیں فسوں آید
کرمت عکس سائلے داند — ہر کجا سایۂ دروں آید
عدوم چوں فزد و نیست عجب — قیمیتم نیز اگر فزوں آید
آرزویت ہمہ بر آمدہ باد — پیش ازان کت بدل درون آید

(مآثر رحیمی جلد سوم از صفحہ ۵۰۱)

مُلّا عبدالباقی پورا قطعہ منظومات کے سلسلہ میں لکھتے ہوئے آگے بڑھ گئے ہیں۔ اس مدحیہ قطعہ کے شان نزول پر روشنی نہیں ڈالی، البتہ آپ کے سفرِ حج کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ خانخاناں نے ملا محبّ علی کو سفرِ حجازِ مقدس پر روانہ ہوتے وقت

ما یحتاج راہِ خرچ ضروری آں سفر چنانچہ بایدو شاید بہ جہت او مستعد و مہیا ساختند (مآثر رحیمی جلد سوم ص۴۹۲)

درحقیقت یہ اسی مدحیہ قطعہ کا صلہ تھا۔ اور غالباً یہ مُلّا صاحب کی سب سے پہلی اور یقیناً سب سے آخری حاجت طلبی تھی جو اُنہوں نے اپنی ذات کے لئے بوجہ مذکور گوارا کی۔ خانخانان سے ان کی وابستگی کے مراسم کی وجہ تو ظاہر ہے کہ وہ انہیں ان کے وطنِ مالوف سے ہمراہ لائے تھے۔ ضروری موقعہ پر حاجت طلب کرنا، مُلّا صاحب کا حق تھا اور خانخاناں کا فرض تھا کہ وہ دریا دلی سے ادا کریں اور ایسا ہی ہوا بھی۔ لیکن شاہجہاں کی ملازمت میں منسلک کرنے والوں کے پاس کیا دلیل ہے؟ ملازمت میں ان کا کیا عہدہ تھا؟ اور تنخواہ کیا تھی؟ کہاں کی جاگیر یا منصب عطا ہوا تھا؟ اگر زمرۂ شعرا میں شامل کیا جائے تو واقعی وہ شاعر بے بدل تھے۔ لیکن ایک ملازم ہونے کی حیثیت سے ان کے قصائد پیش ہونے چاہئیں، جنہیں پیش کرنے سے دونوں مُلّا قاصر ہیں۔ میں نے اپنی بیاض سے جو تین شعر پیش کئے ہیں، وہ حصولِ سلطنت کی مبارکباد کے ساتھ ساتھ پند سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ کیا نمکخوار ملازم مدح سرائی کے سوا ناصح مشفق بننے کی بھی جرأت کرسکتا ہے؟ واقعات پر غائر نظر ڈالنے سے معاملہ برعکس نظر آتا ہے۔ یعنی ملا محبّ علی جیسے مرتاض اور بیگانۂ علائق دنیوی کو شاہجہاں کی خوشامد و دلجوئی کی کسی وقت بھی ضرورت نہ ہوئی۔ البتہ شاہجہاں کو مُلا محبّ علی کو دوست بنانے اور خوشنود رکھنے کی ابتدأ سخت ضرورت تھی۔ بادشاہ نامہ کی سابقہ مذکورہ عبارت سے ناظرین باخبر ہیں کہ شاہ جہاں کو حضرت محمد بن فضل اللہ سے اس قدر

عقیدت تھی کہ بزمانہ شہزادگی آپ کی خانقاہ میں حاضر ہوکر دست بوسی کا شرف حاصل کرتا تھا۔ خاص بات یہ بھی ہے کہ وہ اپنی عقیدت کے مطابق حصولِ سلطنت کے لئے آپ کی توجہ اور دعاؤں کا آرزومند تھا اور جانتا تھا کہ وقتِ ضرورت اس اللہ والے بُزرگ کے دربار میں زور و زر سے کام چلنے والا نہیں۔ مُلا محبّ علی اس دربار کے ایک مقبول فرد تھے اس لئے کہ حضرت نائب رسول اللہ صاحب کے علم و فضل اور صاف باطنی کے باعث انہیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ شاہجہاں نے کچھ فطری درویش دوستی اور بہت کچھ حصولِ مقصد کے لئے کارآمد ہستی خیال کرکے ملا صاحب کو دوست بنایا۔ قرب ہونے پر ان کی علمی قابلیت و بذنجی کا گرویدہ ہوگیا اور ہمیشہ اُن تعلقات کو برقرار رکھا۔ مما لک دکن کے دوروں میں بالعموم انہیں ہمرکاب رکھتا بلکہ کبھی کبھی آگرہ میں بلا بھیجتا اور یہ سب بسلسلۂ ملازمت نہ تھا، بلکہ محض اظہارِ خلوص اور لطفِ صحبت کے پیش نظر ہوتا۔ مزہ یہ ہے کہ مُلّا صاحب کو شاہجہاں کا ملازم بیان کرنے والے یہ بھی لکھتے ہیں۔

> از تکلفاتِ رسمی و تصنعاتِ عرفی بیگانہ۔ بیشتر اوقات برانجاحِ حوائج مسلمانان و اسلام کفر و اصلاح فجرہ مصروف دارد۔ (بادشاہ نامہ جلد اول ص ۳۳۵)

یعنی ملا محبت علی تکلفاتِ رسمی اور عام دنیا سازی سے بے نیاز ہیں اور زیادہ وقت مسلمانوں کی حاجت روائی تبلیغِ اسلام اور فسق و فجور کے انساد میں مصروف رہتے ہیں اور مسلمانوں کو شاہی نوازشات سے مالامال کرنے کی سعی فرماتے ہیں۔ جب ملا صاحب کا زیادہ وقت ان مشاغل میں گذرتا تھا، تو انہیں شاہ جہاں کا ملازم ماننے کے لئے یہ یاد کرنا پڑے گا کہ دربار میں تبلیغ اسلام اور رفاہِ عام کا بھی شعبہ تھا۔ جس میں مذکورۂ بالا خدمات انجام دینے کے لئے مُلّا صاحب ملازم تھے۔

بادشاہ نامہ کی متلون عبارتیں پیش کردی گئیں۔ اب مُلّا صاحب کی صوفیانہ منزلت اور عارفانہ مشاغل کے متعلق مُلّا محمد صالح کنبوہ کی رائے ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں:

> ان عارف کامل در عین غلبہ نشۂ ذوق گاہے گاہے اشغال نائرہ شوق رابہ رشحہ فشانی لطیف اشعار آبدار فرونشاندہ انواعِ سخن از مثنوی، غزل، قصیدہ و رباعی کہ از روی کمال مرتبہ وجد و حال ناشی شد انشاء می نمایند۔ واغلب اوقات شاہد معنی عاشقانہ و عارفانہ کہ ز شمائم آن نسائم قدس ونفحات انس تمام بہ مشام ارباب عرفان و وجدان می رسد درلباسِ نظم جلوہ می دہند۔

(عمل صالح جلد سوم ص ۳۶۸)

اس عبارت میں ملا صاحب کا شاعرانہ کمال اور ان کی شاعری میں جملہ اصنافِ سخن کی حد تک تصوف کے عارفانہ رنگ کی اثر انگیزی کو خصوصیت سے سراہا گیا ہے، حتیٰ کہ قصیدہ میں بھی

مؤلف کو عرفان و وجدان کی سرمستیاں جلوہ فرما نظر آتی ہیں۔ کیا ایسا عارفِ کامل تارک دنیا اور گوشہ گزین ہونے کے باوجود بھی مدحت سرائی کا پیشہ اختیار کرنے کی ذلت گوارا کرسکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ملا محبّ علی نہایت متوکل قناعت پسند اور تقوی و تورع کے عامل تھے۔ انہیں قصیدہ گو ملازموں کی صف میں کھڑا کرنا زہد و تقویٰ اور عرفان و تصنف کی توہین ہے۔ کیا دلیری ہے کہ یہی مُلّا صاحب صالح اسی صفحہ پر بیک جنبشِ قلم ملا صاحب کو شاہجہاں کے دربار میں حکما حاضر کردیتے ہیں۔ ملا نہاوندی نے آپ کے باطنی کمالات کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

> این شیوہ از ایشان نہایت پسندیدہ و نیکومی نماید کہ از شائبہ ریا و کذب مبراست و تمام عمر بیک وطیرہ وروش کہ شیوہ اوست اوقاتِ شریف مسلوک می دارد کہ نہ از نہایت و مرحمت جہانیاں خوش حال و نہ از کم لطفی و بے شفقتی زمانیاں آزردہ و صاحبِ ملال می گردد۔ لطف مخلوق را معدوم انگاشتہ بندگی خالق جز وکل خدمت و صحبت فقرا و درویشاں رابر ہمہ چیز ترجیح می نہہ (مآثر رحیمی جلد سوم ص۴۹۳)

یعنی مولف کو ملا صاحب کی یہ خصوصیت بے حد پسند ہے کہ کذب و ریا سے کوسوں دور ہیں اور ساری عمر اس وضع میں بسر کردی کہ لوگوں کی عنایات و اکرام پر کبھی مغرور و مسرور نہ ہوئے، ورنہ بے التفاتیوں اور نا مہربانیوں سے ملال گذرا۔ مخلوق کے نیک و بد تعلقات سے اُنہوں نے کبھی دلچسپی نہیں لی۔ البتہ خالقِ جز وکل کی بندگی اور فقرا کی صحبت کو ہر چیز پر فوقیت دیتے ہوئے اور دنیا داروں سے تعلق رکھا بھی تو اپنی ذات کے لئے نہیں، بلکہ اس اثر و رسوخ سے مستحق لوگوں، جمہور مسلمانوں و عام حاجتمندوں کو فائدہ پہنچانے کی مصلحت سے اور بس۔ وہ مزید اسی سلسلہ میں لکھتے ہیں:

> دبودن او درین سلسلہ و خدمت اہلِ زمان جائے تعجب است۔ وتعجب ہم ندار وچہ ایں بزرگوار صورت و معنی اگرچہ ظاہر اور لباس حکومت و سلطنت است در باطن بہ پلاس فقر آراستہ و پیراستہ است و اگر ظاہر بینان ازین معنی غافل بودہ باشد وایں شان را از اہل منصب و مہم دنیا دانند گو باش! علیم علام حال ہر کس رامیداند۔

اب مؤلف کی رائے جو آپ کے متعلق ہے ان الفاظ میں ملاحظہ فرما دیئے:

> الحق مثل مولانائے مذکور درین جز و زمان نیست ونخواہد بود واہل ہندرا اعتماد تمام بہ فضیلت و حالتِ او ہست می رسد و می زیبد (مآثر رحیمی جلد سوم ص۴۹۴)

مگر پھر بھی وہ مُلّا صاحب کو روزِ قیامت سے آخر تک خانخاناں کا مسلسل ملازم ہی بتاتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ ملا عبدالباقی نہاوندی ۱۰۲۳ھ میں ہندوستان آیا اور خانخانان کے حضور میں

پیش ہوا۔ یہ اپنے وطن میں رہ کر بھی خانخاناں کی فیاضی سے متمتع ہوچلا تھا۔ نظیری کے توسط سے ایک غزل بھیجی تھی جس میں ایک شعر یہ بھی تھا۔

در عراقِ پُر نفاق ایں آرزو میسوز دم　　　از سخن سنجانِ بزمِ خانخاناں نستم

اور خانخانان نے اس کے صلہ میں دو ہزار روپے بھیج دیئے تھے۔ بالمشافہ ملاقات میں خان خانان نے پھر دریا دلی سے سلوک کیا، لیکن کوئی خدمت یا پابندی عائد نہیں کی۔ جب نہاوندی نے خدمتِ لائقہ بجا لانے پر اصرار کیا اور ترغیب دلائی کہ اجازت ہو تو مآثر رحیمی مُرتب کردی جائے۔ اجازت ملنے پر اس نے کام شروع کردیا اور دو سال میں تین جلدوں کی ضخیم و مبسوط کتاب مرتب کر کے پیش کی۔

اسی طرح خانخانان میر محمد نعمان نقشبندی سے باعتقاد تمام ملتا تھا۔ انہیں اپنی مجلسوں میں اور تقریبات کے موقعہ پر شریک رکھتا تھا۔ ان کی خدمت میں گراں قدر نذرانے پیش کئے، لیکن انہوں نے کبھی کچھ قبول نہ فرمایا۔ آخر ان سے التجا کی کہ میں عنداللہ کارِ خیر میں کچھ خرچ کرنا چاہتا ہوں۔ برائے خدا مجھے مفید مشورہ دیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ فاروقی سلطنت ختم ہوجانے سے جامع مسجد برہانپور کا جو بیرونی حصہ نامکمل رہ گیا ہے، اس کی تکمیل کرادو۔ خانخاناں نے آپ ہی کی نگرانی اور مشورہ سے احاطۂ جامع مسجد مشرقی اور جنوبی دروازہ اور ہرسہ جانب پختہ اور وسیع جھروں کی قطاریں و سنگ خارا کے دو وسیع حوض تعمیر کرادیئے جو آج بھی اچھی حالت میں موجود اور مستعمل ہیں۔ میر محمد نعمانؒ بھی اپنے طریقہ کے ذکر و عبادت کے بعد زیادہ وقت خان خانان کے ساتھ گذارتے تھے۔ یہ تمام حالات اور مذکورہ تعلقات کا ذکر خود مآثر رحیمی میں موجود ہے۔ لیکن مُلا نہاوندی نے انھیں خانخانان کا ملازم نہیں لکھا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نہاوندی نے ملا محبّ علی کو خانخانان کے دربار میں درباری شان سے دخیل و موجود دیکھ کر انہیں بھی ایک ملازم ہی تصور کرلیا اور جب تک اس کو دیکھنے کا اتفاق ہوا، اسی عالم میں دیکھتا رہا۔ حالانکہ رہ مذکورین کی ملاقات اور باہمی ربط قائم ہونے سے ۲۳ سال بعد برہانپور آیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مُلا صاحب علی نہاوندی سے عزیز دوست کی طرح ملے اور ملتے رہے۔ ملا صاحب کے حالات میں بہت سی دریافت طلب باتیں ان سے پوچھ کر ماثر رحیمی میں لکھیں اور بہت سی دیگر باتیں اپنے مشاہدے اور قیاس سے درج کردیں۔ نیز کچھ خانخاناں کی مدحت سرائی میں مبالغہ سے کام لے کر ممدوح کا توفق و برتری ثابت کی۔ اس سلسلہ میں نہ صرف ملا محبّ علی کو بلکہ عرفی، نظیری، ملا حیاتی، بلکہ فیضی تک کو خانخاناں کے ملازم اور مداحوں میں لکھ گیا ہے۔

ہم نے ہر سہ مصنفین کے ہر قسم کے بیانات سامنے رکھ کر واقعات اور ماحول کے اعتبار تبصرہ اور نقد ونظر کا دیانت دارانہ حق ادا کرنے کی کوشش سے حتی الامکان پہلو تہی نہیں کی۔ نتیجۃً اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ ملا محبّ علی بلند پایہ شاعر، عارف کاملِ، درویش منش، صوفیِ صفا کیش، عالمِ متبحر، بذلہ سنج، فیض رسانِ خلق، مبلغ اسلام، تارک الدنیا، صاحبِ وجد و حال، فقیر دوست، متوکل، عبادت گذار، خدا رسیدہ بزرگ تھے۔

فریضۂ حج ادا کرنے کی سعادت بھی حاصل کی تھی۔ حضرت شیخ محمد ابنِ فضل اللہ نائب رسول اللہ سے بیعت کا شرف ۱۰۰۵ھ میں بمقام برہانپور میسر آچکا تھا۔ ۱۵ یا ۱۰۱۸ھ میں خرقۂ خلافت سے افتخار پایا، جبکہ سفرِ حج کو روانہ ہورہے تھے۔

آپ کے کتنے مرید تھے، مرید کرتے بھی تھے یا نہیں؟ یہ صراحت کہیں نگاہ سے نہیں گذری۔ اپنے مرشد کا نہایت ادب کرتے، ان کی خدمت میں زیادہ سے زیادہ وقت گذارتے۔ مرشد کی وفات کے بعد مرشد زادوں کا ویسا ہی ادب و احترام کرتے ان کے قرب کو سعادتِ ابدی جانتے تھے۔ مرشد زادے بھی یگانگت کا برتاؤ کرتے اور ہر طرح خلوص واکرام سے پیش آتے تھے۔

باہر بھی ملا صاحب ہی طبقے میں مقبول تھے۔ امراء میں خانخانان عبدالرحیم خان، آ عقیدت خان، آصف خان، شائستہ خان، وغیرہ سے آپ کے بڑے اچھے مراسم تھے۔ شعرا میں شکیبی، نظیری، حیاتی، فیضی، شیدا، طالب، ملا عبدالباقی نہاوندی، وغیرہ سے صحبتیں رہیں اور ہر شخص آپ کا مداح و معروفِ کمال رہا۔ مشائخ میں مسیح القلوب شیخ عیسیٰ جند اللہؒ ملا حسن غوثی، اسماعیل فرحی، میر محمد نعمان نقشبندی، شیخ ہاشم کشمی، شیخ جلال الدین صاحبِ ملفوظاتِ جلالی، شیخ برہان الدین رازِ الٰہی وغیرہ صلحاء و علمائے کبار سے ربط و ضبط تھا، خدا نے دینی و دنیوی تمام سعادتوں اور فضیلتوں سے تازیست مالا مال رکھا۔

۷۳ سال کی عمر میں اس دار فانی سے ملک جاودانی کی طرف کوچ فرمایا۔ اپنے خلوص اور حسنِ عقیدت کی برکت سے مرشد کے مزار کے قریب پائیں جانب گوشۂ جنوب مشرق میں دفن ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد جب حضرت نائب رسول اللہؒ کا مقبرہ تعمیر ہوا تو اس وسیع گنبد کے ملحقہ بیرونی حجرہ میں آپ کی قبر بھی آ گئی۔ یہ مقبرہ برہانپور میں بمقام شیخ پورہ نائب رسول اللہ کے روضہ کے نام سے مشہور اور زیارت گاہ خلائق ہے۔ ملا محبّ علی کا انتقال ۱۰۵۵ھ میں ہوا، جیسا کہ مندرجۂ ذیل قطعہ سے ظاہر ہے۔ سنہ ہجری کا پتہ تو چلتا ہے۔ لیکن ماہ و تاریخ کا علم نہیں ہوتا۔ یہ قطعہ حافظ عبدالغفور کا ہے جو حضرت نائب رسول اللہ کے خلیفہ تھے اور جب شیخ پورہ میں کاکر خان افغان نے جامع مسجد تعمیر کرادی تو یہی وہاں خطیب مقرر کئے گئے تھے۔ بیاض میں یہ تاریخ اس عنوان سے درج ہے۔

تاریخِ وفات ملا محبّ علی طاب ثراہ من مغموم و مہجور حافظ عبدالغفور

افضل الاتقیاء، محبّ علی — بوداز عارفانِ جلوۂ ذات
عالم و فاضل و یگانۂ عصر — منبع خیر و مرجع حسنات
صوفی و متقی مجاہدِ نفس — کامل و اکمل وستودہ صفات
فضل یزادن ولادتِ سعدش — جامع الفضل منتہائے حیات
۹۸۲ھ — ۱۰۵۵ھ

مُلا محبّ علی کے حالات پر اس قدر لکھ چکنے کے بعد بھی مجھے اعتراف ہے کہ میں مذکور کتب سے اخذ و اقتباس کر لینے کے بعد بھی وہ تمام باتیں نہیں لکھ سکا، جو ان کتابوں میں مندرج ہیں۔ اس کی ایک وجہ نظریہ کا اختلاف ہے۔ مثلاً مآثر رحیمی کے مصنف نے اُن کے علم و فضل کے پیش نظر ان کے عرفان و وجدان کے اعتراف کے ساتھ ساتھ ڈرتے ڈرتے انہیں شاعر لکھا ہے اور انہیں خان خانان کا ملازم قرار دے کر صرف ایک موضوع یعنی خانخانان کی مدح کے سلسلہ میں مُلا صاحب کے سیکڑوں اشعار درج کئے ہیں جو مختلف اصنافِ سخن۔ قطعہ، قصیدہ، مثنوی، ساقی نامہ وغیرہ کے ذیل میں ہیں۔

میں عرض کرتا ہوں کہ ملا صاحب نے یقیناً وہ اشعار کہے ہیں۔ لیکن صرف مدح سرائی ان کا مقصود شاعری نہ تھا، بلکہ انہوں نے شعر سے مختلف اہم کام لئے ہیں۔ ایک قطعہ لکھ کر سفرِ حجاز کے مصارف حاصل کئے۔ ایک رباعی بھیج کر تبادلہ کے آرزومند کی تمنا پوری کردی۔ سیر حاصل آبشار کا حاصل سیر قطعہ لکھ کر معزز میزبان کا حقِ مہمانی ادا کردیا۔ یہ چیزیں سلسلۂ نگارش میں ناظرین ملاحظہ فرما چکے ہیں۔

اس سے بھی زیادہ اُنہوں نے بالعموم شعر سے اظہارِ ما فی الضمیر۔ وارداتِ قلب اور جذباتِ عشق الٰہی کو کنایۃً بیان کرکے دل کو ہلکا کرنے کی راہ نکال رکھی تھی۔ وہ کسی حالت میں بھی یہ پہلو ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے، ان کے ساقی نامے وغیرہ سے جستہ جستہ چند اشعار نقل کرتا ہوں۔ ناظرین محسوس کریں گے کہ ان میں بادۂ انگور کی خمار آگینی نہیں ہے۔ بلکہ عرفان و وجدان کی سرمستی و مدہوشی ہے۔ ساقی کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں:

منم[1] باتو چوں نورور آفتاب — ز تومی نیارم شدن در حجاب
بلندی و پستی ماسازِ تست — بم وزیر ہر نغمہ آوازِ تست

---

[1] مآثر رحیمی جلد سوم میں ساقی نامہ مسلسل ۱۲ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ میری بیاض میں معدودے چند اشعار دو قسطوں میں درج ہیں۔

جہاں نقش آئینۂ بیش نیست — نمودے گرش ہست جز خویش نیست
گسستہ عنانم درین دشتِ دور — چو ہانگ جرس کردہ ہر سو عبور
بمنزل کجا زین بیاباں رسم — کہ یابم زسر چوں بہ پایاں رسم
جنوں را دگر کار بالا گرفت — خرورا چو زنجیر در پاگرفت

☆☆☆

بیا ساقیا کار از وست شد — دلے بود درکار غم پست شد
بیا سوئے میخانہ ام رہ نمائے — کزیں در بہ کنجم فرورفت پائے

☆☆☆

مغنی بیا کشتین راز کن — برویم دلِ معرفت باز کن
بیا ساقی آں مے کہ جان خاکِ اوست — جہاں جرعۂ جامِ نمناکِ اوست

(مآثر رحیمی ۳ انتخابِ ساقی نامہ)

یہ اشعار اگرچہ خانخاناں کے مدحیہ ساقی نامہ سے ماخوذ ہیں، لیکن شاعر کی افتادِ طبیعت کا رنگ اس قدر گہرا ہے کہ مدح کا گمان بھی نہیں ہوتا۔ ساقی نامہ میں سو سے زیادہ اشعار ہیں۔ ان میں سے معدودے چند مدحیہ اشعار الگ کردیئے جائیں تو خالص تصوف ہی تصوف رہ جائے گا۔

وہ تو ساقی نامہ تھا، ایک قصیدہ کے اشعار ملاحظہ ہوں۔ دنیا سے بیزاری اور جہادِ نفس کی کس قدر دلنشین ترغیب ہے۔

از غمِ دہر روے دل برتاب — وز رہِ بادہ شمع خود بردار
بجہہ از دامِ خود یکے چوں دو — پر از دشتِ خود یکے چو شرار
دل بصورت مدہ کہ کس نہ شود — غنی از نقش درہم و دینار
چہ نشینی چوروزن وسایہ — چشم بر راہ پشت بر دیوار
رہ ز دیوار کن زہمت وسعی — نقب از گنبدِ رواں بروار
گام بردار تا نہ گردد شب — لیک آہستہ تا نیفتد بار

(مآثر رحیمی جلد سوم ص۴۹۴ تا ۴۹۶) انتخاب قصیدہ

یہ کیسا قصیدہ ہے کہ اس میں مدح وستائش سے زیادہ پیرانہ پند اور بزرگانہ ہدایات اور پند ونصائح تحریر ہیں۔

اسی سلسلہ میں اپنی بیاض سے وہ اشعار نقل کرتا ہوں، جو مذکورہ کتب میں نہیں ہیں اور ابتداءً میں نے وعدہ بھی کیا تھا۔ چند منظومات گذشتہ صفحات میں پیش ہوچکی ہیں۔ مندرجۂ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں جو ان کی وارداتِ قلب، سوز وگداز، فقر وتوکل کے مظہر ہیں۔

ولہٗ

چنداں گریم کہ سنگ در نالہ شود　　وز آب جہاں پُر از گل و لالہ شود
بارم از اشک ابرِ آتش بارے　　کزوے مہ و مہر ورتہ ژالہ شود

ولہٗ

چنداں نالم کہ آب گردد دلِ سنگ　　چوں گردد آب خاک از دگیر درنگ
زاں خاک یکے درخت خیزد کردے　　آید ہمہ میوۂ مرادم در جنگ

شدتِ گریہ وزاری اور آہ و فغان اور ان کے حسبِ مراد نتائج کا کتنا اچھوتا انداز بیان ہے۔ اور دوسری رباعی میں فلسفیانہ تجزیہ، یعنی میں اس قدر آہ و فغان کرتا ہوں کہ پتھروں کا دل پانی ہوجاتا ہے اور جب پانی موجود ہوجاتا ہے تو اس سے خاک وجود میں آجاتی ہے۔ آب و خاک کی یکجائی سے روئیدگی ناگزیر ہے۔ چنانچہ اس سے وہ درخت پیدا ہوتا ہے جس سے میں اپنی مرادوں کا ثمر حاصل کرتا ہوں۔ کس قدر بلیغ پیرایہ میں اعترافِ حقیقت ہے کہ آہ و فغان کے نتیجہ میں شاعر سکونِ قلب حاصل کرتا ہے۔ یہی وہ راز ہے جو نظم کے پردہ میں بیان کرکے عاشقِ صادق نے دل ہلکا کرکے نثر میں کسی عنوان سے اس کے اظہار کی جرأت ممکن نہ تھی۔

(دیگر) میر محبت علی

ما از ازل چو جامِ فنا نوش کردہ ایم　　نامِ فنائے خویش فراموش کردہ ایم
ہر جرعۂ بعالمِ دیگر نمود راہ　　ہجرت ز عالمِ خرد و ہوش کردہ ایم
تا گشتہ ایم در رہِ الفقر مستقیم　　تمت شدیم و یار در آغوش کردہ ایم

ولہٗ

چو گل کشایم و چوں مل بہ بندم از ہر ننگ　　درِ امید بیاد و درِ شکیب بسنگ
بہ چشم من چہ رسد ایں جہانِ بے مقدار　　بری زعیش و غم فارغم زنام وزننگ

مندرجۂ بالا دونوں قطعات مُلّا صاحب کے فطری مسلک فقر و توکل و بے نیازِ علائق ہونے کے مظہر ہیں۔ ان حقائق کی روشنی میں پھر اعادہ کرتا ہوں کہ مُلّا صاحب کے جملہ اصنافِ سخن میں عارفانہ سوز و گداز صوفیانہ رموز و اسرار کی نمایاں جھلک بڑی کثرت سے نمودار ہے، جس کی مثال کسی مدحت پیشہ شاعر کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ لاریب مُلّا صاحب صوفی صفا کیش۔ عارفِ کامل، صاحبِ وجد و حال، عالمِ باعمل، خدارسیدہ بزرگ تھے۔

واللہ اعلم بالصواب.

☆

دورِ سوم

خلفائے حضرت مسیح الاولیا

قدس سرہٗ العزیز

حضرت شیخ برہان الدین راز الٰہی قدس اللہ سرہٗ العزیز

آپ مسیح الاولیاء کے شاگردِ رشید اور ممتاز ترین خلیفہ ہیں۔ باکمال پیر کی خدمتوں اور فرمانبرداریوں میں آپ کو وہ شغف اور غلو حاصل تھا۔ جس کی مثال کمتر مل سکے گی پیر دستگیر نے بھی ہمیشہ آپ پر خصوصی عنایت و شفقت کے ساتھ توجہ رکھی اور بہت جلد مؤثر تعلیم اور روحانی تربیت سے کامل بنادیا۔

مولوی بشیر محمد خان ایڈوکیٹ برہانپوری نے ملفوظات کے حوالہ سے آپ کی ولادت کا سنہ لفظ فیض حق سے ۹۹۸ھ اور مقامِ ولادت موضع راجھی پرگنہ بودوڈ خاندیس لکھا ہے۔ آپ کی نو عمری کا زمانہ تھا کہ آپ کا خاندان برہان پور آ گیا۔ آپ نے والدین کی وفات پانے کے بعد اپنے عم بزرگوار کی زیر پرستی تعلیم و تربیت اور نشو و نما حاصل کی۔ علومِ ظاہری کی تحصیل کے ساتھ ساتھ خدا طلبی کا جذبہ موجزن تھا۔ حضرت ملک حسین بنبائیؒ کی خدمت میں حاضر ہوکر مرید ہوگئے۔ ملک موصوف نے ضروری ہدایات دیکر بعض اذکار کی تلقین کی۔ اسی اثناء میں ملک حسین بغرضِ سیاحت برہان پور سے اطراف ملک میں چلے گئے۔ شیخ برہان الدین کا کام تشنۂ تکمیل تھا اور ذوقِ طلب حد برداشت سے باہر۔ بیتابانہ کسی اور رہنمائے حقیقت کی جستجو میں مصروف ہوگئے اور جب مضافاتِ گجرات کے باشندے ایک بزرگ سید محمد کی روحانی فضیلتوں کا شہرہ سنا تو آپ وہاں جانے پر عازم ہوگئے۔

اتفاقاً حضرت مسیح الاولیا کے ایک خلیفہ شیخ عبدالقدوس سے ملاقات ہوئی، انہوں نے آپ کا منشائے عنصر معلوم ہونے پر رائے دی کہ آپ مسیح الاولیاء کی خدمت میں حاضر ہوں تو مناسب ہوگا۔ شیخ عبدالقدوس کے مشورہ دینے میں ان کی ایک غرض بھی وابستہ تھی یعنی حضرت مسیح الاولیاء نے ان کو پانچ خانوادوں کی خلافت ان کی روحانی صلاحیت کے مطابق عطا فرمائی اور بقیہ نعمت اور تکمیل کے متعلق کفایتاً فرمایا تھا کہ یہ چیزیں بھی وقت آنے پر تم کو اسی خانقاہ سے ملیں گی۔ لیکن ایک توسط کے ذریعہ سے۔ چنانچہ عبدالقدوس نے چشم باطن کی بصیرت سے وہ تابانی شیخ برہان الدین کی پیشانی میں جلوہ گر پائی تھی، اس لئے نہ صرف انہیں مشورہ دیا بلکہ اصرار کرکے آمادہ کیا اور جب وہ آمادہ ہوگئے تو پانچوں خانوادوں کی خلافت انہیں تفویض کرکے وعدہ کرالیا

کہ جب آپ حضرت مسیح الاولیاء کی عنایات و توجہ سے درجۂ کمال کو پہنچ جائیں گے مجھے بھی اپنے مریدوں میں شامل کر لینا۔

ایڈوکیٹ صاحب نے لکھا ہے کہ آپ جب مسیح الاولیاء کی خدمت میں حاضر ہوئے تو عمرِ گرامی انیس سال کی تھی۔ یعنی (۱۰۱۷ھ) مسیح الاولیاء نے محبت سے شرفِ نیاز عطا کیا اور دریافت فرمایا کہ مجھ سے بیعت ہونے سے تمہارا کیا مقصد ہے۔ اگر جاگیر و منصب کی تمنا ہو تو ظاہر کرو حاکم شہر سے میرے تعلقات اچھے ہیں، سفارش کئے دیتا ہوں اور طلبِ علم کا ذوق ہے تو بابا فتح محمد کی رفاقت میں جو چاہو پڑھ سکتے ہو۔ آپ نے جواب دیا یہ دونوں چیزیں نہیں چاہتا، طلبِ حق کا جذبہ رکھتا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ چلہ نشین ہو کر کشائش باطنی کی نیت سے اسمائے اعظم پڑھوں۔ فرمایا مبارک ہے اور ایک حجرہ آپ کے لئے مقرر کر کے چالیس اسماء پڑھنے کی تلقین فرمائی۔ سید عبدالحی نے یہ روداد ان الفاظ میں لکھی ہے:

> ''چوں بخدمتِ حضرت مسیح الاولیاء رسید پرسیدند کہ اگر قصدِ یومیہ و اراضی است بصدر شہر کہ آشنا ست سفارش و صدارت نمایم واگر قصدِ طلبِ علم است بہ رفاقت بابا فتح محمد ہرچہ خواہید بخوانید۔ گفتم ازیں ہر دو ہیچ نمے خواہم طلبِ حق دارم میخواہم کہ اربعین بہ نشینم و اسمائے عظام بہ نیت کشائشِ باطنی بخوانم فرمودند مبارک است حجرہ تعین نمودند و امر نخواندنِ چہل اسم نمودند۔''

(روائح الانفاس قلمی ص ۱۳)

چونکہ یہ وظیفہ اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق عمل میں آیا تھا، کچھ ترقی نہ ہوئی۔ حضرت نے چلّہ سے فارغ ہونے پر پوچھا کچھ فائدہ ہوا۔ آپ نے جواب دیا کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ بلکہ پہلے کے مقابلہ میں دل کو زیادہ تاریک پاتا ہوں۔ حضرت نے فرمایا فائدہ نہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ چلہ کشی تم نے اپنے اختیار اور ارادہ سے کی تھی۔ اب جاؤ اور استنجے کے کلوخ لے کر آؤ۔ آپ نے جنگل میں ڈھیلے فراہم کئے اور ایک ایک اپنے رخساروں پر گھس کر صاف کیا ٹوکری بھری اور اُٹھا کر چلنے کا عزم کیا۔ فرماتے ہیں کہ ٹوکری سر پر رکھتے ہی مجھ پر وہ کیفیت طاری ہوئی جو بیان سے باہر ہے۔ ٹوکری کو اپنے سر سے ایک گز بلند معلق پایا۔ سوچا کہ اس عالم میں تنہائی کے راستے سے گذر جانا بہتر ہے۔ تاکہ شاہراہِ عام پر اِس چیز کا اظہار نہ ہو اور اسی طرح حضرت کے دولت کدہ پر آ پہنچے۔ مسیح الاولیاء دروازے پر کھڑے تھے اپنے دونوں ہاتھوں سے ٹوکری اتاری اور بابا فتح محمد کو دیکر فرمایا لے جا کر بالاخانہ پر حفاظت سے رکھو یہ انہوں نے بہترین کیفیت کے عالم میں پیش کئے ہیں۔ اسی طرح ایک سال تک آپ کا یہی شغل رہا۔ ایک روز دیگر مریدوں کو چلّہ میں

بٹھانے کا ذکر آیا۔ آپ سے بھی پوچھا چلّہ میں بیٹھو گے۔ آپ نے جواب دیا حضور چلّہ نشینی سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ میں تو کلوخ لانے سے بہت خوش ہوں۔ آپ نے فرمایا بھائی حصولِ مطلب نہ کلوخ لانے سے ممکن ہے اور نہ چلہ نشینی سے بلکہ مرید کے لئے ہر شئے کا حصول پیر کے حکم کی تعمیل پر مبنی ہے۔ آخر الامر آپ چلّہ میں بیٹھے اور فتح الباب کے ساتھ ہی فارغ ابواب تک پہنچ گئے۔ دیدۂ بصیرت نورِ معرفت سے پُرنور ہوگئے اور سینہ تجلیاتِ عرفانی سے معمور۔ بڑے اعتماد سے فرماتے تھے کہ درحقیقت مرید بمنزلہ مریض کے ہوتا ہے اور پیر طبیب حاذق۔ مریض کو طبیب کے حکم کے مطابق ہی دوا کھانی چاہئے۔ اپنی مرضی سے اگر مختلف الخواص دوائیں استعمال کرلے گا تو ہلاک ہوجانے کا اندیشہ ہے۔

روحانی علوم اور عرفانی تعلیم کے ساتھ ساتھ مسیح الاولیاء نے اپنے شاگرد رشید کو علومِ ظاہر، شعر و ادب اور عروض، ریاضی، منطق وغیرہ میں بھی طاق کردیا تھا۔ معرفت کے سلسلہ مین آپ کا لقب رازِ الٰہی تھا اور فنِ شعر میں برہان تخلص کرتے تھے، عربی ادب پر بھی آپ کو منتہیانہ عبور حاصل تھا۔ آپ کی تصانیف سے ہر چیز کا نمونہ پیش کیا جائے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

مذکورۃ الصدر اربعین سے عروج و ارتقاء کی حالت میں فارغ ہونے کے بعد مسیح الاولیاء نے آپ کو خلافت عطا فرمائی۔ لیکن آپ نے عرصہ تک کسی کو مرید نہ کیا۔ اول تو ادب مانع تھا کہ مرشد کی موجودگی میں مشیخت کا کاروبار شروع کرنا اچھا نہ معلوم ہوتا تھا۔ دوسرے حکم مکرر کا انتظار بھی تھا۔

آپ کی دو حرم تھیں، پہلی بیوی تو آپ کی ماموں زاد بہن تھیں، ان کے بطن سے اولاد بھی ہوئی، لیکن زندہ نہ رہی۔ حضرت مسیح الاولیاء نے شیخ فرید کی دختر کریم النساء سے آپ کی دوسری شادی کرادی۔ شیخ فرید ابن شیخ عبدالحکیم ابن شاہ بہاء الدین باجن رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند اور اس درسگاہ کے سجادہ نشین ہونے کے علاوہ مسیح الاولیاء کے تربیت یافتہ، مرید اور خلیفہ تھے۔ حضرت نے اپنے بڑے فرزند شیخ عبدالستار کے ساتھ یکساں طور پر ان کی تعلیم و تربیت فرمائی۔ وہ بھی حضرت کی خدمت و شرفِ حضوری کو سعادت ابدی جانتے تھے۔ اور باوجودے کہ جد و پدر کی خانقاہ اور آبائی مکانات میں وافر گنجائشیں تھیں لیکن شیخ فرید نے مستقل طور پر حضرت کے قرب کے خیال سے آپ کی خانقاہ کے متصل زمین خرید لی تھی۔ اور جب انہیں آبائی مسند ہدایت کی طرف (مسیح الاولیاء کے وصال کے بعد) رجوع ہونا پڑا تو یہ زمین حضرت شیخ برہان الدین راز الٰہی کو نذر کردی۔ چنانچہ آپ کا مقبرہ، مسجد، دیوان خانہ اور دیگر مکانات اسی سے ملحقہ زمین پر ہیں۔ شیخ فرید نے یہاں ایک مختصر مکان بنوایا تھا جو بقول مولوی بشیر محمد خان صاحب فیض خانہ کہلاتا تھا۔

آپ کے خلافت سے مشرف ہونے کے بعد آپ کی حرمِ اول نے مسیح الاولیاء سے بیعت ہونے کی تمنا کی۔ آپ نے حضرت سے التماس کی تو حکم ہوا کہ تم کو میں نے خرقہ خلافت کے ساتھ ساتھ مرید کرنے کی اجازت بھی دے رکھی ہے تم خود اپنی بیوی کو مرید کیوں نہیں کرتے۔ چنانچہ آپ نے حکم مکرر کی بشارت پا کر انہیں مرید کرلیا۔ اس طرح آپ کی اہلیہ صالحہ آپ کے مریدین میں سردفتر ہیں۔ اس کے بعد آپ دیگر لوگوں کو بھی مرید کرنے لگے اور آگے چل کر یہ سلسلہ اس قدر عروج پر آیا کہ علماء وفضلا، امراء مشائخ ہر طبقہ کے لوگ اس کثرت سے آپ کے حلقہٗ ارادت میں منسلک ہوگئے جن کی تعداد کا احاطہ مشکل ہے۔

مرشدِ طریقت حضرت مسیح الاولیاء کی نگاہ میں آپ اس قدر محبوب ومکرم تھے کہ وہ اپنے نجی معاملات میں بھی آپ کو دخیل وشریک رکھتے تھے۔ حضرت بابا فتح محمد کے ہاں فرزند پیدا ہوا۔ خادمہ بچہ کو مسیح الاولیاء کے پاس لائی۔ آپ نے فرمایا اسی طرح شیخ برہان کے پاس لے جاؤ وہ اس کا نام رکھ دیں گے۔ خادمہ نے وہاں پہنچ کر مسیح الاولیاء کے ارشادِ گرامی سے آپ کو باخبر کیا تو آپ نے مسکرا کر بچہ کو ایک نظر دیکھا اور جو گلوری چبا رہے تھے، اس میں سے ذرا چبایا پان بچہ کے منہ میں دے کر کہا لے جاؤ۔ خادمہ نے کہا کہ نام تو آپ نے رکھا ہے نہیں۔ فرمایا جاؤ نام بھی رکھ دیا ہے۔ خادمہ نے واپس لے جا کر مسیح الاولیا کو دکھایا اور کہا اُنہوں نے نام نہیں رکھا۔ حضرت نے بچہ کو پان سے سرخرو دیکھ کر فرمایا خوب! بچہ کا نام شہاب الدین رکھا ہے۔ شہاب الدین آپ کی اس عطا کردہ نعمت کی برکت سے اپنے وقت کے جید عالم، حافظ، قاری اور صاحبِ تصانیف ہوئے اور آپ نے انہیں اپنی خانقاہ سے متصلہ مسجد میں امامت پر مامور فرمایا تھا۔

آپ دولتِ دنیا اور اہلِ دول سے طبعًا گریز رکھتے تھے۔ اورنگزیب کو اگرچہ سلطنت آپ کی توجہ اور دعا کی برکت سے حاصل ہوئی تھی۔ لیکن آپ کو شہزادہ سے اس قدر گریز تھا کہ برملا اس کی حاضری کو آپ نے کبھی پسند نہیں کیا اورنگزیب کو بھی شدت سے اعتقاد اور کامل یقین تھا کہ آپ کی دعائیں ہی کشودِ کار کا ذریعہ ہوسکتی ہیں۔ شہزادگی کی مڑک اور شخصی خودداری کو بالائے طاق رکھ کر عام لوگوں کے ہجوم میں بہ تبدیل ہیئت حاضر مجلس ہوتا رہا، لیکن آپ پہنچان جاتے اور تبرک عطا کیئے بغیر رخصت کردیتے۔ بختاور خاں نے مراۃ العالم میں بڑی تفصیل سے یہ روداد لکھی ہے۔ ایک مرتبہ تو آپ نے اورنگ زیب کو پہچان کر خطاب کیا کہ آپ کو یہ فقیر خانہ اتنا پسند آ گیا ہے کہ آپ یہاں آنے سے باز نہیں رہ سکتے۔ اس لئے میں اپنے لئے دوسرا مقام تجویز کیئے لیتا ہوں۔

آخر ایک مرتبہ اورنگ زیب نے ایک موقعہ حاصل کرکے دارا شکوہ کی خلاف شرع حرکات کی ترویج اور اپنا اسلامی اصولوں پر حکومت کرنے کا عزم ظاہر کرکے دعا کرنے کی درخواست کی

حضرت نے فرمایا ہم فقیروں کی دعا سے کیا ہوتا ہے تم بادشاہ ہو دعا کرو ہم آمین کہدیں گے۔ ہمراہیوں نے شہزادہ کے کان میں مژدہ سنایا۔ بادشاہی مبارک ہو۔

اہلِ دول سے گریز کی ایک اور روایت۔ امیر الامرا شائستہ خان کے متعلق بصراحت مطالعہ میں آئی ہے وہ اس طرح ہے کہ امیر الامرا شاہجہاں کے عہد میں برہان پور مستقر میں صوبہ جات محروسۂ دکن کی نظامت پر مامور ہوکر آئے اور اپنی فقیر دوست فطرت کے مطابق یہاں کے صوفیائے کرام سے راہ و رسم پیدا کی آپ کی خدمت میں بھی باریاب تو ہوتے تھے۔ لیکن بیعت کی تمنا قبول نہ ہوتی تھی۔ سید عبدالحی نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ شائستہ خان آگئے۔ نماز عصر کا وقت تھا جماعت تیار تھی، حضرت نے جماعت کے ساتھ نماز عصر ادا کی، جماعت میں شائستہ خان بھی شریک تھے۔ آپ نے بعد ادائے نماز جلد ہی امیر الامراء کو رخصت کردیا اور اپنے مرید نصیر خان سے کہا کہ خان جی آپ بیٹھئے میں نماز عصر کا اعادہ کرلوں، کیونکہ اس امیر کی شرکت جماعت کے باعث نماز ایسی ادا ہوئی ہے گویا نہیں ہوئی ہے، چنانچہ آپ نے حجرہ میں جاکر مکرر نماز عصر پڑھی۔ راوی کی اصل عبارت یہ ہے:

> روزے شائستہ خان بملازمت رسید وقتِ نماز عصر عنقریب بود فرض بجماعت ادا نمودند و شائستہ خان را وداع فرمودند۔ وبعد رخصت او بمیان نصیر خاں فرمودند کہ خان جی نمازے کہ بقربت شایستہ خان ادا نمودہ شد گویا کہ نکردہ آمد شما بہ نشینید کہ من اعادت کنم۔ بحجرہ خاص رفتند و نماز اعادت نمودہ باز تشریف آوردند۔ (روائح الانفاس قلمی ص۸۶)

یہ ۱۰۶۰ھ کا زمانہ تھا۔ شائستہ خان نے خانقاہ کی تعمیر اور فقراء کے مصارف کے لئے معتد بہ رقم پیش کرنی چاہی وہ بھی قبول نہیں کی گئی۔ آخر امیر الامراء نے حضرت سید شیر محمد قادری رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ اور متصلہ مسجد تعمیر کرادی۔ جس پر یہ کتبہ نصب ہے اور مسجد آج بھی اچھی حالت میں ہے۔ محلۂ چندر کلاں کے مسلمان اسی مسجد میں نماز پڑھتے ہیں۔

ناظر شائستہ خان پُر اعتماد و اعتبار — چشمۂ مہر و مروت آبِ حیوان آشکار
خواجہ ادراک از برائے بند گیہا و سجود — در ہزار و شصت سال احداث ایں مسجد نمود
(فرید سعید صدیقی)

مولوی بشیر محمد خان صاحب نے شائستہ خان کے مرید ہونے کا جو واقعہ لکھا ہے وہ اس ذکر سے ۱۳ برس بعد کا وقوعہ ہے۔ شائستہ خان کو پونہ میں سیوا جی سے جو چشمِ زخم پہنچا وہ رمضان المبارک ۱۰۷۳ھ کا سانحہ ہے۔ بادشاہ عالمگیر نے شائستہ خان کو صوبجات دکن سے تبدیل کرکے

بنگال کی نظامت پر بھیج دیا۔ وہ بنگال جاتے ہوئے برہان پور آئے اور حضرت سے بیعت ہونے کے لئے باصرار و التجا خود کو پیش کیا۔ اس قدر طولانی امیدواری کے علاوہ جوان بیٹے کے تازہ داغ خوردہ امیر الامرا کے اصرار و التجا کو حضرت رد نہ کر سکے اور انہیں مرید کرلیا۔

آپ کی قناعت پسندی کا یہ عالم تھا کہ جب اپنے خسر کے عطا کردہ مکان میں منتقل ہوئے تو اکثر فرمایا کرتے کہ اس وسیع مکان کی سکونت سے دل میں تنگی سی محسوس ہوتی ہے۔ حالانکہ فیض خانہ آپ کے سابقہ تنگ مکان سے برائے نام ہی وسعت رکھتا تھا۔

مولوی بشیر محمد خان صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب آپ نے مکان کی کھپریل بنوائی تو بعض احباب نے کہا کہ کھپریل کے نیچے چھت بنانی چاہئے کہ گرد و غبار سے حفاظت ہوجائے۔ آپ نے پوچھا کتنی بلند ہونی چاہئے۔ نصیر الدین معمار نے عرض کی اتنی بلند ہونی چاہئے کہ اگر چار پائی پر کھڑے ہوکر دستار باندھیں تو ہاتھ کی گردش میں مزاحم نہ ہو۔ آپ نے فرمایا نہیں صرف اتنی اونچی ہونی چاہئے کہ چارپائی پر بیٹھ کر دستار باندھ سکیں۔ پھر فرمایا کہ چونہ اینٹ سے نہ بنائی جائے۔

نواب میر عسکری عاقل خان بھی ایک صاحبِ منصب امیر تھا۔ دہلی اور لاہور جیسے مرکزی مقامات کی حکومت پر فائز رہ چکا تھا۔ صاحبِ سیف ہونے کے ساتھ ساتھ برجستہ نگار اہلِ قلم بھی تھا۔ حاضرِ خدمت ہوکر مرید ہوا اور امارت ترک کرکے سادگی سے زندگی بسر کرنے لگا اور آپ کی نسبت سے بجائے عسکری کے رازی تخلص اختیار کیا۔ آپ کے ملفوظات مرتب کرکے ثمرات الحیات کے نام سے موسوم کیے، نیز فقرا اور درویشوں میں بے تکلیف اٹھنا بیٹھنا شروع کیا۔

ایک مرتبہ عاقل خان موصوف نے حاضر خدمت ہوکر اپنا ایک واقعہ سنایا کہ میں تفریحاً حضرت شاہ بھکاری قدس سرہٗ کے روضہ پر جا نکلا، وہاں چند آزاد کیش قلندر بھنگ گھونٹ رہے تھے۔ تیار ہوجانے پر اُنہوں نے دور شروع کردیا اور ایک پیالہ بھر کر مجھے بھی دیا۔ مجھے نزلہ کی شکایت ہے میں نے شائستگی سے معذرت کی اور پینے سے باز رہا۔ آپ نے فرمایا کہ ان کی دلجوئی کے لئے کم از کم پیالہ لبوں تک پہنچا لیتے تو بہتر ہوتا۔ اور یہ اصلاحِ نفس اور رعونت دور کرنے کا سبب ہوتا کہ نفس مکار جس صورت میں راہ پاتا ہے، دغا دیتا ہے، اس روایت کی اصل عبارت یہ ہے:

> اے عزیز روزے از مریدانِ آنحضرت عسکری نام بخدمت بازنمود کہ مرا اتفاق تفرج بسوئے روضۂ حضرت شاہ بھکاری قدس سرہٗ افتاد۔ آنجا درویشان قلندر کیشان آزاد وشال بودند و بنگ می سائیدند چوں نوبت بدورِ کاسہ رسید بمن جبا

نمودند۔ بہ سبب غلبۂ صفرا عذرے نمودن و بحسنِ مقال معذرتے کردم ونخوردم۔

فرمودند کہ اولی بودے کہ لب بکاسہ رسانیدید و مراعات شاں میکردید واین نیز رفع رعونت صلاح نفس بود کہ نفس مکار در ہر صورت کہ می یابد و غامیدہد۔

(روائح الانفس ص ۳۲۵)

حُبِ دنیا سے گریز کے سلسلہ میں آپ کی یہ روایت قابلِ غور ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک روز شاہ ابراہیم بکھریؒ اور شیخ محمد[1] بن فضل اللہؒ کسی مجلس میں یکجا تھے۔ شیخ محمد نے دریافت کیا کہ زمانۂ سابق میں طالبوں کو معمولی سی ریاضت سے ہی کشود کار میسر آجاتا تھا، لیکن فی زماننا ہر چند کہ طالب محنتِ شاقہ برداشت کرتے ہیں۔ پھر بھی منزلِ مقصود تک رسائی نہیں پاتے۔ شاہ ابراہیم نے جواب دیا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ہم تم گجرات میں (شیخ وجیہہ الدین علوی کے درس میں) کنز پڑھتے تھے۔ مسئلہ چاہ سامنے آیا تھا کہ جب کنواں ناپاک ہوجائے تو لازم ہے کہ پہلے مرا ہوا چوہا نکالیں اس کے بعد پانی کھینچ ڈالیں، تب کنواں پاک ہوگا۔ اور جب تک چاہ سے مُردہ چوہے کو نہ نکالا جائے کتنا ہی پانی نکال دیں ناپاک رہے گا۔ اس زمانہ میں طالبوں کا دل حبِ دنیا سے آلودہ ہے۔ جب تک حبِ دنیا دل میں موجود رہے گی ریاضت کا فائدہ نظر نہ آئے گا۔ کیونکہ ترک دنیا افضل ہے تمام عبادتوں سے اور حبِ دنیا بدتر ہے تمام گناہوں سے۔ اصل عبارت یہ ہے:

فرمودند کہ روزے شاہ ابراہیم بھکری و شیخ محمد فضل اللہ قدس سرہما در مجلسے جمع بوند۔ شیخ پرسید کہ در زمانۂ سابق طالبان رابہ اندک ریاضت فتح الباب روی نمود۔ اکنوں دریں زمانہ ہر چند طالبان ریاضات شاقہ کشند اماپے مقصود نمے برند شاہ فرمود یاد بودہ باشد آنروز کہ ماوشما در گجرات کنز میخواندیم و مسئلہ چاہ برآمدہ بود کہ چوں چاہ پلید شود اول باید کہ جیفۂ موش ازان برآرند پس آب بکشند تا پاک شود۔ واگر باوجود جیفہ موش دراں ہر چند آب بسیار کشند پاک نہ گردد و دریں زمانہ حب دنیا در دل طالباں جا کردہ است تا آنکہ ایں حبِ دنیا بدر نیاید ریاضت سودے نہ دارد۔

ترک الدنیا راس کل عبادۃ
وحب الدنیا راس کل خطیئۃ

(روائح الانفس ص ۲۵)

---

[1] آپ نائب رسول اللہ مشہور ہیں، آپ کا روضہ شیخ پورہ برہان پور میں ہے۔

درویشی (فقیر) کی حقیقت کے متعلق آپ کی تعلیم یہ تھی کہ درویشی خلوت نشینی یا پہاڑوں اور غاروں میں بیٹھ کر ریاضت کرنے یا آسمان پر پرواز کرنے کا نام نہیں ہے، بلکہ اپنے دل کو غیر اللہ سے بے تعلق کر لینے کا نام درویشی ہے۔ آپ کے الفاظ کی ترجمانی اِن الفاظ میں ملتی ہے:

درویشی خلوت نشستن و در کوہ و غار بودن و بر آسمان بر آمدن نیست، درویشی دلِ خودرا از ما سوائے حق منقطع ساختن است۔ (روائح الانفاس ص۲۴۲)

آپ کا قول تھا کہ درویشی آٹھ چیزوں پر مبنی ہے، اگر یہ صفات کسی سپاہی میں پائے جاتے ہوں تو وہ حقیقتاً درویش ہے اور کوئی درویش ہوتے ہوئے بھی ان پر کاربند نہ ہو تو فی الواقع اس کا درویشی سے کوئی تعلق نہیں اور وہ آٹھ لوازم یہ ہیں:

اول ہر وقت باوضو، ہمیشہ روزہ، کم خوراک، کم سونا، کم گوئی، لوگوں کی صحبت سے گریز، خواہشات سے اجتناب، مرشد سے قلبی لگاؤ۔

(ترجمہ روائح الانفاس ص۲۹۳)

کم گوئی کے متعلق آپ کا یہ نکتہ نہایت بلیغ ہے۔ فرماتے ہیں کہ جس طرح تمسخر کی عِلّت سے دل مر جاتا ہے اسی طرح بسیار گوئی بھی قلب کی ہلاکت کا باعث ہوتی ہے۔ اصل الفاظ یہ ہیں:

فائدہ اندر سکوت آنست کہ چنانکہ ضحک موجبِ موتِ قلب است ہمچناں تکلم بسیار ممات دل است۔

دل زبس گفتن بمیرد در بدن   گرچہ گفتارت بود در عدن

(روائح الانفاس ص۲۵۱)

مرشد سے قلبی لگاؤ پر جو ہدایات اور تمثیلات پیش کر کے آپ نے مریدین کو دلنشین درس دیئے ہیں، وہ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ ایک دو نمونے پیش کئے بغیر آگے بڑھ جاؤں تو یہ ذکر تشنہ رہ جائے گا۔ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت شیخ برہان الدین غریب قدس سرہٗ اپنے مرشد حضرت سلطان نظام الدین اولیاء کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان کے ساتھ ان کا ایک مرید تھا۔ ''سعدی دکنی'' جو قصبۂ سیر پور متصل برہانپور میں دفن ہے۔ برہان الدین غریب کی توجہ تو اپنے مرشد سلطان الاولیاء کی جانب تھی، لیکن شیخ سعدی کی توجہ حضرت برہان الدین غریب کی جانب تھی، حالانکہ یہاں مرشد کے مرشد بھی موجود تھے۔ ان کی یہ ادا سلطان الاولیاء کو بہت پسند آئی، دریافت فرمایا کہ یہ جوان سعادتمند کس کا مرید ہے۔ شیخ برہان الدین نے جواب دیا اسی بارگاہ کے خاک نشینوں میں شامل ہے۔ سلطان نے خوش ہو کر کاندھے سے چادر اتاری اور شیخ

سعدی کو اشارہ کیا کہ لو۔ شیخ سعدی نے جواب دیا کہ میرے پیر دیں گے تو لے لوں گا۔ سلطان الاولیاء نے وہ چادر حضرت شیخ بُرہان الدین غریب کو دی کہ انہیں دیدو اور انہوں نے ہی دی۔ تب شیخ سعدی نے کمال ادب سے بہ سر و چشم قبول کی۔ اصل عبارت یہ ہے:

میفر مودند کہ روزے شیخ برہان الدین قدس سرہٗ کہ در دولت آباد مدفون است در خدمت پیر خود شیخ نظام الدین اولیا قدس سرہٗ رسید شیخ سعدی[1] مرید شیخ برہان الدین مذکور کہ در سیر پور مدفون است ہمراہ بود شیخ برہان الدین متوجہ شیخ خود گشت و شیخ سعدی با آنکہ پیر پیر روبرو بود توجہہ بہ پیر خود نمود۔ این ادائے دلنشین شیخ نظام الدین گردید۔ از شیخ برہان الدین پرسید کہ این جوانِ سعادت مند از مریدانِ کیست۔ گفت از خاکسارانِ ہمیں درگاہ است۔ شیخ نظام الدین ردا از کتف بر آوردہ شیخ سعدی اشارت کرد کہ بگیر۔ شیخ سعدی بگفت کہ اگر از پیرما برسد متیواں گرفت۔ شیخ نظام الدین ردائے مذکور بہ شیخ برہان الدین داد تا بواسطۂ او برسد۔ شیخ سعدی آدابِ خدمت بجا آورد و بسر و چشم قبول نمود با آنکہ پیر پیرش بود بدو توجہہ نفرمود۔ (روائح الانفاس ص۵۲)

سعدی دکنی کو جو لوگ صرف شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں وہ غالبًا اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ شیخ سعدی دکنی کا شمار اولیائے کاملین میں ہے۔ ان کا مزار برہان پور سے چھ (۶) میل دُور ایسے مقامات پر ہے جو عرصۂ دراز سے آبادیوں سے الگ تھلگ ہے۔ لیکن آج بھی وقتِ مقرر پر ان کے عرس میں نہ صرف اطراف کے دیہات سے بلکہ برہان پور سے بھی خاص لوگ جا کر شرکت کرتے ہیں۔ آج سے تین سو سال پہلے کیا عالم ہوگا، جب کہ بُرہان پُور کے صوفیائے کاملین اور اولیائے عصر ان کے عرس میں پا پیادہ جا کر کسب فیض کرتے تھے۔ صاحب تذکرۂ ہٰذا حضرت شیخ برہان الدین راز الٰہی جن کی ولایت و مشیخت اس زمانہ میں درجۂ کمال کو پہنچی ہوئی تھی اور آپ کی عظمت و شہرت کا آفتاب نصف النہار پر ضیا بار تھا۔ شیخ سعدی کے عرس میں پا پیادہ تشریف لے گئے تھے۔ جب راہ میں آپ کو خستگی محسوس ہوئی تو قریب کے راستے سے گذرنے

---

[1] یہ روایت بجنسہ میں نے اس خیال سے درج کردی ہے کہ سعدی دکنی پر کام کرنے والوں کو اس تازہ انکشاف اور مستند دلیل کی روشنی میں چند باتوں کا علم ہوجائے جو اب تک پردہ خفا میں تھیں، یعنی سعدی دکنی کا زمانہ حیات۔ ان کا سلسلۂ بیعت اور یہیں سے بہ تاویل و تعمق دوسری راہیں بھی نکلتی ہیں۔ خصوصاً سعدی دکنی اور امیر خسرو کا ہم عصر ہونا اور روحانی تعلق کی بنا پر یکجائی اور اس تعلق کا خسرو کی ہندی (دکنی) زبان کی شاعری پر اثر۔ اور کیا امیر خسروؒ سے منسوب ہندی کلام میں سعدی کا کچھ کلام مخلوط تو نہیں۔ جیسا کہ محمود لاہوری کی خالق باری غلط فہمی بلکہ خوش فہمی سے خسرو سے منسوب چلی آرہی ہے۔ امید کرتا ہوں کہ اس دعوتِ توجہ کو قدیم اردو اور سعدی دکنی سے دلچسپی رکھنے والے نظر انداز نہ فرمائیں گے۔ (راشد برہانپوری)

کے خیال سے کسی ناشناسا کے ارابہ پر بیٹھ کر کچھ راہ طے کی۔ اب قریب کے راستے میں ایک کھیت کی خار بندی سدِ راہ تھی۔ آپ نے ایک مقام سے کانٹے دور کر کے ایک تنگ راستہ بنایا اور بہ دشواری گذر سکے۔ ہمراہی کا بیان ہے کہ اس راستہ سے نہیں گذر سکا، لہٰذا دوسرا راستہ اختیار کیا۔

اصل عبارت ملاحظہ ہو:

> روزے آنحضرت افاض اللہ علیہا وعلی العالمین برکاتہم بہ تماشائے عرس شیخ سعدی سوئے سیرپور رواں شدند۔ در راہ ماند شدند ارابۂ آفانِ کس میرفت برو سوار شدند۔ راقم دردکاب بود چوں نزدیک موضع سندکھیڑہ رسیدند از عقبِ دیہہ خواستند کہ دردے داخل آیند راہ نہ بود و خار بندی محکم داشت بشگافتند در حال شدند، اما نبوعے شگافے زوند کہ غیر را در دے یا رائے رفتن و طاقتِ در آمدن نہ بود۔ راقم ضعیف نتوانست گذشت و از راہ دیگر رسید۔

(روائح الانفاس صفر۵)

آپ مریدوں کی تلقین اور درس میں بالعموم تمثیلات سے کام لیتے تھے۔ چنانچہ عمل اور ارادہ کا فرق ظاہر فرماتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ شیخ خوب محمد چشتی گجراتیؒ کا ایک مرید ان سے ہر روز پوچھا کرتا تھا کہ حضور میں ترکِ علائق کرنا چاہتا ہوں۔ آپ جواب دیتے کہ ابھی نہیں۔ ایک دن اس نے غلبۂ جوش سے اپنا سب کچھ راہِ خدا میں لٹا کر خانہ خرابی کے بعد حاضر خدمت ہوا۔ آپ نے بے اختیار انہیں گلے سے لگالیا اور فرمایا کہ اے فرزند! ابھی تک تو تدبیر کے چکر میں تھا، جب محبتِ الٰہی نے غلبہ کیا تو نے وہ بندھن خود توڑ ڈالے، کیونکہ محبت میں تدبیر کا دخل نہیں ہوا کرتا تدبیر کا تعلق عقل سے ہوتا ہے، مگر جب محبت کا جوش پیدا ہوتا ہے تو تدبیر و عقل پر غالب آجاتا ہے۔ علامہ اقبال نے اسی مضمون متعلق کہا ہے:

> بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
> عقل ہے محو تماشائے لبِ بام ابھی

اصل عبارت سے ناظرین بھی لطف اندوز ہولیں:

> مریدے از مریدانِ شیخ خوب محمد چشتی گجراتی ہر روز مشورت ترک دنیا از شیخ می جست، شیخ اورا منع ازیں میگفت روزے آن مرید بغلبۂ جنونِ محبت ترک دنیا کردہ دخانہ تاراج گشتہ بخدمت شیخ رسید۔ شیخ اورا درکنار گرفت و گفت کہ اے پسر تا حال در تدبیر بودی چون محبت غالب گشت سر رشتہ تدبیر گسستی کہ در عالمِ محبت تدبیر نہ بود تدبیر بعقل تعلق دارد و چوں جنونِ محبت غالب گشت بتدبیر و عقل بسر آید۔ (روائح الانفاس ص ۳۴۷)

آپ کی ہدایت تھی کہ اپنے عجز و کوتاہی کو ہمیشہ سامنے رکھو اور اپنی عبادت اور مقدور پر نازاں نہ رہو، کیونکہ جو اپنے عجز و کوتاہی کو پیش نظر رکھتا ہے خدا کی رحمتیں اُس کو قوت و قدرت عطا فرماتی ہیں اور جو اپنی قدرت پر نازاں ہوتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ کا قہر و جلال بے دست و پا کر دیتا ہے۔ سلسلۂ بیان میں آپ نے ہی مرصع قطعہ ارشاد فرمایا جو بجنسہ درج کرتا ہوں۔

ترجمہ روائح الانفاس ص ۲۴۸

قطعہ

ایں طرفہ کہ در حریم قربش آں پائے نہد کہ سر نہ دارد

دیں طرفہ کہ در ہوائے وصلش آں مرغ پرد کہ پر نہ دارد

آپ کا عمل تو یہی رہا ہے کہ عبادت و نوافل میں ہمہ اوقات منہمک و مشغول رہتے تھے۔ لیکن کاروباری اور فرائض منصبی پر مامور لوگوں کو ان کے متعلقہ امور میں دلچسپی اور انہاک سے انجام دینے کی تاکید فرماتے تھے اور فرماتے تھے کہ جن شخصیتوں کی ذات سے عام لوگوں کی رفاہ و کاروبار تعلق رکھتا ہے۔ اگر وہ لوگ درود و نوافل میں مشغول ہوں گے تو ان کی یہ طاعات قبولیت کا درجہ نہ پاسکیں گی۔ بلکہ وہ حق سے قریب ہونے کے بجائے دور ہوجائیں گے۔ ان لوگوں کی ایک مختصر فہرست بھی دی ہے جو بجنسہ درج ہے جس کا مفہوم نتیجتاً یہی ہے کہ خدمت خلق ورود و نوافل سے افضل ہے۔

آں کسے کہ حصول کاروبار مردم بد و تعلق دارد از بادشاہ ووزیر ورئیس وقاضی و مفتی ومدرس ودیوان وبخشی وعہدہ دار لنگر فقراء و مساکین و غیر آں وادبورد و نوافل مشغول شود از حق دور افتد و بدرجۂ قبول نرسد۔ (روائح الانفاس ص ۳۸۶)

حضورِ قلب طالبانِ حق کے لئے نہایت ضروری شرط ہے اس کی تلقین کے متعلق فرماتے ہیں کہ ارباب طریقت واصحابِ حقیقت کا قول ہے کہ اگر انسان کعبہ شریف میں داخل ہوکر بھی ربِ کعبہ میں مشغول نہیں ہے تو گویا وہ بتخانہ میں ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص بُت خانہ میں بیٹھ کر ربِ کعبہ کے تصور میں مستغرق ہو تو وہ گویا کہ کعبہ میں ہے۔ چنانچہ اگر تو یمن میں ہے لیکن میرے تصور میں ہے تو گویا میرے روبرو ہے۔ لیکن اگر میرے سامنے ہوکر بھی مجھ سے بے تعلق ہے تو گویا یمن میں ہے۔

اس ملفوظ کی عبارت اور شعر یہ ہے:

اربابِ طریقت و اصحابِ حقیقت گفتہ اند کہ اگر در کعبہ باربِ کعبہ مشغول نیست در حقیقت اندر کنیف است و اگر در کنیف است وباربِ کعبہ مشغول است اندر کعبہ است۔

شعر

گر در یمنی تو بامنی پیش منی　　　در پیشِ منی و بے منی در یمنی

(روائح الانفاس ص ۲۴۵)

اطاعت نفس کو آپ بہت برا سمجھتے تھے اور اس سے بچنے کی تلقین اس تمثیل کے ساتھ کرتے تھے کہ اربابِ طریقت کی تاکید ہے کہ نفس کی اطاعت سے جو نفس کی اطاعت ایسی ہے جیسی کُتے کی اطاعت بلکہ کُتے کی اطاعت کرنا نفس کی اطاعت کرنے سے بہتر ہے۔ نیز فرماتے تھے کہ حدیث میں وارد ہے کہ اگر دو شخص ہم سفر ہوں تو لازم ہے کہ ایک امیر اور دوسرا مامور ہو۔ اس میں یہ مصلحت ہے کہ ایک دوسرے کی اتباع کرے گا تو دونوں کو خودرائی اور اتباع نفس کا موقعہ نہ ملے گا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض درویش قلندر کیش کُتا، بکری، یا اور کوئی جانور پال لیتے ہیں تاکہ انہیں نفس کی محکومی سے نجات ملے۔ (ترجمہ روائح الانفاس ص ۲۴۶)

ایک مرتبہ بعد ادائے نماز جامع مسجد (برہان پور) سے باہر نکلے اور لعل باغ کی سیر کو روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچ کر سہ گوشہ حوض تک تشریف لے گئے جو باغ مذکور کے آخری گوشے میں ہے، وہاں ایک آزاد مشرب قلندر معصوم نام گوشہ نشین تھا۔ اس کے قریب سے ہوکر راوٹی میں تشریف لائے جو حوض پر بنی ہوئی ہے۔ آپ بیٹھے ہی تھے کہ قلندر مذکور کا کتا بھونکتا ہوا دوڑا اور حضرت کے قریب ہونے لگا تو آپ نے سید عبدالحی جامع ملفوظات ہذا کو حکم دیا کہ لکڑی سے اس کو بھگادو۔ سید صاحب موصوف نے بہت کوشش کی لیکن وہ کتا بھگایا نہ جاسکا۔ حضرت نے فرمایا لکڑی پھینک دو کتا باز نہیں آئے گا اور مسکرا کر فرمایا: اس درویش کا مشرب مالکی ہوگا کیونکہ اس مشرب کے لوگوں کے لئے کتا پالنے میں کراہت نہیں ہے۔ پھر وہاں سے اُٹھ کر روانہ ہوگئے۔

یہاں اصل عبارت پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جو حسبِ ذیل ہے:

روزے بعد ادائے نماز بروں آمدند از مسجد جامع و متوجہ سیر لعل باغ شدند چوں بحوض سہ گوشہ کہ آخر باغ است تشریف قدوم میمنت لزوم بردند۔ آنجا درویشی آزاد کیشے معصوم نام منزدی بود نزدیک دے شدند و اندر راوٹی کہ براں حوض مذکور است جلوس فرمودند اتفاقاً سگے کہ ازانِ آن آزاد و گدائے بے زاد بود شوخی نمود بحدے کہ قریب آنحضرت جل اسمہ بر سید راقم ضعیف را اشارت فرمودند کہ چوب دردست گرفتہ این سگ را منع نمائی کہ نزدیک من نیاید، چوبے دردست گرفتم و آں را منع نمودم۔ لیکن چوں سگ بغایت شوخ بود از منع بعض نماند فرمودند کہ چوب را بگذار کہ ایں سگ بمنع نخواہد آمد و تبسم نمودہ فرمودند کہ

طریقہ ایں درویش مالکی است وعند المالک درست است و چنداں اکراہ نیست
از آنجا بر خاستند و رواں شدند۔ (روائح الانفاس ص ۲۳۸)

اسی طرح ایک مرتبہ فرمایا کہ شیطان کی مثال کتّے کی مانند ہے کہ جب وہ آدمی کے پیچھے پڑ جاتا ہے تو اُس وقت تک دُور نہیں ہوتا، جب تک اُس کا مالک اسے باز نہ رکھے اور تمثیلاً فرمایا کہ ایک روز مجھے پنچ باؤلی جانے کا اتفاق ہوا جو دریائے (تاپتی) کے کنارے ہے۔ وہاں ایک کتا مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں نے عصا سے روکنے کی ہر چند کوشش کی، لیکن وہ دور نہ ہوا۔ شیخ حسین ہمراہ تھے۔ اُنہوں نے بھی کوشش کی مگر وہ کتا باز نہ آیا۔ اس کتے کے مالک جوگی نے آواز دی تب وہ فوراً ہمیں چھوڑ کر اپنی جگہ جا بیٹھا۔ اس روایت کی اصل عبارت یہ ہے:

مثل شیطان چوں سگے است کہ چوں در آدمی افتد دفع نہ شود مگر آن کہ خداوند سگ اورا باز دارد۔ چنانچہ روزے مرا گذر بر پنچ باؤلی افتاد کہ بہ لبِ دریاست۔ سگے در من افتاد بعصا رو میکردم دفع نمی شد شیخ حسین ہمراہ بود او نیز جہد بلیغ نمود سودے نہ داشت آخر الامر خداوندش کہ جوگی بود سگ را آواز داد و طلب داشت فی الحال از من دور شد و بجائے خود سکوت گرفت۔

(روائح الانفاس ص ۳۷۲)

فرماتے تھے کہ مومن کے حق میں اگرچہ بحکم حدیث ظن المومنین خیرا بدظنی کرنا مذموم ہے۔ لیکن امام محمد غزالی قدس سرہٗ کا تو قول ہے کہ کافر کے حق میں گمانِ نیک ہی رکھنا چاہئے۔ ممکن ہے وہ ایمان لانے کی توفیق پاکر اسلام قبول کرے۔ اسی لئے کافر کی غیبت کرنا بھی بُرا ہے کیونکہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ غیبت زنا سے بھی زیادہ بُرا فعل ہے اور اس کا اطلاق مومن و کافر دونوں پر ہوتا ہے۔

بُری سے بری چیز میں بھی کوئی اچھائی ہوتی ہے۔ تمام قسم کی گندگی کس قدر حقیر اور مکروہ چیز ہے۔ جب وہ کھاد کے طور پر استعمال کی جاتی ہے تو اس کے اثر سے میووں کی بالیدگی اور پختگی میں بڑی مدد ملتی ہے۔ کتا جو کہ جانوروں میں بھی بدترین جانور ہے۔ لیکن اس میں دس خصلتیں اولیاء اللہ کی ہوتی ہیں۔ اس سلسلۂ بیان میں کہ کسی کو چشم حقارت سے نہ دیکھو حسبِ ذیل ہم طرح اشعار درج ہیں جو بجنسہ نقل کئے ہوں۔

حضرت معروف کرخی قدس سرہٗ العزیز

مگس را بچشمِ حقارت مبیں — کہ اوہم دریں بارگہ مہتر است

حضرت جنید بغدادی قدس سرہٗ العزیز

زخارے بہ پرہیز کو خنجرے است زمورے حذر کن کہ اوصفدرے است

حضرت ابوبکر شبلی قدس سرۂ العزیز

مرنجاں دلِ خستۂ پشہ را کہ از ہر دلے سوئے حضرت دریست

حضرت بہلولؔ دانا قدس سرۂ العزیز

خرابات را نیز عزت بدار کہ او نیز در ملکِ حق کشوریست

حضرت منصور حلاج قدس سرۂ العزیز

بکفر و باسلام یکساں نگر کہ ہر یک زدیوانِ او دفتریست

حضرت جندی (مسیح الاولیا شیخ عیسیٰ جنداللہ) قدس سرۂ العزیز

زدہلیز تا صفۂ خانہ بیں کہ ہر خانہ را سوے حضرت دریست

راقم ملفوظات سید عبدالحی حسینیؒ نے بھی اپنا شعر لکھدیا ہے۔

حقارت مکن ذرّہ خستہ را کہ ہر ذرہ از نورِ او انوریست

(روائح الانفاس ص ۳۲۱)

اسی طریقہ پر ملامتیہ فقرا کی نسبت بھی آپ کے خیالات ظن المؤمنین خیرا کی تفسیر تھے۔ فرماتے تھے کہ یہ لوگ جیسے بظاہر نظر آتے ہیں بہ باطن ویسے نہیں ہوتے۔ ایسا بھی ہوتا ہے ایک درویش علی الصبح بیدار ہوا اور اپنے حجرہ میں اول وقت نمازِ فجر ادا کی اور باہر نکل کر مسجد میں ایسے مقام پر آ بیٹھا کہ نمازی لوگ اس کو نماز میں شریک نہ دیکھ کر تارک الصلوٰۃ اور نفرت کریں۔ اس سلسلہ میں حضرت بایزید بسطامی قدس سرۂ کی ایک نقل بیان فرمائی کہ آپ ایک شہر میں ماہِ صوم میں وارد ہوئے۔ آپ کی عظمت و شہرت کے پیش نظر آپ کے گرد لوگوں کا ہجوم ہونے لگا۔ یہاں تک کہ آپ تنگ آ گئے۔ دفعۃً آپ نے دیوانوں کی سی حرکات شروع کر دیں۔ بازار کا موقع تھا لپک کر نان بائی کی دوکان سے ایک روٹی اُٹھالی اور ایک ڈوری میں پروکر گردن میں لٹکالی اور دانتوں سے کتر کتر کر کھانے لگے۔ جو لوگ حسنِ اعتقاد سے آپ کے گرد جمع ہو گئے تھے بد اعتقاد ہوکر بھاگ کھڑے ہوئے۔

سلطان العارفین نے اپنے مرید سے جو ہمراہ تھا فرمایا۔ دیکھا میں نے ایک شرعی مسئلے کی خلاف ورزی نہ کرتے ہوئے لوگوں کے ہجوم کو اپنے سے گریزاں کر دیا اور خود ان کی مزاحمت سے ایمن ہوگیا۔

اس مسئلہ کی تاویل اصل عبارت میں ملاحظہ ہو۔

''سلطان العارفین با مریدے کہ با خود داشت گفت کہ بیک مسئلہ شرعی عالمے را از خود دور ساختم و از مزاحمتِ خلائق امان یافتم۔ کہ در رمضان مسافر را خوردن

رواست و نان از دوکان غلامِ خود گرفتن نہ خطا ست زیرا کہ غلام چوں مملوک بود نانش نیز مملوک باشد حاجت بہ رخصت چہ باشد و اندر بازار مسافر را خوردن ممنوع نہ باشد و نان بگلور او یختن نیز منع نیست و بدندان خوروں حرام نہ۔''

(روائح الانفاس ص ۳۳۷)

آپ کا قول تھا کہ مرشد کامل وہی ہے جس کی صحبت میں مرید کا دل دنیا کی طلب سے متنفر ہوجائے اور فانی لذتیں اور جلد ختم ہوجانے والی راحتیں اس کو تلخ معلوم ہوں۔ اور وہ ذکرِ حق سے مانوس ہوجائے اور محبت دنیا اور آخرت کے نقوش اُس کی لوح دل سے مٹ جائیں۔

ایک مرتبہ یہ نقل آپ نے بیان فرمائی کہ حضرت شیخ الاسلام شیخ غوث گوالیری رضی اللہ عنہ نے غار چنار میں ایک چشمہ پر وضو فرمارہے تھے یکا یک ایک بڑا سانپ آنکلا اور شیخ کو ڈس لیا۔ آپ کو تو کوئی گزند نہ پہنچا۔ البتہ وہ سانپ اسی وقت مرگیا۔ اسی غار میں ایک جوگی بھی گوشہ نشین تھا۔ جب اس نے یہ کیفیت دیکھی دوڑا آیا اور قدمبوس ہوکر شیخ سے کہا کہ آپ ''سدہ'' ہوگئے ہیں یعنی کامل ہوگئے ہیں۔ حضرت نے فرمایا تم نے کیسے جانا۔ اس نے کہا ہم لوگوں کی ریاضت کی کتابوں میں لکھا ہے کہ جس انسان کو ایسی حالت میسر آجائے وہ کاملِ ہوتا ہے۔ اصل عبارت یہ ہے:

حضرت شیخ الاسلام والمسلمین حضرت شیخ محمد غوث رضی اللہ عنہ اندر غار چنار برسر آبے وضوی ساختند۔ در آن اثنا اژدہائے بزرگ در رسید ورانِ شیخ رابگزید، بمجرد گزیدن آن مار بمرد وجاں داد۔ جوگی کہ دران غار بریاضت مشغول بود چوں ایں کیفیت معائنہ کرد رواں دواں بہ پابوس حضرت شیخ مشرف شد وگفت شما ''سُدّہ'' شدید یعنی کامل گشتید۔ حضرت شیخ فرمودند کہ چگونہ دانستی و بچہ نوع شناختی۔ گفت در کتب ریاضۃ من مسطور است کہ اگر آدمی را چنین حالت دست دہد کامل باشد۔ (روائح الانفاس ص ۳۸۰)

جاہل صوفیوں کے عقائد کے متعلق ملفوظات میں آپ سے حضرت شیخ عبدالحق (غالباً شیخ عبدالحق محدث دہلوی) کی ایک ملاقات اور باہم سوال و جواب پر مبنی ایک روایت ملتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ایک دن حضرت شیخ عبدالحق مجھ سے ملنے کے لئے تشریف لائے۔ تنگ مکان میں بیٹھنے کی گنجائش نہ تھی اس لئے مکان کے قریب ہی شیخ شرفو کی مسجد تھی، وہاں جا بیٹھے۔ جب نماز کا وقت ہوا تو ہم نے ادائے نماز کا ارادہ کیا۔ شیخ عبدالحق نے فرمایا پہلے میرے دوسوالوں کا جواب دیدیجئے۔ پھر نماز پڑھیں گے۔ میں نے کہا دریافت کیجئے۔ انہوں نے کہا: ۱۔ بعض جاہل صوفیوں

کا عقیدہ ہے کہ تمام دریا مچھلی ہوگیا اور اس کے سوا اس میں کچھ باقی نہ رہا۔ دویم یہ کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نسبت کس قسم کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ میں نے کہا، پہلے میں نماز پڑھ لوں، پھر جواب دوں گا۔ چنانچہ میں نے نماز ادا کر کے پہلے سوال کے جواب میں حضرت مولانا جامیؒ کی رباعی کا ایک شعر پڑھا:

ترجمہ یہ ہے:

(اے اللہ) جہاں تیری کبریائی کا کمال جلوہ افگن ہے (وہاں) تمام دنیا تیرے بحرِ جود و کرم کا ایک قطرہ ہوتا ہے۔ دوسرے سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تین مراتب معین ہیں۔ ایک مرتبہ حدیثِ لی مع اللہ وقت الخ دوسرا مرتبہ دعوت و رسالت کا ہے جس کے مطابق آپ لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتے تھے۔ تیسرا مرتبہ بشریت کا جس پر آیہ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ ناطق ہے۔ آپ کا سوال ان میں سے کون سے مرتبے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ سُن کر وہ کھڑے ہوگئے اور احترام کے ساتھ میرے ہاتھوں کو بوسہ دے کر فرمایا مجھے شبہ تھا جو دور ہوگیا۔ اصل عبارت یہ ہے:

> می فرمودند کہ شیخ عبدالحق روزے بزیارت من آمد۔ سلب آنکہ در خانہ جائے نشستن تنگ بود۔ در مسجد شیخ شرفو کہ قریب خانہ بود اجلاس نمودیم چوں وقت نماز شد قد ادائے صلوٰۃ کردیم شیخ مذکور گفت کہ اول از شما دو چیزمی پرسم بعد جواب آن ادائے صلوٰۃ نمایم۔ گفتم بگوئید۔ گفت اول آنست کہ اعتقاد بعضے از صوفیان جہال آنست کہ دریا تمامی ماہی شد و بقیہ از و ہیچ نماندہ۔ دوم آن کہ شمارا برسول صلی اللہ علیہ وسلم چہ نوع اعتقاد است۔ گفتم اول نماز خود ادا نمایم بعدہ جواب دہم۔ بعد فراغ صلوٰۃ در جواب سوال یک بیتے از رباعی مولوی جامیؒ برخواندیم کہ گفت۔ بیت
>
> آنجا کہ کمال کبریائی تو بود   عالم نمے از بحار عطاے تو بود
>
> و در جوابِ دوم گفتم کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم را سہ مرتبہ مقرر است یکے مرتبہ لی مع اللہ وقت۔ الحدیث۔ دوم مرتبہ مرتبہٴ دعوت و رسالت کہ بداں خلق را بحق دعوت میکرد سوم مرتبہٴ بشریت کہ آیہٴ انما انا بشر مثلکم بداں ناطق است ء شما از کدامی مرتبہ سوالے دارید؟ برخاست و بحرمت تمام دستِ من بگرفت و بوسہ داد و گفت کہ مراشبہٴ بود برطرف شد۔ (روائح الانفاس ص ۲۷۶)

اہلِ فنا اور علماء کی صحبت کے فوائد سمجھاتے ہوئے اپنے مرشد حضرت مسیح الاولیاء کے ایک مصرعہ کے مفہوم سے متعلق فرمایا کہ ایک پل اور ایک لمحہ اہلِ فنا کی صحبت میں رہنا دنیا بھر کی ریاضتوں اور مجاہدات سے بہتر ہے۔ اس لئے کہ ریاضت و مجاہدہ کا مقصد دولت فنا کا حاصل کرنا ہے اور یہ چیز اہلِ فنا کی صحبت سے دم بھر میں حاصل ہوجاتی ہے اور ان صاحبانِ کمال کی ادنیٰ توجہ کی برکت سے یہ نعمت میسر آجاتی ہے یہاں آپ نے ایک فارسی شعر اور ایک ہندی دوہا پڑھا۔ یہ رنگین عبارت ملفوظات میں اس طرح مرقوم ہے:

از حضرتِ عین العرفا مسیح الاولیاء قدس سرہ در معنی ایں مصرعہ کہ دمے پیشِ دانا بہ از عالمے است میفر مودند کہ لمحہ ولحظہ در خدمت صاحب فنا بودن بہ از عالم ریاضیات و مجاہدات است یوم عند ربک کالف سنۃ مما تعدون۔ زیرا کہ بریاضت حصولِ دولت فنا محتمل است و اگر در صحبت صاحبِ فنا بتوجہ دمے بہ نشیند از برکت توجہ او بدرجۂ حالتِ فنا رسد۔ بیت

پیر رہ کبریت احمد آمدہ سینہ او بحرِا خضر آمدہ

پیر کامل طلب کہ مسِ تر زرِ خالصِ ساز دواز قلب سیاہ دور اندازد۔ بیت

باشد کہ وارہاند مار از من زمانے روشنضمیر پیرے یا خوبرو جوانے

مراد از جوان خوبرو طالب صادق است کہ روے دل مصفا از کدورت بشریت دار دو پیر روشنضمیر مرشدِ کامل است ایں جا ایں دوہرہ میخوانند۔

دوہا

اندھی اندھا ٹھیلیا دونوں کنوئیں پر نت

جس کے گُر سود و بنا چیلا کیوں ترِنت

شیخ نظام تھانیسری نقل میں نمودند کہ مراد از کور اول پیر صاحب فنا است کہ از شہود غیر نابینا است واز کور ثانی طالب کہ از مشاہدۂ عین بے بصر است۔ وقتے کہ کورِ اوّل کہ مرشد است بکورِ ثانی کہ طالب است صدمہ توجہ زندوراں حالت ہر دو در چاہِ فنا افتند و در لجۂ توحید مستغرق آیند۔ آرے ہر کرا مرشد غرق بحرِ فنا ونیستی آید طالبش بہ حاحل فنا اکتفانہ نماید۔ (روائح الانفاس ص۳۳)

فنا و بقا کے مسئلہ میں ایک اور مقام پر حضرت مسیح الاولیاء کے حوالے سے یہ روایت مذکور ہوئی ہے کہ آپ (مسیح الاولیاء) فرماتے تھے۔ بعضے مشائخ فنا کا عقیدہ رکھتے ہیں اور بعضے بقا کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے سلسلہ میں فنا کا وجود ہی نہیں ہے بجز بقا کے۔ اس کا سبب یہ

ہے کہ پہلے گروہ میں وہ لوگ ہیں جو مدتوں فنا کی حالت میں رہے بعد میں انہوں نے بقا کا مقام حاصل کیا۔ چنانچہ اُنہوں نے دیکھا ہے کہ بغیر فنا کے بقا کا مقام حاصل نہیں ہوتا۔

دوسرے وہ لوگ ہیں، جنہیں فنا کے درجہ میں تھوڑا ہی عرصہ رہنے کے بعد بقا کی منزل تک رسائی ہوجاتی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ درجۂ فنا کے قائل نہیں ہیں۔

میفر مودند کہ حضرت عین العرفا رضی اللہ عنہ میفر مودند کہ بعضے از مشائخ قائل بہ فنا اند۔ وبعضے قائل بہ بقا و گویند کہ در سلسلۂ ما فنا نیست الابقا۔ واین سبب آں است کہ طائفۂ اول رامُدتے در حالت فنا داشتند بعدہ بمقام بقا رسانیدند ایشاں دیدند کہ بے فنا بقا میسر نیست۔ وطائفۂ ثانی را اند کے در حالتِ فنا داشتند بعدۂ بدرجۂ بقار سانیدند۔ ایشان را در کیفیت فنا درنگ نہ شد فی الحال بمقام بقا رسیدند۔ بہرہمیں قائلِ فنانیستند۔ (روائح الانفاس ص۳۶۲)

ایک دن آپ کے ایک مرید نصیر خان[1] نے دریافت کیا کہ عشق درحقیقت کیا شے ہے؟ اس اثنا میں عبدالسلام درویش آگئے اور سلام کرکے بیٹھ گئے (آپ نے ان سے مخاطب ہوکر فرمایا: میاں عبدالسلام نصیر خاں (نہیں آپ از راہ محبت خانجی کہتے تھے) پوچھ رہے ہیں کہ عشق کی حقیقت کیا ہے؟ تم آگئے ہو بتاؤ کہ فی زمانہ عشق کے کیا معنیٰ ہوتے ہیں۔ درویش نے بے ساختہ نعرہ مارا اور اُچھل کر زمین پر گر پڑا۔ آپ نے نصیر خان کو توجہ دلاکر فرمایا خان جی عشق کے معنی یہ ہیں جو تم دیکھ رہے ہو۔ اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ عشق ایسی حالت کا نام ہے جو الفاظ میں بیان نہیں کی جاسکتی۔ جب تک عشق کی حالت طاری نہ ہو بیان کرکے سمجھانا دشوار ہے۔

روزے مولانا نصیر خان پرسید کہ معنی عشق چہ باشد۔ دریں اثنا عبدالسلام درویش آزاد کیش در رسید و سلام دادہ بہ نشست فرمودند کہ میاں عبدالسلام خانجی از معنی عشق استبصار می نمودند شمار سیدید بگوئید درہمیں زمان معنی عشق چہ باشد۔ شہقۂ از ودر وجود آمد و برجست و بر زمین افتاد۔

فرمودند کہ خانجی معنی عشق این است کہ دیدید وایں اشارہ بود بآں کہ عشق حالت است بیروں از مقالت تا حال عشق رو نہ نماید فہم مقال دشوار

---

[1] مولوی بشیر محمد خان برہانپوری نے اپنے مقالہ مطبوعہ معارف ۶ جلد ۶۷ صفحہ ۴۷۲ میں انہیں نصیر خان کو نصیر خان فاروقی والی برہان پور تحریر فرمادیا ہے۔ یہ موصوف کا سہو نظر ہے نصیر خان فاروقی کا انتقال ۸۴۱ھ میں ہوچکا ہے۔ ۱۰۸۳ھ میں اس کی موجودگی بعید از قیاس ہے۔

با پیر مغان دوش زبس حیرانی — گفتم رمزے زمے بگو پنہانی
گفتا بود ایں حقیقتِ وجدانی — اے جان پدر تانہ چشی کے دانی

(روائح الانفاس ص ۳۴۲)

ریاضت کے فوائد کے متعلق فرماتے تھے کہ ریاضت و مجاہدہ نفس سے سالک کو معقولات کا کشف ہوجاتا ہے اور معقولات کے معانی محسوسات کی صورت اختیار کرلیتی ہیں اور ان سے اشیاء کی حقیقتیں معلوم ہوجاتی ہیں۔ لیکن اس مقام پر سالک کے بھٹک جانے کا خطرہ بھی ہوتا ہے۔ تمثیلاً حضرت غوث الاولیا محمد غوث رضی اللہ عنہ کے ایک مرید کا واقعہ بیان فرماتے تھے کہ وہ چلّہ نشینی کے عالم میں جب اس منزل تک پہنچا کہ تمام نباتات زبانِ حال سے اس کو سنانے لگیں کہ میں فلاں بوٹی ہوں مجھ سے فلاں فلاں کام ہوسکتے ہیں اور مجھ سے فلاں مرض کو شفا ہوتی ہے حتی کہ ایک شب ایک شے نے بزبانِ حال اس کو کہا کہ میں کیمیا بنانے کا ذریعہ ہوں مجھ سے تانبا خالص سونا بن جاتا ہے۔

چلّہ نشین کو ہوس پیدا ہوئی اور اس کا دل اس چیز کی طرف راغب ہونے لگا۔ قریب تھا کہ بوالہوسی اس کی ریاضت کو خاک میں ملادے اور تباہ کردے کہ غیب سے حضرت غوث کا طمانچہ پڑا اور اس کے دل سے وہ ہوس دُور کردی۔ دوسری شب پھر ایک شے نے زبانِ حال سے کہا کہ میں بھی اسی کام آتی ہوں یعنی مجھ سے کیمیا بنائی جاتی ہے۔ مگر اب سالک اس کی طرف متوجہ نہ ہوا اور منزلِ مقصود کو پہنچا۔ (ترجمہ روائح الانفاس ص ۲۹۰)

ایک مرتبہ بعض مریدوں نے سوال کیا کہ مسئلہ توحید (طریقت) کو مسئلہ شریعت سے کس طرح مربوط و مطابق کیا جاسکتا ہے۔ اس معاملہ میں مخالف سوالات اور وسوسے پیدا ہوتے ہیں۔ فرمایا ابتدائے حال میں میرے دل میں بھی اس قسم کے وسوسے پیدا ہوتے رہے ہیں۔ لیکن حضرت مسیح الاولیاء قدس سرہٗ نے چند تمثیلات ارشاد فرماکر ان تمام شبہات کو دور فرمادیا۔ اس وقت عصر کا وقت تنگ ہورہا ہے تمام کو دُہرانا مشکل ہے۔ منجملہ ان کے ایک مثال یہ ہے کہ اگر کسی کو مرغی کا انڈا مل جائے اور وہ اس کو پکا کر کھالے تو درست ہے (ناجائز یا حرام نہیں) لیکن اگر وہی انڈا محفوظ رکھا جائے اور اس سے مرغ پیدا ہو تو اس میں سر، پاؤں، منقار پر وغیرہ چیزیں موجود ہوں گی۔ لازم ہے کہ اس کو ذبح کرے اور حفظِ مراتب کے لحاظ سے ناجائز چیزیں، خون، پر، پاؤں، منقار اور اس کے شکم سے جو گندگی نکلتی ہے اس کو پھینک دے اور بقیہ کو تناول کرے۔ اور ایسا ہی کیا بھی جاتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا وجود مطلق معینہ ومقیدہ مراتب و مدارج میں ظہور فرماتا ہے اور اسی روش پر کلّیت و اطلاق کی بلندیوں سے جزئیت وتقید کی پستیوں کی جانب

نزول فرماتا ہے اور اس وجود کا ہر ایک درجہ حفظِ مراتب کے لحاظ سے دوسرے حکم میں آتا ہے اور دوسرے لوازم چاہتا ہے۔ اسی طرح گیہوں کے دانے پیس کر پکائے اور کھالئے جاتے ہیں، لیکن اگر انہیں دانوں کو کھیت میں بکھیر دیتے ہیں تو اس سے سبزی پیدا ہوتی اور شجری مرتبہ حاصل ہوجاتا ہے۔ پھر جڑیں، تنہ پتے اور خوشے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن دیگر تمام چیزوں کو نظر انداز کر کے صرف گندم حاصل کرنے پر توجہ کی جاتی ہے۔

لہٰذا ظاہر ہے کہ کُلّیت اور اطلاق کی حالت میں مخصوص احکام ہوتے ہیں اور جزئیت و تقید کے مراتب کا ظہور ہونے پر اس کی تفصیلات کے مطابق ہر درجہ کے لئے ایک دوسرے سے مختلف احکام ہوتے ہیں کہ ان میں سے ایک کا اطلاق دوسرے پر نہیں ہوسکتا۔ یعنی جو چیز بوئی جانی چاہیئے وہ پھینکنے یا جانوروں کے کھلانے کا دستور نہیں ہے۔ گندم پیس کر اور پکا کر کھائے جاتے ہیں، لیکن اس کے درخت کی پتیوں، سرکنڈوں کو انسان کھانے کے کام میں نہیں لاتا۔ پتیاں بوئی نہیں جاتیں۔ وغیرہ (ترجمہ روائح الانفاس ص۳۰۹)

سماع سے متعلق ملفوظات میں متعدد نقلیں مذکور ہیں صاحب حالت صوفیا کی نگاہ میں تو سماع عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔ حضرت مسیح الاولیاءؒ نے ایک مرتبہ مُلّا محبّ علی سندھی کو **السماع کالصلوٰۃ** کہہ کر مجلس سماع میں گفتگو سے روکا تھا۔ آپ بھی سماع سے گہری دلچسپی رکھتے تھے اور آدابِ سماع کے ساتھ اس سے روحانی استفادہ فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ صاحبِ حال کے لئے قوالی کی ضرورت نہیں ہے۔ تمام اچھی اور بُری آوازیں اس کے لئے سماع و سرود کا درجہ رکھتی ہیں۔ بقول حضرت سعدی علیہ الرحمۃ

نہ بم داند آشفتہ کار و نہ زیر بر آواز مرغے بنالد فقیر
مگس پیشِ شوریدہ پر نزد نہ اوچوں مگس دست بر سر نزد

حضرت گنج شکر قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

ع صوفی نہ کند بہ بانگ نے رقص (ص۱۰۳)

اور فرمایا کہ ایک روز ایک جوان ان الفاظ پر ''گوری گوری کات'' رقص کرنے لگا۔ حضرت مسیح الاولیاء نے فرمایا کہ اس کے رقص سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ عشقِ مجازی میں مبتلا ہے۔

سماع محرکِ قلوب ہوتا ہے۔ خصوصاً اہلِ طبیعت اور اہلِ حقیقت کے لئے اور ان میں سے ہر ایک جس منزل میں بھی ہو ترقی کی طرف رجوع کرتا ہے۔

فرماتے تھے سماع سننے والوں کی دو قسمیں ہیں ایک بشرط علم و صحو سنتے ہیں اور بعضے بشرط حال سنتے ہیں۔ اول الذکر اسماء و صفات باری تعالیٰ کے عارف ہوتے ہیں، اگر یہ کیفیت کیفیت

نہ ہوتو کفرِ محض ہے اور ثانی الذکر کے لئے شرط ہے کہ وہ حالتِ بشریت کی فنا اور لذّتوں کے آثار کی نفی احکامِ حقیقت کے ظہور سے کرسکتے ہوں۔ چنانچہ ایک دن حضرت ابوسعید ابوالخیر قدس سرہٗ اس شعر پر وجد میں آگئے۔

چشم گر این است و ابر وایں و ناز و غمزہ این
الوداع اے زہد و تقویٰ الفراق اے کفر و دین

بعد فراغ حال مریدوں کو ظاہر فرمایا کہ عزیزو میرے تواجد کا باعث ظاہری معنی نہ تھے بلکہ اس شعر میں ذات و صفات کی جلوہ آرائیاں میری بیخودی کا باعث ہوئیں۔ چشم کا مرادف عین ہے اور عین سے مراد ذات باری اور ناز غمزہ، ابرو سے مراد صفات، استغنا، بے نیازی، قہر و غلبہ، چونکہ معرفت میں اگر صحیح اسماء پر توجہ نہیں ہے تو کفر میں مبتلا ہوجانے کا اندیشہ ہے۔ (ص۱۰۴)

اسی طرح ایک درویش نے کسی کو یہ گاتے سنا: میری بنگر یا پھوڑی رے۔ رقص کرنے لگا اور جب اُس سے پوچھا گیا کہ ان مجازی الفاظ کو تونے کس چیز پر محمول کیا۔ اُس نے کہا بنگڑی جوکہ ہاتھ کا کنگن ہے ہاتھ کی قید کا موجب ہے جب وہ ٹوٹ جاتی ہے ہاتھ قید سے آزاد ہوجاتا ہے۔ پس میں نے اس کو اپنی قید ہستی سے آزادی پر محمول کیا اور میں نے اس عالم میں خود کو قیدِ ہستی سے آزاد پایا۔

ایک روز حضرت امیر خسرو دہلوی بازار سے گذر رہے تھے ایک صراف اپنی دکان میں روپیہ گن رہا تھا جب اس نے پندرہ سولہ سترہ کہا حضرت خسرو سرِ بازار وجد میں آگئے۔

ایک روز شیخ چاند جو حضرت مسیح الاولیا کے مرید تھے اور مجذوب ہوگئے تھے۔ ابتدائی سلوک کی حالت میں حضرت کی خانقاہ کے متصل بلند چبوترے پر سے عالمِ وجد میں نیچے گرگئے۔ ان کے نعرے سن کر مسیح الاولیاء باہر تشریف لائے اور کدال لے کر اپنے دستِ مبارک سے کھود کر چبوترے کی بلندی کسی قدر کم کردی۔ (ص۱۰۶)

فرمایا کہ مجلسِ سماع کا جو طریقہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا سے منسوب ہے۔ (اُسی طرح حضرت مسیح الاولیاءؒ کی خانقاہ میں منعقد ہوتی تھی) مجھ پر وجد کی حالت طاری ہوئی، جو کچھ میرے پاس از قسمِ لباس موجود تھا، میں نے قوالوں کو دے ڈالا جو سندھی تھے۔ آنحضرت نے (بیخودی دور ہونے کے بعد) اپنا خرقہ مبارک مجھے عطا فرمایا جو خرقۂ خلافت کی بشارت تھی۔ جامع ملفوظات نے لکھا ہے کہ میں بھی اِس متبرک خرقہ کی زیارت سے مشرف ہوا ہوں۔ اصل عبارت ملاحظہ ہو:

میفر مودند کہ در مجلسِ سماع کہ منسوب بہ طریقۂ خواجہ بہاء الدین زکریا است مراد جدے وحالتے سر زوانچہ باخود از قسم رخت پوشش داشتم ہمہ بار قاصانِ مجلس سماع کہ از متوطنانِ بلدۂ معمورۂ سندھ بودند دادم۔ آنحضرت بخرقۂ مبارک خود مشرف کردند و بشارت اشارت خلافت دادند۔ راقم ضعیف نیز بشرف زیارت آن خرقہ متبرک رسیدہ۔ (روائح الانفاس ص ۱۰۷)

آپ کا ایک اور واقعہ اس طرح مذکور ہے کہ آپ نمازِ جمعہ کے لئے میاں شیخ فرید قدس سرہٗ کی مسجد میں تشریف لے گئے اور آب وضو حاصل کرنے کے لئے مسجد کے کنوئیں کا چرخ گردش میں لائے چرخ کی آواز سن کر آپ نے نعرہ مارا اور بعد فراغت وضو جب مسجد میں تشریف لائے کسی نے اللہ کا نام لیا۔ سنتے ہی آپ نے پھر نعرہ مارا۔ یہاں قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ عربی عبارت اللہ کا نام اور چرخ کی آواز کی موزونیت یکساں معلوم ہوئی۔ چنانچہ جو شخص بحکم کنت معہ الذی یسمع لی ہوش کے کان کھلے رکھتا ہے۔ اس کو کلامِ حق کے سوا اور کچھ سنائی دیتا ہی نہیں خواہ کسی زبان میں ہو حتیٰ کہ اشیاء بھی اس کی نظر میں گویائی سے بہرہ ور اور حق گو معلوم ہوتی ہیں۔ (ص ۱۰۸)

فرمایا ایک روز سید محمد گیسو دراز قدس سرہٗ بزم سماع میں تشریف تھے ان کے ایک مرید کو وجد آیا اور وہ نعرہ مار کر کھڑا ہوگیا۔ حضرت نے اس کا دامن کھینچا اور بٹھادیا، اُس نے پھر نعرہ مارا اور کھڑا ہوگیا۔ آپ نے پھر اس کو بٹھادیا۔ تیسری بار وہ اس جوش سے اٹھا کہ اُس کا دامن حضرت کے ساتھ سے چھوٹ گیا۔ حضرت اُٹھ کر نماز میں مشغول ہوگئے مجلس برخاست ہونے کے بعد لوگوں نے حضرت سے اس کا دامن پکڑ کر بٹھانے اور پھر خود اٹھ کر عین سماع میں مشغول نماز ہونے کا سبب پوچھا۔ فرمایا جب اُس نے پہلی بار نعرہ مارا آسمانِ اول تک پہنچ گیا۔ میں نے دامن کھینچ کر زمین پر اتارا۔ دوسرا نعرہ مار کر وہ تا بعرش جا پہنچا۔ میں پھر دامن پکڑ کر واپس لایا۔ تیسری مرتبہ وہ نعرہ مار کر وہ وہاں سے بھی زیادہ بلندی پر فائز ہوگیا۔ پھر میں نماز میں مشغول ہوگیا کہ اب اس کے نزول کے لئے اور کوئی صورت بجز اس توجہ کے نہ رہی تھی۔ غور کریں کہ اس وقوعہ میں کیا اچھی رمز مضمر ہے۔

انہیں عاشق باراز سید محمد گیسو دراز کے متعلق فرماتے ہیں کہ بعض اوقات غلبۂ وجد میں مسجد کے حوض میں جا پڑے تو حوض کا پانی اس قدر گرم ہوجاتا تھا کہ اِس آبِ گرم سے وضو کرنا ممکن نہ ہوسکتا تھا اور بعض وقت حالتِ وجد میں آپ سبزہ پر غلطاں ہوتے تو وہ سبزہ افسردہ و پژمردہ ہوجاتا، بلکہ جل جاتا تھا۔

یہاں چند سطور اصل عبارت کی درج ہیں:

روزے حضرت ملک صاحب؟ در دیوان خانۂ خود نشستہ بود۔ قوالے در رسید و بر خواند کہ

اس چولی لاگے آگا جس شہ کا ہاتھ نہ لاگا

فرمودند کہ بھائی بس کن۔ ہنوز دست و پاوا اعضا و اعضائے دیگر از کثرت بر زمین غلطیدن کہ مجروح شدہ صحت نیافتہ روز دیگر حومای آمد۔ چیزے بدستش داوند و مرخص نمودند۔ (روائح الانفاس ص ۱۱۰)

فرمایا صوفی شیخ فتح اللہ کو بزم سماع میں جب وجد آتا تو ان کی ایک آنکھ کی پتلی گردش کرتی تھی اوہ اس عالم میں جس کی طرف دیکھ لیتے مرعوب ہوجاتا اور اس پر ہیبت طاری ہوجاتی۔

فرماتے تھے کہ میاں سعید خان[1] جو عمائدین شہر میں ممتاز شخصیت رکھتے تھے۔ جب عالمِ وجد میں جھومتے تھے تو مسجد کے ستون اور شہتیر متاثر ہوکر جنبش کرنے لگتے تھے۔

انہیں سعید خان کے بھائی شیخ عبدالغنی نے ایک مرتبہ وجد کے عالم میں درخت کی ایک جھکی ہوئی شاخ تھام لی تھی، اُس کے اثر سے وہ شاخ خشک ہوگئی۔ موصوف سرونج میں سکونت رکھتے تھے اور بہت معقول آدمی تھے۔

---

[1] حضرت سعید خان چشتی قدس سرہٗ کا مزار ایک شاندار مقبرہ میں بمقام برہانپور بیرون اتوارہ دروازہ (دہلی دروازہ) چوڑی بازار کی مسجد کے صحن سے ملحق واقع ہے اور تاحال ان کے اخلاف سعید کے باقیات صالحات میں عزیزم پیر صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ اور ان کے برادرانِ عزیز صندل، عرس وغیرہ کے مراسم انجام دیتے ہیں۔ آپ عالم، صوفی و شیخ وقت تھے اور حضرت اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازی کے نہایت معتمد وابستگان میں منسلک تھے۔ دیوان تن کا ذمہ دارانہ عہدہ آپ سے متعلق تھا۔ حضرت مولانا ظفر علی خان کی تحقیق کے مطابق آپ پہلے شہزادہ مراد بخش کے درباری شعرا میں شامل تھے۔ چنانچہ مولانا موصوف نے آپ کی بدیہہ گوئی کا ایک اور واقعہ لکھا ہے کہ عید کے روز شہزادہ نے پوچھا عید کی تہنیت میں کچھ لکھا؟ اُنہوں نے کچھ نہیں لکھا تھا۔ پھر بھی کہا حضور ایک غزل کہی ہے دوگانہ ادا کرکے عرض کروں گا۔ اس نے کہا ابھی سنادو۔ غزل تو موجود ہی نہ تھی سعید خان نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور مُنہ کے سامنے رکھ کر یہ اشعار جو بجلی کی سرعت سے اُس کی طبع رواں موزوں کرتی جاتی تھی، پڑھنے شروع کیے۔

روزِ عید است لبِ خشک مے آلود کنید چارۂ کار خود اے تشنہ لباں زود کنید
شربتِ حب نباتِ لب جاں بخشِ ایاز نوشدائے رد دل خستہ محمود کنید
دیر گاہ است کہ از دیر مغان دور تر ہم زود باشد کہ کف جام مے اندود کنید
حرف بے صرفہ واعظ نہ تواں کرد بگوش گوش بر زمزمۂ چنگ دنے وعود کنید
ہست بہبودِ شما بندگی شاہ مراد مہتر آن است کہ اندیشۂ بہبود کنید
جدش یافت رداز طالعِ مسعود سعید سعی دریافتن سایۂ مسعود کنید

سعید خان غزل ختم کرچکا تو شاہ زادے نے کاغذ اُس کے ہاتھ سے لیا اور جب اس کو کورا پایا تو حاضرین دربار سے مخاطب ہوکر کہا بدیہہ گوئی اس کو کہتے ہیں۔ یہ غزل اور روداد ادبِ لطیف خاص نمبر ۱۹۴۲ء میں ص ۱۵ پر درج ہے۔ مولانا اس مضمون میں ان کی بدیہہ گوئی کے واقعے اور بھی لکھے ہیں میں نے بلحاظ اختصار ان کے اسی تبرک سے اس نوٹ کو زینت دی۔

فرماتے تھے کہ مجلسِ سماع کے بھی آداب ہیں ان پر عمل کرنا ضروری ہے۔ یہ کہ مجلس میں پانی نہ طلب کریں۔ باہم گفتگو نہ کریں۔ اِدھر اُدھر نہ دیکھیں۔ ناموزوں حرکات نہ کریں، کوئی شخص وجد میں کھڑا ہوجائے تو لازم ہے کہ تمام اہلِ مجلس بھی کھڑے ہوجائیں۔

فرماتے تھے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک صوفی پر وجد کا غلبہ ہوا اور وہ رقص کرنے لگا اور رقص کرتے ہوئے کسی کو تھام لیا تو خواہ دوسرے شخص پر وجد کی واردات طاری بھی نہ ہوں تو اوّل الذکر کے اثر سے وجد میں آجاتا ہے۔ چنانچہ شہر کے ایک صوفی شیخ فتح محمد رقص میں تھے۔ آپ ایک گوشہ میں کھڑے تھے کہ شیخ مذکور رقص کرتے ہوئے آپ کے بالمقابل آئے اور آپ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ آپ پر بھی وجد طاری ہوگیا اور جھومتے ہوئے رقص میں آگئے۔ فرمایا اس قسم کی اکثر مثالیں اور روایات صوفیائے کرام کی کتابوں میں بھی مذکور وموجود ہیں۔

آپ کی ذات جامع الکمالات سرتاپا کرامات تھی، لیکن طبعاً آپ کشف وکرامات کو قابلِ فخر چیز نہیں گردانتے تھے۔ حالانکہ آپ سے بلا قصد و ارادہ بے شمار خرق و عادات کا ظہور ہوتا رہا ہے۔ فرماتے تھے کہ خرق و عادات وکرامات اہلِ حق کی نگاہ میں کوئی پسندیدہ چیز نہیں ہے۔ اصل کشف تو یہ ہے کہ انسان بشریت سے خود کو بیگانہ کرلے اور کفر وایمان کی بحثوں میں نہ اُلجھے۔

کفر کافر را ودیں دیندار را ذرہ دردے دل عطار را (ص۲۹۰)

فرماتے تھے کہ یہ اصول طالبِ حق کے فرائض میں داخل ہے کہ معاصی اور طاعات سے باخبر ہونے کے بعد علم اخلاق حاصل کرے اور افعالِ ذمیمہ کو اخلاقِ حمیدہ سے مبدل کرے تاکہ روحانی وایمانی مہلکات سے نجات پائے۔

بزرگانِ سلف کی ہدایات اور معمولات سے استفادہ حاصل کرنے کی مریدوں کو بھی تاکید فرماتے اور خود بھی عمل پیرا رہتے تھے۔ خصوصاً اپنے مرشد حضرت مسیح الاولیاء کی تقلید و اتباع کو بمنزلت ایمانی سمجھتے تھے۔ حضرت مسیح الاولیاء قدس سرہٗ کے دمِ عیسیٰ (پانی پر دم کرنے) کی فیض رسانی شہرۂ آفاق تھی۔ ہر مرض اور ہر تکلیف کو دور کرنے کے لئے آپ پانی پر دم کردیا کرتے اور حاجتمندوں کو ہمیشہ حسبِ دلخواہ فائدہ ہوتا۔ ایک روز آپ نے شیخ عبدالستار سے دریافت کیا۔ حضرت کون سے اسم پڑھ کر پانی پر دم کرتے ہیں۔ اُنہوں نے جواب دیا کہ صرف اپنے مرشد شاہ لشکر محمد عارف کا نام!

مسیح الاولیاء پر یہ امر منکشف ہوگیا۔ اسی وقت کوئی شخص پانی دم کرانے کو لایا۔ حضرت نے بلند آواز سے اپنے مرشد کا نام لیا اور دم کرکے دے دیا۔ اُس روز سے آپ نے بھی معمول کرلیا کہ جو تکلیف زدہ پانی دم کرنے کو آپ کے پاس لاتا، آپ مسیح الاولیاء کا نام دم کرکے دیدیا کرتے اور اُس سے ہمیشہ ہر شخص کو فائدہ ہی پہنچتا۔

آپ اوراد و ظائف بھی پڑھتے تھے۔ کسی چیز کی مداومت و خصوصیت کے پابند نہیں رہتے تھے۔ وقتاً فوقتاً اہل اللہ کے معمولات کو عمل میں لاتے تھے۔ چنانچہ مولوی بشیر محمد خان صاحب نے ملفوظات محمد یوسف وغیرہ کے حوالے سے آپ کے جن معمولات کی صراحت تحریر فرمائی ہے جامع روائح انفاس کی وضاحت اس سے قطعاً مختلف ہے اور اُنہوں نے یہ بیان ان الفاظ میں شروع کیا ہے:

انچہ بر معمول آنحضرت قدس اسرارہم وافاض علی العالمین انوارہم اطلاع داشتہ دریں مختصر بطریق فائدہ در قیدِ تحریر می آرد وہو ولی التوفیق الی سواء الطریق۔

(روائح الانفاس ص ۳۸۸)

آپ غسل کے موقعہ پر وضو کرتے ہوئے ہر عضو پر یا صمد یا قادر پڑھ کر پانی ڈالتے تھے اور حضرت مسیح الاولیاءؒ کا بھی یہی طریقہ تھا۔ اور وضو سے فارغ ہوکر سورۂ انا انزلناہ پڑھتے تھے۔ فجر کی سنت نماز میں پہلی رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد قُل یایھا الکافرون اور دوسری رکعت میں بعد سورۂ فاتحہ قل ھو اللہ پڑھتے تھے۔ سنت نماز ختم ہونے پر **سبحان اللہ وبحمدہ اور سبحان اللہ العظیم وبحمدہ- استغفر اللہ ربی من کل ذنب واتوب الیہ.**

فرماتے تھے کہ فجر کی نماز کے بعد ۳ مرتبہ **استغفر اللہ الذی لا الہ الا ھو الحی القیوم واتوب الیہ. اللھم انت السلام ومنک السلام والیک یرجع السلام حینا ربنا بالسلام وادخلنا دار السلام تبارکت ربنا وتعالیت یا ذالجلال والاکرام. اللھم لا مانع لما اعطیت ولا معطی لما منعت ولا راد لما قضیت ولا ینفع والجد منک الجد** پڑھے اور جب حینا ربنا پر پہنچے دل میں یہ تصور کرے کہ اب تک میں جاندار ہونے کی حیثیت سے زندہ تھا۔ اب حق کے ساتھ زندہ ہوا، کیونکہ محبّ کی زندگی محبوب سے متعلق ہوتی ہے جو خود کو مُردہ کرکے اس کے تعلق سے زندہ ہو پھر نہیں مرتا۔

تسبیح فاطمہ بھی آپ کی معمولہ عبادت میں داخل تھی یہ تسبیح حضرت خاتون جنت رضی اللہ تعالٰی عنہا کو حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم فرمائی تھی۔ ہر فرض نماز کے بعد ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ الملک القدوس ۳۳ بار والحمدللہ ۳۳ مرتبہ ولا الہ الا اللہ اور ایک مرتبہ واللہ اکبر اور تسبیح فاطمہ میں سبحان اللہ ۳۳ بار، الحمدللہ ۳۳ بار اور اللہ اکبر ۳۴ بار مشہور ہیں۔ حضرت اس پر پابندی سے عمل فرماتے تھے اور بعض اوقات اتنی اونچی آواز سے پڑھتے تھے کہ قریب بیٹھنے والا سُن سکتا تھا جامع ملفوظات نے لکھا ہے کہ میں نے چند مرتبہ سنا اور شمار بھی کیا ہے۔

فرماتے تھے کہ یا حی و یا قیوم کی تسبیح کے لئے وقت کا تعین ضروری نہیں اور یہ شرط بھی نہیں ہے کہ کسی سے گفتگو نہ کی جائے۔ برخلاف اس کے آیہ ومن یتق اللہ الخ کے ورد میں بات کرنا سخت منع ہے اور یہ اس لئے ہے کہ جمالِ حق کی عظمت سجدہ کی حالت میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ لہٰذا جلوۂ ذاتِ بے نیاز کے طالب کو لازم ہے کہ رکوع و سجود کے متواضع و عاجزانہ عالم میں حضوری کا انتظام کرے۔

فرماتے تھے کہ وظیفہ پڑھتے وقت اس طرح نہ بیٹھے کہ غرور ونخوت کا انداز پایا جائے کہ اس سے دعائیں قبولیت سے مرحوم رہتی ہیں۔ نہایت انکسار و فروتنی کے طور سے بیٹھے کہ عجز و انکسار دعاؤں کی اجازت کا باعث ہوتا ہے۔

طالبِ حق کو لازم ہے کہ شغل اور ورد سے کبھی غافل نہ ہو۔ حضرت شیخ وجیہ الدین علوی قدس سرہ سے کسی مرید نے پوچھا کہ طالب کے لئے توجہ اور دل کی مشغولیت کافی ہے پھر ورد کی کیا ضرورت ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ شغل و توجہ میں جو خامی رہ جاتی ہے، ورد اس کی مدد کرتا ہے اور شغل و توجہ سے جو ثمرات حاصل ہوتے ہیں ان کی حفاظت کرتا ہے۔

آپ کے علمی فضائل و کمالات کے سلسلہ میں ابتداء عرض کیا جاچکا ہے کہ آپ ماہرِ عروض شاعر بھی تھے اور آپ کا تخلص برہان تھا۔ یہ ثبوت ایک شعر سے بہم پہنچتا ہے جو روائح الانفاس میں درج ہے اور اس میں تخلص برہان ہی واقع ہوا ہے اور جامع ملفوظات نے بایں الفاظ رقم فرمایا ہے۔

حضرت پیر دستگیر راست۔ افاض اللہ علینا و علی العالمین اسرارہم و برکاتہم۔

برہان دلیل حق نہ شود جز شفیعِ دوست
دیدم کہ پیر ظاہرِ حق حق بطون اوست
(روائح الانفاس ص ۴۱)

اِس ایک شعر کے سوا اور کوئی شعر یا نظم کلام ایسا ہمدست نہ ہوا جو بلا اشتباہ آپ سے منسوب کیا جائے۔ البتہ جناب مولوی بشیر محمد خان صاحب نے آپ کی ایک مثنوی کا اختصار اپنے مقالہ میں درج فرمایا ہے۔ یہ مثنوی آپ کو میرے ایک علم دوست عزیز دوست جناب فرید الدین صاحب کی وساطت سے ہمدست ہوئی ہے، جس میں آپ کی وضاحت کے مطابق ۱۵۳ اشعار ہیں اور تخلص کسی جگہ بھی نہیں ہے البتہ ایک شعر میں حضرت عیسیٰ جنداللہ کی جانب جن کے آپ خلیفہ تھے اشارہ ہے۔

عیسوی را عشق او بیخود نمود
عشق را بے سوبداں اے اہلِ جود

مجھے جناب مولوی بشیر محمد خان صاحب کے مقالے کا یہ مقام پڑھ کر بڑی حیرت ہوئی اس لئے کہ اس شعر میں لفظ عیسوی اشارہ نہیں، بلکہ حضرت مسیح الاولیاء کے چھوٹے فرزند حضرت بابا فتح محمد محدث کا تخلص ہے۔ محدث صاحب نے اپنے والد کے اسم گرامی شیخ عیسیٰ کی نسبت سے عیسوی تخلص اختیار کیا تھا، جو اُن کے شہرۂ آفاق تصنیف مفتاح الصلوٰۃ میں بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ سایۂ اصلی کی تحقیق کے سلسلہ میں آپ نے جو نظم درج کتاب کی ہے اس کا مقطع یہ ہے:

بازار جمل دو نیم ہست گر عاقلی عامل شود

بہر خدا گفتم بتو اے عیسوی این نظم را

مفتاح الصلوٰۃ بڑی مقبول کتاب ہے مختلف مطابع سے کئی مرتبہ شائع بھی ہوچکی ہے اور برہان پور میں اکثر جگہ اس کی قلمی نقلیں پائی جاتی ہیں۔ دو نسخے قلمی تو میرے پاس موجود ہیں، دونوں میں سایۂ اصلی کی تحقیق سے متعلق بابا فتح محمد کی نظم اور مقطع اسی طرح تحریر ہے۔ ممکن ہے مولوی بشیر محمد خان صاحب نے توجہ نہ فرمائی ہو اور مندرجہ رسالہ معارف مثنوی کو باوجود عیسوی تخلص موجود ہونے کے قیاساً حضرت شیخ برہان الدین راز الٰہی قدس سرہ سے منسوب فرمادیا۔

امید کہ اس واضح ثبوت کو ملاحظہ فرماکر موصوف اپنی قیاسی رائے میں تبدیلی پر توجہ فرمائیں گے جبکہ اُنہیں خود بھی تذبذب سا ہے۔

چونکہ اس مثنوی کے انکشاف وفی زمانہ منصۂ شہود پر لانے کا سہرا عزیزم جناب شیخ فرید الدین ایم اے اور محترم جناب بشیر محمد خان صاحب ایڈوکیٹ کے سر ہے۔ اوّل الذکر نے احمد آباد سے نقل حاصل کی اور ثانی الذکر نے اپنے مقالے میں مربوط کر کے رسالۂ معارف میں شائع فرمائی۔ لہٰذا میں نے بصد نیاز و ادب دونوں حضرات کا کھلے الفاظ میں وضاحت سے شکریہ ادا کرتے ہوئے مثنوی مذکور کو حضرت بابا فتح محمد محدث کی تصنیفات کے سلسلہ میں منسلک اور ان کے تذکرے میں شریک کرلیا ہے اور یہاں بھی ہر دو حضرات کی خدمت میں بصمیم قلب ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں۔

گر قبول افتد زہے فخر و شرف

حضرت شیخ کی تصنیفات کے سلسلہ میں مولوی صاحب موصوف نے صرف شرح امنت باللہ اور وصیت نامے کا ذکر کیا ہے۔ لیکن تاریخ برہان پور میں شرح اسمائے حسنیٰ کا نام بھی آپ کی تصنیفات میں مذکور ہے۔ ان کے علاوہ میرے پاس آپ کا ایک رسالہ قلمی فارسی اور ایک مضمون قلمی عربی موجود ہے، جن میں سے کسی ایک کا ذکر بھی میں نے کہیں اور نہیں سنا۔ رسالہ پیم کہانی اور ایک مکتوب عربی ہر ایک کے متعلق مختصراً عرض ہے۔

پیم کہانی۔ یہ عجیب و غریب کتاب ہندی اور فارسی شہد و شکر کا شیرین تر مرکب ہے۔ عشق الٰہی کی والہانہ سرمستیوں کا ذکر عارفانہ انداز میں بڑی مرغوب اور دلنشین چیز ہے۔ ہندی زبان کے عاشقانہ دوہوں کی فارسی زبان میں شرح کی گئی ہے۔ چالیس سے کچھ زیادہ دوہے ہیں، جن کی شرح سلسلۂ بیان کے ربط سے عشق حقیقی کی زندہ جاوید داستان بن گئی ہے۔ کتاب اس طرح شروع ہوتی ہے۔

یا فتاح وبہ نستعین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیم کہانی کہت ہوں سنو سکھی تم آئے　　　پیو کو ڈھونڈن ہوں گئی آئی آپ گنوائی

معنیٰ ظاہر یہ ہیں کہ میں عشق کی کہانی کہتا ہوں دوستو! آؤ اور سنو میں دوست کی جستجو کے لئے گیا تھا۔ خود کو بھی گم کر آیا۔ مطلب یہ ہے کہ عاشق بیچارہ دردِ محبت سے نالاں و گریاں ہوکر کہتا ہے کہ میں جب عشق کا قصہ دہراتا ہوں اور اس کا نام زبان پر لاتا ہوں اور اس سے جو لذت حاصل ہوتی ہے احباب کی واقفیت کے لئے بیان کرتا ہوں۔ یہ عجیب قصہ ہے جو عقل و خرد سے بالاتر ہے اور دنیا بھی اس کے متعلق ساکت ہے۔ صاحب نزہۃ الارواح شاکی ہیں کہ حضرت امام اعظمؒ نے عشق پر کوئی درس نہیں دیا۔ اور حضرت امام شافعیؒ کی بھی اس ضمن میں کوئی روایت نہیں ملتی۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ عشق کے بارے میں کوئی خبر نہیں دیتے اور حضرت امام مالکؒ بھی اِس سے آگاہ نہیں ہیں۔ عشق کا معاملہ بھی عجیب ہے کہ چاروں شرعی صحیفوں میں اس کے متعلق ایک آیت بھی نہیں ہے۔

جب کسی ازلی سعادتمند کو یہ درد اسیر و دستگیر کر لیتا ہے تو وہ راہِ طلب میں بے اختیار اور خولیش و بیگانہ سے بیزار ہوکر کہہ اُٹھتا ہے کہ:

دست از طلب ندارم تا کام من بر آید　　　یاتن رسد بجاناں یا جان زتن بر آید

وہ اپنے مطلوب کی جستجو میں در بدر بھٹکتا اور تنگ آ کر کہتا ہے:

سالہا در طلبِ روی نکو در بدرم　　　روی بنما و خلاصم کن ازیں در بدری

نیز ہر کس و ناکس سے اپنے درد کی دوا طلب کرتا ہے۔ سلطان العارفین حضرت بایزید بسطامی قدس سرہٗ کا بھی ابتداء میں یہی عالم رہا ہے۔ ایک مرتبہ آپ نے کسی اعرابی سے پوچھا کہ میرے درد کی دوا کہاں ملے گی؟ اس نے جواب دیا جس راہ سے یہ درد تم تک پہنچا ہے، اسی راہ سے دوا بھی میسر آسکے گی۔ یعنی یہ مرض تمہارے باطن سے رونما ہوا ہے علاج کے لئے بھی باطن کی طرف رجوع کرو بحکم نحن اقرب الیہ من حبل الورید. تمہارا مطلوب تم سے دور نہیں ہے۔

تمام بزرگوں کا اس قول پر اتفاق ہے کہ اس کا پتہ آسمانوں پر پرواز کرنے اور زمین کی خاک چھاننے سے نہیں ملتا۔ بلکہ جو عارف ہے وہ اپنے وجود میں اس کو تلاش کرتا ہے اور وہیں پاتا بھی ہے۔ من عرف نفسه فقد عرف ربه پر نصیحت ختم ہے۔ اگر تمہارا دل نور اسلام سے منور ہے تو تم پر روشن ہونا چاہئے کہ مطلوب تمہارے وجود میں موجود ہے۔ دوسری جگہ کیوں ڈھونڈھتے ہو۔

یارِ مابا ماست کے از ماجد است　　　　مائی ما پردہ دارِ یار ماست

حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ اہل اللہ جو کچھ دیکھتے ہیں خود میں دیکھتے ہیں۔ اپنے سوا کسی کو نہیں پہچانتے ہیں۔ فرماتے ہیں تم اپنے نفس کا جائزہ کیوں نہیں لیتے؟ بحکم وفی انفسکم افلا تبصرون. ایک بزرگ کا اشارہ ہے۔

چشم دل چوں باز شد معشوق را در خویش دید

عین دریا گشت چوں بیدار شد چشم حباب

اور اس مرتبہ کو صوفیوں کی اصطلاح میں فنا فی اللہ کہتے ہیں۔

یہاں تک میں نے ۵ صفحات کی طولانی فارسی عبارت کا بالاختصار ترجمہ و مفہوم قلمبند کیا ہے۔ اس سے آگے اصل عبارت کا لطف اُٹھایئے۔

روزے حضرت شیخ برہان الدین برہانپوری راز الٰہی قدس اللہ سرہٗ در فنا فی اللہ رمزے اظہار می نمودند سخن می گفتند و در امثالِ این فرمودند کہ امثال این چنان است کہ کسے از نمکے آدمی سازد و او را بدریا بردہ گوید کہ دُرے ازیں دریا برار او ہر چند کہ قصد بسیار کند وجہہ بے شمار نماید در تہ آب رود خواہد کہ بہ نہایت او بر سد دور بر آرد۔

دوہرہ

چلی پتلی لون کی تھاہ سمندر کا لین　　　　مل سروپ پانی بھئی پلٹ کہے کو بین

خود گداختہ شود و خود را گم کند۔ چنانچہ ستارگان در پرتو آفتاب بے نوری شوند و گم میگروند ہمچناں از پرتو آفتابِ احدیت ہستی سالک گم می شود و بیکار گردد۔ ہر چند کہ برائے حصول مطلب خویش پیش میرد خود را بیش گم می کند۔ چنانچہ محققی گفتہ۔

رباعی

ہیچ[1] میدانی کہ چیزے کیستی و چیستی　　　　در دلت دریاب نیکو ہستی آیا نیستی

دانکہ می بیند بصیر است وانکہ می شنود سمیع　　　　وانکہ می واند علیم است پس بگوتو کیستی

---

[1] یہ رباعی حضرت مسیح الاولیاء کی ہے۔ (راشد)

در رشحات از بزرگے آوردہ اند کہ در آدمی چند صفت عاریت نہاوہ اند و آدمی آنرا بہ خود نسبت کردہ و خود را چیزے خیال میکند چوں چشمِ دلِ او کشادہ میشود دمی بیند کہ آن ہمہ از ما نیست بلکہ از جائے دیگر است کہ از انجا باین جا پر تو انداختہ واین محل تاریک راروشن ساختہ۔ چون ازین حقیقت واقف می شود خود رامحض عدم می یابد۔

ایک اور دوہا اور اس کی شرح

دوہرہ

پیم کہانی بس بھری مت سنیو کوئی آئے
باتوں باتوں بس چڑھے دیکھت ہیں گھر جائے

معنی ظاہر آنست کہ افسانۂ عشق زہر آلودہ است کسی آمدہ نہ شنود کہ از سخنانِ این افسانہ شنوندہ را زہر اثر می کند۔ دیدہ و دانستہ خانہ خراب می شود۔ مطلبش آنکہ عاشق افتادہ از راہِ امتحان میگوید ومی ترساند وظاہر میکند کہ افسانۂ عشق نہ شنوید وسخن او در گوش نہ کنید کہ درپۓ این گفتگو واثرہاست از شنیدن و دیدن می کشد و از ویدن خویش و بیگانہ بریدن و از ماسوی اللہ دست امید کشیدن بلکہ ایشان را موجود نہ ویدن و جامۂ صبر دریدن و سراپائے ساختہ جانب محبوب دویدن ودرد و بلا بجان خریدن چنانچہ آنمست شراب باقی حضرت شیخ فخر الدین عراقی قدس سرہٗ فرمودہ است۔

نظم

بہ عالم ہر کجا رنج و بلا بود   بہم بروند و عشقش نام کردند

شنیدہ باشی کہ درنسل عادیاں دخترے بود نیک اختر چوں خبر حسن و زیبائی حضرت یوسف علیہ السلام شنید از شنیدن بہ دیدن کشید و از جام کثرت شرابِ وحدت نوشید و از مجاز بہ حقیقت رسید و مے وصل از لبِ محبوبِ حقیقی چشید۔

اول سے آخر تک پوری کتاب اسی بلندی و برجستگی سے ختم ہوئی ہے۔ بسلسلۂ بیان میں بزرگوں کے اقوال تمثیلات۔ حدیثوں اور آیاتِ قرآنی کا ربط نفسِ مضمون کی اس شرابِ طہور کو دو آتشہ بنائے ہوئے ہے۔ تطویل سے بچنے کے لئے بہ نظر اختصار چند مقامات سے صرف دوہے نقل کرتا ہوں۔ ملاحظہ ہو:

پیم گلی اِت سانکڑی پیو بن کچھ نہ سمائے
تن من چھوڑ جو آ سکے تو ہیں آیا جائے

ایک اور دوہا

پیم نگر موں آئے کے سدھ بدھ سؤن رہیو کون
سدھ بدھ یوں گھل جات ہے جوں پانی میں لون

یہ دکھا دیکھئے

اکت کتھا ہے پیم کی کہے بنت کچھ نانھ
جاتن لاگے نہیرا سوبوجھے من مانھ

اور یہ دوہا

آگ لگو وادیس کو پھٹ پڑے وہ ٹھاؤں
جہاں نہیں چرچا نیہہ کا پنچ نہ لیویں نانوں

آخری دوہا

پیت کی ریت کریت ہے مت کھینچ وہ نانوں
بھولی گئو اور بوڑھی نو کا نہیں ٹھکانا ٹھانوں

اس دوہے کی شرح میں بزرگوں کے اقوال، اشعار، حدیثیں، آیاتِ قرآنی وغیرہ کو جگہ جگہ استعمال کیا گیا ہے۔ صرف اس کی شرح ۹ صفحات سے کچھ زیادہ جگہ میں تحریر ہے۔ بعض اشعار تو شعراء سے نامزد ہیں، مثلاً عراقی، حافظ اور متعدد اشعار۔ نیز خاتمہ کی منظوم مناجات کسی سے نامزد نہیں ہے۔ ممکن ہے یہ نظم حضرت کی فرمودہ ہو۔ میں ان تاکیدی الفاظ کے ساتھ پوری نظم ہی نقل کئے دیتا ہوں۔ اگر یہ منظوم مناجات جیسا کہ اندازہ اور قرینہ بھی ہے۔ حضرت کی ثابت ہو تو ان کے ذکر میں ان کا یہ تبرک بھی غنیمت ہے۔

مناجات اہلِ نجات ایں است

اے جمالِ تو کانِ محبوباں — عکس حُسنِ تو جلوۂ خوباں
جلوۂ حسنِ قسمت در ہمہ جا — از تو دارند جملہ نشوونما
چشمِ آنکس کہ کردۂ تو وا — نظرش کے فتد بہ غیر سوا
تاکہ حسنِ تو گشتہ است عیاں — جذبہ عشق تست درہمہ جاں
ہمہ ذرات مست و بیخبر اند — از خودی ہاے خویش بگذ شتند

حسنِ لیلیٰ کہ زورہِ مجنوں   بردہ از کوی عقل سوے جنوں

ہوش وامق کہ زلفِ عذر ابرو   دل و جانش بہ بیخودی بہ سپرد

لبِ شیریں کہ بود شور انگیز   رنج فرہاد راحتِ پرویز

زاں ہمہ پر تو جمالِ تو بود   کہ دل ہر یکے ازاں بر بود

گرچہ جز یک جمال بیش نہ بود   در ہر آئینہ روے خویش نمود

گشت کثرت نما در آئینہ ہا   مختلف گشت در معائنہ ہا

گاہ در گل بود گہہ (گلے) درخار   روئے در ہر لباس و ہر اطوار

ہر طرف جلوہ گر بہ شکل و گر   تو بہر شکل روئے اونگر

گاہ در مومناں نماید روئے   گاہ در کافراں کشاید موئے

گہہ بہ کعبہ گہے بہ مسجدہا   پر توئے روئے تسمت صنما

گاہ در بُت گر وگہے بہ بتان   جلوہٗ خود نمودی اے جانان

بت پرست و برہمن و خمار   از تو دانند موبہ مو اسرار

گہہ زروئے مضل و گہہ ہادی   ہمہ را پرورش تو خود وادی

چونکہ در اصلِ شاں ہی نگرم   ہمہ جاروی تست جلوہ گرم

بُروی از صورتِ دلِ مجنون   کردی اور الحسنِ خود مفتوں

دلِ وامقِ بہ ہستی بردی   زلفِ عذرا بہانہ آور دی

روی شیریں کہ بود راحت خیز   شہر فرہاد شکر پرویز

ایں ہمہ جز بہانہ بیش نہ بود   کیست جز تو کہ روئے خویش نمود

من ہم اے شہ یکے گدائے توام   ازدل و جان خود فدائے توام

تاکہ جانم جدا اشد ازاعیاں   جملہ دارند برمن آہ و فغاں

کہ بری در سرائے خود بیناں   کر فرستی بہ پیش بے دیناں

چند سرگشتہ داریم چوں باد   گہہ پری بر خرابہ گہہ آباد

چہ شود گرازیں خلاص دہی   گہہ ز اخلاص جامِ خاص دہی

بادشاہا مر از خویش رہاں   تاکہ باشم بچشمِ خویش نہاں

روز و شب کوس دولتِ توزنم   گہہ نیاید بخاطرم کہ منم

چند داری مراز خود مہجور   توبہ نزد من است ومن نہ تو دور

گر بہ تیرم کشی و گر بہ تفنگ   صلح کردم برین ندارم جنگ

پردۂ ماؤ من زپیش رہائے — برزخ خویش چشم من بکشائے
چونکہ بر خویش چشم بکشایم — تو درانی بہ چشم من نایم
ورنہ بہ بینی نہ مرد این ہوسم — طلب شیر و کمتر از مکسم
بدل اہلِ ولاں وراہم دہ — بصفِ بے ولاں پناہم دہ
سر من خاک ساز درویشان — تابیایند و بگذرند ایشاں
حرزِ جانم نگاہِ ایشاں کن — دل و جانم بہ راہ ایشاں کن
خاطرم رام کن ز صحبت شاں — وقتِ من ساز خوش ز صحبت شاں

تمت تمام شد، کارِ من نظام شد پیم کہانی، من تصنیف قدوۃ الواصلین زبدۃ العارفین، منبع السالکین حضرت شاہ برہان الدین راز اللہ قدس اللہ سرہٗ العزیز مورخہ ۱۱ ماہ رجب المرجب بروز شنبہ ۶ ۱۳۰۶ھ صورت اتمام یافت۔

کتاب عام کتابی سائز کے ۸ ۷ صفحات میں تحریر ہے کل ۴۵ دوہے ہیں، جن کی شرح مندرج ہے۔ کاغذ انگریزی دور کا ہے اور بہت معمولی تاہم پوری کتاب سالم و مکمل ہے۔ کاتب نے اپنا نام نہیں لکھا۔ خط معمولی بلکہ بدخط اور کتابت کی غلطیاں بھی بکثرت ہیں۔

عربی مکتوب

قبل اِس کے کہ مکتوب ہذا کی نقل و ترجمہ پیش کروں یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ کس طرح وجود پذیر ہوا۔

برہانپور کے ایک بزرگ سید عبدالرحمٰن نے مختلف علماء و مشائخِ عصر کے پاس مختلف علمی سوالات عربی میں روانہ کئے اور اپنے سوالات کے جوابات بھی عربی میں طلب کئے۔ سوالات، تصوف، علمِ کلام، علم بیان، منطق فلکیات وغیرہ علوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے ایسے ۲۳ مکاتیب کے جوابات علمائے عصر سے حاصل کئے اور اس مجموعہ مکاتیب کو معہ مختصر تمہید و خاتمہ کے ثلثۃ و عشرین مکاتیب کے نام سے ایک رسالہ ترتیب دیا جو راقم الحروف کے پاس موجود ہے۔ اسی رسالہ میں دوسرا مکتوب حضرت شیخ برہان الدین راز الٰہی قدس سرہٗ کے نام ہے۔ آپ سے شریعت، طریقت، حقیقت کی وضاحت چاہی ہے۔ آپ نے جو جواب دیا ہے۔ اس کی نقل رسالۂ مذکور سے پیش ہے چونکہ یہ رسالہ کسی خوش قلم نسخہ نویس کا مکتوبہ ہے۔ اس کی کتابت کی اغلاط کی درستی کے لئے جناب ڈاکٹر مولوی غلام مصطفیٰ خان صاحب کا بصمیم قلب ممنون ہوں۔

نیز ڈاکٹر صاحب موصوف ہی نے ترجمہ کی بھی زحمت فرمائی جس کے لئے صد نیاز مزید شکریہ۔

مکتوب کے شروع ہونے سے قبل پیشانی پر سرخی سے یہ عبارت درج ہے:

فی مجاریۃ العارف صاحب الکشف والوجدان الشیخ البرہان البرہان پوری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللہ الذی انزل الکتب وارسل الرسل ھداۃ الناس السبل فھدوھم اجمعین الی الشریعۃ والخواص منھم الی الطریقۃ واخص الخواص اے الحقیقۃ والصلوٰۃ علی سیدھم محمد مصطفی وعلی آلہ شموس الھدی. اما بعد فقد وصل الی احوج الخلیقۃ بمنصک الانیقۃ مشتملا علی السؤال عن الشریعۃ والطریقۃ والحقیقۃ فاعلم نور اللہ قلبک بنور الایقان وکحل بصیرتک بالاذعان ان سید ولد آدم صلی اللہ علیہ وسلم اعتنی بسعادتنا فی الآخرۃ والدنیا فوضع قوانین نرجع الیھا فی معاشنا لینتظم بھا احوالنا ثم وضع العبادات البدینۃ احکاما لتلک القوانین وتوجیھا لوجوہ القلوب الی قبلۃ الحق ویسمی...... القوانین و العبادات شریعۃ والتربیۃ التی بالشریعۃ عامۃ شاملۃ لکل احد من المومنین ثم دعی الناس الی تخلیۃ نفوسھم عن الاخلاق الذمیمۃ کالبخل والحرص والحقد والحسد وامثالھا وتخلیتھا بالاخلاق الحمیدۃ کالکرم والعفو و علو الھمۃ وامثالھا واھتمامہ صلی اللہ علیہ وسلم بحسن الاخلاق عظیم حتی قال بعثت لاتمم مکارم الاخلاق والتربیۃ التی تھدیھا الدعوۃ ایضا. عامۃ لکن الشارع بقیم الحد والتعزیر بمخالفۃ الشرع ظاھر اولا یقیمھا لسوء الاخلاق وقد قال صلی اللہ علیہ وسلم نحن نحکم بالظاھر وقال اللہ تعالیٰ وذروا ظاھر الاثم وباطنہ والمواد بظاھر الاثم الاعمال السیئۃ وبباطن الاثم الاخلاق الردیۃ ثم ھدی صلی اللہ علیہ وسلم خواص احبائہ الی طریق الریاضات الموجبۃ لانقطاع النفس عن العلائق البدینۃ وکونھا بصدد الانقطاع ای وقت اتفق ھو الموصل الی معرفۃ حقائق الاشیاء کشفاء ومشاھدۃ للانوار والتجلیات والفناء فی اللہ والبقاء بہ ویسمی مجموع علم الاخلاق وعلم السلوک طریقۃ ویسمی المقاصد التی ینتھی الیھا الطریۃ حقیقۃ فالنبی مبعوث لوضع الشریعۃ وکشف الحقیقۃ وقد قال صلی اللہ علیہ وسلم الشریعۃ اقوالی والطریقۃ افعالی والحقیقۃ احوالی یعنی الشریعۃ ما اقول لنظم العالم وتعیین العبادات والطریقۃ اخلاقی ای الاعمال الموصلۃ الی کشف الملکوت والحقیقۃ الفناء والبقاء والتجلیات وعلم التصوف باحث عن طریق السلوک والوصول ولھٰذا قال جعفر الصادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ من عاش فی ظاھر

رسول الله صلى الله عليه وسلم وباطنه فهو صوفى والمومن برعاية الشريعة صالح وبرعاية الطريقة سالک وبرعاية الحقيقة ولى كامل اختلاف شرائع الانبياء بحسب اختلاف امزجة الناس كاختلاف ادوية الاطباء بحسب اختلاف امزجة المرضاء فان الانبياء اطباء النفوس كما ان الحكماء اطباء الابدان فتامل ثم تامل وجيد التامل لينكشف عليک الحال ويرفع عنک الاشكال ثم اعلم ان الوصول الى الحقيقة موقوف على سلوک الطريقة وهو موقوف على التزام الشريعة وبعض الناس اهل الشريعة فقط وليس لهم استعداد الطريقة وبعضهم اهل الشريعة والطريقة وليس لهم استعداد الحقيقة وبعضهم اهل الشريعة والطريقة والحقيقة ولان النبى صلى الله عليه وسلم رأى تفاوت وهذه الدرجات قال كلموا الناس على قدر عقولهم وقال صلى الله عليه وسلم نحن معاشر الانبياء امرنا ان نكلم الناس على قدر عقولهم ولم يكن النبى صلى الله عليه وسلم مظهراً للحقيقة لكل احدا من المومنين وانما كان هذا القبيل من كلامه صلى الله عليه وسلم مع اصحاب الصفة وكانوا تاركين الدنيا سالكين فى سبيل الله واصلين الى الحقيقة والمشهور منهم حذيفة ابن اليمان والبلال الحبشى وصهيب الرومى و سلمان الفارسى وأسامة وحارثه و معاذ براء و مقداد و ابوذر وابو درداء و عمار وامام علیؓ فهو رئيس الارباب الطريقة والحقيقة وكل الصحابة مسرور به بعد النبى صلى الله عليه وسلم كما بروية صلى الله عليه وسلم ولهٰذا قال الشيخ المغربى فى الباب السادس من الفتوحات اقرب الناس الى محمد صلى الله عليه وسلم على ابن ابى طالب. امام العالم وسر الانبياء اجمعين ويناسب هذا قوله صلى الله عليه وسلم كن مع الانبياء سرا ومعى جهرا فان قصر احدكم عن مرتبة الحقيقة وتكلمت معه منها ضيعته وافسدت اعتقاده وضيعت كلامک بل ضيعت نفسک لانه لايفهم مقصودک ويكفرک فيكون فى معرض القتل ويويد هذا ان النبى صلى الله عليه وسلم رضى من الجارية الخرساء المشيرة الى السماء حين قال صلى الله عليه وسلم لها اين الله تعالىٰ ولاجل ذالک قال ابوهريرة رضى الله عنه انى حفظت من رسول الله صلى الله عليه وسلم دعائين من العلم اما الواحد فبثثته فيكم واما الاخرة واما الاخرة فلو بثثتهٔ فيكم لقطعتم من البلعوم وهذا الحديث مذكور فى صحيح البخارى وقال ابن عباسؓ لو فسرت قوله تعالىٰ خلق سبع سمٰوٰت ومن الارض مثلهن لرجمتونى وقال على كرم الله وجهه مشير الى صدره ان هٰهنا علوما جمعه لو وجدت لها حملة ولو

ھٰھنا للتمنی وایضا لو جمعت من خیار کم مائۃ واحدثکم من غدوۃ الی العشاء ما سمعت من فی ابی القام لیخرجون من عندی وانتم تقولون ان علیا من اکذب الکاذبین وافسق الفاسقین.

﴿ حمد بیحد اس ذاتِ گرامی کی جس نے صحیفے نازل فرمائے اور رسولوں کو بھیجا جو لوگوں کو راستہ دکھانے والے ہیں۔ پس ان سب کو شریعت کی طرف رہنمائی کی اور اخص خواص کو طریقت کی ہدایت اور اخص خواص کو حقیقت کی رہنمائی اور صلوٰۃ ان سب کے سردار محمد مصطفیٰ ﷺ اور ان کی آل و اصحاب پر جو ہدایت کے آفتاب ہیں دیگر آنکہ وصول ہوا میرے پاس جو محتاج ہوں تمام مخلوق میں سب سے زیادہ آپ کا والا نامہ جو مشتمل تھا شریعت طریقت اور حقیقت کے سوال پر معلوم ہو (اللہ آپ کے قلب کو ایقان کے نور سے منور فرمائے اور آپ کی بصیرت کو اذعان کا سرمہ لگائے) کہ حضرت آدم کی بیٹوں کے سردار صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا اور آخرت میں ہماری سعادت کے لئے توجہ دی آپ نے ایسے قوانین وضع فرمائے جو ہمارے معاشی مسائل میں مفید ہیں، تاکہ اپنے احوال میں نظم پیدا کریں پھر ان قوانین کی خاطر عبادات بدینہ وضع کیں دلوں کے چہروں کو حق کے قبلہ کی طرف موڑنے کے لئے اور اول قوانین وعبادات کا شریعت نام رکھا گیا۔ اور وہ تربیت جو شریعت کے ذریعہ ہوتی ہے، عام ہو تمام مومنین کے لئے۔ پھر آپ نے لوگوں کو دعوت دی اپنے نفوس کو کنارہ کش کرنے کے لئے اخلاق ذمیمہ سے مثلاً بخل، حسد، کینہ وغیرہ کے اور اپنے نفوس کو تعلق کریں اخلاق حمیدہ سے مثلاً کریم اور عفو۔ علو ہمتی وغیرہ ہمتی وغیرہ کے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حسنِ اخلاق کے بارے بڑا اہتمام فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ فرمایا میں اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں اور وہ تربیت جس کی طرف یہ دعوت ہدایت کرتی ہے۔ وہ عام ہے لیکن شارع علیہ السلام نے حد اور تعزیر قائم کردی ہے۔ شرع ظاہر کی مخالفت پر اور نہیں قائم کی حد سوء اخلاق کے لئے اور تحقیق فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ ہم فیصلہ کرتے ہیں ظاہر پر اور فرمایا اللہ پاک نے کہ درگذر کرو ظاہر و باطن کے گناہ سے اور ظاہر گناہ سے مراد اعمال سیئہ ہیں اور باطن گناہ سے مراد ردی اخلاق ہیں۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خاص احباب کو ریاضات کے ضروری طریقے بتائے تاکہ نفس منقطع ہوجائے۔ علائق بدینہ سے او جب بھی منقطع ہونے کے درپے ہوگا، اس وقت ممکن ہوگا کہ وہ حاصل کرے اشیاء کے حقائق کشف سے اور انوار وتجلیات کا مشاہدہ ہو اور فنا ہو اللہ پاک کی ذات میں اور اس کے ساتھ بقا نصیب ہو۔ علم الاخلاق اور علم سلوک کا مجموعہ طریقہ کہلاتا ہے اور جو مقاصد طریقت پر منتہی ہوتے ہیں وہ حقیقت کہلاتے ہیں۔ پس نبی مبعوث ہوتا ہے شریعت کو وضع کرنے حقیقت کا

انکشاف کرنے کے لئے اور تحقیق فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ شریعت میرے اقوال ہیں اور طریقت میرے افعال اور حقیقت میرے احوال ہیں یعنی شریعت وہ ہے جو میں نے وضع کی نظم عالم اور تعین عبادت کے لئے اور طریقت میرے اخلاق ہیں یعنی وہ اعمال جو عالم ملکوت کا انکشاف کراتے ہیں اور حقیقی ہی فنا بقا اور تجلیات کا نام ہے اور علم تصوف، سلوک اور وصول کے طریقے بتاتا ہے اور اسی نے فرمایا جعفر الصادق رضی اللہ عنہ نے کہ جس نے زندگی بسر کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہر اور باطن کے مطابق وہ صوفی ہے اور وہ مومن جس نے شریعت کی پابندی کی وہ صالح ہے اور جو طریقت پر عمل کرے وہ سالک ہے اور جو حقیقت کی رعایت کرے وہ ولی کامل ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں کا اختلاف لوگوں کے مزاجوں کے اختلاف کے سبب ہے، جیسے اختلاف اطباء کی داؤں میں مریضوں کے مزاجوں کے اختلاف کے سبب ہے۔ پس انبیاء علیہم السلام نفوس کے اطباء ہیں جیسے حکماء جسموں کے اطباء ہیں۔ پس اس بارے میں غور کر پھر غور کرو تاکہ حال کھل جائے اور رفع ہوجائے تم سے اشکال پھر جانو گے کہ حقیقت تک پہنچنا سلوکِ طریقت پر موقوف ہے اور وہ موقوف ہے التزام شریعت پر اور بعض لوگ صرف شریعت کے اہل ہوتے ہیں اور نہیں ہوتی ان کو استعداد طریقت کی اور بعض لوگ شریعت اور طریقت کے اہل ہوتے ہیں اور نہیں ہوتی ان میں استعداد حقیقت کی اور بعض لوگ شریعت طریقت اور حقیقت سب کے اہل ہوتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے درجات کے اسی فرق کی وجہ سے فرمایا کہ لوگوں سے کلام کرو، ان کی عقلوں کے مطابق اور فرمایا حضور نے کہ ہم گروہ انبیا ہیں کہ ہم کو حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے کلام کریں ان کی عقلوں کے مطابق اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر نہیں فرماتے تھے حقیقت ہر ایک مسلمان پر اور آپ کی اس قسم کی گفتگو اصحاب صفہ کے ساتھ رہا کرتی تھی وہ تارک الدنیا اللہ کی راہ کے سالک اور واصل تھے حقیقت کے اور ان میں سے مشہور حذیفہ ابن یمان اور بلالِ حبشی اور صہیب رومی اور سلمان فارسی اور اُسامہ اور ثارثہ و معاذ اور براء و مقداد اور ابوذر و ابوالدرداء و عمار تھے اور حضرت علی تو سردار تھے اہلِ طریقت اور حقیقت کے اور تمام صحابہ ان سے خوش ہوتے تھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جیسا کہ دیدار سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی لئے شیخ مغربی (محی الدین ابن العربی) نے فتوحات کے چھٹے باب میں لکھا ہے کہ لوگوں میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ قریب علیؓ ابن ابی طالب ہیں جو تمام دنیا کے امام اور انبیاء کے راز ہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اس بات کے مناسب ہے کہ آپ نے ان کو فرمایا کہ انبیاء کے ساتھ راز رہو اور میرے ساتھ کھلے رہو اب اگر تم میں سے کوئی مرتبہ حقیقت کو پہنچانے میں کوتاہ رہے اور تم نے اس سے حقیقت پر گفتگو کی تو تم اسے بیکار بنادو گے

اور اس کا عقیدہ خراب کردو گے اور اپنی گفتگو کو بھی رائگاں کردو گے۔ بلکہ اپنی نفس کو بھی خراب کردو گے کیونکہ وہ تمہارا مقصد نہیں سمجھے گا اور وہ تمہیں کافر کہے گا تو وہ قتل کا مستحق ہوجائے گا اور اس بات کی تاکید اس طرح ہوتی ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم راضی ہوئے ایک گونگی لڑکی سے جس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ جب دریافت کیا اس سے حضور نے کہ اللہ کہاں ہے اور اس لئے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے علم کے دو ظرف (برتن) حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محفوظ کرلئے ہیں ان میں سے ایک کو میں نے تم میں پھیلادیا ہے اور دوسرا وہ ہے کہ اگر میں تم میں پھیلاؤں تو تم میری گردن کاٹ لو گے اور یہ حدیث صحیح بخاری میں مذکور ہے۔ اور ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اگر میں تفسیر کردوں اس آیت کی خلق سبع سمٰوٰت تو تم مجھ پر پتھر مارو گے اور فرمایا حضرت علی کرم اللہ وجہ نے اپنے سینہ کی طرف اشارہ کرکے کہ یہاں سارے علوم جمع ہیں کاش کہ میں پاتا ان کو اُٹھانے والے (لو کا لفظ یہاں تمنا کے لئے ہے) اور یہ بھی فرمایا کہ تم میں سے اگر سو بہترین آدمیوں کو جمع کروں اور میں بیان کروں صبح سے شام تک جو کچھ کہ میں نے سنا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تو تم میرے پاس سے چلے جاؤ گے اور یہ کہتے ہوئے کہ علی سب سے زیادہ جھوٹا اور کاذب ہے۔

حضرت رازِ الٰہی قدس سرہٗ کی دیگر تصانیف کے متعلق اہل مطالعہ تذکرہ نگاروں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ گذشتہ سال جناب بشیر محمد خان صاحب ایڈوکیٹ نے آپ کے رسالہ وصیت نامہ کا کچھ نمونہ رسالۂ معارف میں شائع فرمادیا ہے۔

پیم کہانی اور منسلکہ کی نسبت کوئی تحریر نگاہ سے نہیں گذری تھی۔ اس لئے میں نے مکتوب کو مکمل اور پیم کہانی سے اقتباس پیش کردیا ہے۔ آپ کا وصال باتفاق جمہور ۱۵ شعبان المعظم ۱۰۸۲ھ کو ہوا۔ آپ کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جنازہ میں ہزارہا خواص وعوام نے شرکت کی۔ مورخ معروف خافی خان کا بیان ہے کہ میں بھی حاضر تھا۔ غور سے دیکھنے پر بھی یہ اندازہ نہیں ہوسکتا تھا کہ جنازہ دوشِ ہوا پر جارہا ہے یا لوگوں کی انگلیوں پر! اصل عبارت سے ایک مختصر فقرہ ملاحظہ ہو:

> محرر اوراق (محمد ہاشم خافی خان) ہم از جملہ چندیں ہزار مردم در پائے جنازہ می رفت ہر چند بدیدۂ تامل نظر می انداخت اصلاً مرئی نمی شد کہ جنازہ بر سر انگشتان مردم میرود یا بر ہوا میرود۔

آپ کو اپنی خانقاہ کے حجرہ میں دفن کیا گیا اور نہایت سادگی سے خام مزار بنایا گیا۔ با اینہمہ رجوعِ خلق کا یہ عالم تھا کہ مزارِ فیض آثار پر ہمہ وقت اہلِ نیاز کا بے پناہ ہجوم رہنے لگا اور

توسیع کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ تاہم دس بارہ سال تک کوئی تبدیلی یا وسعت نہیں کی گئی۔ حتیٰ کہ حضرت اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازیؒ برہان پور تشریف لائے اور انہوں نے حضرت شیخ سے دیرینہ عقیدت کی بناء پر آپ کا عظیم الشان مقبرہ تعمیر کرنے کا انتظام کیا۔

تعمیر سے متعلق کوئی تحریری صداقت موجود نہیں۔ ایک سینہ بسینہ زبانی روایت البتہ سنی گئی ہے۔ چونکہ میں نے اِس تذکرہ ہی میں نہیں بلکہ اپنے تمام تحقیقی مضامین میں ایسی افواہی روایات کو دخیل کرنے سے ہمیشہ اجتناب کیا ہے جن کی تصدیق یا بین ثبوت بہم نہ پہنچی ہو۔ لیکن اس روایت میں بعض باتیں ایسی ہیں جو واقعات سے نمایاں ربط رکھتی ہیں اس لئے بایں خیال کہ

تا بنا شد چیز کے گویند مردم چیزہا

ممکن ہے اس میں کچھ مبالغہ ہو جو کچھ سنا ہے ذیل میں درج کرتا ہوں:

اورنگ زیب زمانۂ شہزادگی ہی سے شیخ کا انتہائی عقیدتمند تھا۔ عام آدمیوں کی طرح آپ کی مجلسوں میں شریک ہوتا اور بیش قرار نذرانے خدمتِ والا میں پیش کرتا۔ لیکن حضرت نے کبھی توجہ نہ کی اور کوئی نذرانہ قبول نہ فرمایا۔ پھر بھی شہزادہ نے حاضر باشی ترک نہ کی حتیٰ کہ حصولِ سلطنت کو بھی آپ کی باطنی توجہ اور دعاؤں کی برکت تصور کرتا رہا۔

برہان پور آ کر جب یہ دیکھا کہ شیخ کا مزار تنگ و تاریک حجرہ میں ہے اس پر ایک خوش منظر وسیع و مستحکم گنبد کی تعمیر کا انتظام کیا اور اپنی کسبِ حلال کی وہ رقم جو کلاہ سازی اور کتابت قرآن مجید سے بہم پہنچائی تھی بہ خلوص عقیدت و نیاز آغاز کار میں صرف کی۔ مزار کو مرکز قرار دیکر اطراف وسیع مربع قطعۂ زمین میں وسط میں گنبد اور اطراف میں محرابدار مسقف دالانوں کی تعمیر کے قابل مضبوط بنیادیں قائم کر کے مرتفع کرسی چونہ گچ اور سنگ خارا کی صاف ترشی ہوئی سلوں سے تعمیر کی۔

تعمیر یہیں تک پہنچی تھی کہ حضرت کی روح مبارک کی جانب سے سختی کے ساتھ آئندہ کام ختم کر دینے کی ہدایت ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ اورنگ زیب کی قوتِ بازو کی کمائی یہیں تک کفایت کر سکی گنبد کی تعمیر پر شاہی خزانہ سے رقم صرف ہوتی اس لئے حضرت نے اسے رد کر دیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

یہ روایت میں نے حدِ سماعت تک اپنے الفاظ میں نقل کر دی ہے۔ اس میں واقعات سے ربط رکھنے والی قابلِ لحاظ باتیں یہ ہیں: ارنگ زیب کی عقیدت بزمانۂ شہزادگی اظہر من الشمس ہے خافی خاں کی تاریخ میں بڑی وضاحت سے تمام تفصیلات مندرج ہیں بالفاظ مختلف چند ثقہ حضرات سے بلکہ میرا تو خیال ہے کہ حضرت سید ریاض الدین قدس سرہٗ سے بھی یہ روایت سننے میں آئی ہے۔

موجودہ مقبرہ جو ۱۹۴۷ء مطابق ۱۳۶۶ھ میں تیار ہوا۔ اسی قدیم بنیاد پر تعمیر ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنی پائیدار بنیاد اور ایسی مستحکم کرسی جو قریباً تین سو برس گذر جانے پر بھی ایسے عظیم الشان مقبرہ کی تعمیر جدید کی متحمل ہوسکی۔ زمانۂ بناء میں عظیم ترین عمارت بنانے کے لئے ہی استوار کی گئی ہوگی اور اپنے استحکام کے اعتبار سے وہ شاہی تعمیر ثابت ہوتی ہے۔

میں نے تعمیر مقبرہ سے متعلق جناب سید اکرام الدین صاحب سجادہ نشین حال سے خط و کتابت کی تو موصوف نے یہ تمام چیزیں واضح فرمائیں کہ

مقبرہ کی تعمیر ۱۳۵۵ھ مطابق ۱۹۳۷ء سے شروع ہوکر ۱۳۶۶ھ مطابق ۱۹۴۷ء میں ختم ہوئی۔ درمیان میں سامانِ تعمیر کی نایابی کے باعث دو سال کام ملتوی رہا۔

مقبرہ کی تعمیر پر تقریباً پچھتر ہزار روپیہ صرف ہوا ہے۔ یہ تمام روپیہ سید جنید علی مغفور سجادۂ ماسبق اور ان کے تین فرزندوں سید ریاض الدین صاحب مرحوم سجادہ سابق اور جناب سید نصیر الدین صاحب وجناب سید ولایت علی صاحب نے اپنی ذاتی رقم سے صرف کیا کسی کا عطیہ یا کسی قسم کا چندہ اس کے لئے وصول نہیں کیا گیا۔

اِس عظیم الشان تعمیر کے انبار در انبار سامان کی بہم رسائی اور نگہداشت کی محنتِ شاقہ اس طولانی عرصہ تک سید حبیب الدین صاحب نے کمال مستعدی سے انجام دی جو سید نصیر الدین صاحب کے فرزند اور سجادۂ حال کے بہنوئی ہیں۔

مقبرہ کی تعمیر اسی بنیاد پر استوار کی گئی جو قدیم زمانہ سے مرتفع چبوترہ کی صورت میں قائم تھی۔ اس کی پختگی کا امتحان کیا گیا تو ثابت ہوا کہ بنیاد نہایت پختہ ہے۔

یہ نادر العصر تعمیر برہانپور کے نامور مستری عبدالعزیز عرف عجا بھائی کی کارکردگی میں از ابتداء تا انتہا تکمیل کو پہنچی۔ مستری موصوف نے برہانپور و دیگر مقامات پر اور بھی مقابر بنائے ہیں لیکن یہ مقبرہ اپنی وسعت وعظمت کے اعتبار سے ان کا عظیم کارنامہ ثابت ہوتا ہے۔

سید جنید علی قدس سرہٗ نے اس سے قبل ۱۳۲۶ھ میں احاطہ مقبرہ کی مسجد بھی تعمیر کرائی تھی، یہ تعمیر بھی قدیم پایہ پر واقع ہوئے ہے جو مستری عبدالعزیز ہی کی مشاق دستکاری کا حسین ترین نمونہ ہے۔ اس تعمیر میں بھی کسی کا عطیہ یا چندہ قبول نہیں کیا گیا۔

اس سے اور چند سال قبل حضرت سید جنید علی قدس سرہ نے اس وسیع احاطہ کی پختہ دیواریں، پھاٹکیں اور مضبوط دروازے بنوائے تھے، احاطہ خاصا وسیع ہے۔ عرس کے موقعہ پر دو روز تک میلہ لگتا ہے۔ اکل وشرب کی صدہا دکانیں لگتی ہیں۔ دیگر مختلف اجناس کی دکانیں بھی آتی ہیں۔ اہل نیاز کا ہجوم در ہجوم تانتا بندھا ہوتا ہے۔ اس عرس کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ معزز

خاندانوں کی پردہ نشین مستورات بھی بڑی کثرت سے حاضر ہوتی ہیں۔ ان کے لئے پردہ کا مقعول انتظام ہے۔ اس احاطہ سے ملحق لیکن بالکل الگ دوسرا احاطہ ہے۔ اسی میں خواتین کا اجتماع ہوتا ہے، وہاں بھی ہر قسم کی دوکانیں ہوتی ہیں جن میں عورتیں ہی کاروبار کرتی ہیں۔ کوئی مرد تو کیا دس سال کا لڑکا بھی اس احاطہ میں داخل نہیں ہوسکتا۔

شب برات کی صبح قبلِ نماز فجر اور سہ پہر کو میلاد و درود خوانی کے ساتھ صندل چڑھایا جاتا ہے اور رات کو بعد نماز عشاء بڑے اہتمام سے میلاد خوانی ہوتی ہے۔ شہر کی تمام نعت خواں جماعتیں حاضر ہوتی ہیں۔ اکثر اوقات تمام رات مجلس میلاد برپا رہتی ہے۔

جس طرح زندگی میں حضرت شیخ کی فیض رسانی مدت العمر جاری رہی۔ اسی طرح آپ کے وصال کے صدیوں بعد آج تک آپ کے مزار سے لوگ بلا امتیازِ مشرب و ملّت اپنی عقیدت و نیاز کی حد تک فیض یاب ہورہے ہیں اور ان کے ستودہ خصال اخلاف بھی علم پدر کی آگاہی کے فیضان سے میراثِ پدر کے مالک رہے ہیں! اور ہیں۔

☆
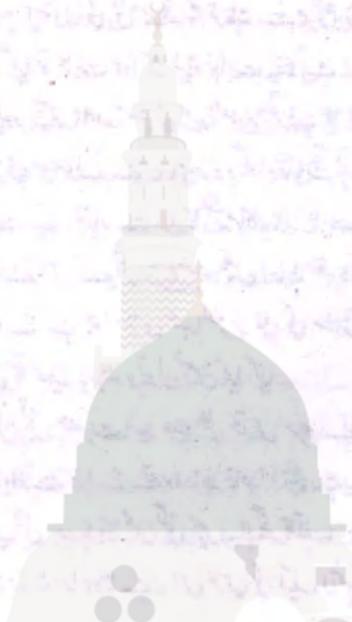
تاج العاشقین شیخ محمد ابن شیخ عبداللہ سندھیؒ

آپ کی ولادت نشوونما تعلیم و تربیت برہانپور میں ہوئی۔ مسیح الاولیاءؒ کے شاگرد، مرید، خلیفۂ معتمد و امین تھے۔ لیکن حضرت ملا غوثی نے آپ کو حضرت شیخ لشکر عارف باللہ کا خلیفہ لکھ دیا ہے۔ یہ ان کا سہو نظر اور مشاہدہ کا مغالطہ ہے اس کی توجیہ یہ ہے کہ شیخ محمد آغاز شعور میں شیخ طاہر محدث کے مدرسہ میں تعلیم پاتے تھے اور حضرت مسیح الاولیاء بھی محدث صاحب سے علوم عقلیہ کی کتابیں پڑھتے تھے۔ ابتداء ہی سے شیخ محمد کو مسیح الاولیاء کی جانب خاص کشش تھی، چنانچہ آپ مسیح الاولیاء کے مرید ہوگئے۔ بلکہ مسیح الاولیاء کے سب سے پہلے مرید شیخ محمد ہی ہیں۔

مسیح الاولیاء اولاً کسی کو مرید نہیں کرتے تھے، بلکہ طالبانِ ارادت و بیعت کو لطائف الحیل سے ٹال دیا کرتے تھے۔ ایمائے غیبی سے آپ کو راغب کیا گیا تب آپ نے یہ سلسلہ شروع کیا۔ مولانا فرحیؔ نے یہ صراحت ان الفاظ میں لکھی ہے:

> یک مرتبہ چنیں صدور یافت کہ کتاب مشکوٰۃ پیش حضرت عمومی میخواندم و طے روزہ داشتم۔ دریں اثنا شبے حق جل و علا بین الیقظۃ والنوم بصورت تمثیل متجلی شد و در دستِ من طومارے وادو دران طومار مقدار چہل و پنجاہ سطر مسطورِ بود ندودر ہر سطر ہمیں بود کہ جذبتہ من جزبات الالٰہیۃ توازی عمل الثقلین۔ و در ہر سطر چنانکہ درمکتوبات جاے اسم میگذارند گذاشتہ بودند در یک سطر نام شیخ محمد ابن عبداللہ مرقوم بود۔ بواسطۂ آن کہ دران ایام چوں ابتداے ظہور بود بغیر ایشاں کسے دیگر طالب نہ شدہ بود لاجرم نام کسے دیگر ہم نہ بود۔ (کشف ص ۲۸-۲۹)

اس عینی اشارت و بشارت کے بعد آپ نے کسی اہل صلاحیت کو مرید کرنے سے گریز و انکار نہیں کیا اور انکار کی گنجائش ہی کہاں رہی تھی جبکہ اُس طرح سے چالیس پچاس تعلیقات کا مرقع پیش نظر کرکے آگاہ کردیا گیا کہ تم فیض رسانی خلق سے کیسے گریز کرسکتے ہو اس تعداد کے تو آپ کے خلفاء ہمارے ہاں نامزد ہوچکے ہیں۔

اس مصدقہ شہادت کے بعد کسی شبہ کا امکان باقی نہیں رہتا کہ شیخ محمد بن عبداللہ مسیح الاولیاء کے مرید و خلیفہ تھے۔ حضرت شیخ لشکر محمد عارف کے نہیں۔ حضرت عثمان بوبکانی رحمۃ اللہ علیہ کے درس میں جب مسیح الاولیاء نے شرکت کی اُس زمانہ میں شیخ محمد نے بھی حکیم عثمان کے درس میں نقلی اصطلاحات پر چند کتابیں پڑھیں تھیں اور اس طرح وہ اپنے پیر کے ہمدرس ہونے

پر اظہار فخر و ناز کیا کرتے تھے۔ ملا غوثی کو ان کے اسی بیان پر مغالطہ ہوا کہ جب یہ دو اساتذہ کے درس میں مسیح الاولیاء کے ہمدرس رہے ہیں تو باہم پیر بھائی بھی ہوں گے۔ حالانکہ خود ملا غوثی نے شیخ نعمۃ اللہ کے ذکر میں شیخ محمد کو مسیح الاولیاء کا خلیفہ لکھا ہے۔ یعنی جب شیخ نعمۃ اللہ زیارتِ حرمین شریفین سے فارغ ہوکر واپس آئے تو بندر ڈابھول (ڈابھیل متصل سورت) کے متعلق لکھتے ہیں:

> مذکور الصدر بندر میں مسیح الاولیاء کے خلیفہ حضرت شیخ محمد نامی اس نواح کے لوگوں کی رہنمائی کے واسطے نامزد تھے۔ ان کے دیدار سے آنکھوں کو منور کیا۔

(اذکار الابرار ص ۵۶۲)

اس روایت کی حقیقت یہ ہے کہ جب گجرات کے متعدد لوگ برہانپور آ کر مسیح الاولیاء کے مرید ہوئے اور ان میں سے اکثر یہاں موجود رہ کر سلسلۂ شطاریہ کی تعلیم و تکمیل نہ کر سکتے تھے اُنہوں نے بمنت التجا کی کہ کسی خلیفہ کو ہمارے ہمراہ بھیج دیا جائے تاکہ ہماری مقصد بر آری ہو۔ آپ نے شیخ محمد کو مامور فرمایا یہ وہی زمانہ ہے جب شیخ نعمۃ اللہ بندر ڈابھیل پہنچے تھے۔ شیخ محمد چونکہ مسیح الاولیا سے والہانہ محبت رکھتے تھے مفوضہ امور سے فارغ ہوتے ہی عجز و زاری کے ساتھ واپسی کی التماس کی اور اجازت ملنے پر حاضر خدمت ہوگئے ان کے خطاب تاج العاشقین کی کوئی تقریب یا وضاحت سامنے نہیں ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ اپنے پیر سے اس درجہ محبت وفدویانہ عقیدت کے باعث مسیح الاولیا نے انہیں یہ خطاب عنایت فرمایا ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

گجرات سے واپسی کے بعد برہان پور میں مسیح الاولیا کے سایہ عاطفت میں روحانی ریاضت و مجاہدات کے ساتھ ساتھ پیر کی جملہ خدماتِ لائقہ تندہی سے انجام دیتے رہے۔ مسیح الاولیاء نے انہیں اپنا امین مقرر کر کے یہ خدمت ان کے ذمہ کردی کہ وہ فتوح و نذر کی رقوم اپنی تحویل میں رکھیں اور مستحق فقراء خانقاہ میں معینہ اصول کے مطابق تقسیم کردیا کریں کیونکہ مسیح الاولیاء کی عادت تھی کہ وہ مالِ دنیا از قسم نقد و جنس کبھی تحویل میں نہیں رکھتے تھے۔

ایک مرتبہ رات کے وقت خانخانان عبدالرحیم خان مسیح الاولیا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بعض علماء و صلحا بھی موجود تھے، پُر لطف صحبت نے نصف شب تک طول کھینچا، رخصت کے وقت خانخانان تین چار سو یا کچھ کم و بیش روپیہ نذر کرتے گئے۔ آپ نے اپنے امین شیخ محمد کو یاد کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ گھر جا کر سو رہا ہے حکم ہوا ابھی بلاؤ چنانچہ شیخ محمد بلائے گئے اور حضرت نے وہ رقم ان کے حوالہ کی۔ جب وہ لے جاچکے تب آپ کو نیند آسکی کشف الحقائق میں یہ ذکر اس طرح مرقوم ہے:

روزے خانخانان ابن بیرم خان کہ در اکثر شبہا خدمت حضرت مسیح منقبت می آمدند۔ آمدہ بہ صحبت علما و صلحا نشستند وقریب نصف شب برخاستہ سہ صد یا چار صد روپیہ یا کم وبیش نذر دادند۔ در آنوقت حضرت پیر دستگیر میاں شیخ محمد راکہ قسمت نمودن فتوح بہ فقیران ومستحقان حوالہ ایشان بود طلبیدہ عذر میکردند کہ شمارا از خواب بیدار کردہ طلب نمودہ ام شما تصدیع کشیدہ باشید لاکن من چہ کنم الخ
(کشف ص۳۹)

غرض شیخ محمد حضرت مسیح الاولیاء کے سچے شیدائی کی طرح جملہ خدماتِ لائقہ کی انجام دہی میں مصروف تھے اور ان کا عزم مصمم تھا کہ اب موت کے زبردست ہاتھ ہی پیر و مرشد سے جدا کریں تو کر سکتے ہیں۔ خود کسی طرح قدموں سے جدا نہ ہوں گے۔ افسوس کہ یہ اسباب بھی جلد ہی پیدا ہو گئے۔

اکبر بادشاہ نے خاندیس پر فوج کشی کی فاروقی بادشاہ معہ امراء و عمائدین شہر برہان پور قلعۂ آسیر میں جا بیٹھا۔ خیال تھا کہ اکبر چاہے کتنی ہی جدوجہد کرے اس ناقابلِ تسخیر قلعہ پر تسلط نہیں پا سکتا۔ لیکن اکبر کو بھی ایسی ضد آ گئی تھی کہ اس نے پورے ملک کی فوج طاقت سمیٹ کر نواح خاندیس میں فوجیں پھیلا دیں۔ قلعہ پر نئی نئی تیاریوں، قلعہ شکن آلات سے یورشیں، مکر و حیلہ و رشوتوں سے کام نکالنا چاہا، لیکن گیارہ ماہ تک خود موجود رہ کر تمام کوششوں میں ناکام رہا اور قلعۂ آسیر فتح نہ ہو سکا۔ ان حالات میں اس کی وہمی طبیعت میں یہ بات جم گئی کہ برہان پور کے صوفی اور مشائخ اپنے بادشاہ کی ردِ بلا کے لئے وظیفے پڑھتے اور دعائیں مانگتے ہیں۔ اس لئے مٹھی بھر اہل برہان پُور سلطنت کی عظیم طاقت کو خاطر میں لا کر مامون و مطمئن ہیں۔ یہ خیال آتے ہی اس نے بزرگوں پر بے دریغ ہاتھ ڈالا اور اکثر کو قید و بند کی مصیبتیں جھیلنی پڑیں، جو زیادہ صاحبِ اثر تھے اور ان کو گرفتار کرنے میں بغاوت پھوٹ پڑنے کا اندیشہ تھا، انہیں حیلہ سازی سے بے دست و پا کیا۔ ایک فتنہ عظیم برپا تھا۔ شیخ عثمان بوبکانی اس اندیشہ سے اول ہی برہانپور چھوڑ چکے تھے۔ حضرت نائب رسول اللہ حجاز سے لوٹ کر سورت و احمد آباد میں وقت گذاری کرتے رہے۔ مسیح الاولیا سے عرض کی گئی کہ آپ یہاں تو بہت لوگوں کو فیض یاب کر چکے ہیں چندے ہمارے لشکر کے طالبانِ حق کی رہنمائی فرمایئے اور آپ کو لشکر میں مہمان اور صحیح لفظوں میں نظر بند رکھا۔ پھر اس مہم سے فارغ ہو کر آگرہ تک ساتھ لے گیا۔

شیخ محمد کو گرفتار کر لیا گیا اور ان پر شاہ برہان پور کی ہوا خواہی کا الزام لگا کر قید میں ڈال دیا گیا، انہیں بھی بحالتِ قید آگرہ لے گیا، وہاں حضرت غوث الاولیا کے فرزند کی سفارش سے قید

سے تو آزادی ملی، لیکن برہانپور آنے کی اجازت نہ دی بلکہ قلیچ خان کی نگرانی میں دے دیا گیا۔ جب قلیچ خان لاہور کی مہم پر بطور کمک بھیجا گیا تو شیخ محمد کو بھی کشاں کشاں اس کے ساتھ جانا پڑا۔ یہ ۱۰۰۹ھ-۱۰۱۱ھ تک کے واقعات ہیں۔ آگے چل کر مُلا غوثی لکھتے ہیں کہ ۱۰۱۳ھ غرہ جمادی الاول کو آپ پنجاب میں پیکر پرست راجپوتوں کی لڑائی کے اندر شہید ہوئے۔

☆
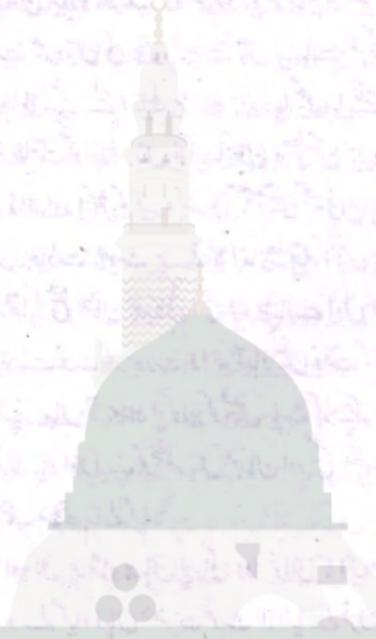
حضرت شیخ اسماعیل فرحیؔ

مولانا شیخ اسماعیل فرحیؔ سندھی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تالیف کے آئینہ میں۔

فرحی کی ایک زندۂ جاوید تالیف کشف الحقائق (۱) ہمارے سامنے ہے۔ اس کتاب میں موصوف نے اپنے استاد، مربی، پیر و مرشد، مسیح الاولیاء حضرت شیخ عیسیٰ جنداللہ قدس سرہٗ العزیز کے سوانح حیات و ملفوظات قلمبند کئے ہیں۔

یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے تو حضرت مسیح الاولیاء کے مصدقہ اور بلند پایہ ملفوظات ہیں جو حضرت کی زندگی میں ان کی آ گہی کے ساتھ ۱۰۲۰ھ سے مدون ہونا شروع ہو گئے تھے۔ لیکن اسی کتاب سے خود فرحیؔ جامع ملفوظات کے حالات کا مختصر خاکہ بھی مرتب کیا جاسکتا ہے۔ یعنی سلسلۂ بیان میں مؤلف کے قلم سے جگہ جگہ ایسے جملے و عبارتیں غیر محسوس طور پر بلا ارادہ رقم ہوتی چلی گئی ہیں جن سے مولف کی وطنیت، مقام ولادت، نام لقب، کنیت، تعلیم اور علمی پایہ، صوفیانہ ذوق، ریاضت و مجاہدات، شاعری، تخلص کی توجیہہ، مشائخ و صوفیائے کرام سے صحبتیں، سیر و سفر کی تفصیل معلوم ہوجاتی ہے۔

میں اسی کتاب سے فرحی کے حالات پیش کرنے کی سعادت حاصل کررہا ہوں اور عقیدتاً اس کو حضرت مسیح الاولیاءؒ کی روحِ مبارک کا فیض و تصرف خیال کرتا ہوں۔ یہ اُنہیں کی روحانی مسیحائی اور اسم عیسیٰ کا فیضانِ نسبت ہے کہ ان کا تذکرہ نگار اسی نگارش سے ساڑھے تین سو سال بعد حیاتِ تازہ کی سعادتِ ابدی سے سرفراز ہوا۔

فرحیؔ کے والد کا نام شیخ محمود سندھی تھا۔ اس کی ولادت برہانپور میں واقع ہوئی اور اسماعیل نام رکھا گیا۔ تاریخِ ولادت اور سنہ وغیرہ کا پتہ نہیں البتہ قرائن سے پایا جاتا ہے کہ دسویں صدی ہجری کے ربع آخر میں ولادت ہوئی ہوگی، کیونکہ ۱۰۲۰ھ میں اس نے یہ کتاب شروع کی تھی اس سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہ اس سنہ میں نوجوانی سے گذر کر پختگی کی منزل میں قدم رکھ چکا ہوگا۔ مسیح الاولیاء کی خدمت میں زمانۂ شعور میں حاضر ہوا اور کئی سال ریاضت و خدماتِ گونا گوں انجام دیکر ۱۰۲۰ھ میں ہی خلافت سے سرفراز ہوا۔ پھر اسی سنہ میں مسیح الاولیاء نے اس کی حسنِ خدمت سے محظوظ ہوکر کتابِ رشحات عطا فرمائی اور اس پر اپنے قلم سے مناسب الفاظ میں لقب و کنیت رقم فرمائی تھی۔ وہ لکھتا ہے:

دریں وقت بسیار لطف و کرم نمودہ کتاب رشحات از خانہ طلبیدہ و در گوشۂ ان بخط مبارک خود کتبہ ہبہ بنام ایں فقیر با کنیت و لقب باین عبارت نوشتہ عنایت فرمودند

باسمه و سبحانه الذی هو الصلوة علی من استحقها هذا الکتاب الرشحات الالٰهیة من المشائیخ الربانیة قد وهبته المولد العزیز الی الفرح سراج الدین اسماعیل ابن محمود صانه الله عما شانه واوصله سبحانه الی ما ذاته عن غیره بحق النبی و آله واصحابه ومن تبعه الی یوم الدین. مورخه ۲ شهر رجب سنه هذا رو بست (کشف ص ۴۷)

ظاهر ہے کہ اس درجہ پر پہنچنے کے وقت بہر حال پچیس تیس سال سے زائد عمر ہوگی۔ نیز ایک جگہ فرحی نے حضرت مسیح الاولیاء کی خدمت میں کامل بیس سال تک حاضر رہنے کا ذکر کیا ہے۔ چونکہ حضرت مسیح الاولیاء کا وصال ۱۰۲۹ھ[1] میں ہوا ہے۔ اگر یہ تحریر حضرت کے وصال کے قریب زمانہ میں بھی فرض کی ہے تو مرید ہونے کا زمانہ ۱۰۰۹ھ قرار دیا جاسکتا ہے۔ یعنی ۱۰۰۹ھ میں یا اس سے قبل فرحی کو عاقل بالغ و صاحبِ شعور سمجھا جائے گا۔ فرحی کے الفاظ یہ ہیں:

وایں فقیر تابیست سال بعد از مرید شدن ہر روز گاہے بعد از نماز فجر وعصر در ملازمت قبلہ گاہی مشرف میشد واحیانا ناغہ نمی گشت۔ (کشف ص ۳۳)

برہانپور میں ولادت:

یہ بات بھی فرحی کی تحریر سے ثابت ہے۔ حضرت مسیح الاولیاء قدس سرہٗ کے وصال کے بعد اپنی سیاحت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

برائے دیدنِ مظاہر حق و ملاقاتِ درویشان از زاد بوم خود کہ برہانپور است الخ...... (کشف ص ۵۰)

اس کے اسلاف سندھ سے آکر برہانپور میں کب مقیم ہوئے، اس کی بھی کوئی صراحت نہیں ملتی۔ ممکن ہے اس کے والد شیخ محمود اس کی ولادت کے قریب زمانہ میں واردِ برہانپور ہوئے ہوں۔ چنانچہ فرحی یہیں پیدا ہوا اور برہانپور کو اپنی زاد بوم کہنے کا فخر حاصل کرسکا۔ آغاز کتاب میں اپنا تعارف پیش کرتے ہوئے وہ اپنے آبائی وطن سندھ کو بھی نہیں بھولا لکھتا ہے:

اسماعیل ابن محمود سندھی القادری الشطاری الفرحی کہ از حضرت پیر دستگیر مکنی اسم کنیت بابی الفرح وملقب بہ سراج الدین است میگویند الخ (کشف ص ۲)

---

[1] حضرت مسیح الاولیاء شیخ عیسیٰ جند اللہ کا وصال ۱۰۲۹ھ نہیں ۱۰۳۱ھ ہے۔ (صاحب تعلیقات)

تعلیم

فرحؔی نے ابتدائی تعلیم کن اساتذہ سے کس حد تک حاصل کی، اس کی تفصیل بھی موجود نہیں ہے۔ البتہ یہ بدلائل قوی ثابت ہے کہ حضرت مسیح الاولیاء کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس حد تک علمی استعداد بہم پہنچا چکا تھا کہ آپ کے درس میں شریک ہوسکے اور یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ حضرت مسیح الاولیاء مبتدیوں کونہیں پڑھاتے تھے، حتی کہ اپنے فرزندوں کی ابتدائی تعلیم بھی دیگر اساتذہ کے سپرد تھی۔ خود فرحؔی نے ایک بزرگ کا نام لیا ہے جو آپ کے بچوں کے معلم تھے۔ لکھا ہے:

اے عزیز ملا احمد کہ مرید و معلم صبیان حضرت پیر دستگیر بود پیشِ این فقیر نقل میکرد الخ (کشف ص۵۵)

چانچہ فرحؔی کی علمی استعداد کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ درسیات متداولہ سے فارغ التحصیل ہوکر یہاں داخل ہوا تھا کہ اس سے کم استعداد کے طلباء کے لئے مسیح الاولیاء کے درس میں شرکت کی گنجائش ہی نہیں تھی۔

مسیح الاولیاء کا درس کن علوم اور کونسی وقیع کتب پر منحصر تھا، اس کی تفصیل فرحؔی نے جگہ جگہ لکھی ہے اور طریقۂ درس کی صراحت بھی دی ہے جو اس طرح تھا کہ طلبا کی جماعت موجود ہوتی تھی اور ان میں سے کوئی ایک طالب کسی زیرِ تعلیم کتاب سے کچھ عبارت پڑھتا باقی غور وتوجہ سے سنتے۔ آپ حاضرین میں سے کسی ایک کوحکم دیتے کہ پڑھی ہوئی عبارت کی شرح بیان کرو۔ اس طرح مختلف طلباء اپنے ذہن کی رسائی کی حد تک مطلب بیان کرتے۔ اس کے بعد آپ اس عبارت کی سیر حاصل شرح فرماتے۔ متصوفانہ نظریہ سے اس کے اسرار وغوامض پر روشنی ڈالتے ہر طریقہ سے تاویل و استدلال کے ساتھ ایسے نکتے ظاہر فرماتے کہ ہر شخص کے ذہن نشین ہوجاتا تھا۔ آپ کے درس کی برہان پور میں اس قدر شہرت تھی کہ متعدد ایسے علماء جو اپنے مقام پر سینکڑوں طلبا کومعقول، منقول حدیث وتفسیر کی تعلیم دیتے تھے پابندی کے ساتھ آپ کا درس سننے کے لئے آپ کے مدرسہ میں حاضر ہوتے تھے۔

تفسیرِ عباسی کے ایک درس کا واقعہ فرحؔی نے درج کیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک روز تفسیر عباسی کا درس جاری تھا۔ خوانندہ نے جب یہ آیت پڑھی: **وَلَا تقربا هذه الشجرة فتكونا من الظلمين.** اور اس کے یہ معنی جو صاحبِ تفسیر نے لکھے تھے کہ مراد اس شجر سے شجرِ علم ہے تو حاضرین وفضلا جو توجہ سے سُن رہے تھے متعجب ہوئے اور کوئی اس نکتہ کوحل نہ کرسکا اور سب حضرت مسیح الاولیاء کی طرف متوجہ ہوئے۔

آپ نے فرمایا کہ مُلا عصام بھی اس مشکل کو حل نہ کر سکے تھے، حتیٰ کہ ان کی روح نے عروج پا کر آدم علیہ السلام سے ملاقات کی اور ان سے دریافت کیا کہ صاحبِ تفسیر عباسی نے اس جگہ ہٰذا الشجرۃ کو شجرِ علم کہا ہے اور یہ نکتہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ آپ بیان فرمائیے حقیقت کیا ہے۔ حضرت ابوالبشر علیہ السلام نے فرمایا جو کچھ تفسیر عباسی کے مولف نے لکھا ہے درست ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بہشتِ بریں میں مجھے اللہ تعالیٰ کی ذات سے کبھی کبھی اس قدر قرب اور مشاہدہ کا اتفاق ہوتا تھا، جس کی انتہا نہیں ہوسکتی تھی۔ چنانچہ مجھے ارشاد ہوا تھا کہ ایسے عالم میں علم کی طرف توجہ کرے گا تو میرے قہر و غضب میں مبتلا ہوگا۔ انجامِ کار ایک روز میں عالمِ جذب و جوش میں علم کی طرف متوجہ ہوگیا اور اس کا نتیجہ جو کچھ ہوا وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اس کی تاویل میں آپ نے فرمایا: اما بہ ایں حکم کہ

فعل الحکیم لا یخلوا عن الحکمة. حکیم کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔

حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے دنیا میں جو مزرع الآخرۃ ہے منتقل کرنے میں باری تعالیٰ کی یہ حکمتیں کارفرما تھیں کہ دنیا جو دار الفساد ہے، اس میں انبیاء اولیاء صدیقوں اور اہلِ ایمان کا ظہور ہے۔

فرحؔی نے یہ عبارت اِس طرح شروع کی ہے:

اے عزیز و درس حضرت حقیقت آگاہی تفسیر عباسی میگذشت روزے درمیانِ سبق قاری این آیۃ خواند۔ الخ (کشف ص ۱۲)

فرحی کے عین المعانی کے درس میں شرکت

مسیح الاولیاء کا مدرسہ کلاں زیرِ تعمیر تھا، اس کی تعمیر میں بہ نیت حصولِ سعادت آپ کے مریدین و اساتذہ عملی حصہ لیا کرتے تھے۔ ایک روز تعمیر کا کام جاری تھا۔ متعدد مشائخ و خلفا کاریگروں کو اینٹ و چونہ کی خدمت انجام دے رہے تھے اور مسیح الاولیا سامنے ہی مسجد میں ایک شخص محمد صدیق کو عین المعانی کا درس دے رہے تھے۔ ایسے میں فرحؔی پہنچ گیا اور حضرت کو سلام کر کے تعمیر کے کام میں شرکت کے خیال سے اُدھر جانے لگا تو حضرت نے ہاتھ سے اشارا کر کے بلایا اور فرمایا کہ ابھی تم محمد صدیق کے سبق میں شرکت کرو، دورانِ سبق میں بہت سی مشکلات حل ہوگئیں اور بہت سے جدید انکشافات سے بہرہ ور ہوا۔ فرحی نے اس بیان کے ضمن میں بڑی طولانی عبارت لکھی ہے۔ بعض مقامات کی نقل اس کے الفاظ میں:

روزے شیخ محمد صدیق در مسجد پیش حضرت قبلۂ عالم سبق کتاب مذکور (عین المعانی) میخواند...... درین اثناء فقیر بملازمت رسید و سلام کردہ میخو است کہ بایاران موافقت کند۔ حضرت ایشان بغایتِ لطف و کرم بدست مبارک اشارت نمودہ طلبیدند و فرمودند شما بایں کار مشغول شوید یعنی باستماعِ سبق شیخ محمد صدیق...... و حضرت پیر دستگیر فرمودند کہ اطلاع بر وضع این و حاکم کسے دارد۔ پس جواہر خمسہ طلبیدہ دعاے مذکور دراں کشیدہ ایں ضعیف را بر وضع آن مطلع ساختند۔ الخ (کشف ص۱۶-۱۷)

اجتماعی اسباق کی شرکت کے علاوہ فرحی کو حضرت سے انفرادی طور پر درس لینے کا شرف بھی حاصل تھا چنانچہ مرآۃ العارفین کو اس نے آپ سے انفرادی طور پر درساً پڑھا ہے۔ اس سلسلہ میں اس نے تحریر کیا ہے:

اے عزیز فقیر مراۃ العارفین پیشِ حضرت پیر دستگیر در درس میخواند۔ در کشف اول کتاب این عبارت بر آمد کہ اے عزیز سر خلقت شناختن نہ اندک کاریست از ابن عباس رضی اللہ عنہ بشنو الخ (کشف ص۵۳)

فرحی کی علمی استعداد عام معیار سے بہرحال بلند تھی۔ وہ لمعات لوائح فصوص الحکم وغیرہ کا فارغ التحصیل طالب علم تھا۔ ان شواہد پر حوالجات کی نقل طول عمل خیال کر کے قارئین کرام کو اس کی ریاضت و مجاہدات کے چند واقعات کی طرف متوجہ کرتا ہوں۔ اس نے پیر و مرشد کی حسبِ ہدایت چلے کئے وظائف پڑھے ہیں، عملیات کی سختیاں اُٹھائی ہیں اور نتیجہ میں توقع سے زیادہ فیض یاب ہوا ہے۔

ریاضت و مجاہدات

ایک مرتبہ فرحؔی بابا عبدالستار اور چند دیگر مریدوں کو حضرت مسیح الاولیاء نے چلّہ نشین کیا ان دنوں فرحؔی حضرت شیخ عبداللہ صوفی کے رسالہ اوراد صوفیہ کا بھی مطالعہ کیا کرتا تھا۔ اس رسالہ میں دعائے سیف اللہ کی شرائط میں متعدد رموز اصطلاحات درج تھیں، جن میں سے بعض کے حل تک فرحؔی کے ذہن کو رسائی نہ ہوتی تھی ایک دن اُس نے حضرت بابا عبدالستار سے دریافت کیا، انہوں نے جواب دیا کہ حضرت قبلہ ہر شب میرے حجرہ میں تشریف لاتے ہیں۔ ان سے معلوم کر کے بتاؤں گا۔ پوچھا کب تشریف لاتے ہیں ہمیں تو اندازہ ہی نہیں ہوتا اور نہ کبھی دروازہ کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔ فرمایا آخر شب میں تشریف لاتے ہیں اور دروازہ بند ہی رہتا ہے۔

دوسرے دن فرحیؔ نے دریافت کیا میری گذارش کا کیا جواب ملا۔ انہوں نے وہ رموز سمجھادیئے جو حضرت نے واضح فرمائے تھے۔ نیز یہ بھی کہ جامع رسالہ نے عمداً ان اسرار کو رمز و کنایہ کے پردہ میں پوشیدہ رکھا ہے کہ نا اہلوں کی رسائی نہ ہو۔ فرحیؔ نے اس واقعہ کو اس طرح شروع کیا ہے:

> اے عزیز حضرت بابا عبدالستار وفقیر و چند درویش دیگر حضرت پیر دستگیر بہ اربعین نشاندہ بودند۔ دران ایام فقیر اورادِ صوفیہ کہ تالیفِ بندگی شیخ عبداللہ صوفی است مطالعہ میکرد۔ در آن کتاب در بیان شرائط دعائے سیف اللہ این عبارت برآمد الخ (کشف ص ۵۷)

ایک مرتبہ وظیفہ کے اشغال جس میں غالباً ترک حیوانات کی پابندی تھی۔ فرحی کا ہاتھ ایک مجلد چرمی کتاب سے چھوگیا معاً تین مؤکل وارد ہوگئے اور آتے ہی انہوں نے دل، جگر اور کلیجہ کو پکڑ لیا۔ فرحی نے عاجز اور پریشان ہوکر حضرت محمد غوث رحمۃ اللہ علیہ کا نام لیا۔ یہ نام سن کر ایک مؤکل نے کہا تجھے حضرت شیخ سے کیا تعلق ان سے کیا سروکار۔ مگر فرحیؔ غوث الاولیاء کا نام ورد کرتا ہی رہا۔ آخر اس قدر تخفیف ہوئی کہ وہ اپنے پیر و مرشد حضرت مسیح الاولیاءؒ کے حجرہ تک جاسکا۔ روداد بیان کی۔ حضرت نے احتیاط کی تاکید فرمائی۔ نظرِ توجہ فرماکر رخصت کردیا۔ اس توجہ کی برکت سے فرحی اپنے حجرہ میں پہنچنے تک اصلی حالت پر آ گیا تھا۔ فرحیؔ کی عبارت کا ضروری حصہ یہ ہے:

> این ضعیف را درا دائے شرائط اسم یا واحد الباقی یک روز لمس چرم جلد کتاب کہ امرے از امورِ جلالی است واقع شد۔ ہماں ساعت سہ موکل در وجودِ من آمدہ یکے دل۔ یکے جگر۔ یکے سپرز گرفت و بہ شدت تمام فقیر را تب آمد درین حالت سہ چار مرتبہ نامِ حضرت بندگی شیخ محمد غوث بر زبان راندہ الخ۔

(کشف ص ۵۳)

ایک مرتبہ فرحی پر کچھ ایسے حالات طاری ہوگئے کہ طبیعت پر بیہودہ خطرات و خیالات کا ہجوم رہنے لگا اور یہ حالت کسی طرح دور ہی نہیں ہوتی تھی۔ رمضان المبارک کا مہینہ اور آخری عشرہ تھا۔ حضرت مسیح الاولیا اعتکاف میں بیٹھے تھے۔ پچھلی رات کا وقت تھا، فرحی نے پریشان ہوکر خیال کیا کہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوکر توبہ کروں۔ مسجد میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ آپ تجدیدِ وضو کے لئے حجرہ میں تشریف لے گئے ہیں۔ یہ حجرہ میں حاضر ہوا فرمایا: اس وقت کیوں آئے۔ فرحی نے حالات بیان کرکے تجدید توبہ کا ارادہ ظاہر کیا۔ فرمایا بہت اچھا اور فرحی کو لیکر مسجد میں

تشریف لائے۔ پردۂ اعتکاف میں لے جاکر سامنے بٹھالیا اور اُس کے دونوں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر توجہ شروع فرمائی۔ کوئی دعا یا استغفار نہیں پڑھائی صرف نگاہِ توجہ سے اس کے دل پر تصرف جاری کردیا۔ اس کا بیان ہے میں نے محسوس کیا جس طرح شاہی محل کا گوشہ گوشہ اچھی طرح جھاڑ کر صاف کیا جاتا ہے۔ میرا دل مذکورہ غل و غش کی کثافت سے پاکیزہ و مصفا ہوگیا۔ میں نے دیکھا کہ میرے دل کی تمام ظلمتیں انوار سے مبدل ہوگئیں۔ پھر میں نے اندازہ کیا کہ اس نور میں محو ہوکر میں ایسا نڈھال ہوگیا ہوں کہ کسی حالت کا شعور ہی نہیں رہا اور میرے دل سے حقیقی خودی نے سر اُبھارا اور جب اس خودی سے استقلال وقوت تمام حاصل ہوئی حضرت قبلہ نے میرے ہاتھ چھوڑ دیئے اور رخصت فرمایا۔ یہ شعر فرحؔی نے اسی واقعہ کی یادگار میں کہا ہے اور اسی بیان کے تحت درج کتاب ہے۔

بود آن شب از شبِ قدرے بہ نزد من عزیز
زان کہ دروے فیض پیرم ساخت اہل نستم
(کشف ص۴۸-۴۹)

مرزا شاہ رخ کا فرزند جس کو اس نسخہ میں مرزا فتحپوری لکھا ہے۔ حضرت مسیح الاولیا کا مرید تھا۔ اُس نے چند مرتبہ حضرت سے التجا کی کہ میری تمنا ہے کہ شہر مندسور مجھے جاگیر میں مل جائے۔ حضرت دعا فرمائیں تو دشوار نہیں۔ فرحی کا بیان ہے کہ ایک روز حضرت پیر دستگیر نے مجھ سے فرمایا کہ وہ حصولِ مدعا کے لئے چند مرتبہ کہہ چکا ہے تم اس کی مقصد برآری کے لئے توجہ اور دعا کرو۔ مجھے ادباً دل میں پس و پیش ہوا۔ حضرت پر میرا یہ اندیشہ منکشف ہوگیا۔ فرمایا قطبِ وقت کی عادت ہی اس قسم کی ہوتی ہے کہ اپنے ماتحتوں سے کام لیا کرتے ہیں اور مثالاً سلیمان علیہ السلام کا واقعہ دُہرایا کہ کمال نبوت حاصل تھا۔ جنبش نگاہ سے سب کچھ کرسکتے تھے۔ لیکن بلقیس کو سبا سے بلانے کے لئے خود توجہ نہ فرمائی بلکہ اپنے وزیر آصف سے کام لیا۔ الغرض چند روز بعد طالب کو مندسور کی جاگیر مل گئی۔ میں نے کوئی عمل دعا یا وظیفہ نہیں پڑھا۔ بلکہ حسب الحکم صرف توجہ مبذول رکھی۔

> اے عزیز مرزا فتح پوری پسر مرزا شہ رخ کہ مرید پیر دستگیر بود بحضرت ایشان عرض نمود کہ امید گاہا درحقِ من توجہ فرمایند کہ شہر مندسور در جاگیر من ظل اللہ بدہند۔ پس روزے بایں ضعیف فرمودند کہ او برائے حصول این مطلب من چند مرتبہ گفتہ است شما درحق دے بجہت مطلبش توجہ بہ کار برید۔ الخ

(کشف ص۵۶)

فرحی کی شاعری تخلص کی توجیہہ اور کلام

فرحی کا بیان ہے کہ ابتدائے حال میں مجھے القباض رہتا تھا۔ حضرت پیر و مرشد نے ابوالفرح کنیت عطا فرما کر میرے دل کو فرحت و کشادگی کا آئینہ بنادیا اور میں نے اسی نسبت سے فرحی تخلص اختیار کیا۔

حضرت پیر دستگیر بفقیر کنیت ابوالفرح عنایت نمودند فقیر موافق آن تخلص خود فرحی نہاد (کشف ص ۴۵)

لیکن یہ واقعہ ۱۰۳۰ھ کا ہے[1] اسی سنہ میں اس نے ملفوظات کشف الحقائق کی تدوین شروع کی اور اس کتاب میں جو منظوماتِ فرحی کی درج ہیں وہ مبتدیانہ استعداد سے بہت بلند ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ فرحی کافی عرصہ سے شاعری کرتا رہا ہے۔ واللہ اعلم اب تک کیا تخلص کرتا تھا اس کا کوئی ذکر اس نے خود نہیں کیا ہے۔

اس کا کلام اس کی تالیف سے پیش کیا جاتا ہے۔ کیونکہ کہیں اور سے اس کا کلام راقم الحروف کو دستیاب نہیں ہوا اور اس کتاب میں بھی معدودے چند اشعار ہیں جو اپنے مفہوم کے اعتبار سے کسی عبارت میں چسپاں ہوسکتے تھے اور وہ بھی غزلوں کے اشعار ہیں۔ اس کتاب میں بالا ارادہ درج کرنے کے لئے البتہ حمد باری تعالیٰ، نعت سرورِ کائنات اور منقبتِ پیر و مرشد کے سلسلہ میں اس نے نظمیں درج کی ہیں۔

صوفیانہ استعارات، تلازمات کے نثر سلسلہ حمد کا اختتام اس نے اس شعر پر کیا ہے:

یقین میدان کہ این چندیں عجائب ——— زبہر یک دل بینا نہادند

نعت سرور کائنات مفخر موجودات بڑے جوش سے لکھی ہے اور کافی اشعار درج کئے ہیں، جن کا انتخاب یہ ہے:

محمد کہ بدرِ منیر آمدہ ——— بہر دو جہاں بے نظیر آمدہ
چہ بدرے کہ از نور او آفتاب ——— بود بر چہارم فلک نوریاب
نہ بل کا فتاب و چہ مہ ہر چہ ہست ——— زنورِ لطیفش ہمی نقش بست
بنازم بداں شاہِ دنیا ودیں ——— کہ دار و دو عالم بزیر نگیں
شریعت کہ فرمان آن شہ بود ——— بجا آرد آنکس کہ آگہ بود
طریقت کہ آئینِ آن سرور است ——— بود شمع راہِ دلِ حق پرست
حقیقت کہ آئینِ احوال اوست ——— نگنجد در و ہیچ...... زد دست

---

[1] یہ واقعہ ۱۰۳۰ھ کا نہیں بلکہ ۱۰۲۰ھ کا ہے۔ جیسا کہ گذشتہ ابواب میں خود راشد برہانپوری لکھ چکے ہیں۔ (صاحب تعلیقات)

اسی سلسلہ میں فرحی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک پر مکھی نہ بیٹھنے کی ایک اچھوتی توجیہہ لکھی ہے۔ میری نگاہ میں یہ توجیہہ اور اس کو منظوم کرنے میں اولیت اسی کو حاصل ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ مکھی جو ہر پاک و ناپاک جگہ بیٹھ جانے کی فطرتاً خوگر ہے۔ آپ کے منزہ و پاکیزہ جسم پر بیٹھنے کی جرأت نہیں کرسکی (اس کے الفاظ میں) آپ کا پابوسی سے محروم رہ گئی اور اسی حسرت میں کفِ افسوس ملتی ہے۔ اسی بدنصیبی پر دونوں ہاتھوں سے سر پیٹا کرتی ہے۔ اس اچھوتے مضمون کو نہایت سلاست اور برجستگی سے نظم بھی کیا ہے۔

چو آں ماہ نورِ خد ایست و بس	چساں برتنِ او نشیند مگس
مگس کو نشیند بہ پاک و پلید	بپا بوسی او جو زہرہ نہ دید
ملامت بہ بخت خود آورد پیش	بمالدہمی دستِ حسرت بہ خویش
شدہ خوں ازیں حسرت اور اجگر	ازین میزند دست ہرجا بہ سر

گریز میں خود کو مخاطب کر کے متنبہ کرتا ہے کہ وہ رسول جس کی مدح خدا کرتا ہے تو اس کی نعت کیسے بیان کر سکے گا۔ کجا تیری خیال آرائی اور کہاں نعتِ پیغمبر ﷺ بھلا سمندر کوزہ میں بند کیا جاسکتا ہے؟

رسولے کہ مدحش بگوید خدا	کجا نعت گفتن توانی ورا

تو ونعت او ایں چہ حرفے بود
کہ دریا نہ در خورد ظرفے بود
(کشف ص۱)

نعت سے فارغ ہو کر فرحی نے اپنے پیر و مرشد حضرت مسیح الاولیاءؒ کی منقبت میں نہ صرف زورِ بیان صرف کیا ہے بلکہ ارادت و نیازمندی کا ہدیہ پیش کیا ہے اس کے بھی کئی اشعار ہیں۔ لہٰذا انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ مطلع میں الفاظ غوث اعظم وارد ہوئے ہیں۔ فرحی نے ادباً اور عقیدتاً اپنے مرشد کو ان الفاظ سے مخاطب کیا ہے۔ اس قصیدۂ منقبت کی پیشانی پر اس نے یہ عبارت لکھی ہے:

غوث العارفین قطب الموحدین سید المفسرین سند المحدثین زینت العلما مربی الفقرا، مسیح الاولیا، ابوالبرکت، عین العرفا بندگی شیخ المشائخ حضرت شیخ عیسیٰ بن حضرت شیخ قاسم ابن حضرت شیخ یوسف بن حضرت ملا رکن الدین ابن حضرت شیخ معروف بن حضرت شیخ شہاب الدین سندھی

زہے غوث اعظم کہ از فضل رحمٰن — زند جوش ہر دم بہ ایجاد امکاں
زبدر جنبش ببیں نور احمد — ز لطفِ کلامش عیاں ہر قرآن
زباران فیضش دل ہر مریدے — صدف وار پر شد زلولوی عرفان
زکہنہ کمالش دلِ من چہ یا بد — حبابے چہ گوید زور یاے عمّاں
زہے آفتابِ حقیقت کہ دائم — بتا بدبہ ذراتِ کونین یکساں
زہے رہ نمائے کہ در راہِ وحدت — شدہ پیشوائے ہمہ پیشوایاں
مرید تو ہر یک بہ بزمِ مشائخ — چودرہ بدہ بینش چو در قلب ایماں
بپائے تو از ویدہ تعلین سازم — شراکش بہ بندم زنم دیدہ مژگاں
باسم مسیحات کروند ازاں زو — کہ احیاے دلہا بو وبر تو آساں

توئی آنکہ وقتِ تکلم ز فرحیؔ
کنی آشکارا چنیں سر پنہاں
(کشف ص۲)

پورا قصیدہ عقیدت وارادت کے جذبات کے ساتھ ساتھ سلاست و برجستگی اور شوکتِ الفاظ سے مزین ہے۔ اس کتاب میں فرحی کے زیادہ تعداد میں مسلسل اشعار انہیں مذکورہ بالا دونوں قصیدوں میں ملے ہیں۔ آئندہ جو اشعار پیش ہوں گے وہ بیک مقام ایک یا دو سے زائد نہیں ہیں۔ اگر چہ وہ غزلوں یا قصائد کے اشعار معلوم ہوتے ہیں البتہ ایک مناجات کے چند شعر مسلسل ملے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

اے کہ زمامِ ہمہ در دستِ تو — اشتر ہر شیفتہ دلِ مسیت تو
ہست امیدم کہ شوی رہنما — تا دمِ آخر بہ رہ مصطفیٰ
چارہ بکن چارہ کہ آوارہ ام — داے بمن گر نہ کنی چارہ ام
آمدہ ام از خودی خود بجان — نیم نگہ کن ز خودم دار مال
ساز فتیلہ زرگ وریشہ ام — شمع فروز ازدل غم پیشہ ام
چاشنی لذت دیدار بخش — بے من وما قوتِ گفتار بخش
از ہمہ سوساز ولم سوی خویش — در رخ ہر ذرہ نما روئے خویش

خود دل فرحیؔ تو پر از نور کن
محو خودم ساز و زخود دور کن
(کشف ص۳)

یہ مسلسل اشعار تھے جو فرحؔی نے حسبِ موقعہ مسلسل ہی درج کئے ہیں۔ یہ شعر فرحؔی نے حضرت مسیح الاولیاء کے اولین سفر کے موقعہ پر چسپاں کیا ہے۔ آپ کا یہ سفر پیر و مرشد کی جستجو کے سلسلہ میں واقع ہوا تھا۔

ہادئ جوکہ دریں بادیۂ خوں آشام ۔۔۔ رہ بمنزل نہ برد ہیچکسے بے رہبر

ظاہر ہے کہ شعر فرد نہیں ہے بلکہ کسی مسلسل نظم کا ایک شعر ہے۔ اسی طرح یہ دو شعر:

دلی کو را بود درجان پیشہ ذوقِ بیداری ۔۔۔ بناقص ما انداز جرمے چو کامل ہست ایمانش

چوادم رازِ عصیاں ہر دو چشمپش جوئبار آمد ۔۔۔ شگفتہ انبیا و اولیا در صحن بستانش

یہ بھی مفرد ابیات نہیں بلکہ اس معرکتہ الآرا قصائد کی مقبول عام زمین کے قصیدہ کے اشعار ہیں جو خاقانی، خسرو اور جامؔی نے ایک دوسرے کے مقابل زورِ کلام دکھانے کے لئے استعمال کی۔ مذکورہ قدما کے زمین میں کافی طولانی قصائد ہیں واللہ اعلم فرحی کا یہ قصیدہ کتنے اشعار کا ہوگا۔ علی ہذا القیاس یہ شعر بھی فرد نہیں معلوم ہوتا۔

طمع شوم از نقط خالی ۔۔۔ چوں درختے است بے گل و بے بار

حضرت سعدی نے طمع راسہ حرف ست و ہر سہ تہی کہہ کر اس مضمون کو اپنے لئے خاص کرلیا تھا۔ مگر فرحؔی نے بے برگ و بار کہہ کر ندرت کے ساتھ اپنے لئے گنجائش نکالی ہے۔ ایک قطعہ۔

ایں جہاں بر مثالِ آن کہ فتد ۔۔۔ بر بدن از حصہ نقش و نگار

بعدیکچند در نظر نیاید (ناید) ۔۔۔ نہ از و بیخ بود نہ آثار

یہ قطعہ سلاست و برجستگی کے ساتھ ساتھ فرحی کے درویشانہ مسلک کا بھی مظہر ہے۔ دنیا کی بے ثباتی کی کسی اچھوتی تمثیل ہے جو آئے دن بوریا نشینوں کے مشاہدہ میں آتی ہے۔ ایک اور شعر بطور پند۔

چوں مروت میگنی باکس برومنت مکن ۔۔۔ زاں کہ کارنکواں جز حسبۃ اللہ نیست

اور ایک شعر جس سے حسنِ عقیدت کا اظہار پایا جاتا ہے۔

فرحیا ہر سوکہ روئے او ببینی سجدہ کن
کیں عبادت را بیک سو در جہاں محراب نیستؑ

ہر دو مذکورۂ بالا اشعار بھی فردیات نہیں بلکہ غزلوں کے اشعار معلوم ہوتے ہیں اور یہ شعر

چوں صفات و ذاتِ اودر ہر یکے جلوہ نمود
پس چرا آگہ بناشی زاں چہ داری نقد خویش

مسئلۂ ہمہ اوست سے تعلق رکھتا ہے۔ اُس کا جلوہ ہر چیز میں ہے۔ یہ تو عام بات ہے۔ فرحی نے یہاں بھی چرا آ گہ بناشی کہہ کر اس میں زور اور جدت پیدا کر دی ہے۔

من اندر خوابِ نوشین مست خفتہ تا سحر باشم
حریفان نیم شب برخاستہ بروند محملہا

یہ شعر بھی فرد نہیں بلکہ حضرت حافظ شیراز کے مطلع دیوان والی غزل کی طرح کا شعر ہے۔ اس سے اور سابقہ اشارات سے پایا جاتا ہے کہ فرحی نے مقبول زمینوں میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور اس نے مختلف اصنافِ سخن پر کلام لکھا ہے۔ ایک اور شعر ہے ؎

زایں وآن جلوہ کنند پیش تو اصنامے چند ما سوا گر بہ تجلیٔ ظہورش نگری

جس موقعہ پر یہ شعر چسپاں کیا گیا ہے وہ تو اپنی جگہ ایک لطیف چیز ہی ہے۔ اس کے اعادہ سے اس لئے گریز کرتا ہوں کہ طول سخن نہ ہو جبکہ یہ شعر اپنی بندش، چستی اور معنوی حیثیت سے خاصا وقیع اور پُر لطف ہے۔ نیز ہمارا مقصد فرحؔی کے کلام کا نمونہ پیش کرنا تھا جو اِس مختصر کتاب سے پیش کر دیا گیا۔ جس سے ثابت ہے کہ وہ کسی بھی صنفِ سخن میں بند نہ تھا۔ غزل، قصیدہ، رباعی، قطعہ وغیرہ کے نمونے سامنے ہیں پھر یہ سب کچھ اس کتاب سے ماخوذ ہے جو اپنے موضوع کے لحاظ سے جداگانہ چیز ہے۔ اتفاق حسنہ نہیں تو اور کیا ہے کہ اس کی ایک مخصوص تالیف سے نہ صرف مختلف اصناف پر اس کا نمونۂ کلام بلکہ اُس کے مختصر سوانح حیات بھی مرتب ہو گئے۔ فرحؔی نے شاعری میں کس شاعر کو استاد بنایا اس کا علم نہ ہو سکا۔ غالبًا یہ شرف بھی اُس کو حضرت مسیح الاولیاءؒ سے حاصل رہا ہے۔ کیونکہ آپ بھی منجملہ تمام فضائل و عالمانہ و مشائخانہ اوصاف کے عربی، فارسی اشعار کہنے کا بلند ذوق اور صحیح ملکہ رکھتے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ آخر میں فرحؔی کی سیر و سیاحت کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

فرحی کا مسلسل بیس سال تک پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر رہنا مذکور ہو چکا ہے۔ واقعہ ہے کہ جب وہ مسیح الاولیاءؒ کی خدمت میں باریاب ہوا اور مریدی سے شرف یابی حاصل کی اسی آستانہ کو اپنا ماویٰ و ملجا بنالیا اور یہیں چار دانگ ہندوستان سے حاضر خدمت ہونے والے سیاحوں اور حضرت کے خلفاء اور مریدین سے ہم پیالہ و ہم نوالہ رہا۔ لیکن آپ کے وصال کے بعد زیادہ عرصہ تک برہان پور میں قیام نہ کرسکا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:

بعد از وصال حضرت پیر دستگیر یک سال و دو ماہ بگذشت این فقیر بحکم قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا کَیْفَ بَدَءَ الْخَلْق. برائے دیدن دیدن مظاہر حق و ملاقاتِ درویشان از زاد بوم خود کہ شہر بُرہان پور است بمرتبۂ دو سال و

مرتبہ ثانی ہفت سال در ہندوستان و کشمیر و پنجاب کانگڑہ در زمانۂ جہانگیر بادشاہ شہر بشہر گردید۔ (کشف ص ۵۱)

پہلی مرتبہ ۱۰۳۲ھ کے آخر یا ۱۰۳۳ھ کے آغاز میں سفر کیا۔ یہ جہانگیر کا عہد تھا دو سال اس نے مختلف شہروں کی سیر کی اور لوٹ آیا، لیکن جب وہ لوٹا ہے ۱۰۳۵ھ کا آغاز تھا۔ یہ زمانہ برہانپور میں بڑی شورش اور ابتری کا دور تھا۔ خانخانان عبدالرحیم خان کا ستارہ زوال میں آچکا تھا۔ وہ شاید ان پریشان کن حالات میں زیادہ نہ ٹھہر سکا اور جلد ہی دوسرے سفر پر روانہ ہوگیا اور مسلسل ۷ برس تک مختلف شہروں کی سیر سیاحت کرتا رہا۔ لاہور و کشمیر میں حضرت مسیح الاولیاء کے مریدین موجود تھے۔ ان کا اشتیاق اس کو وہاں بھی کھینچ لے گیا اور اس نے اطمینان سے وہاں کے علماء و اربابِ حال و قال کی صحبتوں سے دلجمعی اور روحانی فیوض و برکات حاصل کیئے۔ افسوس کہ فرحی کا زمانۂ وفات اور مقامِ مزار کا حال معلوم نہ ہوسکا۔ تاہم ۱۰۶۱ھ تک وہ زندہ تھا کیونکہ اس نے اپنی تالیف کشف الحقائق سنہ مذکور ہی میں ختم کی ہے۔

تعلیقات

تعلیق (۱): برہانپور کے سندھی اولیا میں احوال مسیح الاولیا، کشف الحقائق سے نہ صرف مستعار ہے۔ بلکہ کہیں کہیں تو عین ترجمہ سے ہی کام لیا گیا ہے۔ اس لئے لازم ہے کہ اس بنیادی ماخذ کا تنقیدی جائزہ لیا جائے۔

راشد برہانپوری نے اسماعیل فرحی اور کشف الحقائق کے متعلق مندرجہ ذیل باتیں قطعی طور پر بیان فرمائی ہیں:

(۱) کشف الحقائق حضرت مسیح الاولیا کے مصدقہ ملفوظات ہیں جو ان کی آگہی کے ساتھ ۱۰۲۰ھ میں مدوں ہونا شروع ہوگئے تھے۔

(۲) اسماعیل فرحی کی تاریخ پیدائش کا پتہ نہیں البتہ دسویں صدی کے ربع آخر میں ولادت ہوئی ہوگی۔

(۳) فرحی زمانہ شعور سے لیکر مسیح الاولیا کی خدمت میں رہا ۱۰۲۰ھ ہی میں اسے خلافت بھی ملی۔

(۴) حضرت مسیح مبتدیوں کو نہیں پڑھاتے تھے۔ اس لئے فرحی فارغ التحصیل ہوکر یہاں داخل ہوا تھا۔

(۵) مرشد کی وفات ۱۰۳۱ھ کے فوراً بعد برہانپور چھوڑ کر سفر اختیار کیا۔ پھر ۱۰۳۵ھ میں لوٹ آیا۔ یہ زمانہ برہانپور میں ابتری اور شورش کا تھا۔ پھر فوراً لوٹ گیا اور سات سال تک مختلف شہروں میں گھومتا رہا۔ لاہور اور کشمیر میں حضرت مسیح الاولیاء کے مریدین موجود تھے۔ وہاں بھی گیا۔

(۶) فرحی کا زمانہ وفات معلوم نہیں البتہ ۱۰۶۱ھ تک کشف الحقائق لکھتا رہا۔

• اسماعیل فرحی کے متعلق بیان کی گئی باتیں اپنے اندر بہت سارے سوالات لئے ہوئے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ فرحی کے والد مولانا محمود سندھی دسویں صدی کے ربع آخر میں (فرحی کی ولادت سے کچھ عرصہ پہلے) برہانپور میں وارد ہوئے۔ جبکہ کتاب ہذا کے آغاز میں یہ تاثر دینے کی بھرپور کوشش کی گئی کہ ۹۵۰ھ میں مسیح الاولیا کے والد اور عم مکرم اچانک سب کچھ چھوڑ کر احمد آباد گجرات کا رخ کچھ اس انداز سے کیا کہ پھر پلٹ کر سندھ کی طرف نہیں دیکھا۔ نہ اہل سندھ کے ساتھ ان کا کوئی تعلق باقی رہا۔

حالانکہ ۹۵۰ھ کا سفر (نہ کہ ہجرت) ان مختلف اوقات میں اختیار کیے گئے سفر میں سے کسی ایک کا احوال ہے۔ جو پاٹ سندھ سے ایلچ پور، احمد آباد اور برہانپور وغیرہ کی طرف اختیار

کئے جاتے تھے۔ بلکہ حضرت مسیح الاولیا نے جب شیخ لشکر محمد عارف کے حلقہ ارادت میں داخل ہونے کا شرف حاصل کیا اور مستقلاً برہانپور میں اقامت کا فیصلہ کیا تب بھی نہ صرف اہل سندھ بلکہ وابستگاں، واحفاد اور مسند پاٹ سے ان کا مستقل رابطہ رہا۔ مولانا محمود سندھی اور دیگر علما سندھ کا گاھی بہ گاھی برہانپور مسیح الاولیا کے پاس آنا اور سندھی تاجرون کا اپنے مال کو حضرت صاحب کا ظاہر کرنے کی حجت کرتے ہوئے ٹیکس بچانے کی کوشش کرنا اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ یہ رابطہ برہانپور میں مستقل اقامت کے بعد بھی جاری رہا۔

راشد برہانپوری کشف الحقائق کے ان کے پاس موجود نسخہ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ یہ کتاب حضرت مسیح الاولیا کی آگہی سے لکھی گئی پھر فرماتے ہیں کہ ۱۰۲۰ھ میں لکھنا شروع ہوئی اور ۱۰۶۱ھ اس کا سن تکملہ ہے۔ یوں کہہ لیجئے کہ حضرت مسیح الاولیا کی وفات کے ۳۰ سال بعد تک یہ کتاب زیر قلم رہی۔ پھر یہ دعویٰ کہ حضرت صاحب کی آگہی سے لکھی گئی کہاں تک درست ہوسکتا ہے۔ اس کتاب میں حضرت مسیح الاولیا کے بعد کا احوال اتنا طولانی بھی نہین کہ تحریر میں لانے کے لئے ۳۰ سال کا عرصہ درکار ہو۔

حضرت مسیح الاولیاء کی وفات کے بعد مسند برہانپور پر جو کشیدگی پیدا ہوئی اس کے نتیجہ میں سندھ اور برہانپور میں موجود اولاد نرینہ رفتہ رفتہ اپنے حق سے دستبردار ہونے پر مجبور ہوتی رہی۔ اغلب یہی ہے کہ حضرت مسیح کی وفات کے بعد خلفا اور مریدین کے الگ الگ حلقے پیدا ہو گئے تھے۔ جن کے درمیاں سازشی لوگ زور پکڑ گئے اور علمی مشاغل تعطل کا شکار ہو گئے۔ علم و ادب اور روحانیت کی وہ بساطین جو مسیح القلوب نے بچھائیں، تیز و تند سازشی طوفان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ شیخ عبدالستار جلد وفات پا چکے، بابا فتح محمد مسند سے کنارہ کش ہو گئے۔ فرحی کے لئے راشد برہانپوری لکھتے ہیں کہ جب ۱۰۳۵ھ میں وہ برہانپور لوٹا تو ''یہ زمانہ برہانپور میں بڑی شورش اور ابتری کا دور تھا'' اولاد مسیح موجود سندھ و برہانپور کا ذکر تذکرہ نگاروں کے بیان کردہ احوال میں دانستہ یا غیر دانستہ سازش کا شکار ہوتا چلا گیا۔

اغلب یہی ہے کہ حضرت مسیح الاولیا کی وفات کے بعد جلد فرحی ہمیشہ کے لئے برہانپور کو خیرباد کہہ چکا تھا۔ اس نے اس عرصہ میں جو شیخ عیسیٰ جند اللہ کی .... نصیحت کی باتیں ملفوظات کی صورت میں جمع کی تھیں ان اوراق میں ۱۰۶۱ھ یا اس کے بعد کسی سال دانستہً یا غیر دانستہً تحریف کی گئی ہے۔ کیونکہ خود راشد برہانپوری کے پاس موجود نسخہ کشف الحقائق کافی عرصہ بعد کا رقم کیا ہوا تھا۔

بلکہ اس کے کئی اور نسخے بھی تیار کئے گئے۔ جن میں سے ایک اور نسخے کی موجودگی کا ذکر راشد برہانپوری نے کیا ہے کہ وہ پشاور یونیورسٹی میں موجود ہے۔ شاید وہ ان ہی کے توسط سے وہاں پہنچا ہو۔

مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد نے سنہ ۲۰۰۰ع میں احوال و مناقب بعضی مشائخ سلسلہ شطاریہ خصوصاً شیخ محمد اشرف شطاری لاہور بنام کتاب ''احوال مشائخ کبار'' شایع کی ہے۔ یہ تحریر سلیمان بن شیخ سعداللہ کی ہے جو ۱۰۵۰ھ سے ۱۰۹۱ھ کی حدود میں تحریر ہوئی۔ سنہ ۱۰۵۰ھ وہ زمانہ ہے جب فرحی برہانپور کے حالات سے دل برداشتہ ہوکر لاہور اور کشمیر اور دیگر شہروں کی طرف نکل گیا تھا۔

راشد برہانپوری رقمطراز ہیں: ''ان پریشان کن حالات میں (فرحی) زیادہ نہ ٹھہر سکا اور جلدی دوسرے سفر پر روانہ ہوگیا۔ اور مسلسل ۷ برس تک مختلف شہروں کی سیاحت کرتا رہا۔ لاہور اور کشمیر میں حضرت مسیح الاولیاء کے مریدین موجود تھے۔ ان کا اشتیاق اسکو وہاں بھی کھینچ لے گیا اور اس نے اطمیناں سے وہاں کے علماء و ارباب حال وقال کی صحبتوں سے دلجمعی اور روحانی فیوض و برکات حاصل کئے۔ افسوس کہ فرحی کا زمانہ وفات اور مقام مزار کا حال معلوم نہ ہو سکا تاہم ۱۰۶۱ھ تک وہ زندہ تھا۔ کیونکہ اس نے اپنی تالیف کشف الحقائق سن مذکور ہی میں ختم کی ہے۔''

۷ سال کے سفر کے بعد بھی فرحی کا ذکر تاریخ برہانپور میں موجود نہیں۔ ممکن ہے وہ دوبارہ انہیں علاقوں کی طرف لوٹ گیا ہو۔ یقینن جمع شدہ ملفوظات کا ایک نسخہ بھی اس کے ساتھ ضرور ہوگا۔ کیونکہ شیخ سعداللہ نے ''احوال مشآئخ کبار'' میں فرحی کے ان ملفوظات کا حوالہ دیا ہے۔ اس کتاب میں حوالہ سے ثابت ہوتا ہے کہ فرحی کی ملاقات شطاریہ سلسلے کے بزرگ مصنف کتاب ''احوال مشائخ کبار'' سلیمان بن شیخ سعداللہ سے ہوئی ہے یہ بزرگ شیخ محمد اشرف شطاری لاہوری کے خلیفہ تھے۔

شیخ سعداللہ نے اپنی تحریر میں فرحی اور اس کے رسالہ (ملفوظات) کا جو حوالہ دیا ہے اس میں ''زمانہ حال'' کا استعمال ان کی ملاقات کو ثابت کرتا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

> ''ملا فرحی کہ بدو واسطہ از مریدان آستان فیض نشان حضرت شاہ وجیہہ الحق والدین است طاب اللہ ثراہ مردی درویش و فاضل سخنور بود درسالہ کہ مشتمل بر احوال مرشد حضرت شیخ عیسیٰ سندھی رحمتہ اللہ تالیف نمودہ۔''

فرحی کے ہمعصر شیخ سعد اللہ شطاری کی تحریر مذکورہ سے مندرجہ ذیل حقائق قابل غور ہیں:

(۱) شیخ عیسیٰ کے ساتھ سندھی لکھ کر ان کی وطنیت سندھ دکھائی ہے نہ ایرج پور برار۔

(۲) فرحی حضرت شیخ عیسیٰ کے دو واسطوں سے مرید تھے۔

(۳) صرف ونحو کے اعتبار سے شیخ سعد اللہ کے ''زمانہ حال'' کا استعمال ثابت کرتا ہے کہ فرحی لاہور جانے کے بعد شیخ موصوف کی خانقاہ پر ٹھہرے تھے یا ان سے کافی ملاقاتیں کیں وہ

ایک رسالہ کا بھی ذکر کر رہے ہیں جس میں مرشد حضرت مسیح الاولیاء کا ذکر موجود تھا جو شیخ سعد اللہ کے بھی زیر مطالعہ رہا۔ لیکن وہ اس کا نام کشف الحقائق یا کوئی اور نہیں لکھ رہے۔

لیکن شیخ سعد اللہ مسیح الاولیاء اور فرحی کے درمیاں دو واسطے دکھا رہا ہے۔ تو پھر راشد برہانپوری کا یہ کہنا کہ فرحی نے کتاب کشف الحقائق شیخ عیسیٰ کی آ گہی سے لکھی کسی طور درست نہیں ہوتا۔

ان حقائق کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ملا فرحی کے اصل نسخہ میں تحریف وتخفیف کر کے بعض نسخے تیار کیے گئے۔ اس حقیقت کو چھپانے کے لئے یہ کہہ دیا گیا کہ 'کشف ۱۰۶۱ھ تک لکھی جاتی رہی۔''

اس بات کو مندرجہ ذیل حقائق سے تقویت ملتی ہے:

''حضرت مسیح الاولیاء کی وفات کے بعد جیسا کہ خود راشد برہانپوری کہتے ہیں کہ سجادگی وتولیت پر مقدمہ بازیاں شروع ہوگئیں۔ اولاد، خلفا اور مریدین بٹ کر رہ گئے۔''

حقیقی نرینہ اولاد موجود پاٹ سندھ و برہانپور کے علاوہ وابستگان حقیقی کے لئے برہانپور میں حالات تنگ کر دیئے گئے۔ بابا فتح محمد جیسے لائق فائق اور اہل عالم دین برہانپور کے حالات سے دل برداشت ہو گئے۔ فرحی نے برہانپور کو خیر باد کہہ دیا۔ وہاں لکھے گئے تذکروں سے پاٹ اور برہانپور میں موجود اولاد کے احوال دانستۂ یا غیر دانستۂ گم ہوتے گئے۔ حتا کہ شیخ طاہر محدث جیسے عالم بے بدل کی تحریریں، شیخ یوسف سندھی کا احوال آج بھی لوگ معلوم کرتے رہتے ہیں۔ شیخ طاہر محدث اور شیخ عیسیٰ کی اہم تصانیف ضایع ہوگئیں یا کردی گئیں۔

اغلب ہے کہ انہی دنوں میں فرحی جو نسخہ برہانپور میں چھوڑ گئے، وہ تحریف وتخفیف کا شکار ہوا۔ اس میں حضرت مسیح کی پند ونصیحت کی باتوں کو جوں کا توں رکھ کر باقی احوال کو کچھ اس انداز سے پیش کیا گیا جیسے حضرت مسیح کی آ گہی سے سب تحریر ہوا ہو۔ اس تحریف شدہ نسخے کی کچھ نقلیں بھی تیار کی گئیں۔ جس کی بنیاد پر ''برہانپور کے سندھی اولیاءؒ'' کی عمارت کھڑی کی گئی ہے۔ اس میں بھی اولاد نرینہ پاٹ و برہانپور کا احوال اور خلفاء کے تذکروں کا موازنہ پڑھنے والے خود کر سکتے ہیں۔ شاید یہ راشد صاحب کی مجبوری تھی کہ ان کے پاس نسخہ ہی وہ موجود تھا جس کی سن کتابت کے لئے وہ خود بھی مطمئن نہیں۔

بیان کردہ حقائق کے پیش نظر کشف الحقائق کو من وعن تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ کہنے کو اس کے دو حصے تصور کیے جا سکتے ہیں۔ ایک احوال مسیح الاولیاء جس کے متعلق شک ظاہر کیا گیا ہے ثانی واعظ مسیح المنقبت۔''

واللہ اعلم بالصواب

حضرت پیر سیدی رحمۃ اللہ علیہ

سید تخلص ۱۰۰۸ھ

حضرت مسیح الاولیا قدس سرہٗ کے مرید و خلیفہ تھے۔ آپ کے والد کا نام سید علی تھا اور وہ قطب السادات حضرت سید محمد گیسو دراز کی اولاد سے ہیں۔ والدہ کی طرف سے شیخ فاروقی تھے۔ آپ کی والدہ شاہ بہاء الدین باجن قدس سرہٗ کی پوتی تھیں۔

سید صاحب نجیب الطرفین ہونے کے ساتھ ساتھ جوہر ذاتی سے بھی آراستہ تھے۔ حضرت مسیح الاولیاء کے نہ صرف مرید بلکہ شاگردِ رشید تھے۔ آپ کے درس میں سید صاحب نے عُلوم ظاہری و باطنی میں بوجہ احسن تکمیل کی ہوئی تھی۔ صوفیانہ شاعری میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ مشائخِ شطار کا شجرہ اپنے مرشد مسیح الاولیاء سے حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک برجستہ منظوم فرمایا تھا۔ مرشد سے نہایت عقیدت و محبت رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ معاصرین کو آپ پر رشک ہوتا تھا۔ ان معنوی حسنات کے باوجود اپنے حال کو اہل ظاہر سے مخفی رکھتے تھے۔ سپاہیانہ وضع میں رہتے تھے اور فاروقی بادشاہ بہادر خان والی خاندیس و برہانپور کی فوج میں ملازم تھے۔

اکبر بادشاہ نے جب خاندیس پر فوج کشی کی اور بہادر خان قلعہ آسیر میں محصور ہونے پر مجبور ہوا تو اس نے جن معتمد اور جان نثاروں کو اپنی اور قلعہ کی حفاظت کے لئے ساتھ لیا تھا۔ ان میں آپ بھی تھے۔ محاصرہ کا نتیجہ ابھی سامنے نہ آیا تھا کہ آپ کا وصال ہوگیا۔ یہ ۱۰۰۸ھ کا سانحہ ہے۔ ان دنوں محاصرہ کی بڑی شدت تھی۔ تمام راستے مخدوش و مسدود تھے۔ لہٰذا آپ کو اندرونِ قلعہ فاروقی مسجد کے جنوبی جانب تھوڑی دور پر دفن کیا گیا۔ اور وہ وقتِ آخر اور تدفین کے موقعہ پر مرشد کی قربت اور شرکت کا شرف حاصل نہ کرسکے ورنہ ان کی اپنی مرشد سے عقیدت کے پیش نظر حضرت مسیح الاولیاء کے ہاتھوں تجہیز و تکفین وغیرہ ہوتی۔

خانخانان عبدالرحیم خان نے اپنے عہدِ امارت میں آپ کے مزار کو پختہ تعمیر کرایا۔ مضبوط پتھر کی صاف ترشی ہوئی سلوں سے وسیع مرتفع چبوترہ پر ایک پتھر کا ترشا ہوا تعویذ نصب کرایا اور چاروں گوشوں پر چار ستون قائم کرکے حسین محرابوں پر ایک خوبصورت قبہ بنوایا۔ عام لوگ سیدی کے بجائے آپ کو سدّی صاحب اور آپ کے مقبرہ کو سدّی صاحب کی چھتری کہتے تھے۔

خانخاناں کی یہ تعمیر ساڑھے تین سو سال تک حوادثِ زمانہ کا مقابلہ کرتی رہی لیکن (شاید) بجلی کے صدمہ سے ۱۳۶۱ھ میں قبہ اور محرابی تعمیر شکستہ ہوگئی۔ چبوترہ اور مزار البتہ آج بھی اچھی حالت میں ہے۔ آسیر جب تک آباد رہا لوگ آپ کا عرس نہایت عقیدت سے کرتے رہے۔ اب بھی برہانپور وغیرہ مقامات سے لوگ قلعہ آسیر دیکھنے کو جاتے ہیں تو آپ کو مزار پر چڑھانے کو پھول ضرور لے جاتے ہیں۔ وہاں فاتحہ پڑھنا داخل حسنات سمجھتے ہیں۔ علامہ غوثی نے چند تفصیلات لکھ کر تحریر فرمایا ہے کہ:

ہجری ایک ہزار کے بعد اوّلین عشرہ میں کوچ فرمایا۔

اس سے متیقن سنہ وفات ظاہر نہیں ہوتا۔ لیکن اکبر کے محاصرہ کا زمانہ بالتحقیق ۱۰۰۸ھ ہے اور آپ کے سنہ وصال کا تاریخی مادّہ ''افضل زمن'' ہے۔ سید کی ایک رباعی

بادہ نو شجاں کن خونِ عاشقا نوشی بجد ازیں چوے با ادمیتواں زدن جوشی
بزم تیرہ بختاں را ہمچو شمع و فانوس است طرہ طلا بر سر جامہ یکہتی پوشی

نیچے یہ عبارت درج ہے۔ بجہتِ یادگاری حسب الفرمودہ ملاذ مہربان، قدر دان مخلصان اخوان پناہ عطوفت دستگاہ مرزا قاسم علی بیگ سلمہ اللہ تعالیٰ۔ احقرِ عباد فقیر محمد ہاشم تحریر نمود در سفر دکن وقتیکہ حضرت ظل اللہ در بیرم پوری کنار دریاے بھمرہ تشریف داشتند و بندہ مہمان ایشان بود تابود۔ ۱۷ رمضان المبارک ۴۱ جلوس والا موافق ۱۰۸۱ھ بیاض سندھ یونیورسٹی حیدرآباد میں موجود ہے۔ اس زمانہ میں قاسم علی بیگ کے قبضہ میں تھی انہیں کی فرمائش پر محمد ہاشم نے بطورِ یادگار تحریر سید کے مذکورہ شعر لکھدیئے۔

☆

حضرت شیخ صدر جہاں ابن ابوالفتح

آپ کا وطن اصلی مضافات مانک پور کا کوئی موضع ہے۔ فطری طور پر خدا طلبی کا جذبہ رکھتے تھے۔ سیاحت کے دلدادہ تھے اور توکل شعار تھا۔ آغازِ جوانی میں طوافِ حرمین شریفین کے شوق میں گھر سے روانہ ہوئے۔ ساحل پر پہنچے تو سمندر کو اس قدر پُر شور پایا کہ کوئی جہاز روانہ نہ ہوسکتا تھا۔ پھر آپ اس قدر علیل ہوگئے کہ سمندر کے ساکن ہونے کے بعد بھی سفر کے قابل نہ ہوسکے۔ اندازہ ہوا کہ اس سال قدرت ہی کو میری خانہ کعبہ میں حاضری منظور نہیں، واپس ہوئے اور مالوہ کے سیر حاصل مقام دھار میں گذر ہوا اس اولیا خیز سرزمین سے اس قدر دلچسپی پیدا ہوئی کہ آپ نے مستقل قیام کا قصد کرلیا۔ یہاں بزرگانِ سلف کے مزارات سے روحانی لذت وفیض حاصل کرتے رہے اور وہاں کے برگزیدہ شیخ حضرت معروف غریب اللہ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے اور بیعت سے شرف یاب ہوئے۔ حج کا موسم قریب آیا تو آپ کے مرشد نے جانے کی تیاری کی۔ ان کا فرزند شیخ تاج الدین عطاء اللہ خرد سال تھا۔ حضرت معروف نے طے کیا کہ عطاء اللہ کی پرورش صدر جہاں کے ذمہ رہے۔ چنانچہ وہ تو اپنی خانقاہ کا جانشین اور اپنے فرزند کا پرورش کنندہ آپ کو مقرر کرکے سفرِ حجاز کو روانہ ہوگئے۔ لیکن اس انتظام میں آپ زیارت حرمین شریفین و حج کا موقعہ نہ پاسکے۔

حضرت شیخ معروف غریب اللہ کا یہ سفرِ حج سفرِ آخرت بھی ثابت ہوا۔ وہ واپس نہ آسکے اور مدینہ منورہ میں فوت ہوکر وہیں دفن کئے گئے۔ اُنہوں نے مکہ معظمہ سے صدر جہاں کو ایک خط لکھا تھا۔ جس میں خاص ہدایات اور خلافت کی بشارت لکھی تھی۔ چنانچہ مرشد کے وصال کی خبر ملنے کے بعد آپ مفوضہ ذمہ داریوں کو انجام دیتے رہے۔

جب مرشد کا فرزند کچھ استعداد حاصل کرچکا تو آپ نے اس کو والد کا جانشین کرکے پھر سیاحت کو نکل کھڑے ہوئے۔ خوش قسمتی آپ کو مسیح الاولیاء کے آستانے پر پہنچا گئی۔ یہاں آپ کے ذوقِ خدا طلبی کی بوجہ احسن تسکین و تکمیل ہوگئی۔ حضرت کے فرمان کے مطابق وطن واپس ہوگئے۔ لیکن ہر سال پابندی کے ساتھ برہانپور جاتے اور ایک اعتکاف کرکے لوٹ جاتے تھے تا زیست اِس معمول میں فرق نہ آیا۔

علامہ غوثی حسن سے مخلصانہ مراسم تھے۔ برہانپور آتے وقت بھی اور واپس وطن جاتے ہوئے بھی دونوں وقت چند روز ان کے یہاں قیام کرتے تھے بلکہ اس آمد و رفت کے علاوہ بھی سال میں دو تین مرتبہ مانڈو جاکر علامہ غوثی کے دولتکدہ پر مہمان ہوا کرتے تھے اور عارفانہ اسرارِ حکمت کی گفتگو رہا کرتی تھی۔ علامہ غوثی نے گلزار ابرار میں آپ کا حال لکھتے ہوئے ان ملاقاتوں کا بڑی محبت سے ذکر کیا ہے۔ چنانچہ آپ کے مذکورۂ بالا حالات ترجمہ گلزارِ ابرار ہی سے ماخوذ ہیں۔ آپ کا وصال ۱۷ ربیع الاول ۱۰۱۴ھ میں ہوا۔ دہار (مالوہ) میں مدفون ہوئے۔

☆
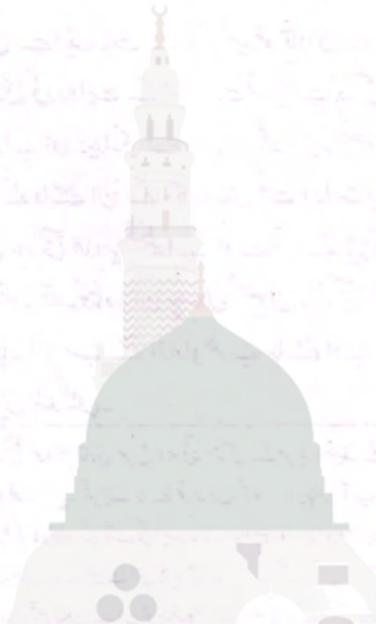
حضرت خواجہ علی متخلص مسیحی

آپ احمد آباد گجرات کے رہنے والے تھے۔ حضرت حسین رومی کے فرزند اور قادری سلسلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ گجرات کے بڑے دولتمندوں میں آپ کا شمار تھا۔ طریقت کی تلقین حضرت مسیح الاولیاء سے پائی تھی۔ علامہ غوثی لکھتے ہیں کہ میرے گہرے دوست تھے۔

تخلص پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت مسیح الاولیا قدس سرہٗ کی نسبت سے ہی آپ نے مسیحی تخلص اختیار کیا ہوگا۔ صوفیانہ اشعار کہتے تھے۔ آزاد خاطر، فارغ البال تھے۔ حرص داز سے بے نیاز اور اپنی حالت پر مطمئن تھے مسیح الاولیاء سے انتہائی محبت رکھتے تھے۔ آپ کے خرقِ و عادات سے متعلق ایک رسالہ لکھ کر علامہ غوثی کو دیا تھا۔ غوثی لکھتے ہیں کہ اس رسالہ کے چند بیانات کا خلاصہ ہی تو میں نے عبارت میں لاکر اپنے گلزاروں کو بہار بنایا ہے۔ منجملہ ان کے ایک روایت درج گلزار کی ہے۔ جو ترجمۂ گلزار سے بجنسہ پیش کرتا ہوں۔

رومی نگار خانہ میں سے ایک بات یہ ہے کہ سید محمد قادری کے بیٹے سید عبداللطیف نے شیخ عبدالرحیم[1] چشتی عادل پوری کی روایت کے حوالہ سے فرمایا ہے کہ شیخ عبدالرحیم کہتے تھے۔ ایک رات اعتکاف کے اندر خواب اور بیداری کے درمیان مجھ کو ایسا معلوم ہوا کہ چار نورانی اشخاص نے مسیح الاولیا کے بیٹھنے کے واسطے ان کے مکان میں تخت آراستہ کیا ہے اور ان کے نام سے قطبیت کا ترانہ گاتے ہیں اور مسیح الاولیا مُسکراتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مجھ جیسے شخص کو اس تخت کی نشست کے قابل نہ سمجھو۔ قصہ کوتاہ۔ ان چاروں شخصوں نے مسیح الاولیاء کے بہانہ پر خیال نہ کرکے تخت کے اوپر بٹھایا۔ اور سب نے از راہِ طرب سامنے ادب سے ہاتھ باندھ کر مبارکباد میں خوشی اور نشاط کی آوازیں بلند کیں۔

---

[1] شیخ عبدالرحیم کپرونجی حضرت شیخ ابراہیم قاری مرغ لاہوتی سندھی کے مرید و خلیفہ تھے۔ بادشاہ راج علی خان عادل شاہ فاروقی شیخ عبدالرحیم کا مرید تھا۔ آپ تشریف لائے تو عادل شاہ نے جہاں آپ فروکش تھے ایک سراء اور مسجد تعمیر کروادی۔ آپ نے اس نواح کو بادشاہ کے لقب کی نسبت سے عادلپورہ سے موسوم فرمایا اور مسجد کے ایک حجرہ میں فردکش رہے۔ ۱۰۰۵ھ میں وصال ہوا اور حسب وصیت اسی حجرہ میں دفن کئے گئے۔ اسی سنہ میں بادشاہ سہیل خان کی معرکہ آرائی میں شہید ہوئے۔ خانخانان عبدالرحیم خان نے ان کا جنازہ تزک و احتشام سے لاکر عادلپورہ میں مرشد کے قریب دفن کیا۔

جب میں صبح کے وقت مسیح الاولیا کی خدمت میں گیا تو میرے بشرہ سے رات کی دیکھی ہوئی حالت کے آثار معلوم فرمائے۔ اجازت کے واسطے لب نہ ہلایا۔ اور مجھ کو کہنے سے روک دیا۔ درس سے فارغ ہونے کے بعد جب خلوت ہوئی تو وہی خواب کی سرگذشت مجھے بے کم و کاست خود ظاہر فرمائی۔ میں نے اللہ جل شانہٗ کا شکر بہت زیادہ کیا کہ میری خواب اضغاث و احلام (پریشان خوابوں میں سے) نہ تھی۔ (ترجمہ گلزار ابرار ص ۶۰۴)

آپ کے مزید حالات اور کہیں دستیاب نہ ہوسکے۔ وہ تو احسان ہے علامہ غوثی کا کہ انہوں نے مختصر نویسی کے باوصف ان کا اس قدر حال لکھ دیا جو پیش کردیا گیا۔

☆

حضرت شیخ فرید ابن شیخ عبدالحکیم ابن شاہ باجن چشتی قدس سرہٗ

آپ شیخ عبدالحکیم ابن حضرت شاہ باجن کے فرزند ہیں۔ آپ کو گونا گوں ازلی و پیدائشی خوش نصیبیاں حاصل تھیں۔ اول تو یہی کہ خدا نے آپ کو ایسے برگزیدہ خاندان میں پیدا کیا۔ آپ اس نامور باپ کے فرزند سعید ہیں جن کا مرید ہونے پر شیخ علی متقی جیسا عالم مقبول انام نازاں رہا ہو۔ دوسرے یہ تقدیری سعادت کہ حضرت مسیح الاولیاء قدس سرہٗ کی مریدی اور شاگردی و پرداخت کا شرف پایا۔

علامہ غوثی لکھتے ہیں کہ حضرت مسیح الاولیاء اپنے بڑے بیٹے شیخ عبدالستار کی بندش اور آپ کی تربیت یکساں فرماتے ہیں۔ آپ نے اس فیض رسانِ عالم مرشد و جامع العلوم استاد کی تعلیم و تربیت سے بوجہ احسن فائدہ اُٹھایا۔ علوم متداولہ کی تحصیل کے علاوہ عیانی اور بیانی عارفانہ علوم کے کمالات تک رسائی حاصل کی۔ فارسی اور عربی کی بہت سے مبسوط کتابوں کا اختصار اور انتخاب اس طرح کیا کہ وہی ان کتابوں کا لُبِ لباب ثابت ہوتا ہے۔ مسیح الاولیا سے فنِ شعر میں بھی استعداد بہم پہنچائی اور صوفیانہ مضامین میں ہی زیادہ تر شاعری کرتے تھے۔ صاحبِ وجد و حال تھے۔ سماع سے ذوق تھا۔ سرود کی مجلسوں میں جب آپ وجد میں آتے تو حاضرین متاثر ہوکر نعرہ زن ہوجایا کرتے تھے۔ علامہ غوثی نے یہ بھی لکھا ہے کہ آپ کی ظاہری صفائی اور باطنی نور سے آبائے کرام کی معرفت کے چراغ میں از سرِ نو روشنی آ گئی ہے۔

آپ بھی مرشد کا انتہائی ادب کرتے تھے۔ حضرت شیخ برہان الدین راز الٰہی کے ملفوظات میں مذکور ہے کہ آپ تیس سال تک مسیح الاولیاء کے حضور میں بہ ادب دو زانو بیٹھے رہے۔ یہاں تک کہ اس مداومت سے آپ کی پنڈلیوں کا رنگ تبدیل ہوگیا۔ لیکن آپ نے نہ کبھی خستگی محسوس کی اور نہ نشست میں تبدیلی کی۔ اصل عبارت یہ ہے:

> میفرمودند کہ میاں شیخ فرید سی سال بحضورِ حضرت عین العرفان قدس سرہٗ بہ دو زانوے ادب نشستند و دریں مدت از زانو بزانوے دیگر نہ شد، چنانچہ ساقہاے پالش رنگ گرفتہ بود اما حالشن گاہے بماندگی خستہ نہ شد۔ (روائح الانفاس قلمی ص ۵۸)

آپ کو مرشد کی خدمت میں حاضر باشی کا اس قدر شغف تھا کہ آباء و اجداد کی خانقاہ و مسکونہ محلات میں خاصی وسعتیں اور وافر گنجائشیں تھیں، لیکن پیر کی قربت کے خیال سے آپ نے خانقاہ سے متصل زمین خریدی اور اس پر مختصر سا مکان اور ایک مسجد تعمیر کرائی اور وہیں سکونت اختیار کرلی۔ حتیٰ کہ مسیح الاولیاء کے وصال کے بعد بھی کچھ عرصہ تک اپنے ہمدرس وہم مشرب مرشد زادہ شیخ عبدالستار کی رفاقت میں ہمدم و ہمراز اور مخلص مشیر رہے۔ چنانچہ روائح الانفاس میں ہی یہ روایت مطالعہ میں آئی ہے کہ حضرت بابا عبدالستار بڑے فیاض تھے یہاں تک کہ دوسروں کی حاجت روائی کے جذبہ میں اپنے اہل وعیال کو بھی نظر انداز کرجاتے تھے۔ اس قدر کہ گھر میں لواحقین کو ما یحتاج کی تنگی ہوجاتی تھی۔ شیخ فرید نے حق رفاقت ادا کرتے ہوئے انہیں ٹوکا بھی کہ اس بے احتیاطی سے سخاوت نہ کیجئے کہ سائلوں کی پریشان خاطری آپ کی دلجمعی کو متاثر کرے۔ مگر حضرت بابا احتیاط کے پابند نہ ہوسکے۔ انجام کار انہیں عظیم دشواریوں کا سامنا ہوا۔ ملفوظات کی عبارت یہ ہے:

> میفر مودند کہ بابا عبدالستار را کہ شیوۂ سخاوت بسیار بود میاں شیخ فرید منع سخاوت بسیار نمودند و فرمودند کہ چنیں نہ کنید کہ اثر تفرقہ قلوب سائلانِ بدلِ جمع شما اثر کند۔ آخر الامر چنانکہ میاں شیخ فرید میفر مودند ہماں شد و تفرقۂ عظیم روے داد۔

(روائح الانفاس قلمی ص۹۲)

حضرت مسیح الاولیاء کو بھی ان کی حسنِ ارادت و خلوص کے پیش نظر ان کی دلجوئی کا بڑا خیال رہتا تھا۔ شیخ فرید نے کافی عرصہ ریاضت و مجاہدات میں کامیابی کے بعد بخیالِ خود اپنے آپ کو خلافت کا اہل سمجھ کر خرقہ خلافت کی درخواست کی۔ حضرت نے خلافت تو عطا فرمادی۔ لیکن تخلیہ میں فرمایا کہ اگر یہ دو سال اور صبر کرتے تو بہتر تھا۔

آپ کے علم و فضل اور زہد و تقویٰ کی شہرت تھی۔ بادشاہ عالمگیر بھی آپ سے ملتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ بادشاہ نے دریافت کیا کہ آپ نے سجادہ نشین کے لئے کس فرزند کو تجویز کیا ہے۔ اُنہوں نے جواب دیا کہ سجادہ ایک مصلیٰ ہوتا ہے، لہٰذا مصلاً کا وہی مستحق ہوسکتا ہے جو زیادہ نماز پڑھتا ہو۔

جس طرح مسیح الاولیاء شیخ فرید کی دلجوئی کو ملحوظ رکھتے تھے اسی طرح ان کے ممتاز ترین خلفاء بھی آپ کے ساتھ خصوصی رعایت ملحوظ رکھتے تھے۔ چنانچہ حضرت شیخ برہان الدین رازِ الٰہی جو عموماً محفلوں اور تقریبوں میں شریک ہونے سے گریز کرتے تھے۔ شیخ فرید کی دعوت کو رد نہ کرسکے۔ جانتے تھے کہ ایسی مجالِس میں شرکت سے جمعیتِ قلب کو نقصان پہنچتا ہے مگر ان کی

دلشکنی نہ ہو اس خیال سے شریک مجلس ہوئے۔ شیخ فرید کی دختر کی شادی تھی آپ تقریب میں تشریف لے گئے اور دو ساعت ان کے پاس بیٹھ کر چلے آئے۔ فرماتے ہیں کہ اس خلل سے ڈیڑھ سال تک دل پر تفرقہ کا اثر رہا۔ ملفوظات میں لکھا ہے:

میفر مودند کہ فقیر در مجلس کدخدائی دختر میاں شیخ فرید قدس سرہٗ بطلب و جد ایشان رفتہ بودم دو پاس بمقارنت شیخ اجلاس نودم دیاز گشتم ایک و نیم سال تفرقہ این در دل یافتم۔ (روائح الانفاس قلمی ص۹۹)

حضرت شیخ فرید کی ایک دختر حضرت شیخ برہان الدین رازِ الٰہی کی زوجیت میں تھیں۔ یہ مناکحت حضرت مسیح الاولیاء کے مشورہ کے مطابق عمل میں آئی تھی۔ چنانچہ حضرت رازِ الٰہی قدس سرہٗ کی اولاد اسی محترمہ کے بطن سے ہوئی جس سے سلسلۂ نسب جاری رہا۔ آپ کو آخر عمر میں اپنے آپ و جد کی خانقاہ کی طرف رجوع ہونے کا اتفاق ہوا اور خاندانی سجادگی پر مامور ہوئے تو سندھی پورہ کی زمین و مکان حضرت شیخ برہان الدین رازِ الٰہی کو تفویض فرمادیا تھا۔

آپ کی پوری زندگی زہد و تقویٰ و خدمتِ خلق میں بسر ہوئی اور اپنے مامور اسلاف اور عظیم المرتبت مرشد کی اتباع و تقلید میں بسر ہوئی۔ تاریخِ وصال کا علم نہ ہوسکا۔ بعد رحلت خاندانی گورستان احاطۂ شاہ باجن قدس سرہٗ میں دفن ہوئے۔

☆
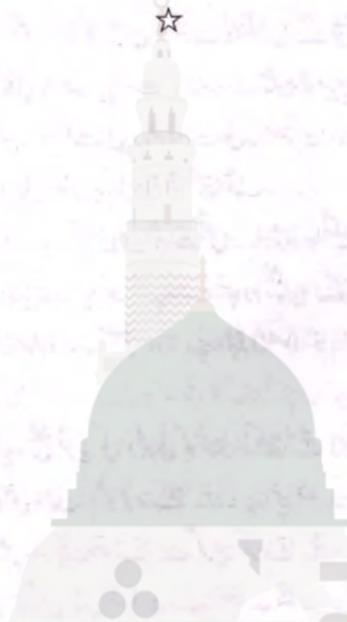
میر محمد

یہ ۲۵ سالہ نوجوان حاجی پاینده کا مہمان یا اُن کے ہاں مقیم تھا۔ حاجی صاحب حضرت مسیح الاولیاء کے مرید تھے۔ ایک مرتبہ میر محمد بھی حاجی پاینده کے ہمراہ خانقاہ میں آیا اُس کے سر پر چیرہ بندھا ہوا تھا۔ مگر اس کی بندش نہایت بدنما تھی۔ مسیح الاولیاء نے فرمایا کہ تم نے اس بری طرح چیرہ کیوں لپیٹ رکھا ہے۔ میر محمد نے ادب سے جواب دیا کہ حضرت محترم میرا داہنا ہاتھ ایک عارضہ کے باعث شل ہوگیا ہے اونچا نہیں ہوسکتا مجبوراً بائیں ہاتھ سے جیسا بھی لپٹا جاسکتا ہے، لپیٹ لیتا ہوں۔ حضرت نے فرمایا ہمارے سامنے داہنے ہاتھ سے باندھو! اس نے اس حکم کی تعمیل کی۔ چیرہ سر سے اُتار کر از سرنو داہنے ہاتھ سے باندھنا شروع کیا۔ اول۔ اول تو ہاتھ اونچا ہونے میں تکلیف معلوم ہوئی۔ لیکن جیسے جیسے چیرہ بندھتا جاتا تھا، ہاتھ کھلتا جاتا تھا اور چیرہ بندھنا تمام ہونے تک ہاتھ خاطر خواہ کارآمد ہوگیا۔

میر محمد پر اس واقعہ کا ایسا اثر ہوا کہ وہ اسی وقت سے خانقاہ نشینوں میں شامل ہوگیا۔ حضرت کے مکان میں چلے جانے کے بعد حاجی پاینده نے کہا کہ آؤ گھر چلیں۔ اس نے کہہ دیا کہ اب میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا اور یہی ہوا بھی۔ میر محمد پچھلی رات سے بیدار ہوکر بہ اشتیاق تمام بلند آواز سے اشعار پڑھتا اور اذان کہتا تھا۔ خانقاہ کے لنگر خانہ سے کھانا کھاتا اور کسی سے کسی بات کی طلب اور طمع نہ کرتا۔ چند سال اسی طریقہ پر زندگی بسر کی اور وہیں انتقال کیا۔ فرحی کے اصل الفاظ یہ ہیں:

> روزے جوانے در بیست و پنج سالگی میر محمد نام ہمراہ حاجی پاینده کہ مرید حضرت پیر دستگیر بود بخدمت حضرت مرشدِ خاص و عام مشرف شد و آن جوان چیرہ بر سر خود بدست چپ بستہ بود و آن در نمود خوب نمی نمود او فرمودند کہ بر سر چنیں چیرہ چرا بستۂ او عرض کرد کہ امید گاہا پیش ازیں چند سال دست راست مرا عارضہ سخت رونمودہ بود ازاں پس ایں دست بالانمی شود بنا برایں بدست چپ اینچنیں چیرہ رامی بندم۔ فرمودند کہ بارے پیش من بدست راست بہ بنداء چیرہ را از سر فرود آوردہ بدستِ راست در پے بستن شد، او چیرہ می بست اندک

اندک دست دے کشادہ می شد۔ چوں چہرہ را تمام کرد دست او تمام کشادہ
گردید۔ پس حضرت پیر دستگیر در دولت خانہ خود تشریف بردند۔ چوں آن جوان
در خانہ حاجی پایندہ چند روز ماندہ بود اور اگفت کہ بیائید بخانہ رویم و باز اینجا
خواہیم آمد۔ او بہ حاجی پایندہ گفت کہ بعد ازیں ہیچ جانرویم و درہمیں خانقاہ
خواہم بود۔ آخرہمچنیں کرد دور آخر شبہا برمی خاست و بشوق تمام بآواز بلند شعر
ہارا میخواند واذان می گفت و طعام خانقاہ میخورد و زندپو سے اختیار نمود و یکسے طمع
نمی کرد و بہمیں ہج چند سال بزیست وجان بجاں آفریں سپرد۔
(کشف الحقائق قلمی ص۳۰)

فرحیؔ نے ان کا بھی سنہ وفات اور مقام مزار ظاہر نہیں کیا۔ واللہ اعلم کس سنہ میں وفات
پائی اور کہاں دفن ہوئے۔

☆

شیخ عبدالقدوس سندھی

آپ حضرت مسیح الاولیاء کے جاں نثار رفیق اور حاضر باش مرید تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت سے قرابت قریبہ کا اعزاز بھی آپ کو حاصل رہا ہو۔ قرابت کا گمان مجھے اس لئے ہوا ہے کہ حضرت بابا فتح محمد محدثؒ نے مدینہ منورہ تشریف لے جاتے وقت جو ترکہ عزیز و اقارب کے لئے چھوڑا ہے، اس کی تقسیم نامہ میں آپ کی بیوہ کا بھی ذکر ہے۔

۱۰۱۷ھ میں آپ جوان العمر تھے۔ پھر بھی مرشد کی خدمت اور حُسنِ ریاضت کے باعث روحانی استعداد کے مطابق پانچ خانوادوں کی خلافت سے سرفراز تھے۔ مرشد کا اشارہ تھا کہ ترقی مدارج کے بعد اسی بارگاہ سے مگر ایک توسط کے ذریعہ تم کو بقیہ نعمت بھی اپنے وقت پر حاصل ہوجائے گی۔

چونکہ آپ کی چشم باطن کو بصیرت میسر آ چکی تھی، جب شیخ برہان الدین سے ملاقات ہوئی تو آپ نے ان کی پیشانی میں وہ نور دیکھا جس کے توسط کا مرشد نے اشارہ کیا تھا۔ مگر جب یہ معلوم ہوا کہ وہ ملک حسین بنبانی کے مرید ہیں اور ان عدم موجودگی میں کسی اور رہنمائے طریقت کی جستجو میں گجرات جارہے ہیں تو آپ کو پریشانی ہوئی اور بے تاب ہوکر انہیں ترغیب دی کہ وہ حضرت مسیح الاولیاء کے مرید ہوجائیں اور بالآخر انہیں آمادہ کرلیا۔ قبل اس کے کہ شیخ برہان الدین مسیح الاولیاء سے بیعت ہوں۔ آپ نے انہیں ان پانچوں خانوادوں کی خلافت تفویض کردی جس پر وہ فائز تھے اور وعدہ لیا کہ جب آپ مسیح الاولیا سے فیضیاب ہوکر اعلیٰ مدارج پر پہنچیں تو مجھے مرید کرلینا۔ شیخ نے وعدہ کیا اور وقت آنے پر آپ کی تمنا بھی بر آ گئی۔

الغرض آپ اپنے ہمراہ شیخ برہان الدین کو مسیح الاولیاء کی خدمت میں لے گئے۔ انہوں نے چند ضروری سوالات کے بعد مرید کرکے ریاضت و مجاہدات کی طرف رجوع کردیا اور

تھوڑے عرصہ بعد ہی وہ مرشد کی رہنمائی اور تعلیمات سے فیض یاب ہوکر رازِ الٰہی کے لقب سے سرفراز ہوگئے۔

حضرت کے مزید حالاتِ زندگی کی تفصیلات علم میں نہ آسکیں۔ البتہ یہ صراحت مختلف ذرائع سے ملتی ہے کہ آپ کو رجوعِ خلق حاصل تھا۔ بعد وصال بھی آپ کے مزار سے اہلِ ارادت فیض حاصل کرتے رہے۔ چنانچہ آپ کے مزار کی نذر و نیاز کی آمدنی آپ کی بیوہ اور پس ماندگان کے لئے قوت بسری کا ذریعہ رہی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کو موت و حیات، ہر زمانہ میں اہلِ حاجت کی فائدہ رسانی کا فیض حاصل تھا۔ صحیح تاریخ وفات بھی معلوم نہ ہوسکی۔ سنہ ۱۰۶۴ھ سے پہلے آپ کا وصال ہوچکا تھا۔ اس کا ثبوت حضرت بابا فتح محمد محدث کے وصیت نامہ میں موجود ہے۔ مزار کی نسبت بھی نشاندہی نہیں کی گئی ہے۔ واللہ اعلم کہاں مدفون ہوئے۔

☆
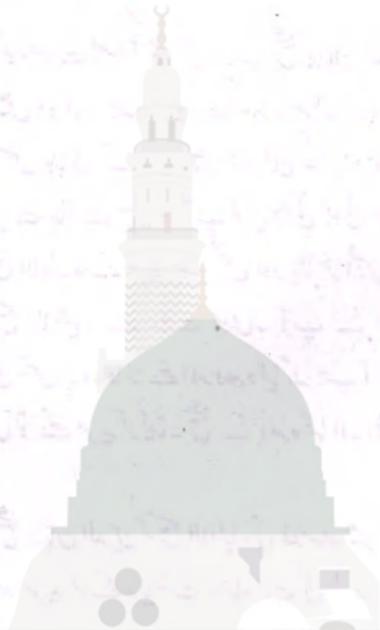
مُلّا عبدالعزیز لاہوریؒ

ملا صاحب اپنے علم و فضل کے اعتبار سے یگانۂ روزگار تھے۔ فطرتاً صوفیانہ مزاج پایا تھا۔ بظاہر درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے اور اسی وجہ سے مُلّا مشہور تھے۔

آپ کا شمار بھی ان خوش نصیب خلفا میں ہے جن کی ذات پر حضرت مسیح الاولیاء نے اظہار تفاخر فرمایا تھا۔ فرحی نے مسیح الاولیا کے ارشاد کی ترجمانی ان الفاظ میں کی ہے:

پس حضرت پیر دستگیر فرمودند کہ یقین است کہ اگر من مرید نمی کردم دست من بدست شاہ بازے مثل حاجی نعمت اللہ و حاجی عبدالعزیز وغیر ایشاں کجا ملاقی می شد و ایشان چسان بدامِ ارادتِ من می افتاوند (کشف الحقائق قلمی ص ۱۹)

یہ شاہ بازِ اوجِ فضائل و فواضل آپ کے دام ارادت میں کس طرح اسیر ہوا، اس کی دلچسپ تفصیل یہ ہے کہ ملا صاحب موصوف اپنے وطن سے ادائے فریضہ حج کے ارادے سے براہ خشکی روانہ ہوئے اور مختلف اسلامی بلاد و امصار کے علماء و مشائخ کی صحبت سے اکتسابِ فیض کرتے ہوئے حج کی سعادت حاصل کی۔ واپسی میں برہان پور آنا ہوا۔ یہاں بھی مشاہیر علما و صوفیا کی خدمت میں باریاب رہے۔ جب حضرت مسیح الاولیا کی خانقاہ میں رسائی ہوئی تو دل کو عجیب فرحت اور روح کو بے انتہا لذت محسوس ہوئی۔ کمال نیاز مندی اور حسنِ ارادت سے مرید ہوکر فقرائے خانقاہ میں منسلک ہوگئے۔ جوہرِ قابل رکھے تھے۔ فیض رساں مرشد کی چند روزہ توجہ سے کمالاتِ روحانی سے بہرہ یاب ہوگئے۔ مسیح الاولیا نے تکمیلِ مدارج کے بعد آپ کو وطن جانے کی اجازت دے دی۔ آپ خدمت اقدس سے جدا ہونا گوارا نہ کرتے تھے۔ مگر ارشاد مرشد کی تعمیل بھی ضروری تھی بادل ناخواستہ لاہور گئے اور تھوڑے ہی عرصہ بعد پھر واپس آگئے۔ پیر کی محبت میں آپ کا یہی وطیرہ رہا کہ جب مسیح الاولیاء بتاکید رخصت کرتے آپ چلے جاتے اور چند ہی روز کے بعد بیقرار ہوکر چلے آتے۔ حتیٰ کہ ایک مرتبہ حضرت نے رخصت کے وقت ہدایت کی کہ جب تک میں طلب نہ کروں یہاں نہ آنا! آپ اِس حکم سے تڑپ اُٹھے اور ادب سے عرض کی کہ میں نامعلوم عرصہ تک جدائی کا صدمہ کیسے برداشت کرسکوں گا۔ حضرت نے دلجوئی کی اور فرمایا

کہ ایسا نہ ہوگا ہم جلد ہی مل سکیں گے۔ لیکن خبردار اس ہدایت کے خلاف عمل نہ کرنا۔ غالبًا یہ ۳۱-۱۰۳۰ھ کا زمانہ تھا۔ جیسا کہ فرحیؔ کی آئندہ وضاحت سے ثابت ہوتا ہے۔

فرحیؔ نے طویل عبارت میں یہ واقعہ باتفصیل لکھا ہے کہ حضرت مسیح الاولیاء کے وصال کے ایک سال بعد جب میں برہانپور سے دل برداشتہ ہوکر سیاحت کے لئے نکل گیا، جب لاہور پہنچا تو ملا عبدالعزیز سے ملاقات ہوئی۔ قبل اس کے کہ میں انہیں حضرت پیر دستگیر کے وصال سے مطلع کرتا خود انہوں نے بتایا کہ حضرت کی تاکید کے باوجود جب میں ان کی جدائی کے اشتیاق کو ضبط نہ کرسکا تو اس اعتماد پر کہ برہانپور جانے میں حضرت کے ارشاد کی خلاف ورزی تو ہوتی ہے لیکن امید ہے کہ دیرینہ شفقت کے پیش نظر حضرت معاف فرمائیں گے۔ سفر کی تیاری کی۔ جس رات میں نے تہیہ کیا تھا کہ صبح روانہ ہوجاؤں گا۔ اس رات اس خیال سے کہ دعائے سیفی کا ورد ناغہ نہ ہوجائے آخرِ شب بیدار ہوگیا اور ورد شروع کیا ہی تھا کہ مجھ پر عجیب حالت طاری ہوگئی۔ میں نے دیکھا کہ حجرہ کی دیواریں اور چھت ہر چیز عینک کے مانند شفاف ہوگئی ہے اور میری نگاہیں زمین و آسمان کی تمام چیزوں کو دیکھ رہی ہیں اور نظر آیا کہ کوئی چیز پرواز کرتی ہوئی میری طرف آرہی ہے۔

یکایک میں نے دیکھا کہ حضرت پیر دستگیر موجود ہیں اور فرمارہے ہیں کہ میں نے رخصت کرتے وقت تاکید کردی تھی کہ بلا طلب نہ آنا۔ پھر تم نے برہانپور آنے کا قصد کیوں کیا۔ میں نے عرض کیا کہ اشتیاق دیدار مجھ سے ضبط نہ ہوسکا۔ خیال تھا کہ معذرت کرنے پر حضرت میری یہ خطا معاف کردیں گے۔ فرمایا شوقِ ملاقات تھا تو میں آیا ہوں، مل لو۔ لیکن ہمارے تمہارے درمیان علمی صحبتوں کی جو مقدار قدرت کی طرف سے معین تھی تکمیل کو پہنچ گئی ہے۔ چنانچہ میں تمہیں منع کرنے کے لئے آ گیا تھا، کیونکہ تمہارا بغرض ملاقات آنا بے سود تھا۔ (ترجمہ کشف الحقائق ص ۳۶-۳۷-۳۸)

ظاہر ہے کہ مسیح الاولیاءؒ نے اسی مصلحت سے ملا صاحب کو برہانپور آنے سے منع فرمادیا تھا کہ آپ بذریعہ کشف آگاہ تھے کہ مشتاقِ دیدار مرید اس قدر طولانی سفر کی زحمتیں اُٹھاکر برہان پور آئے گا اور مجھے نہ پائے گا تو یہ روح فرسا صدمہ برداشت نہ کرسکے گا۔ چنانچہ اس اشتیاقِ دید بھی آخر وقت میں پورا فرمادیا اور کنایۃً بتادیا کہ ظاہری ملاقات کا مقصد تمہارے لئے حصول فیض و باطنی تعلیم جس قدر ہماری ذات سے متعلق تھی وہ تکمیل کو پہنچ گئی ہے۔ اب ملاقات ہونے کی صورت اور ضرورت باقی نہیں رہی۔

یہ ۱۰۳۳ھ کا واقعہ ہے۔ فرحیؔ ملا صاحب کو بقید حیات اور صحت و عافیت کی حالت میں چھوڑ کر ان سے رخصت ہوکر آگے چل دیا۔ واللہ اعلم اس کے بعد وہ کب تک زندہ رہے۔

درویش عبدالحکیم سیاح

درویشوں کی عرفِ عام میں دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک ''بے نوا'' جو اپنے پاس کوئی اثاثہ یا ساز و سامان نہیں رکھتے نہ ان کا کہیں ٹھکانا ہوتا ہے۔ جہاں پڑ رہے وہی مسکن۔ جو میسر آ گیا وہی قوتِ لا یموت۔ دوسرے ''بانوا'' یہ بھی تجرد اور توکل پر بسر تو کرتے ہیں۔ لیکن اپنے لئے ٹھکانہ تجویز کر لیتے ہیں جس کو تکیہ کہا جاتا ہے۔ تکیہ ایک کمرہ کا مختصر سا کھلا ہوا مکان ہوتا ہے، جس میں عموماً دروازہ نہیں ہوا کرتا۔ چنانچہ عبدالحکیم بھی ''بانوا'' درویش تھے۔ اور بڑے سیاحت پسند، نہ صرف ہندوستان بلکہ جزیرۂ سراندیپ کی بھی سیر کی تھی۔ اور بے شمار مشائخ، فقراء اور درویشوں کی ملاقات سے فیض یافتہ تھے۔ برہانپور تشریف لائے اور جب حضرت مسیح الاولیاءؒ کی خدمت میں باریاب ہوئے تو شاید انہوں نے پالیا، جس کی جستجو میں برسوں سے اکنافِ عالم میں سرگرداں تھے۔ بیرونِ شہر برہان پور تکیہ بنا کر مقیم ہوگئے اور حضرت کی خدمت میں روزانہ حاضر ہوتے رہے تھے اور معیت ہونے کی برکت سے جلد جمعیتِ خاطر کی دولت سے مالا مال ہوگئے۔

فرحؔی نے سیاحِ مذکور کی زبان سے سُنا ہوا ایک دلچسپ واقعہ کشف الحقائق میں درج کیا ہے، جس کا ترجمہ بالاختصار حضرت مسیح الاولیاء کے ذکر میں درج کیا گیا ہے۔ یہاں اصل عبارت درج کئے دیتا ہوں کہ کس طرح سیاح نے حضرت کی کرامت دیکھنے کی اپنی دل میں خواہش کی اور کس طرح اس کا ظہور ہوا۔ اصل عبارت مذکور یہ ہے:

> درویشی عبدالحکیم نام کہ سیاح بود بسیار اعزہ را دیدہ و سیر سراندیپ ہم کردہ چوں در برہانپور آمد و حضرت پیر دستگیر را دید بیرون شہر تکیہ بستہ بماند۔ و ہر روز بخدمت حضرت ایشیان می آمد روزے عید رمضان بود و عبدالحکیم سیاح و جملہ درویشان در ملازمت حضرت شیخ مسیح منقبت حاضر بودند کہ عبدالحکیم را در خاطر گزشت کہ اگر حضرت قبلہ گاہی از اولیائے کامل اند این سنگریزہ ہائے صحن زا تبصرف خود بہ زر و نقرہ بدل کنند و چوں امروز عید رمضان است در خانہ ہر کس سینویں و شیر خواہد بود مرانانِ گرم کہ بر روغن و شکر باشد بخوراند ناگاہ دیدم کہ در صحن تمام سنگریزہ از زر و نقرہ گردید ندیس بخاطرم رسید کہ چندیں از و برگیرم باز

در دل گفتم کہ مبادا این حرکت طمع حضرت حقائق آ گاہ رانا موزون نماید و مرا سبب تفرقہ شود بنا بریں نہ گرفتم۔ پس حضرت مسیح الاولیاء رو بطرفِ من کردہ فرمودند کہ بعضی مردم کہ ازان سرور علیہ الصلوٰۃ والسلام معجزہ طلب کردہ و آنرا دیدہ اسلام آوردند از وصال حق محروم ماندندو کسانیکہ بے طلبِ معجزہ ایمان آوردند ایشان را وصالِ حق روزی ہمی شد۔ اکنوں بحکم الشیخ فی قومہ کالنبی فی امتی۔ معاملہ مرشد ہم بریں غط است۔ بعد از شنیدن مین سخن بغایت انفعال کشیدہ عذر بسیار کردم و بعد از تشریف بردن حضرت ایشان بخانہ آن سنگریزہ بحالِ خود شدند۔ دمن از خانقاہ بہ تکیہ خود می رفتم کہ شخصے نان گرم با روغن وشکر چنانکہ در خاطرم گذشتہ بود بدستم دادہ رفت۔ ایں ماجز پیش این جامع ملفوظ عبدالحکیم خود گفتہ بود۔ (کشف الحقائق قلمی ص۵۲)

فرحؔی نے سیاح کی اسی قدر ذکر کیا ہے اور کہیں بھی اس کے حالات نگاہ سے نہیں گزرے۔ لہٰذا سیاح کی وفات اور مزار کا پتہ چلانا مشکل ہے۔ اس لئے بھی کہ ممکن ہے وہ اپنے تکیہ میں دفن کیا گیا ہوتو بھی برہان پور کے لاتعداد تکیوں میں سیاح کا تکیہ کہاں واقع تھا۔

☆
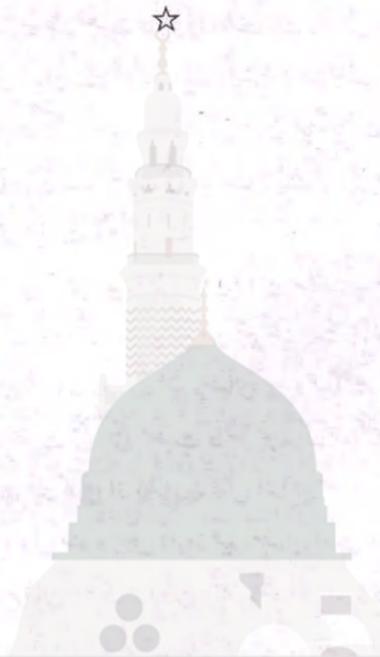
شیخ عثمان ابن احمد سندھیؒ

شیخ صاحب مسیح الاولیاء کے رفیقِ قدیم اور دور اول کے مریدین میں شامل ہیں۔ خلافت سے سرفراز تھے، اُنہوں نے فرحؔی سے یہ روایت بیان کی تھی کہ:

ایک مرتبہ خوشگوار چاندنی رات میں مسیح الاولیا تفریحاً گھر سے نکلے راوؔی۔ میاں اسحٰق کاکن اور بہاء الدین دتہ بھی ہمراہ تھے جب محلّہ خرادی بازار میں پہنچے وہاں ایک گوشہ میں چکی کے دونوں پاٹ نظر آئے، جن میں ایک ٹوٹا ہوا تھا۔ حضرت نے ٹوٹے ہوئے پتھر پر توجہ فرمائی معاً اس پتھر میں سے ذکر لا الہ الا اللہ کی آواز آنے لگی، جسے ہم علانیہ سن رہے تھے۔ میاں اسحٰق راستہ ہی سے اپنے گھر چلے گئے تھے۔ حضرت کو معلوم ہوا تو بہاء الدین دتہ کو بھیج کر اُنہیں بلایا۔ ان کا مکان وہاں سے فاصلہ پر تھا۔ پھر بھی جب وہ آئے اُس وقت تک پتھر سے ذکر جاری تھا، جس کا میاں اسحٰق نے واپس آ کر بھی ظاہری کانوں سے سنا۔

فرحؔی لکھتے ہیں کہ مدتِ مدید بعد میں نے حضرت سے اِس روایت کی تصدیق چاہی تو آپ نے فرمایا کہ تم نے یہ بات کس سے سنی ہے؟ جب میں نے شیخ عثمان کا نام لیا تو حضرت قبلہ نہایت برہم ہوئے اور فرمایا کہ یہ بے وقوف ابتدائے احوال میں اکثر میرے ساتھ رہا ہے اور اس قسم کی کئی باتیں مشاہدہ کرنے کے باوجود اپنی بدنصیبی سے منکر پایا گیا۔

فرحؔی مزید لکھتے ہیں کہ حضرت کی یہ برہمی اس وجہ سے تھی کہ لوگوں نے حضرت سے کہا تھا کہ شیخ عثمان مذکور آپ کی مریدی سے انکار کرتا اور یہ بتاتا ہے کہ میں حضرت کا پیر بھائی ہوں۔ چنانچہ جب حضرت قبلہ کو برہم دیکھا تو میں نے عرض کی کہ مجھے امید ہے کہ وہ عاجز پھر بھی آپ کے لطف و کرم سے محروم نہ رکھا جائے۔ کیونکہ خود حضور نے حضرت شاہ لشکر محمد عارفؒ کا یہ قول بیان فرمایا ہے کہ:

"اگر کوئی مرید میری مریدی سے منکر ہوجائے تب بھی روزِ قیامت میں اُس کو پاداشِ گناہ سے نجات دلاؤں گا۔"

میری اس گذارش و سفارش پر حضرت کا غصہ لطف و کرم سے مبدل ہوگیا اور فرمایا ایسا ہی ہے میری برہمی اس قسم کے لوگوں کی تربیت کے مقصد سے ہے اور بس۔ سطورِ بالا فرحی کے ان جملوں کا ترجمہ ہیں:

بعد شنیدن این نقل چوں مدتے مدید بر آمدہ بو وفقیر را یارۂ تردو در تحقیقِ آن وقوع یافتہ ازیں سبب روزے پیشِ حضرت پیر استفسار میکردم حضرت ایشاں فرمودند ایں راز از کہ شنیدہ بود۔ بعرض رسانیدم کہ از شیخ عثمان ابن احمد چوں نامِ آن مرد گفتم بہ غضب در آمدند و چہرۂ مبارک آنحضرت سرخ شدہ فرمودند کہ آں بے عقل در ابتدائے احوال اکثر اوقات ہمراہِ من بود و بسیار چیز ہا از قسم این حالت ادرا معائنہ افتادا ما از بے طالعی خود آخر منکر برآمدہ وایں غضب را سبب آن بود کہ مردم پیشِ حضرت پیر دستگیر میگفتند کہ شیخ مذکور از مریدی شما منکر شدہ خود را ہم پیرہ شما میگوید۔ القصہ چوں غصہ برآں نمودند ایں فقیر عرض نمود کہ قبلۂ عالم امید خان است کہ عاجز از احاطۂ کرم و لطف حضرت بیروں نگردو بجہت آں کہ از زبانِ مبارک حضرت شنیدہ ایم کہ بندگی حضرت جنداللہ فی الارض فرمودند کہ اگر مریدے از مریدی من منکر گردو در روزِ جزا دے را وے را برائے عصیاں گرفتہ باشد من اورا خلاص گردانم...... چوں فقیر ایں سخن گفت تمام غضب آں حضرت بلطف مبدل شد و فرمودند آرے ہمیں است کہ شما گفتید وایں غصہ من بواسطۂ تربیت ایں مردم است۔ (کشف الحقائق ص۴۶)

ان کا حال بھی فرحیؔ نے اسی قدر لکھا ہے۔ اس بیان کے علاوہ ان کا ذکر اور کہیں نگاہ سے نہیں گذرا۔ واللہ اعلم کب تک زندہ رہے اور کہاں دفن ہوئے۔

مسیح الاولیاء کے لاتعداد مریدین و خلفاء میں سے چند جن کے کچھ حالات بہم پہنچ سکے ان کے جداگانہ اذکار اس تذکرہ میں منسلک ہیں۔ لیکن وہ متعدد بزرگان کے متعلق زیادہ معلومات پر دسترس نہ ہوسکا۔ بطورِ فہرست پیش کرتا ہوں جو حسبِ ذیل ہے:

ا۔ شیخ عثمان ابنِ شیخ احمد سندھی: یہ شخص آپ کا رفیقِ قدیم اور دورِ اوّل کے مریدین میں شامل ہے۔ خلافت سے سرفراز تھا۔ معتوب بھی ہوا۔ لیکن فرحی کی سفارش سے معاف کردیا گیا تھا، اس کا مختصر ذکر شاملِ تذکرہ ہے۔

۲- حاجی اسحٰق سندھی: ان کا ذکر شیخ عثمان کی روایت میں بھی ملتا ہے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کا شمار مسیح الاولیاء کے دور اول کے مریدین میں ہے۔ نیز آپ مسیح الاولیاء کے جان نثار رفیق رہے، حتیٰ کہ جب اکبر بادشاہ ۱۰۰۹ھ میں بہ جبر مسیح الاولیاء کو آگرہ لے گیا۔ اس عالم میں آپ حضرت کے رفیق سفر رہے ہیں۔

۳- حاجی نعمت اللہ: فرحی نے ان کو کہیں لاہوری اور کہیں ساکنِ شیخوپورہ لکھا ہے۔ یہ مسیح الاولیا کے وہ خوش نصیب مرید ہیں جن کی ذات پر حضرت نے ایک سے زیادہ مرتبہ اظہارِ تفاخر کیا ہے۔ ایک مقام فرحیؔ کے الفاظ ہیں:

اگر من مرید نمی کردم دستِ من بدستِ شاہبازے مثل حاجی نعمت اللہ...... وغیر ایشاں کجا ملاقی می شد و ایشاں چساں بدامِ ارادتِ من می افتادند۔

(کشف الحقائق ص۱۹)

آپ حضرت کے درس میں شریک ہوتے تھے اور فہمیدہ نا فہمیدہ ہر قسم کے سوالات کر گذرتے تھے۔ حضرت کو اور دیگر طلباء کو شاق تو گزرتا، لیکن آپ اخلاقاً انہیں کچھ نہ کہتے۔ چنانچہ ایک روز فرحیؔ سے فرمایا کہ اگر آج مدرسہ کا وجود نہ ہوتا اور نعمۃ اللہ میرے درس میں نہ آتا تو میں مجذوب ہوجاتا۔ اصل عبارت یہ ہے:

نعمۃ اللہ لاہوری کہ پارۂ طالب علمی داشت در دریں آنحضرت حرف بسیار میکرد بعضے فہمیدہ و بعضے نا فہمیدہ و حضرت ایشان بجہت خلق اورا چیزے نمیگفتند اما مزاجِ طالب علماں وحضرت پیر دستگیر تیز می شد۔ بنا بر علیہ روزے بایں ضعیف فرمودند کہ اگر دریں روزہا بناء مدرسہ نمی گشت ونعمۃ اللہ لاہوری درو رس نمی آمد از غلبۂ حالت من مجذوب می شدم۔ (کشف الحقائق ص۵۵)

حاجی نعمت اللہ آگرہ کے نا مرغوب سفر میں بھی حضرت کے ہمراہ تھے۔ بیانہ کے صحرا میں حضرت کو گرمی کی شدت سے پیاس کا غلبہ ہوا تو حاجی موصوف نے صحرا میں جستجو کے بعد ایک تالاب دیکھا۔ چونکہ دھوپ کی تمازت سے بالائی سطح کا پانی گرم محسوس ہوا تو آپ نے معہ ملبوس غوطہ لگا کر تالاب کی تہ سے ٹھنڈے پانی کی چھاگل بھری جو حضرت نے سرِ سواری نوش کر کے بہت دعائیں دیں۔ حاجی موصوف حضرت کے وصال کے دو سال بعد تک زندہ تھے اور اپنے وطن شیخوپورہ میں موجود تھے۔ فرحیؔ اپنی سیاست کے زمانہ میں اُن کے ہاں مہمان رہ چکا ہے اور مذکورہ بالا روایات ان کی تصدیق سے درج کتاب کی ہیں۔ (ترجمہ کشف الحقائق قلمی ص۵۸)

۴- میاں عبدالکریم: حضرت شاہ عالم کے عرس کے روز میاں عبدالکریم کو شوق پیدا ہوا کہ وہاں اکثر فقرا جمع ہوں گے۔ قوالی کا خوب لطف آئے گا۔ کاش میں وہاں جا سکتا۔ حضرت پر یہ بات منکشف ہوگئی۔ حکم دیا کہ جاؤ دیکھ کر بتانا کہ عرس میں کون کون شریک ہیں۔ آپ وہاں گئے اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ جس کی صورت دیکھتے ہیں حضرت پیر دستگیر کی شکل نظر آتی ہے۔ اصل عبارت یہ ہے:

> میاں عبدالکریم مرید حضرت پیر دستگیر را روزے بخاطر رسید کہ امروز عرس حضرت شاہ عالم است اکثر فقراء در انجا حاضر باشند وسر و دہم خوب خواہد بود کا شکے من ہم آنجا میرفتم، چوں ایں خطر اور اے روے نمود حضرت ایشاں وے را فرمودند کہ برو در عرسِ شاہ عالم دیدہ بیا کہ کدام کدام مردم در انجا حاضر شدہ اند چوں او آنجا رفت دہر شخص را کہ نگاہ میکرد وصورت حضرت مشاہدہ می نمود۔

(کشف الحقائق قلمی ص ۳۰)

۵- شیخ حسن: حضرت کا یہ مرید حُسنِ اعتقاد اور جمعیت قلب کے اوصاف سے اس قدر آراستہ تھا کہ حضرت نماز میں امامت کرتے اور وہ بعد میں آکر شریکِ جماعت ہوجاتا۔ اُس کی جمعیتِ خاطر کا اثر آپ کے باطن پر طاری ہوجاتا تھا اور آپ کو اس کا آنا محسوس ہوجاتا تھا۔ فرحی کے الفاظ یہ ہیں:

> مریدے داشتم حسن نام کہ اعتقاد و اخلاص و جمعیت و حلاوت بروجہ کمال داشت و ہرگاہ کہ من امامت میکردم واواز عقب آمدہ اقتدامی نمود اثر جمعیت او در باطنِ من ظاہر می شدو دانستم کہ حسن آمد۔ (کشف الحقائق ص ۲۹)

۶- سید یتیم اللہ: برعکسِ سابق الذکر شیخ حسن کے سید یتیم اللہ کی قربت سے مسیح الاولیاء کو تفرقۂ باطن کا سامنا ہوجاتا تھا۔ ملفوظات میں یہ عبارت ملتی ہے:

> شخصے بود سید یتیم اللہ نام پیش من مرآۃ العارفین شروع کردہ بود ہرگاہ کہ وے را سبق میگفتم چناں تفرقہ در باطنِ من مستولی می شد کہ اصلا درنمی یافتم کہ دل در پہلوے چپ است یا راست۔ (کشف الحقائص ص ۲۹)

۷- مُلا ابوالخیر: آپ صاحبِ علم وفضل تھے اور اپنے علمی تبحر پر نازاں بھی۔ مسیح الاولیا سے عقیدت ضرور رکھتے تھے مگر مرید نہیں ہوئے۔ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے۔ ایک مرتبہ سبحانی وما اعظم شانی کا مسئلہ پیش تھا مسیح الاولیا نے اس کو ایسے دل نشین طریقہ سے حل کیا کہ

حاضرین احسنت و مرحبا کہہ اُٹھے۔ ملا ابوالخیر بھی موجود تھے، فرمایا کہ یہ مسئلہ اکثر بزرگوں سے دریافت کیا گیا، لیکن ایسا حل کسی نے بیان نہیں کیا اور وہ مرید ہوگئے۔

چوں حضرت پیر و دستگیر این را بیان فرمودند۔ ملا ابوالخیر را اعتقاد بر حضرتِ ارشاد پناہی غالب شد۔ مرید گشت و میگفت کہ در ولایت پیش اکثر اعزا بردہ بودند اما ہیچکس اینچنیں معنی نہ گفت (کشف الحقائق ص ۱۳)

۸- شیخ محمد صدیق کابلی: آپ شیخ بادشاہ کے فرزند تھے جو کابل کے مقتدائے عصر تھے۔ والد کی موجودگی میں محض مسیح الاولیاء کی خدمت و ملازمت کے امادہ سے برہان پور آئے اور بیعت سے شرفیاب ہوکر واپس کابل چلے گئے۔ کچھ عرصہ بعد پھر برہان پور میں حاضر خدمت اور شریک درس ہوئے۔ حضرت نے انہیں عین المعانی کا درس شروع کرادیا۔ اس زمانہ میں مدرسہ کلاں کا تعمیر کا کام جاری تھا۔ آپ خود بھی کاریگروں کو چونہ کی تغاریاں (آہنی ٹوکریاں) دینے میں شریک فرماتے۔ نیز دیگر شاگرد و مریدین بھی۔ محمد صدیق مذکور بھی یہ کام بڑی خوشی اور سرگرمی سے انجام دیتے تھے۔ (ترجمہ کشف الحقائق ص ۱۷)

۹- شیخ مجتبیٰ: آپ مسیح الاولیاء کے درس میں رسالہ اورادِ صوفیہ وردِ سیفی کا سبق پڑھتے ہوئے ملتے ہیں۔ فرحیؔ نے ایک طولانی عبارت کے سلسلہ میں لکھا ہے:

حضرت سلامت بعدہ بہ صاحب سبق سیفی میاں شیخ مجتبیٰ را فرمودند کہ پیشتر بخوانید (کشف الحقائق ص ۴۴)

۱۰- بہاء الدین دتہ: ان کا نام صرف شیخ عثمان سندھی کی روایت میں ملتا ہے کہ آپ مسیح الاولیا کے ہمراہ شب ماہ میں سیر کو گئے اور بازار خرادیاں میں سنگ آسیا کو حضرت کی توجہ سے ذکر کرتے ہوئے سنا تھا اور میاں اسحٰق کو بلانے کے لئے بھیجے گئے تھے۔ اصل عبارت شیخ عثمان کے ذکر میں پیش کی جاچکی ہے۔ لہٰذا یہاں اعادہ غیر ضروری ہے۔

۱۱- میران عبدالرحمٰن: فرحیؔ نے ان کی بیان کی ہوئی ایک نقل کا ذکر لکھتے ہوئے ان کا نام نہایت شائستہ القاب و خطاب سے لکھا ہے۔ اس سے پایا جاتا ہے کہ آپ مسیح الاولیاء کے روحانی خلوت کدہ تک رسائی رکھتے تھے اور یہ شرف پیر کی نگاہ میں عزیز و مقبول ہونے کی دلیل ہے۔ فرحیؔ لکھتے ہیں کہ:

اے عزیز سید السادات میران عبدالرحمٰن کہ صاحبِ تجرید و تفرید و شہسوار میدان فقر و توحید بودند و مرید حضرت پیر دستگیر بودند روزے پیش ایں ضعیف از حضرتِ مسیح الاولیا شنیدہ نقل میکردند۔ (کشف الحقائق ص ۳۵)

(۱۲) شیخ محمود
(۱۳) سید یعقوب
(۱۴) عبدالقادر بن خلیل

یہ تینوں آپ کے برگزیدہ خلفاء تھے۔ مسیح الاولیاء نے ایک روحانی مسرت کے موقعہ پر انہیں یاد فرمایا جب کہ یہ لوگ حضرت کی اجازت سے ادائے فریضۂ حج کے لئے حجاز مقدس گئے ہوئے تھے۔ فرحی کے الفاظ یہ ہیں:

پس گفتند آن طفلا نے کہ بزیارتِ کعبہ رفتہ اند کجا اند تا ذوق امروزہ عیسیٰ را مشاہدہ میکردند۔ و آن طفلاں اشارت بہ شیخ محمود و سید یعقوب و عبدالقادر بن خلیل کروند کہ اینہا خلفاے برگزیدہ حضرت ایشان بودند و دراں سال اجازت گرفتہ بقصد حج رفتہ بودند۔ (کشف الحقائق ص۳۲)

۱۵- نور الایمان: ان کا ذکر حضرت مسیح الاولیاء کے تذکرے میں مذکور ہو چکا ہے۔ یہ وہی فنا فی الشیخ مرید ہیں جنہیں ایک مرتبہ حضرت نے سراویل (خلعت خاص) عطا فرمائی۔ کچھ عرصہ بعد وہ عطیہ کسی نے طلب کیا۔ آپ چونکہ ہر پیکر میں پیر کو ہی جلوہ گر پاتے تھے، یہی سمجھ کر کہ حضرت طلب کر رہے ہیں بے تامل دے دیا۔ مولانا سید عبدالحی لکھتے ہیں:

چوں این خبر بہ عین العرفاء سید اورا طلب داشتہ فرمودند فلانے مشائخ کبار سراویل بمریداں و ستر شداں نمی دادند من ترا از راہ لطف و کرم دارم چرا بمردم سراویل میدہی چون چشم بشہود وجود حق داشت جواب داد کہ جبا خود می دہند و خود می طلبند چگونہ نہ دہم وابانمایم، خوشوقت شدند و ثنا بر و گفتند

(روائح الانفاس قلمی ص۱۲۱)

۱۶- مُلا یوسف: آپ مسیح الاولیاء کے مرید اور شاگرد بھی تھے۔ آپ کی خدمت میں تبحر علمی بہم پہنچایا تھا۔ علمِ فقہ اور تصوف میں بھی دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ مدرسہ میں مسیح الاولیا آپ سے لائقہ خدمات انجام دلاتے تھے۔ چنانچہ مُلا صاحب فرحی کی نشان دہی کے مطابق لوائح جامی کا درس دیتے ہوئے ملتے ہیں۔ اس مقام کی اصل عبارت یہ ہے:

روزے ایں ضعیف در اوائلِ احوال پیش مُلّا یوسف کہ شاگرد و مرید حضرت پیر دستگیر و فضیلت مآب خصوصاً در علمِ فقہ و در علم حقائق بسیار مہارتے واشتند رفتہ بنشست و در آن زمان پیش ایشان شخصے لوائح شروح کردہ بود۔

(کشف الحقائق ص۴۱)

۱۷- سید چاند: مسیح الاولیاء کے صاحبِ کرامت مرید تھے۔ فیض رساں مرشد نے آپ کو بھی صاحبِ فیض بنادیا تھا۔ فی زمانہ بھی آپ کے مزار سے چشمۂ فیض و برکات جاری ہے۔ آپ کا مزار بُرہانپور سے چار پانچ میل دور ویرانہ مقام پر واقع ہے اور لوگوں کو کچے راستے سے بدشواری وہاں تک پہنچنا ہوتا ہے۔ پھر بھی کوئی دن خالی نہیں جاتا کہ وہاں مرادیں مانگنے اور نذر و نیاز ماننے والوں کا ہجوم نہ ہوتا ہو۔ عرفِ عام میں لوگ اس مقام کو شیخ چاند ولی کی درگاہ کہتے ہیں اور نہ صرف مسلم بلکہ نواحی دیہات کے غیر مسلم بھی اسی عقیدت سے حاضر ہوتے ہیں۔ مسیح الاولیا کا مرید ہونے کی صراحت اِن الفاظ میں ملتی ہے:

روزے حضرت مسیح الاولیاء بہ سید چاند کہ یکے از مریدانِ قدیمی آن حضرت بود فرمودند بملاقاتِ ہر درویشی کہ بروید اول صورت پیر خود حاضر دارید پس بدو ملاقی شوید۔ (روائح الانفاس قلمی ص ۲۵)

۱۸- خواجہ محمد فاضل: مسیح الاولیاء کے حاضر باش خادم اور قدیم مریدین میں شامل ہیں۔ صاحبِ جذب و اثر تھے' مولوی بشیر الدین برہان پوری نے علم اللہ کمال کے ملفوظات کے حوالہ سے لکھا ہے کہ شیخ برہان الدین راز الٰہی چلّہ کی تیرہویں شب برات کے آخری حصہ میں عجیب و غریب مشاہدوں کے باعث آپ پر ایک جذبہ عظیم طاری ہوا اور آپ نے ننگے سر ننگے پیر اور ننگے بدن حجرہ سے نکل کر صحرا کا رخ کیا۔ اسی وقت حضرت مسیح الاولیاء خلافِ عادت حرم سے باہر آئے اور مریدوں کو آپ کی تلاش کے لئے ہر طرف دوڑایا۔ حضرت مسیح الاولیاء کے خلیفہ خواجہ محمد افضل کو (یہاں سہو نظر یا سہو کتابت ہے۔ محمد فاضل ہونا چاہئے- راشد) بازار کے راستے پر مزار کے قریب مل گئے۔ انہوں نے آپ کو اپنی چادر اڑھادی اس سے آپ کے جذبہ میں کمی ہوگئی اور خواجہ موصوف آپ کو خانقاہ میں لائے۔ (معارف ص ۵ جلد ۶۷)

انہیں محمد فاضل کا ایک مرتبہ بے موقعہ سلام حضرت کی بد مزگی کا باعث ہوا تھا۔ مسیح الاولیاء نے افطار کے بعد کھانا کھایا، پھر فالودہ کی پیالی پیش ہوئی۔ آپ چمچہ لے کر نوش کرنا ہی چاہتے تھے کہ فاضل نے سلام علیکم کہا، یہ آواز سنتے ہی آپ کا اتفراق ختم ہوگیا۔ چمچہ ہاتھ سے گر گیا اور آپ اُٹھ کر مکان میں چلے گئے اور شیخ عبدالستار سے کہا کہ اس بھلے آدمی نے کس وقت سلام کیا کہ مجھے تکلیف پہنچ گئی۔ روائح میں اس طرح مذکور ہے:

روزے مسیح الاولیا روزہ افطار کردہ بخوروں طعام مشغول شدند بعد از فراغِ طعام فالودہ آوردند قاشقی ازان برداشتہ بدہن رسانیدند و باستغراق افتند۔ مریدے محمد

فاضل نام برخاستہ بآواز بلند سلام علیکم گفت۔ بمجر و استماع قاشق از دست انداختہ متوجہ خانہ شدند چوں اندرونِ محل تشریف بردند بمیاں عبدالستار کہ پسر کلاں آں حضرت بود فرمودند کدام وقت سلام کرد کہ حالت مراوقت۔ سانید

(روائح الانفاس قلمی ص۲۰۶)

۱۹- شیخ نظام

۲۰- میر کلال

۲۱- عبدالسمیع قاضی زادہ

ان تین بزرگوں کے علاوہ فرحیؔ نے عبدالرحمٰن اور شیخ رکن کے بھی نام لکھے ہیں کہ یہ پانچوں حضرات مسیح الاولیاء کی توجہ سے مجذوب ہوگئے تھے۔ پھر آپ ہی کی توجہ سے کمال شعور و ہوش سے بہرہ ور ہوئے۔ قاضی زادہ ہفتہ میں ایک مرتبہ ہوش میں آتا تھا بقیہ چار شخص دیگر مقررہ دنوں میں، قاضی زادہ کے دو برادر بزرگ تھے انہوں نے بڑی منت و عاجزی سے اپنے بھائی کے باہوش ہوجانے کے لئے عرض کی۔ حضرت نے سمجھایا بھی کہ اس کیفیت میں اس کو وہ عالم میسر ہے جس کی تمنا میں اکثر مشائخ جان سے گئے لیکن تمنا پوری نہ ہوئی۔ لیکن ان کا اصرار دیکھ کر توجہ فرمائی اور اس کا جذب ختم ہوگیا۔ اصل عبارت یہ ہے:

اے عزیز در حضور این فقیر بتوجہ حضرت ارشاد پناہی پنج درویش مجذوب ولا یفعل شدند وباز بتوجہ حضرت ایشان کمالِ شعور یانتند یکے ازاں فقراں عبدالرحمٰن دوم شیخ نظام۔ سویم شیخ رکن چہارم میر کلال۔ پنجم عبدالسیع قاضی زادہ ماوراء النہر ازانجملہ چہارکس اول را ایام معین فرمودند آخر الامر ہر یکے ازیںہا بہماں ایام ہشیاری گشت و برائے قاضی زادہ در یک ہفتہ ہر دو براد کلانش الحاح وزاری پیش حضرت پیر دستگیر نمودہ و عرض میکردند کہ حضرتِ سلامت چناں توجہ کنید کہ برادر ماکمال شعور یافتہ بحال خود آید۔ حضرت فرمودند کہ کیفیتے کہ این را رونمودہ است بسیار مشائخ بآرزد مردہ اند۔ شما چرا راہ این میزنید۔ تامدتے صبر کنید بعدہ ہشیار خواہد شد ہر دو برادرش تجرد بیدلی نمودند پس حضرت مرشد خاص و عام عبدالسمیع را طلبیدہ باندک توجہ اورا ہوشیار کردند۔ (کشف الحقائق ص۵۲)

۲۲- عبدالرحیم میلاد خواں: حضرت کا یدید خوش گلوئی کی نعمت سے بہرہ یاب تھا۔ عربی و فارسی نعتیں اس قدر خوش الحانی سے پڑھتا تھا کہ مجلس کے جملہ حاضرین وجد میں آجاتے تھے۔

آپ کو اس کی نعت خوانی بہت مرغوب تھی۔ اپنے مرشد کے عرس اور دیگر مخصوص سماع کی مجلسوں میں عبدالرحیم کی موجودگی ضروری بلکہ لازمی ہوتی تھی۔ فرحی نے حضرت شاہ لشکر محمد عارفؒ کے عرس کا چشمدید حال قلم بند کرتے ہوئے لکھا ہے:

> بطرف مقبرہ حضرت پیر دستگیر خود بدیں طریق می رفتند کہ از حویلی حضرت ایشان بر آمدہ عصائے مبارکہ زینہ نخ مبارک خود ایستادہ می شدند دیک قصیدہ تمام عبدالرحیم مولود خوان کہ مقبول ومنظور و مرید پیر دستگیر است میخواند بعدۂ ازانجا نہ دہ قدم پیش رفتہ ایستادہ می گشتند و باز عبدالرحیم یک قصیدہ در انجام نیز تمام میخواند بر ایں نط تا مقبرہ حضرت پیر خود بوقت صبح بہ تمام قوم میر سیدند۔

(کشف الحقائق ص ۵۹)

۲۳- شیخ رکن: آپ مسیح الاولیاء کے قدیم رفقائے جان نثار اور دور اول کے مرید ہیں۔ آپ حضرتؒ کی توجہ سے مجذوب ہوگئے تھے۔ پھر حضور ہی کی توجہ سے اپنے حال پر آ گئے۔ فرحی کی اصل عبارت اسی فہرست کے کسی نمبر میں نقل کی جاچکی ہے۔ سنہ ۱۰۰۸ھ میں اکبر بادشاہ قلعۂ آسیر کی تسخیر میں ناکامی کے باعث جھنجھلایا ہوا تھا اور برہان پور کے مشائخ سے بدظن تھا۔ شیخ رکن چند رفقاء کے ساتھ شب ماہ کی سیر کو گئے تھے، اُنہوں نے چوک بازار میں یہ چرچا سنا تھا کہ بادشاہ مسیح الاولیاء سے صاف نہیں ہے۔ فرحی نے جو ہمراہ تھا اپنا خیال ظاہر کیا کہ جب بادشاہ حضرت سے منزلت کے ساتھ پیش نہیں آتا تو حضور مکہ معظمہ یا اور کہیں کیوں نہیں چلے جاتے۔ یہاں خطرات کی زد میں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ اصل عبارت یہ ہے:

> یک مرتبہ در افواہ مردم افتادہ بود کہ حاکم شہر برہان پور بحضرتِ مسیح الاولیا از تہ دل خوب نیست درین اثنا شبے فقیر (فرحی) شیخ نصر اللہ و شیخ رکن درمیان چہار سوے برہان پور برائے دیدن مہتابی سیر کردہ بودم در آنجا فقیر بہ یاران گفت کہ چوں حاکم شہر قدر حضرت مسیح زمان نمی کند اگر حضرت ایشان در مکہ یا در ولایت رفتہ اقامت کنند۔ اینجا کہ می باشند خوب نمی کنند۔ (کشف الحقائق ص ۴۹)

۲۴- شیخ قاسم: یہ نوجوان نواحِ برہان پور کے کسی گاؤں کا باشندہ تھا۔ مسافرانہ وارد ہوا۔ حضرت مسجد میں تشریف فرما تھے۔ قاسم وہیں حاضر ہوا۔ اپنا عصا نعلین اور کوزۂ گلی محراب میں رکھ کر قدم بوس ہوا۔ بغل میں ایک کتاب تھی مگر حضرت کے دریافت کرنے پر بتایا کہ انیس الغربا ہے میں پڑھنا چاہتا ہوں۔ حضرت نے شروع کرادی۔ اسی اثنا میں حضرت نے بابا فتح محمد سے کہا کہ اب تک معلوم نہ تھا کہ انیس الغربا ایسی معارف نما کتاب ہے۔ چونکہ یہ کتاب بارہا زیر درس آئی تھی۔ حضرت نے

ایسا خیال کبھی ظاہر نہیں فرمایا۔ ماحصل یہ ہے کہ چند روزہ تعلیم اور حضوری نے قاسم مذکورہ کچھ کا کچھ بنادیا۔ اس کی روحانی ترقی کا راز لوگوں پر اس وقت کھلا، جب حضرت کے کسی مرید نے قاسم کے گاؤں میں اُس کا پتہ معلوم کیا تو لوگوں نے بتایا کہ جو قاسم یہاں سے گیا تھا وہ واپس نہیں آیا۔ جو شخص واپس آیا ہے وہ قاسم نہیں بلکہ کوئی اور ہے۔ آخری ٹکڑے کے اصل الفاظ یہ ہیں:

روزے مریدے از مریدانِ حضرت مسیح الاولیا را بردیہے کہ مسکن قاسم بود گذر افتاد۔ از قبائل اوپرسید کہ قاسم چہ تربیت یافتہ و بہ کدام حال شتافتہ۔ ہمہ گفتند قاسمی کہ از ینجا رفتہ بود باز نیامد واین کہ باز آمدہ آن نیست۔ (روائح الانفاس قلمی ص ۳۴)

۲۵- حاجی پایندہ: ان کا نام پایندہ خان مغل بھی دیکھنے میں آیا ہے۔ حضرت مسیح الاولیاء کے مرید تھے ان کے حسنِ اعتقاد کا یہ عالم تھا کہ حضرت کے ارشادات تو بڑی چیز ہیں چشم و آبرو کے اشارے کے وابستہ و پابند رہتے تھے۔ ایک مرتبہ صحنِ مسجد کا حوض صاف کیا جارہا تھا۔ خدام و مریدین گدلا پانی اور کیچڑ حوض سے نکال کر پھینک رہے تھے کہ حاجی پایندہ اچھا لباس پہنے ہوئے نمودار ہوئے قریب آنے پر حضرت نے فرمایا۔ انہیں سنبھالنا بہہ معہ قبا و عمامہ حوض میں نہ گر جائیں۔ ان الفاظ کے ادا ہوتے ہی موصوف معہ لباسِ فاخرہ حوض میں گر کر کیچڑ پانی سے شرابور ہوگئے۔ راوی کی اصل عبارت یہ ہے:

روزے عین العرفا لب حوضِ مسجد نشستہ بودند و یاراں گل دلائے ازاں بر میداشتند جوانے پایندہ نام از در در آمد ہمیں کہ نظر مبارک آنحضرت بروے افتاد فرمودند ہاں یاراں بگیرید ایں جوان را کہ بقبا و دستار خود راور حوض خواہد انداخت اُن سعادتمند چوں این حرف شگرف شنید فی الحال در حوض افتاد۔ یاران شرح ملا کہ دربغل داشت فرا گرفتند۔ (روائح الانفاس ص ۲۹)

حاجی صاحب وہی شخص ہیں جن کے ہمراہ میر محمد معذور ہاتھ والا مسیح الاولیاء کی خدمت میں آکر بیک توجہ اپنی دیرینہ مزوری سے نجات پاکر خانقاہ میں مقیم ہوگیا تھا۔

۲۶- ملا حبیب کشمیری: آپ کشمیر سے آکر مسیح الاولیا کے مرید ہوئے۔ حضرت سے اس قدر محبت رکھتے تھے کہ قدموں سے جدا ہونا گوارا نہ کرسکتے تھے۔ اپنے لئے کسی اور جگہ مسکن کا انتظام کرلیا اور یہیں رہنے لگے۔

ایک مرتبہ مسیح الاولیاء کی چند اہم کتابیں جو شیخ عبدالستار کے مطالعہ میں تھیں ان کے حجرہ سے چوری ہوگئیں۔ اتفاق سے چوری کرنے والے وہ کتابیں فروخت کرنے کے لئے حبیب کشمیری کے

پاس لائے اور اس قدر احمقانہ انداز سے قیمتیں بتائیں کہ انہیں کتب کے مسروقہ ہونے کا شک ہوگیا۔ غور سے دیکھا تو ہر کتاب پر مسیح الاولیا کی مُہر اور کتابت موجود تھی۔ جب یہ یقین ہوگیا کہ مسروقہ کتب حضرت کی ہیں تو آپ نے اپنے آدمیوں کے ہمراہ چوروں کو معہ کتب آپ کی خدمت میں بھیج دیا۔

جب آپ کی تعلیم و تلقین کا کام تکمیل کو پہنچ گیا تو حضرت نے وطن جانے کی اجازت دے دی۔ وہ جانے پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔ حضرت نے فرمایا جب تم میری حضوری کا تصور کرو گے میری انگشتری اپنی انگلی میں دیکھو گے۔ فرحی نے اس سلسلہ میں طولانی عبارت لکھی ہے جس کا ابتدائی ٹکڑا یہ ہے:

حبیب کشمیری را کہ مرید حضرتِ ارشاد پناہی بود وقت رخصت میفر مودند کہ وقتیکہ باحضارِ صورتِ من مشغول میکشتی انگشتری مراہم در انگشت خود میدیدی۔

(کشف ص ۵۰)

۲۷- مرزا فتح پوری ابن میرزا شاہ رخ:

یہ امیر زادہ حضرت کا مرید تھا۔ خدا طلبی کے ساتھ جام دنیا کا بھی دلدادہ تھا۔ ایک روز حضرت سے التماس کیا کہ حضور دعا فرمائیں۔ شہر مند سور میری جاگیر میں ہوجائے۔ مسیح الاولیاء نے فرحی سے کہا کہ تم ان کی مقصد برآری کے لئے توجہ کرو۔ بہرحال میرزا کا یہ مدعا پورا ہوگیا۔ فرحی لکھتے ہیں:

اے عزیز مرزا فتح پوری پسر میرزا شہرخ کہ مرید حضرت پیر دستگیر بحضرت ایشان عرض می نمود کہ امید گاہا در حق من توجہ فرمایند کہ شہر مند سور در جاگیر من باشد حضرت ظل اللہ بدہند۔ پس روزے بایں ضعیف فرمودند کہ او برائے حصولِ این مطلب بمن چند مرتبہ گفتہ است شما در حق دے بجہت مطلبش توجہ بکار برید تا آن مشہر در جاگیرش گردو۔ (کشف ص ۵۶)

۲۸- شیخ نصر اللہ:

یہ سعادت سرشت نوجوان آغازِ شباب میں ہی مسیح الاولیا کا مرید ہوا اور باوجود شغل تجارت کے خانقاہ نشینوں میں شامل ہوگیا۔ یہاں فرحی سے میل جول ہوا اور دونوں میں گہرے مخلصانہ تعلقات ہوگئے۔ فرحی ان کو اپنی روحانی ترقیوں کے راز بھی بتادیا کرتا تھا۔ مسیح الاولیا بھی شیخ سے بہ محبت و توجہ پیش آتے تھے۔ یہاں تک کہ توحیدِ حقیقی کی تعلیم کا کام جو باقی رہ گیا تھا، اس کو آخر وقت میں تکمیل کو پہنچایا۔ عین عنفوانِ شباب میں ان کی وفات ہوئی۔ مسیح الاولیاء نے نماز جنازہ پڑھائی اور تمام مریدین کے ہمراہ جنازہ کے ساتھ جاکر دفن میں شرکت کی۔ فرحی کی اصل عبارت کا ضروری حصہ یہ ہے:

اے عزیز میان نصر اللہ کہ پیشۂ تجارت در عین جوانی گذاشتہ و کدخدا نہ شدہ و مرید حضرت پیر دستگیر شاہ۔ در خانقاہِ حضرت ایشان زاویۂ اختیار نمودہ بماند۔ بعد

از یک چند سلوک منزل معرفت و وقوفِ مقاماتِ حقیقت بوجہ احسن اورا دست داده اما وقتِ توحید حقیقی رونہ نموده بود کہ ناگاه از مشیت جل وعلا در عین جوانی از دارِ فانی در دارِ باقی رحلت نمود......

پس بر جنازہ آن سعادتمند حضرت مسیح منقبت نماز خوانده و همراه تمام درویشان رفتہ مدفون ساختند...... (کشف الحقائق ص ۴۷)

۲۹- سید مرتضیٰ: یہ مسیح الاولیاء قدس سرہٗ کے مرید اور صاحبِ حال شخص تھے۔ عالم وجہ میں آپ کی عجیب کیفیت ہوتی تھی کہ تمام اثراتِ بشریت سے بیگانہ ہوجاتے تھے۔ ایک مرتبہ ایسی ہی حالت میں آپ کو خیال گذرا کہ مشائخ کا قول ہے کہ حالتِ فنا و بیخودی میں صاحبِ حال پر کسی چیز کا اثر نہیں ہوتا۔ امتحاناً آپ نے کھولتے ہوئے روغن کے کڑھاؤ میں ہاتھ ڈال دیا۔ آپ کی انگلیوں پر آبلے پڑنا تو درکنار سوزش بھی محسوس نہ ہوئی۔ اسی پر ثابت ہوتا ہے کہ مجذوبوں کو گرمی سردی کسی چیز سے کوئی مضرت نہیں پہنچ سکتی یہ چیز آج بھی اظہر من الشمس ہے ہر شخص کھلی آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ مجذوب گرمی، سردی، بارش میں بے تکلف کسی بچاؤ کے سامان کے بغیر بسر کرتے ہیں اور انہیں کسی چیز کی شدت سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ اس عبارت کو مؤلف کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے:

روزے سید مرتضیٰ کہ از یارانِ حضرت عین العرفا مسیح الاولیاء را حالتِ فنا و بیخودی دست داد۔ درآن وقت بخاطر رسید کہ اندر اقوال مشائخ است کہ در حالت فنا و بیخودی اثر ہیچ شے موثر نمی شود بہر امتحان انگشت ورکز غال پر ازروغن گرم انداخت ہیچ آسیب واثر گرمی بہ انگشت نہ رسید و سوختہ نہ شد۔ مجذوبان را کہ از گرما و سرما و باراں مضرتے نمی رسد بہر ہمیں است۔ (روائح الانفاس ص ۳۸۰)

۳۰- شیخ حسن جیو سُورتی: آپ سید محمد عیدروس قدس سرہٗ کے مرید وخلیفہ تھے حج کعبہ سے شرفیاب ہوکر سورت واپس پہنچے تو آپ کے مرشد نے آپ کو حضرت مسیح الاولیاء کی خدمت میں روانہ کردیا کہ تمہارا نعمتِ شطاریہ کا حصہ وہاں سے ملے گا۔ سید حسن برہان پور آنے اور مسیح الاولیا سے شرف دست برسی خاص کر کے فیض ارادت شطاریہ بکمال ریاضت و ارادت اخذ کیا۔ چند سال خدمت میں رہ کر مسیح الاولیاء کی اجازت سے پھر حج کو روانہ ہوئے اور حضرت شیخ محمد بن فضل اللہ سے مکہ معظمہ میں بھی اکتسابِ فیض کیا۔ فنا فی الشیخ کے مقام کو پہنچے ہوئے تھے۔ علمِ سلوک میں آپ کے کئی رسالے مشہور ہیں۔ ۱۰۶۰ھ میں وصال ہوا۔ مزار سورت میں ہے۔ (برکات الاولیا اردو ص ۱۵۱ بحوالہ سیر الاولیاء)

خاتمہ

الحمدللہ والمنۃ تذکرہ اولیائے سندھ اختتام کو پہنچا اور میں اس سلسلہ میں اپنی آج تک کی تلاش و جستجو کے نتائج سپرد قلم کرکے اس کارِ اہم کی تکمیل سے فارغ ہوگیا۔

علما و صوفیائے سلف کے مصدقہ حالات کی فراہمی میں جو دشواریاں لاحق ہیں، اس کو کچھ وہی سمجھ سکتے ہیں جنہوں نے اس وادی دشوار گزار میں جادہ پیمائی کی ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ تاریخی کتب میں سلاطین، امرا و اہلِ سیف کے حالات تو بڑی صراحت و تفصیل سے ملتے ہیں۔ لیکن ان ضخیم دفاتر میں مشائخ، علماء اور صوفیائے اہل اللہ و گوشہ نشین فقراء کے حالات نہیں ملتے۔ اور کسی تاریخی کتاب میں اہل اللہ کے کچھ اذکار ملتے ہیں بھی تو وہ الشاذ کالمعدوم کے بمصداق نہ ہونے کے برابر۔ یعنی کسی دور کے صدہا بزرگوں میں سے ایک دو کے مختصر اور یکسر تشنہ حالات ملیں گے اور بس۔

اہل نظر ارباب ذوق بیک نگاہ اندازہ کرسکیں گے کہ میں نے اس تذکرہ کی تیاری میں اپنی استعداد اور صلاحیتوں کی حد تک تلاش و جستجو کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور مجھے اطمینان ہے کہ میری محنت شاقہ رائگاں نہ گئی۔ تائید الٰہی اور انہیں بزرگان کرام کی ارواح طیبات کے فیوض و برکات سے ایسے گوہر نمایہ اور ایسے متاع گم شدہ سے اور اوراق کا دامن مالا مال ہوگیا، جن کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔

تاہم اس کارگذاری میں اگر فخر و مباہات کا کوئی پہلو نکلتا ہے تو یہ افتخار میرا نہیں۔ میرے عزیز و محبوب وطن برہان پور کا حصہ ہے کہ اس اولیا خیز شہر کی خاک پاک نے معارف دستگاہ اہل اللہ کے فیضان و اثر کی برکت سے مجھ ہمچنداں کو یہ استعداد و صلاحیت ودیعت فرمائی کہ برہان پور کو وطن ثانی بنانے والے قدسی نفس سندھی اسلاف کے اذکار و مآثر کا تحفہ اُن کے نامور اخلاف کو خود سندھ میں حاضر ہوکر پیش کرسکا۔

البتہ اس میں کچھ اسقام اور نقائص پائے جاتے ہیں تو وہ بلاشبہ میرے ہیں۔ مجھے اپنی کوتاہیوں کے اعتراف میں کوئی جھجک نہیں۔ اہلِ مطالعہ عفو و کرم سے کام لے کر مجھے آگاہ فرمائیں تو ممنون ہوں گا۔

آخر میں ان محترم حضرات کا شکریہ ادا کرنا واجب بلکہ فرضِ عین سمجھتا ہوں کہ جن کے تعاون سے اس تذکرہ میں کافی مدد ملی ہے۔

کفران نعمت ہوگا اگر میں جناب پیر سید حسام الدین راشدی صاحب کا شکریہ ادا نہ کروں (جن کو مورخ اسلام علامہ سید سلیمان ندوی "محقق سندھ" لکھتے رہے ہیں) کہ انہیں کے مخلصانہ اصرار اور حوصلہ افزا تعاون سے میں انتہائی خراب صحت اور صبر آزما ناسازگار حالات میں اس تذکرہ کو مکمل کر سکا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر موصوف کی کرم فرمائیاں شریک حال نہ ہوتیں تو مذکورہ ناموافق ماحول میں کسی علمی خدمت کا تصور کرنا بھی میرے امکان سے باہر تھا۔ موصوف نے اپنے ذاتی کتب خانے سے معاونی کتب عطا فرمائیں۔ ترتیب و تدوین میں گرانقدر مشورے دیئے اور سب سے بڑی بات یہ کہ محبت و اشتیاق آمیز تقاضوں سے مجھے لکھنے پر متوجہ اور حوصلہ افزائی فرماتے رہے۔ چنانچہ مجھے اعتراف کرتے ہوئے فخر محسوس ہوتا ہے کہ یہ جو کچھ ہے اس کی بنیاد اور فراہمی حالات وغیرہ جناب پیر صاحب کے مخلصانہ تقاضوں کے نتائج ہیں۔ اس کی جزائے خیر تو جنابِ صمدیت سے ملے گی ہی۔ موصوف میری جانب سے بصمیمِ قلب شکریہ قبول فرمائیں۔

اسی طرح جناب پیرزادہ سید ریاض الدین مغفور رحمۃ اللہ علیہ سابق سجادہ نشین حضرت شیخ برہان الدین راز الٰہی قدس سرہٗ جو بڑے صاحبِ ذوق بزرگ اور اپنی حیرت انگیز یادداشتوں کے اعتبار سے مشائخ برہان پور کی زندہ و مستند تاریخ تھے، ان سے نہایت بیش بہا معلومات بہم پہنچیں۔ نیز ان کے ذخیرۂ اسناد سے متعدد اسرارِ سربستہ کے انکشافات و تصدیق ہوسکی بہ کمال ممنونیت وارادت دعا کی صورت میں نذرِ عقیدت پیش کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی روحِ گرامی کو جنت الفردوس میں ممتاز مقام عطا فرمائے۔

اور ان کے جانشین خلف الرشید جناب پیرزادہ سید اکرام الدین صاحب سجادۂ حال اور جناب پیرزادہ سید حبیب الدین صاحب کا بھی شکرگذار ہوں کہ ان حضرات کی عنایت و اعانت سے حضرت بابا فتح محمد محدث قدس سرہٗ کے تقسیم نامہ کی سند کا فوٹو اور حضرت رازِ الٰہی قدس سرہٗ کے مقبرہ کی تعمیر کے متعلق تفصیلی معلومات بہم پہنچیں۔

میرے محترم حضرت حکیم لاڈلے صاحب سجادہ نشین درگاہ حضرت مسیح الاولیاء قدس سرہٗ بھی بجا طور پر شکریہ کے مستحق ہیں کہ اُنہوں نے شجرۂ خاندان، شاہی اسناد، بزرگانِ سندھ کے قدیم واہم خطوط و دیگر ضمنی معلومات عطا فرمائیں۔

میں اپنے جوان سال و جواں اقبال عزیز شاگرد مخدوم صاحب جابر برہانی کا ممنوں ہوں کہ اُنھوں نے گونا گوں مصروفیتوں کے باوجود بصرفِ کثیر متعلق تذکرہ مقابر، مساجد وغیرہ کے تاریخی تازہ فوٹو حسبِ ہدایت ارسال کئے بلکہ میری فرمائش کی تعمیل کے سلسلہ میں اپنے قیمتی کیمرہ سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ نیز میرے مخلص و جاں نثار شاگرد جناب ارمان صاحب کا بھی شکر گذار ہوں کہ اُنھوں نے بھی جابر صاحب کی رفاقت میں بسلسلہ حصولِ تصاویر میں کافی۔ رحمت اور زبر باری برداشت کی۔ جزاہم اللہ تعالیٰ۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے الطاف وکرم اور صاحبِ ذکر بزرگانِ کرام کی پاکیزہ روحوں کی برکت وطفیل سے سب کو جزائے خیر اور ایمان کی سلامتی عطا فرمائے۔

☆
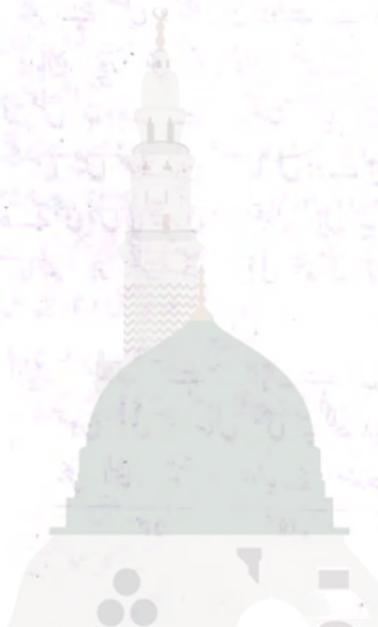
قطعہ تاریخ اختتامِ تذکرہ اولیائے سندھ

نتیجہ فکر سید محمد مطیع اللہ راشدی برہانپوری

مؤلف تذکرۂ ہٰذا

صد شکر آج عہدہ بر آ ہوسکا ہوں میں — اس عہد سے جو دل میں کیا تھ برائے سندھ
یعنی لکھوں گا ان کے سوانح بصد تلاش — برہانپور آئے تھے جو مقتدائے سندھ
دسویں صدی میں ان کو وطن چھوڑنا پڑا — ناگفتہ بہ تھا ایسا ہی کچھ ماجرائے سندھ
یہ صوفیائے سندھ یہ روشن فیض بزرگ — تھی جن کے دم قدم سے جلا و صفائے سندھ
پھرتے تھے اپنے ساتھ لئے اپنی برکتیں — وارد ہوئے جہاں وہیں باندھی ہوائے سندھ
سندھی پورہ بسا کے تو بُرہان پور میں — پیدا اس اجتماع نے کرلی فضائے سندھ

پھر اپنے فضل و فیض کی دولت سے بیدریغ
برہان پور ہی کو نوازا بجائے سندھ

تفصیل کیا بتاؤں کہ کس جدوجہد سے — لکھا گیا ہے تذکرۂ اولیائے سندھ
برسوں رہا ہوں بحرِ تجسس میں غوطہ زن — حاصل ہوئے ہیں تب یہ در بے بہائے سندھ
خوش ہوں کہ اہلِ سندھ نے بھی اس کی قدر کی — مقبول ہیں یہ میری مساعی برائے سندھ
تاریخِ اختتام کی راشد جو فکر کی — آئی نداکہ زینت خلق اولیائے سندھ

۱۳۷۴ھ

اک مادہ تجلی اخیار سندھ ہے — تاباں ہے جس میں نور ولایت نمائے سندھ

موج آئی تو سالِ مسیحی یہ لکھ دیا
بحر البحار تذکرہ اولیائے سندھ

۱۹۵۴ء

شکلِ مربع تاریخ ترتیب تذکرۂ اولیائے سندھ جس سے سنہ مطلوب ۱۳۷۲ھ لاتعداد اعداد میں برآمد ہوتے ہیں

۱۳۷۲	۱۳۷۲	۱۳۷۲	۱۳۷۲	۱۳۷۲	۱۳۷۲
۱۳۷۲	نطق مقدم	موسس عنوان	جوہر سندھی	زمرۂ کامل	۱۳۷۲
۱۳۷۲	عقل مجسم	صافی ایقان	پیکر عالی	راہی منزل	۱۳۷۲
۱۳۷۲	محور ہمدم	کولب در ماں	صفحۂ سیفی	مدرسۂ دل	۱۳۷۲
۱۳۷۲	یاور افہم	گوہر امکان	منزلِ راہی	جوہر حاصل	۱۳۷۲
۱۳۷۲	۱۳۷۲	۱۳۷۲	۱۳۷۲	۱۳۷۲	۱۳۷۲

تذکرہ ہٰذا کی ترتیب و تدوین کا کام زیادہ سرگرمی کے ساتھ ۱۳۷۲ھ میں شروع ہوا ہے۔ لہٰذا سنہ مذکور کے مطابق تاریخِ ترتیب کی فکر کی گئی۔ چنانچہ اپنی ناچیز استعداد اور ذہانت و ذکاوت کی تمام تر صلاحیتوں کو انتہائی سعی و جہد کی حد تک بروئے کار لاکر معجزہ نگار تاریخ گو علمائے سلف کے تتبع میں صرف دو اشعار مقفیٰ و مسجع و مرصع موزون کئے جن کے ہر مصرعہ سے سنہ مطلوب ۱۳۷۲ھ برآمد ہوتا ہے۔

خاص بات یہ ہے کہ اس مربع کو داہنے، بائیں، تحت، فوق، گوشہ بگوشہ چاہے جس طرح اور چاہے جہاں سے پڑھیں ہر حالت میں مکمل مقفیٰ، مسجع و مرصع اشعار پیدا ہوں گے اور ہر مصرعہ سے ۱۳۷۲ھ ظاہر ہوگا۔ اس طرح بالراست مرتب طریقہ پر پڑھنے سے مربع کے ۱۶ اجزا کے مطابق ۱۶×۱۶=۲۵۶ تاریخیں پیدا ہوں گی اور اسی طرح بالعکس پڑھنے سے ۲۵۶ تاریخیں اور بھی۔ لیکن اگر غیر مرتب میں کہیں سے بھی چار چار جز لئے جائیں تو پھر بھی پورے مربع سے چار مصرعے مذکورہ بالا وصف کے ساتھ پیدا ہوں گے اور ہر مصرعہ بامعنی و تاریخی ہی ہوگا۔ چنانچہ غیر مرتب طریق سے بے حد و شمار تاریخیں وجود میں آسکتی ہیں۔ لطف یہ کہ ہر حالت میں بحر، وزن، معنی اور اشعار کی برجستگی میں کوئی خلل واقع نہ ہوگا۔ مندرجۂ ذیل نظم میں ان ہی صراحتوں کے متعلق اشارات ہیں۔

ہوئی بے ساختہ دل کو یہ ترغیب — کہ اس نسخہ کا سالِ جمع و ترتیب
کچھ اس نادر قرینے سے رقم ہو — کہ جس کا مثل اگر ہو بھی تو کم ہو
کئے موزون دو اشعارِ مسجع — مقفیٰ اور سرتاپا مرصع

ہر ایک مصرعہ میں ہے تاریخ ترتیب
مربع کی مگر نادر ہے ترتیب

کہ سولہ جزو میں سے کوئی بھی چار
بنا سکتے ہیں مصرعہ چست و ہموار

چپ و راست اور تحت وفوق پڑھئے
کسی گوشہ سے باصد شوق پڑھیئے

پڑھیں چاہیں جہاں سے یہ مربع
برآمد ہوگی تاریخ مرصع

نہ بحر و زن میں آئے گا نقصان
نہ ہونے پائے گا معنی کا فقدان

بہر عنوان یہ نادر مربع
ہے لاتعداد تاریخوں کا منبع

بتاتا ہے یہ تاریخوں کا دفتر
بحر اسلوبِ تیرہ سو بہتر ۱۳۷۲

خدا کی رحمتیں ہوں اُس پر راشد
جو تھا اس ضعفِ نادر کا موجد

☆
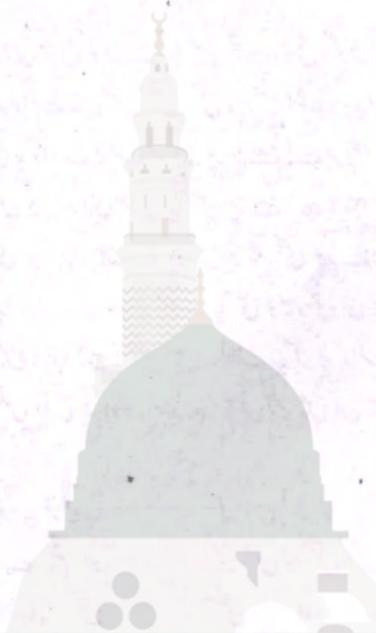
تاریخ طبع تذکرہ اولیائے سندھ دائرہ بہ صنعتِ اطراد

جس سے لاتعداد تاریخیں بابت ۱۳۷۵ھ برآمد ہوتی ہیں

تاریخ حاصل کرنے کا طریقہ:

کسی بھی خانہ کو مبدا قرار دے کر اس کے اعداد نوٹ کرلیں۔ اب جس طاق عدد سے طرح کرنا چاہیں، اسی خانہ سے گننا شروع کردیں۔ جہاں تعداد پوری ہو، اس خانہ کے عدد بھی لکھ لیں اور پھر اسی خانہ سے آگے شمار کریں۔ سات مرتبہ اعداد حاصل ہوجائیں تو دائرہ کا دور ختم ہوجائے گا۔ میزان دے لیجئے مجموعہ بے کم و کاست ۱۳۷۵ء ہوگا۔ جفت عدد سے طرح کرنا ہوتو جس خانہ کے عدد لے چکے ہوں اُس کے آگے سے شمار شروع کریں۔

تاکید: ۱۴ اور ۱۵ نیز ان کے اضعاف مستثنیٰ ہیں۔ طاق وہ اعداد جو دو پر تقسیم نہ ہوسکیں اور جفت وہ اعداد ہیں جو دو پر تقسیم ہوسکتے ہیں۔ ہر ایک کی مختصر مثال ملاحظہ ہو۔

طاق عدد کی مثال:

فرض کیجئے آپ نے حقائق کو مبداء قرار دیا ہے اور پانچ سے طرح کریں گے۔ چنانچہ حقائق کے ۲۱۹ عدد نوٹ کرلیں یہاں سے پانچواں خانہ لفظ محمد کا ہے۔ ۹۲ بھی نوٹ کرلیں۔ پھر محمد کے خانہ سے شمار کریں پانچویں خانہ میں پوری درج ہے۔ اس کے ۲۱۸ بھی نوٹ کرلیں۔ اسی طرح عمل کریں اور جب سات مرتبہ اعداد حاصل ہوجائیں ان کو جمع کرلیں۔ ۱۳۷۵ موجود ہوگا۔ اور اسی طریقہ پر کسی بھی طاق عدد سے بجز ۱۵ اور اس کے اضعاف کے طرح کرنے پر ہر حالت میں ۱۳۷۵ برآمد ہوگا۔

جفت عدد کی مثال

آپ نے راشد کو مبدا قرار دیا ہے۔ اور ۲۰ سے طرح کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا راشد کے عدد ۵۰۵ نوٹ کرلیں اب اس سے آگے یعنی برہان سے شروع کریں تو بیس کا شمار اہل اللہ پر ختم ہوتا ہے۔ اس کے عدد ۱۰۲ بھی نوٹ کرلیں۔ پھر علمائے اجل سے شروع کریں، غرضکہ اسی ترتیب سے سات مرتبہ کے حاصل شدہ اعداد کا مجموعہ ۱۳۷۵ھ ہی بلا کم و کاست پیش نظر ہوگا۔ نیز ۱۴ اور اس کے اضعاف کے علاوہ ہر جفت عدد ۲ سے لیکر ہزار لاکھ کروڑ اور اس سے زیادہ کسی عدد سے طرح کیجئے۔ نتیجہ ہر حال میں سو فیصدی صحیح برآمد ہوگا۔

☆
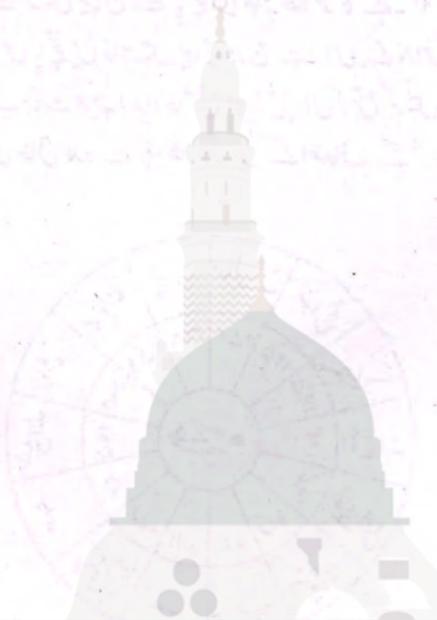
ضمیمہ

فہرست تصانیف بزرگانِ سندھ جن کا ذکر اس تذکرہ میں درج کیا گیا ہے

سلسلہ نمبر	نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	کہاں ہے	کیفیت
۱	۱	مجمع البحار	حضرت شیخ طاہر محدث سندھی	واللہ اعلم	قرآن مجید کی عربی زبان میں تفسیر ہے، شیخ نے اسکو بزمانہ برار لکھنا شروع کیا تھا اور خطبہ میں اپنے میزبان تفال کا ذکر کیا تھا۔ برہانپور مین تکمیل کو پہنچی تو عادل شاہ فاروقی نے اس کتاب میں اپنے لئے دعا کی درخواست کی حضرت نے ایک اور خطبہ لکھ کر اسکی تمنا پوری کردی۔ تذکرہ نگاروں نے شیخ محمد طاہر پٹنی کی شرح صحاح مجمع بحار الانور کو مغالطہ سے مجمع البحار نامزد کرلیا ہو جو فاش غلطی ہے شرح صحاح مجمع بحار الانوار چھپ چکی ہے۔ تفسیر مجمع البحار نایاب ہے۔
۲	۲	مختصر قوۃ القلوب	حضرت شیخ طاہر محدث سندھی	واللہ اعلم	
۳	۳	منتخب مواہب لدینہ	″	″	
۴	۴	ملتقط جمع الجواع سیوطی	″	″	
۵	۵	موجز قسطلانی	″	″	علامہ غوثی نے لکھا ہے کہ اس سے بڑی کوئی شرح بخاری پر نہیں ہے۔ بڑے بڑے بارہ دفتر دو لاکھ بیت میں مختصر کئے ہیں۔

۶	۶	تفسیر مدارک	〃	〃	اپنے دونوں بیٹوں عبداللہ و رحمتہ اللہ کے واسطے مختصر کی تھی۔ اس کا آغاز اس طرح کیا ہے۔ قال ابوعبداللہ طاہر بن یوسف علیہ رحمتہ اللہ
۷	۷	اسامی رجال صحیح البخاری	〃	〃	یہ ایک شرح ہے کرمانی کے طور پر
۸	۸	ریاض الصالحین	〃	〃	اسکی فہرست کی ترتیب تین روضوں پر ہے۔ پہلا روضہ احادیث صحیحہ وحسنہ کا بیان۔ دوسرا روضہ۔ مشائخ طریقت کے ناصحانہ اقوال۔ تیسرا روضہ۔ صاحبان عرفان وجدان معتقدین وحدت وجود
۹	۹	شرح رسالہ وحدت الوجود۔ فارسی	مسیح الاولیاء شیخ عیسیٰ جنداللہ پاٹائی	سندھ یونیورسٹی حیدرآباد	حضرت شیخ عبداللہ بلبانی کے عربی رسالہ کی فارسی شرح ہے جو آپ نے مرشد کے حکم کے مطابق لکھی تھی۔ یہ رسالہ خط پاکیزہ شکستہ کے مجموعہ نادر پنج رسائل میں شریک سندھ یونیورسٹی حیدرآباد ذخیرہ کتب میں موجود ہے۔
۱۰	۱۰	رسالۂ دقیقہ	مسیح الاولیا شیخ عیسیٰ جنداللہ	سندھ یونیورسٹی حیدرآباد	یہ مختصر رسالہ تعینات حقیقت محمدیہ کے بیان میں نظم ونثر سے مرصع ہے۔ ایک قلمی بیاض مسمیٰ بیاض یادگار میں تحریر ہے یہ بیاض یونیورسٹی کے ذخیرہ کتب میں موجود ہے
۱۱	۳	روضۃ الحسنٰی ۹۸۹ھ	〃	〃	موضوع نام سے ظاہر ہے نو دو نہ نام کی شرح ہے
۱۲	۴	عین المعانی ۹۹۰ھ	〃	سندھ یونیورسٹی	یہ عجیب وغریب نادرِ روزگار کتاب بھی نو دو نہ نام کی شرح ہے، اس کی تالیف کی وجہ یہ ہے کہ ایک مرید روضہ الحسنٰی کی نقل کر رہا تھا۔ حضرت نے اسکو مدد دینے کی غرض سے وہ کاغذ اُٹھالئے اور خود

					لکھنے لگے لیکن بجائے کتاب کی نقل کے تازہ اور بلند مضامین قلم سے ٹپکنے لگے۔ تب آپنے ارادتاً اسکو از سر نو لکھنا شروع کر دیا اور نادر ترین کتاب وجود میں آ گئی۔ اس صوفیانہ ورد و وظائف کے خشک مضامین کو آپ کی شگفتہ نگاری نے اتنا لاویز کر دیا کہ طبیعت میسر نہیں ہوئی۔
۱۳	۵	تفسیر الانوار اسرار	،	سندھ یونیورسٹی	یہ مسجع مرصع مقفی التفسیر عرفانہ اور صوفیانہ انداز پر تکمیل کو پہنچی۔ آپ کے عم شیخ طاہر محدث کو علم ہوا تو وہ خوش ہو کر آپ کے بے اختیار بغل گیر ہو گئے اور مبارکبادی چند سورہ کی پاکیزہ خط میں نقل یونیورسٹی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔(۱)
۱۴	۶	رسالہ حواس پنجگانہ	مسیح الاولیا شیخ عیسیٰ جند اللہ	،	یہ رسالہ آپ نے صدرجہاں دہار (ایک خلیفہ) کی التماس پر لکھا تھا۔ اس میں آپ نے حضرات خمس سے مطابقت دی ہے
۱۵	۷	حاشیہ براشارو غریبہ	،	،	شیخ عبدالکریم جیلی کی کتاب ''انسان کامل'' پر یہ حاشیہ آپ نے اس وقت لکھا جب آپ سید احمد دکنی شاگرد حضرت وجیہہ الدین علوی کے درس میں تھے۔
۱۶	۸	شرح قصیدہ بردہ	،	،	یہ شرح فارسی میں ہے۔
۱۷	۹	قبلہ المذاہب الاربعہ	،		یہ رسالہ اہل تصوف کے اشارات سے متعلق ہے۔
۱۸	۱۰	حاشیہ برشرح ضیائیہ			مولانا جامی نے کافیہ پر شرح لکھی تھی یہ اسی شرح پر حاشیہ ہے۔ یہ آپ نے بابا عبدالستار کی تعلیم کے سلسلہ میں لکھا تھا۔

۱؎ ادارہ پاٹ ہاؤس سے حیدر آباد سے شایع ہو چکی ہے۔

۱۹	۱۱	فتح محمدی در علم ما تعلیق بہ التفسیر	؍		آپ نے یہ کتاب بابا فتح محمد کی تعلیم کے سلسلہ میں لکھی تھی۔
۲۰	۱۲	تتمیم سرح مائیہ حال	مسح الاولیا شیخ عیسیٰ جنداللہ		اس شرح کو میر فتح اللہ شیرازی نے شروع کیا تھا لیکن تمام ہونے سے قبل فوت ہوگئے۔ آپ نے قاضی نور اللہ کے ابن عم میر سید علی کی تمنا پر آغاز کی طرح انجام کو پہنچایا۔
۲۱	۱۳	رسالہ عقود	؍		نہایت اختصار کے ساتھ لکھا ہے۔ ارباب حدیث اعداد کا شمار انگلیوں پر رکھتے ہیں اس نسبت سے رسالہ کا یہ نام ہوا۔
۲۲	۱۴	دوربائی کی شرح	؍		؟
۲۳	۱۵	ترجمہ اسرار الوحی	؍		؟
۲۴	۱	مفتاح الصلواۃ	حضرت بابا فتح محمد محدثؒ	سندھ یونیورسٹی	حضرت بابا کی یہ شہرۂ آفاق کتاب نماز کے فرائض، واجبات اور سنن کی تفصیلات سے متعلق ہے مستند حدیثوں سے دلائل کے ساتھ مسائل حل کئے ہیں۔
۲۵	۲	فتح المذہب الاربعہ	؍	واللہ اعلم	علم فقہ میں بزبانِ عربی۔
۲۶	۳	فتوح الاوراد	؍	یونیورسٹی سندھ	ورد و وظائف کی عجیب وغریب کتاب ہے اس کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ سال کے تمام مہینوں اور دنوں کی پنجگانہ نمازوں کے علاوہ نوافل، تہجد اشراق وغیرہ کے متعلق ایک ایک جزوی عبادت میں حضور رسول ﷺ کی اتباع حضور کے اعمال و

۱ اس کا سندھی ترجمہ سندھی ادبی بورڈ نے شایع کیا ہے۔

					افعال کی کامل پیروی کے سلسلہ میں ہر ذکر کیلئے مستند حدیثوں سے حوالہ پیش کیا ہے۔
۲۷	۴	رسالہ جہت الکعبہ	حضرت بابا فتح محمدؒ محدث	واللہ اعلم	سایہ اصلی برہانپور و نواح آن۔(۱)
۲۸	۵	رسالہ مستحب وقت عشاء وظہر	"	"	
۲۹	۶	مثنوی تنزل حق جل وعلا بعقیدہ صوفیا	"		صوفیانہ مختصر مثنوی ہے۔ اسکی ایک نقل کتب خانہ پیر محمد احمد آباد گجرات میں ہے اسکی نقل شریک تذکرہ ہے کتبخانہ مذکور ہیں نجانے کیوں شیخ برہانپوری سے نامزد ہے۔
۳۰	۱	رباعیات سیفی	شیخ سلیمان سیفی برادر خورد حضرت مسیح الاولیا	تذکرہ ہٰذا	آپ کا دوسرا کلام ہمدست نہ ہوا یہ رباعیات بھی عین المعانی اور روائح الانفاس میں پائی گئی ہیں جو فراہم کردی گئی ہیں۔
۳۱	۱	رسالہ تحفہ الاوراد	حضرت شیخ شہاب الدین ابن بابا فتح محمد محدث	واللہ اعلم	یہ رسالہ آپ نے اپنے فرزندوں شیخ بہاء الدین اور شیخ علاوالدین کی تعلیم کے لئے لکھا تھا۔
۳۲	۱	شرح آیات سلیمانیہ	غلام یٰسین عین اللہ ابن شیخ شہاب الدین	سندھ یونیورسٹی	قرآن مجید کی جن آیات میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر آیا ہے آپ نے ان تمام آیات کو جمع کرکے ان کی شرح میں ایسا ربط قائم کردیا ہے کہ کتاب حضرت سلیمان علیہ السلام کی سوانح عمری
					بن گئی۔ آپ کی زندگی کے واقعات تعمیر مسجد اقصیٰ اور وفات تک یہ نسخہ مصنف کے قلم سے لکھی ہوئی اولین مسودہ کی کاپی ہے۔

۱؎ اس کے چند اوراق مخدوم غوث محمد صاحب کے ذاتی کتب خانہ کوٹڑی کبیر میں موجود ہیں۔ جس میں پاٹ، سہون اور سن کے اوقات کا ذکر ہے، جو بابا فتح محمد نے سندھ میں رہائش کے دوران تحریر فرمائے۔

۳۳	۱	شرح بر مختصر وقایہ	قاضی عبدالسلام سندھی	واللہ اعلم	غوثی لکھتے ہیں کہ یہ شرح تمام جزئیات روایت کو شامل ہے۔
۳۴	۱	حاشیہ تفسیر قاضی بیضاوی شرح بخاری	حکیم عثمان بوبکانی		علامہ غوثی لکھتے ہیں کہ آپ کی تصنیفات بہت سی ہیں منجملہ ان کے یہ دو کتابیں نہایت مشکل نما اور دشوار کشا ہیں۔
۳۶	۱	کشف الحقائق	شیخ اسماعیل ابن محمود سندھی	سندھ یونیورسٹی اور پشاور یونیورسٹی	حضرت مسیح الاولیا کے ملفوظات ہیں جو فرحی نے حضرت کی آگہی اور اجازت سے عرصۂ دراز کی حاضر باشی میں آنکھوں سے دیکھے اور کانوں سے سنے حالات لکھے۔ اصولاً ۱۰۲۰ھ میں کتاب ختم کردی تھی۔ (شاید اپنی حیات) ۱۰۶۱ھ تک اس میں متعلقہ حالات کا اضافہ کرتا رہا۔
۳۷	۱	منظومات محبّ علی سندھی	محبّ علی	یونیورسٹی	مولانا محبّ علی سندھی کا منتشر اور متفرق کلام جو مآثر رحیمی میں بہت زیادہ اور ایک قلمی بیاض میں انتخاب پایا جاتا ہے جس میں جملہ اصناف نظم پر بلند و برجستہ منظومات مثلاً مثنوی قصیدہ، غزل، رباعی، قطعہ، ساقی نامہ وغیرہ کا انتخاب ہے۔
۳۸	۱	شرح رسالہ غوثیہ	شیخ طیبؒ سندھی		
۳۹	۲	حاشیہ شرح مشکوٰۃ			
۴۰	۱	بیان وحدت وجود منظوم سندھی زبان میں	قاضی قاضن	نایاب	بحوالہ گلزار ابرار نایاب

حضرت مسیح الاولیاء

شیخ عیسیٰ جند اللہ سندھی برہانپوری

سے متعلقہ آثار، شجرہ و خلفا و اولاد

موجود شہر برہانپور
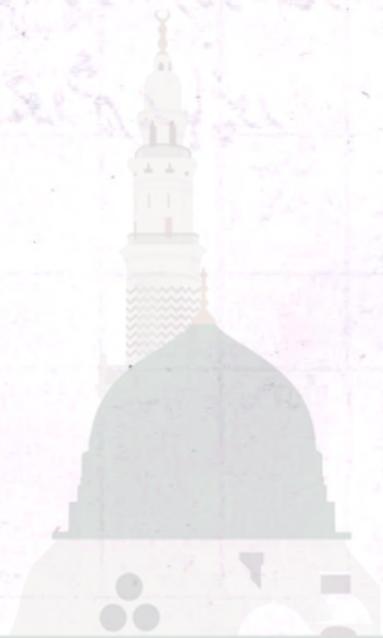
مقبرہ حضرت شیخ طاہر محدث (بارہ دری میں) واقع سندھی پورہ برہانپور
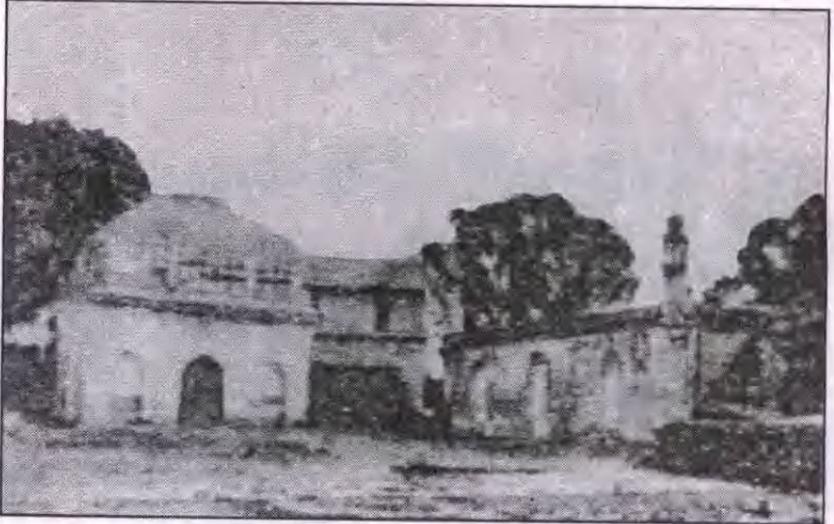
سامنے والے گوشہ میں حضرت مسیح الاولیاء کے مدرسہء کلاں کا زینہ نظر آتا ہے۔

مسیح الاولیاء کے مسکونہ محل کی ایک دیوار
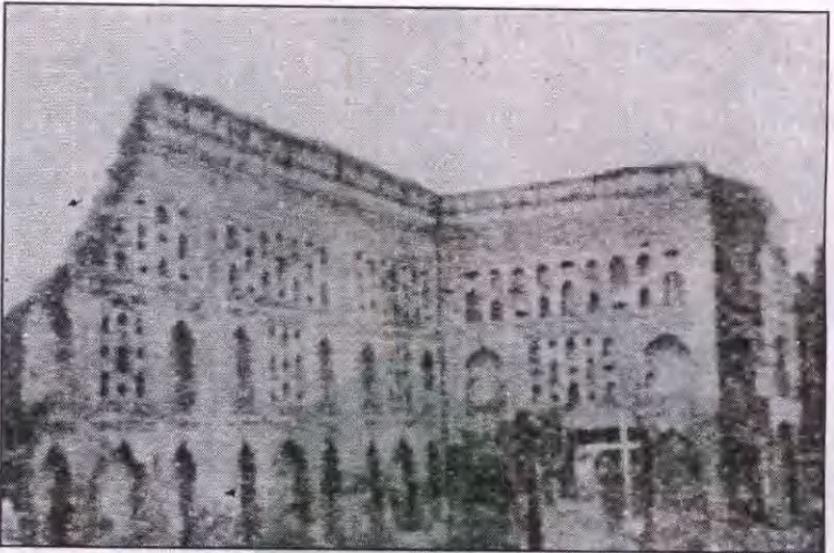
یہ محل محمد شاہ فاروقی نے نذر کیا تھا۔ اس کے عقب میں شیخ محمد طاہر محدث کی سکونت کے لئے بھی ایسا ہی رفیع الشان محل پیش کیا تھا۔ اس وقت بواہر کے سیفی بورڈنگ و یتیم خانہ کی عمارت اسی؛ ہنڈر پر واقع ہے۔
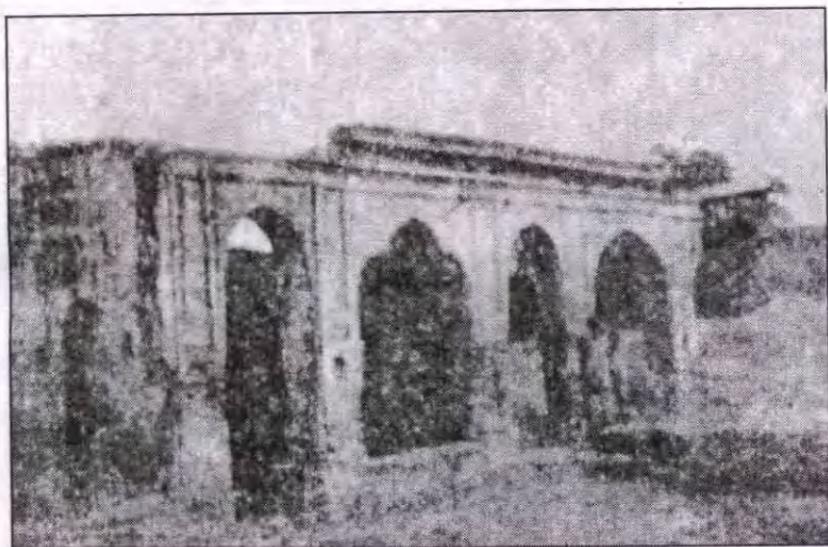
محل مذکور کا غسل خانہ اور اس کے ملحقات
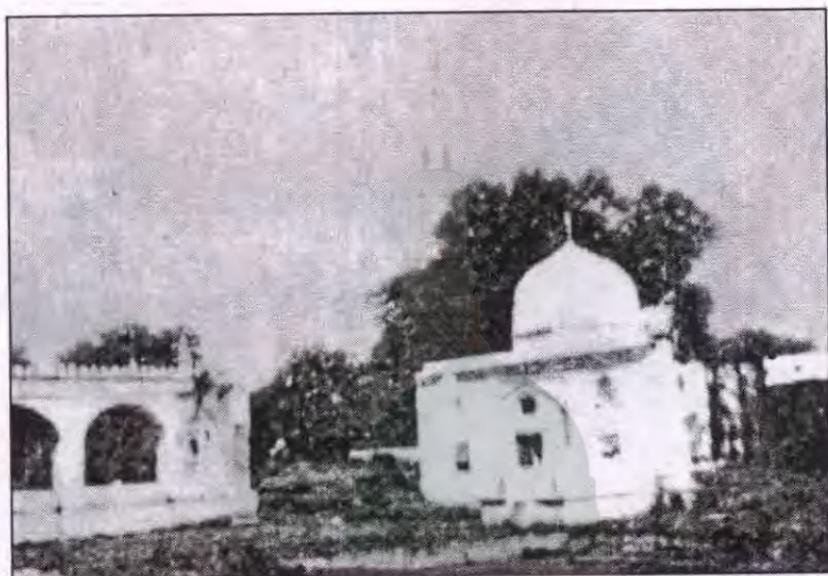
آپ کے روضہ کا دلکش منظر
مسجد مسیح الاولیاء قدس سرہ کے وسیع صحن میں شمالی جانب۔

حال ہی میں لی گئی تصاویر

مزار اور مسجد حضرت مسیح الاولیاء
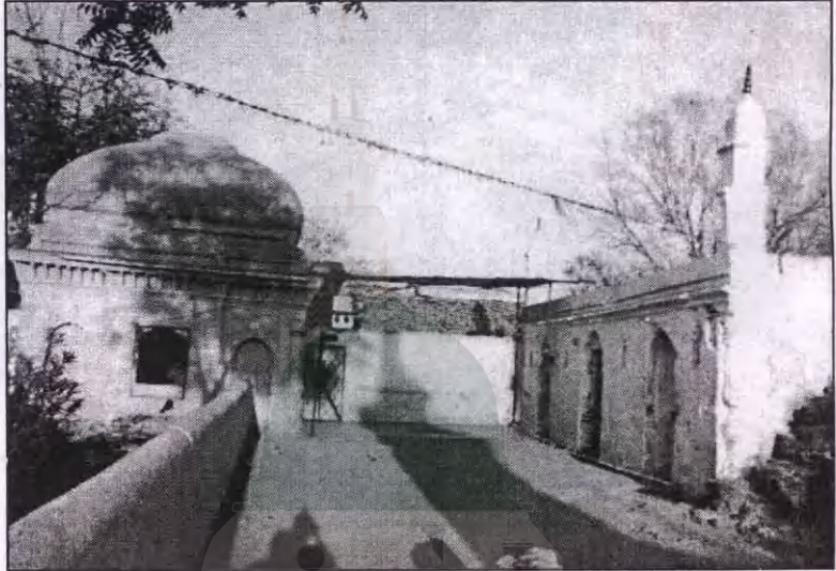
بارہ دری حضرت شیخ طاہر محدث

حال ہی میں لی گئی تصاویر
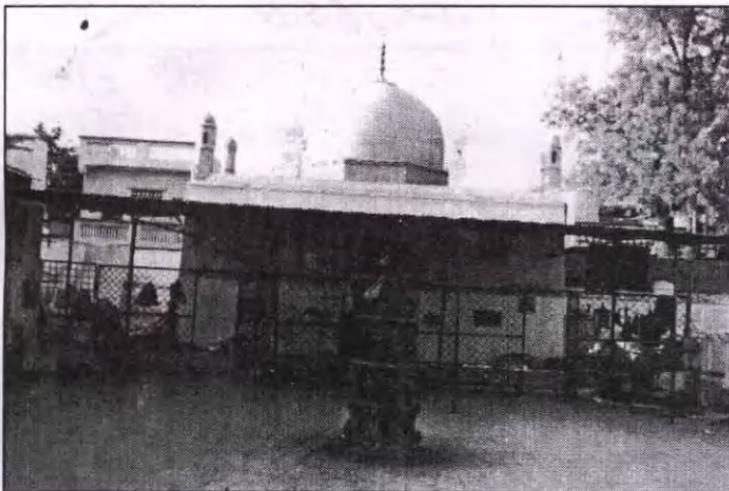
مزار کا بیرونی عکس
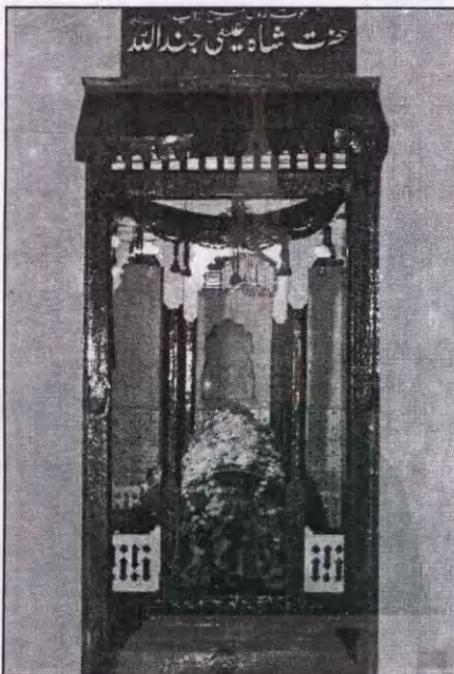
مرقد حضرت مسیح الاولیاء پاٹائی ثم برہانپوری

شبیہ حکیم لاڈلے صاحب برہانپوری

سجادہ محمد اسحاق قادری عرف حاجی صاحب برہانپوری
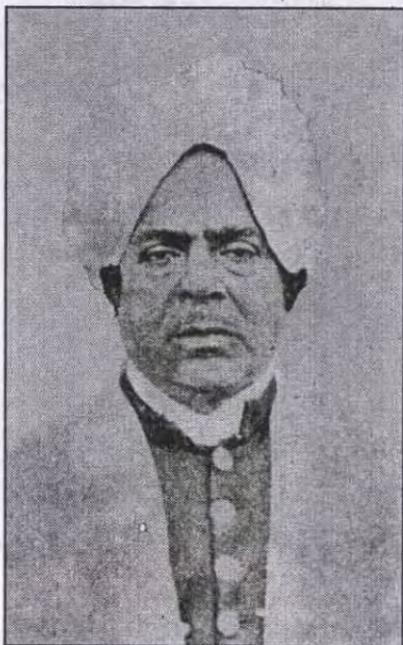
سجادہ نشین حاجی حکیم غلام خواجہ قادری برہانپوری
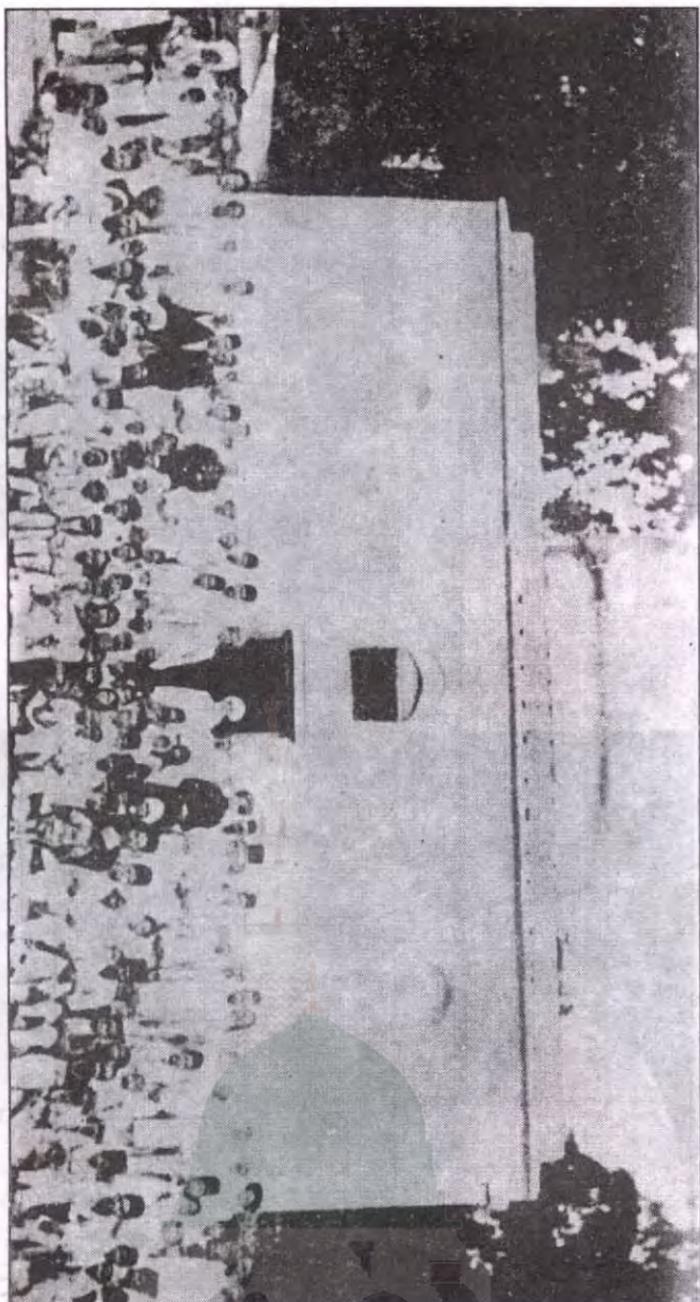
مسیح الاولیاء کے روضہ مقدسہ پر ۳۰ سال قبل کے عرس کا ایک منظر جس میں مختلف خاندانوں کے مشائخ اور خاص و عام شریک ہیں۔
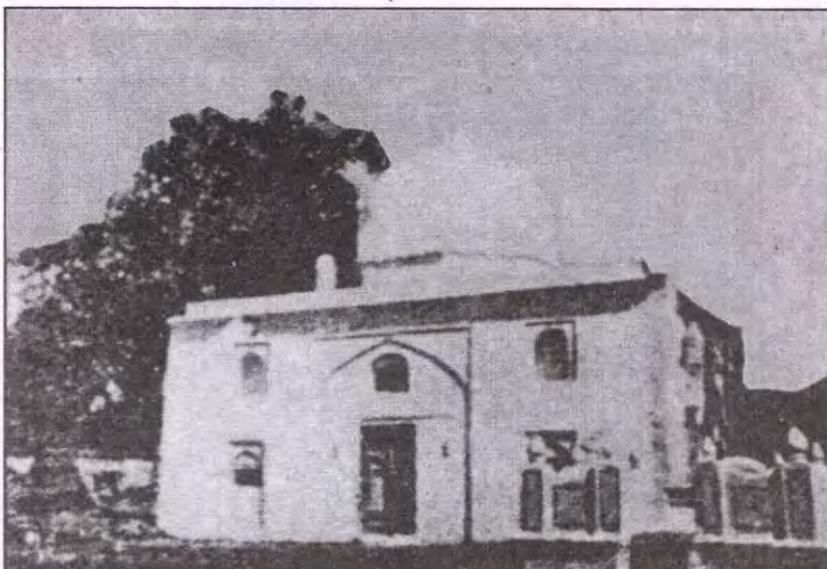
مقبرہ حضرت مسیح الاولیاء شیخ عیسیٰ جنداللہ قدس سرہ العزیز واقع سندھی پورہ۔ برہانپور
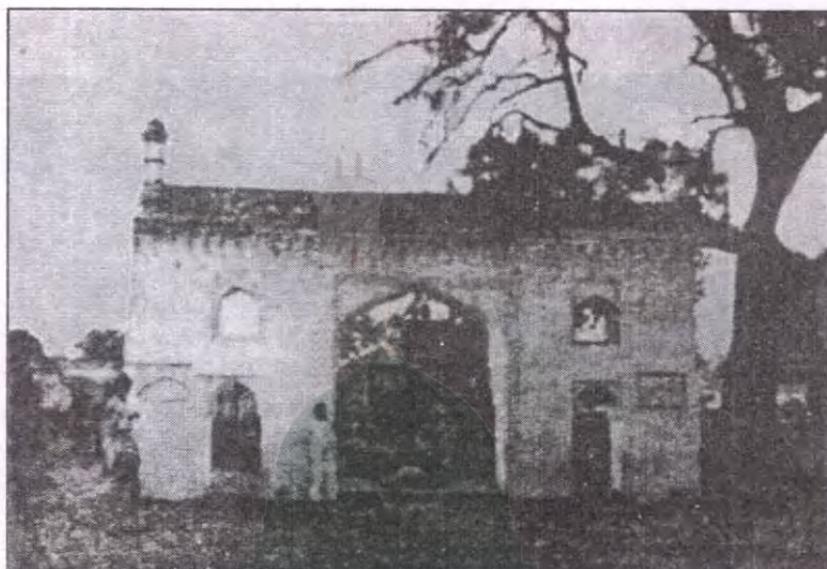
مقبرہ حضرت شیخ عبدالستار فرزند کلاں حضرت مسیح الاولیاء قدس سرہ

حضرت بابا شیخ محمد شاہ کے وصیت نامہ و تقسیم نامہ کا عکس تحریر
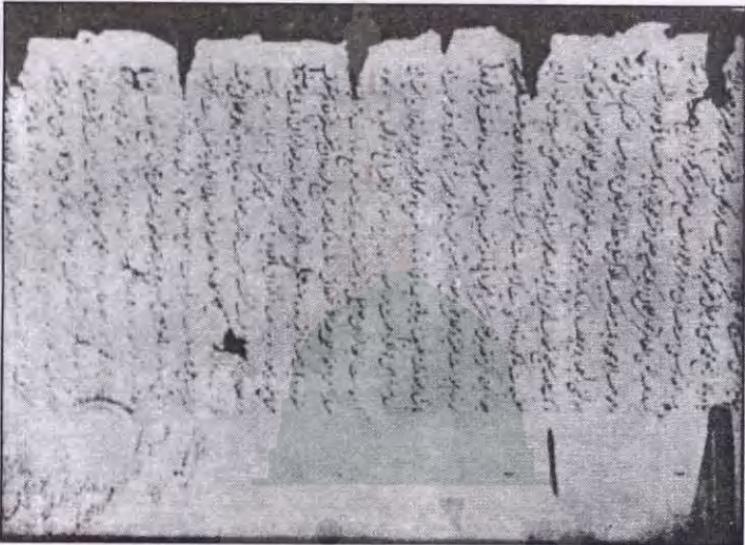
وصیت نامہ و تقسیم نامہ کا بقیہ عکس تحریر
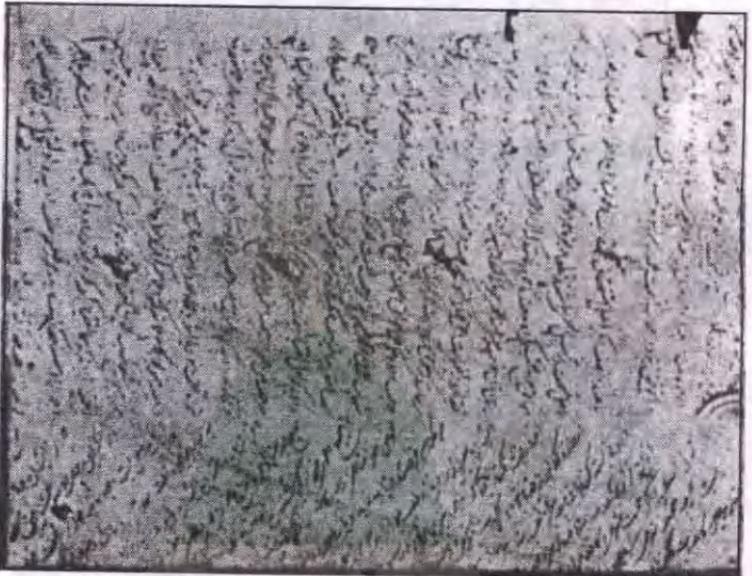
وصیت نامہ و تقسیم نامہ کا بقیہ عکس تحریر
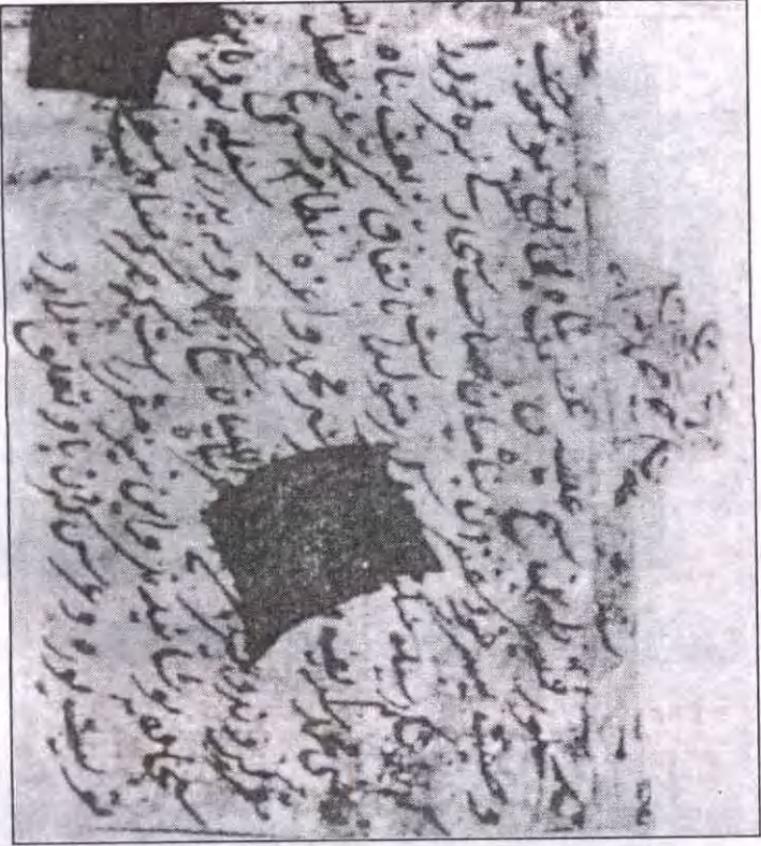
وصیت نامہ و تقسیم نامہ کا بقیہ عکس تحریر

عکس تحریر حضرت شیخ طہٰ ابن حضرت مسیح الاولیاء قدس سرہ

وصیت نامہ و تقسیم نامہ کا بقیہ عکس تحریر
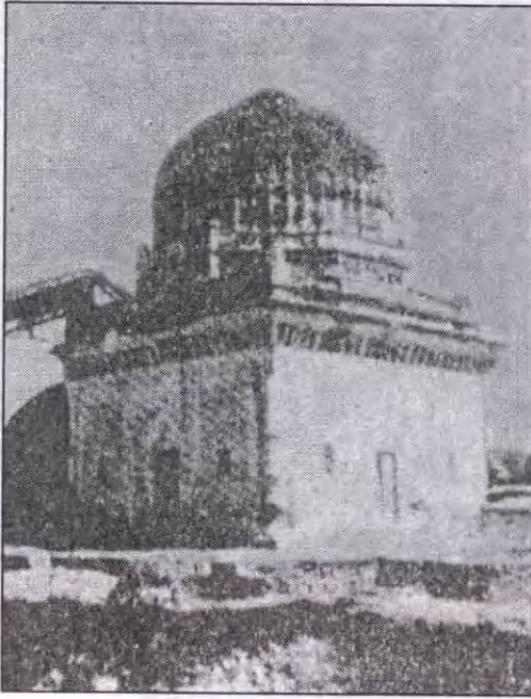
مقبرہ حضرت شیخ شہاب الدین قدس سرہ

مزار حضرت شیخ ابراہیم کلہوڑا قدس اللہ سرہ

مقبرہ حضرت شیخ ابراہیم ابن عمر سندھی قدس سرہ

مقبرہ حضرت ابراہیم ابن عمر کا بیرونی منظر۔ یہاں شیخ مبارک سندھی، شیخ موسیٰ بوبکانی وغیرہ کے مزار ہیں۔
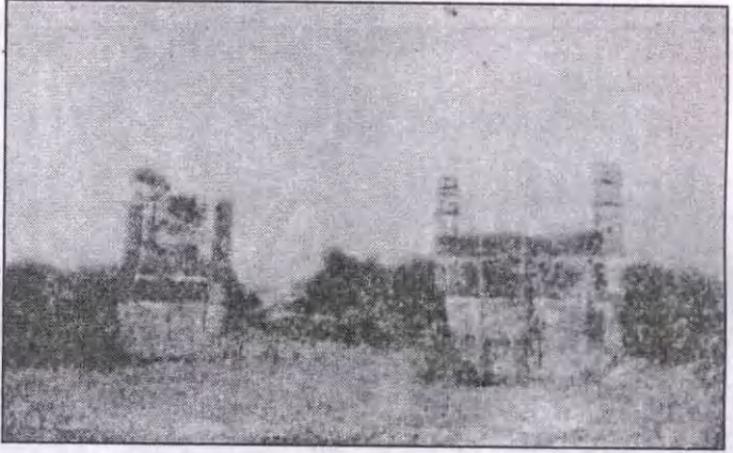
مقبرہ ابراہیم ابن عمر سندھی کے متصل دو چھوٹی مسجدیں جہاں شیخ لاڈ جیو، قاری ابراہیم اور دوسرے بزرگوں کے مزار ہیں۔
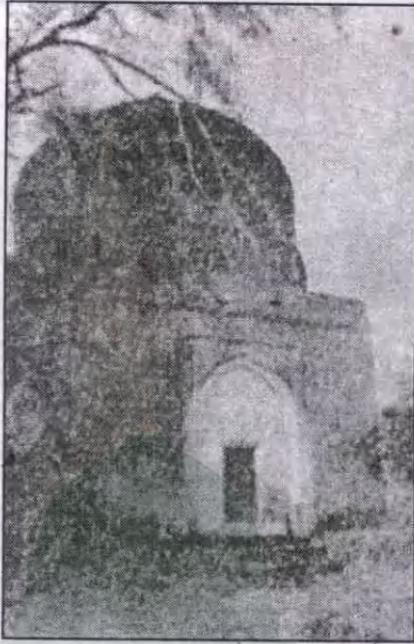
مقبرہ حضرت سید ابراہیم بکھری قدس سرہ

شیخ ابراہیم ابن عمر سندھی کے مقبرہ کے متصل ایک حصہ کا منظر جہاں متعدد مشہور مشائخ کے مزار ہیں۔

قبرستان عادلپور کی ایک غیر معمولی بڑی قبر۔

چادر آب مصفا حیرت افزا آبشار قلب ایں نظارہ گویا آبِ حیوان آشکار آبشار محالِ گوہر آرا برہانپور جس سے ۴۰ فٹ اونچی دیوار سے ۳۰۰ فٹ طولائی حوض میں پانی کی چادر گر رہی ہے، اسی منظر کو دیکھ کر ملا صاحب نے مذکور بالا شعر کہا تھا۔
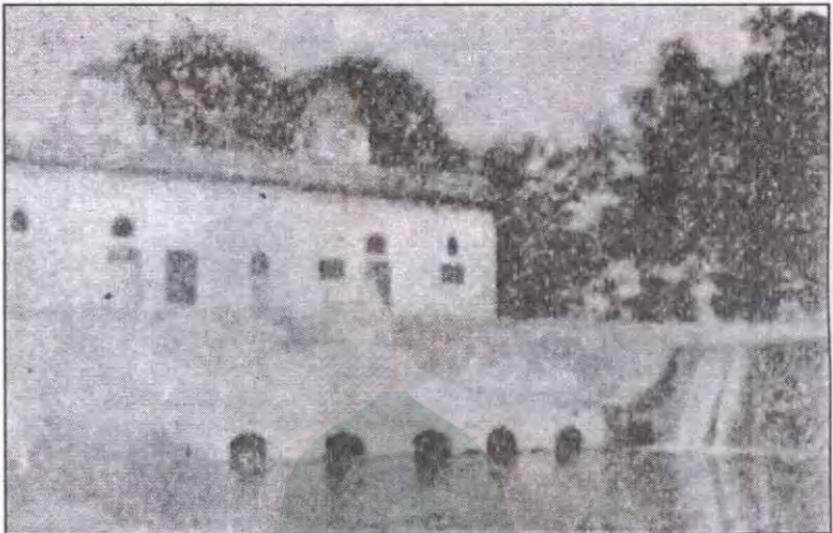
وسیع آبشار کے آمنے سامنے یکساں محلات کا منظر جس کی دلکشی سے متاثر ہو کر ملا محب علی نے یہ شعر کہا تھا

مطلع برجستہ تعمیر سلطان خورم

بر کنار حوض اکبر این دو کاخ محترم

مقبرہ حضرت نائب رسول اللہ،
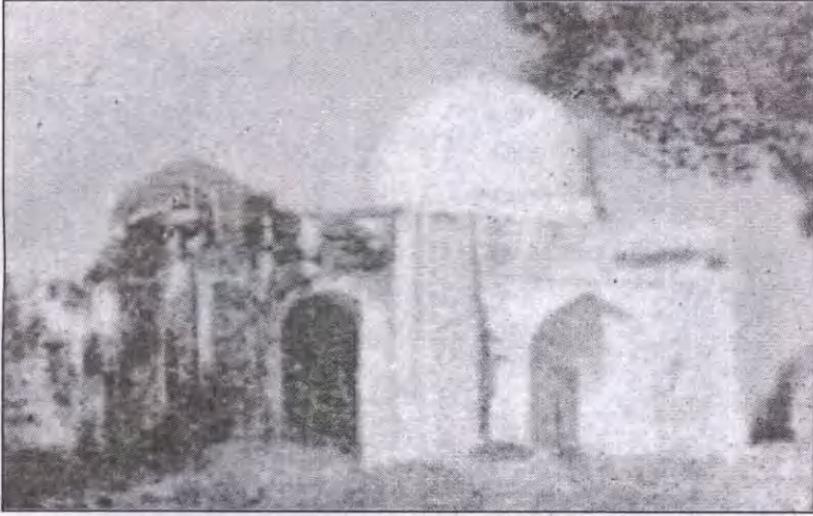
جس کے باہر گوشہ میں محب علی سندھی کا مزار ہے۔

مقبرہ حضرت شیخ برہان الدین رازالٰہی قدس سرہ خلیفہ خاص حضرت مسیح الاولیاء قدس سرہ

حضرت مسیح الاولیاء
شیخ عیسیٰ جند اللہ سندھی برہانپوری

سے متعلقہ آثار مع چند تصاویر مرقد و مسجد

حضرت شیخ الشیوخ عمر بن محمد شہاب الدین السہروردی

موجود شہر بغداد عراق

و شجرہ اولاد موجودہ دیار سندھ
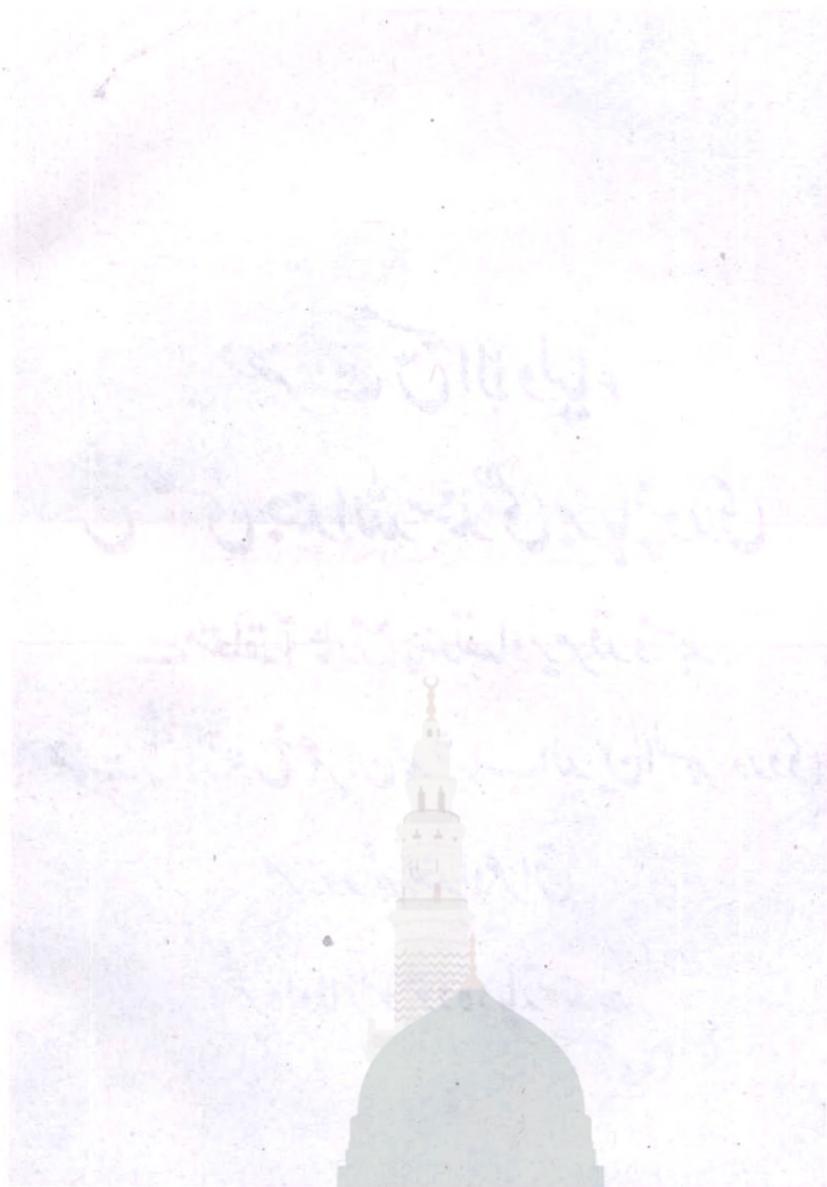
مزار شیخ الشیوخ کا عقبی حصہ جہاں سے وردیہ قبرستان بھی نظر آ رہا ہے۔ مزار کا یہ انداز سلجوقی طرز تعمیر کہلاتا ہے
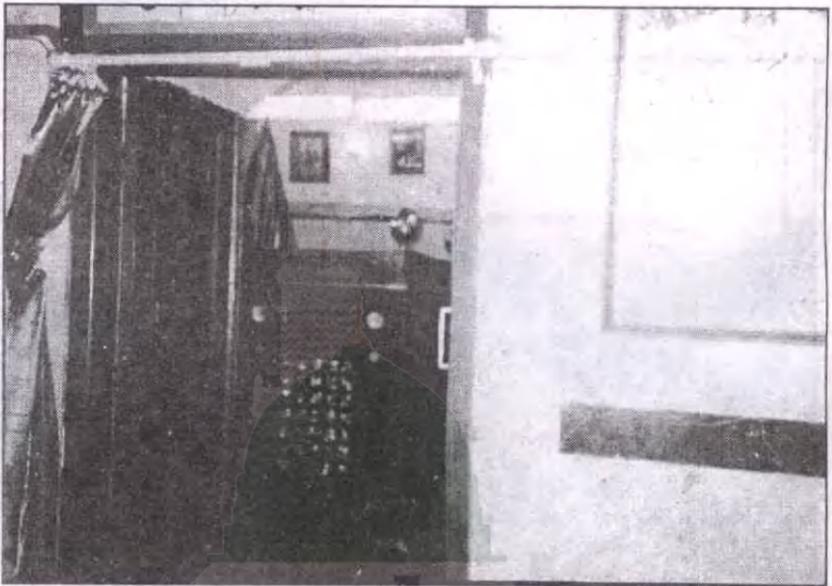
مسجد شیخ الشیوخ کے ایک کونے میں وہ کمرہ جہاں آپ کا مزار مبارک موجود ہے

مسجد شیخ الشیوخ کا اندرونی منظر
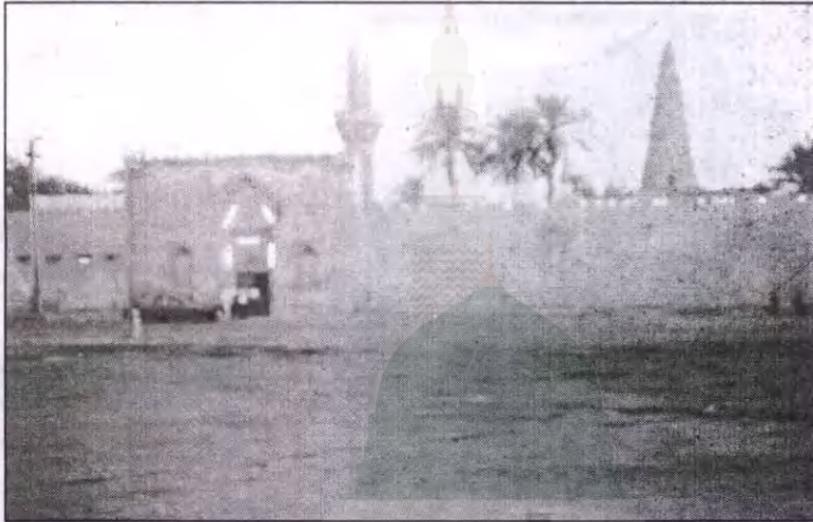
مسجد اور مزار شیخ الشیوخ عمر بن محمد شہاب الدین سہروردی کا بیرونی عکس

کرد و وی صحت یابد چون رسول علیه السلام از خواب بیدار شد
هر دو سوره یاد شده بود دستش فرمود تا رفتن و آن خافور را
ازان جاه بیرون آوردند و پیش رسول علیه السلام بودند
رسول علیه السلام چون یک آیت بخواند یک گره گشاده شد ... چون
تمام بخواند هر یازده گشاده شد و آنحضرت صحت یافت والله اعلم بالصواب

تاریخ اتمام کتابت تفسیر مولانا یعقوب
فی سنه سبع وسبعین وتسعمایه
یوم الخمیس ۱۲ شهر ربیع الآخر
ببلدة ... من اعمال سند
کاتبها امة الله المنان
حبیبه سلطان
بنت محمد قاسم
المحدث
المفتی ...
الحنفی
عفی الله
عنه
وعنها

تفسیر یعقوب چرخی رح کا آخری ورق کاتبہ

امتہ اللہ المسماۃ حبیبہ سلطان بنت شیخ قاسم محدث ۹۷۷ھ

والله اعلم بالصواب تمت

صن النسخة الشريفة الموسومة بغاية التحقيق شرح

الكافية في علم النحو بيد اضعف عباد الله القوي

روح الله بن بابوجي بن موسى سندي

في شهر صفر سنة خمس وثلثين

والف بعد الهجرة النبوية

عليه الصلوة

والسلام
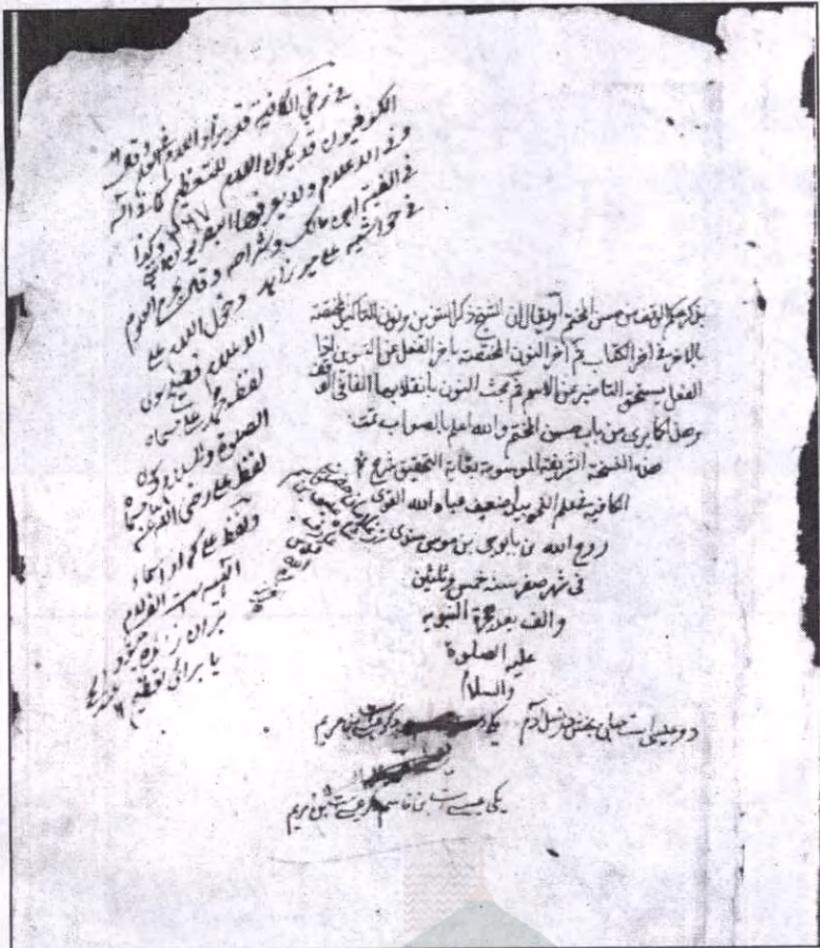
شرح الکافیہ کا آخری ورق، کاتب: نصیر الدین روح اللہ سندھی

اس کتاب کا ایک نسخہ بندہ کے کتب خانے میں اور ایک مدرسہ سومرانی رستم شکارپور میں موجود ہے

حضرت مخدوم فضل اللہ کے خاندان کے شجری کی مہر

فقیر باب اللہ عزوجل حبیب اللہ الرحمٰن محمد زاہد بن حاجی ہاجر اللہ مرید بن ناصر مرید محمد

بن محمد حسن بن مفتی الاسلام مخدوم دین محمد بن مفتی الاسلام عبدالواحد کبیر بن

مولانا عبدالرحمٰن قاری بن مولانا محمود بن مولانا عیسیٰ ثانی سندھی باتری بن

مولانا شہر اللہ وھو رمضان بن شیخ الطریقہ قادریہ شطاریہ شیخ الاولیاء شاہ جند اللہ مخدوم عمر

کبیر وہو تولد [illegible] ربانی محبوب حقانی شہابی [illegible] سندھی باتری برہانپوری [illegible]

سرہ الاقدس اولیاء [illegible] خاتم مذکور
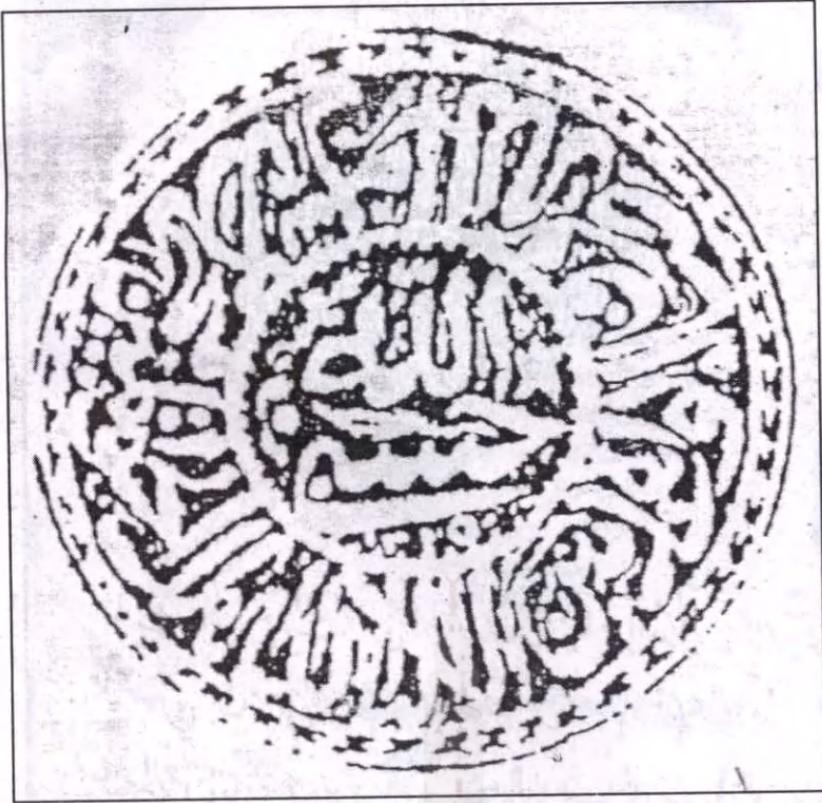
افقہ الفقہ فی السند حضرت مخدوم حسن اللہ شاہ

پاٹائی کی مہر- جو آپ فتویٰ دیتے ہوئے استعمال کرتے تھے
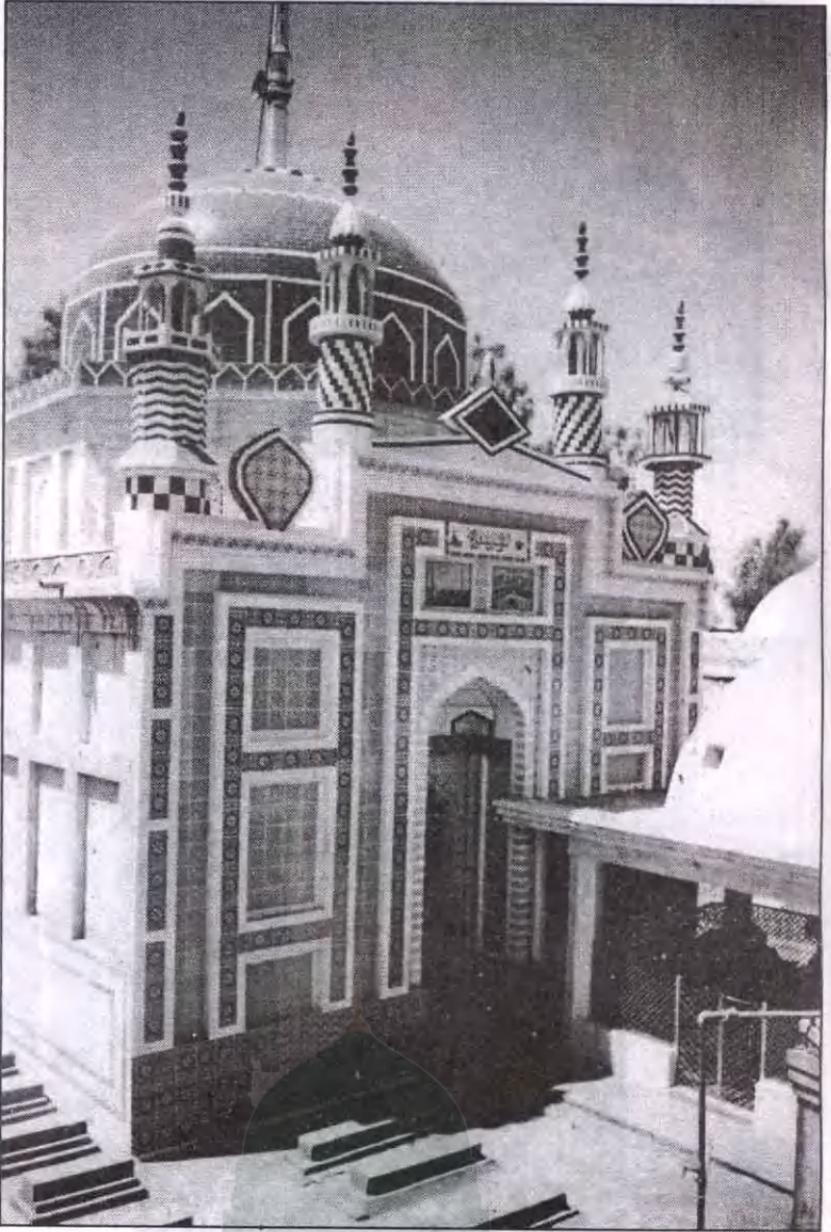
مزار مخدوم فضل اللہ پاٹ شریف

مزار مخدوم فضل اللہ سے متصل مسجد
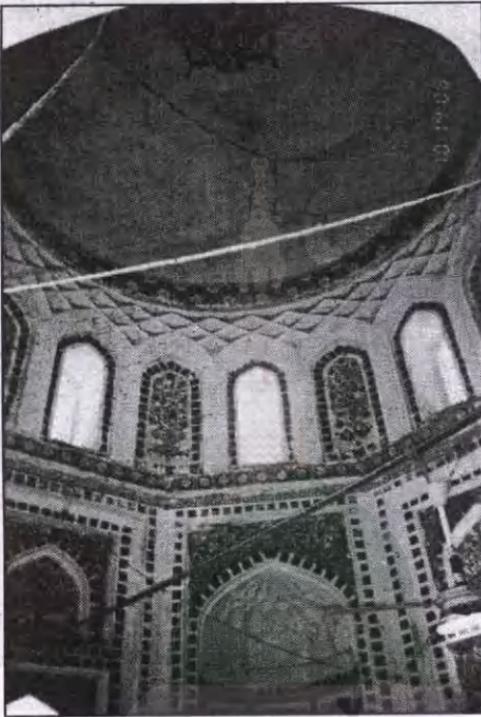
مزار مخدوم فضل اللہ کا اندرونی عکس

میاں صاحب احمدی قاضی آف پاٹ شریف (المتوفی ۱۹۲۳ء)

۱۹۱۵ء میں تعمیر شدہ پرائمری اسکول پاٹ شریف کی عمارت

یہ اسکول میاں صاحب کے نام سے ہی منسوب ہے

پاٹ کے شمال میں موجود جھیل کا منظر

شہر خموشاں ''قاضی قاسمانی'' سیم وتھور کا شکار
قاضی میاں احمدی ثالث تصویر میں نظر آرہے ہیں
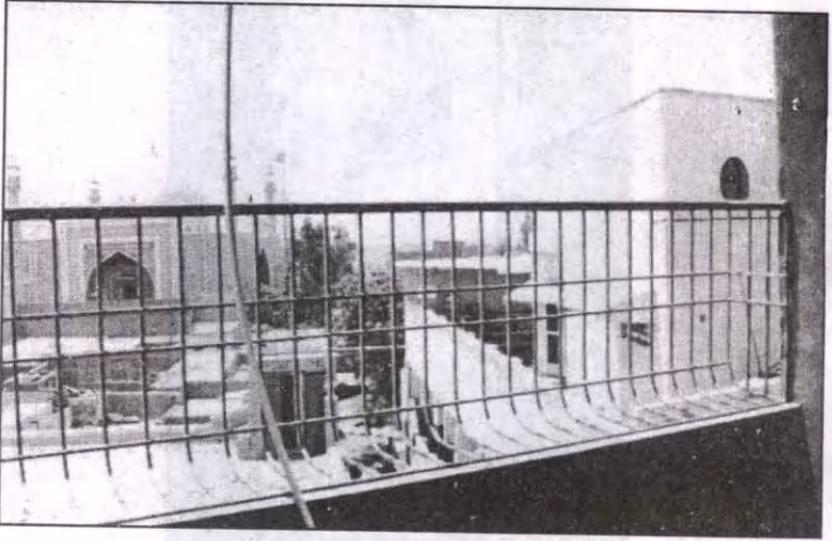
دواخانہ سہون شریف کی چھت سے حضرت لال شہباز کی مزار کا منظر
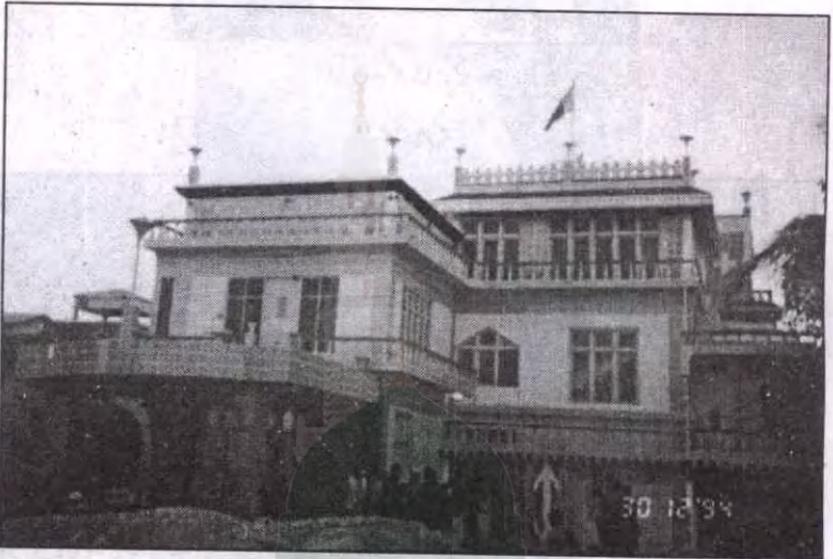
شہید غنی ہاسپٹل (حیدر آباد)

دواخانہ سہون شریف

حکیم محمد مراد

شاعر حاجی میاں صاحب عبدالقادر صدیقی

مدفن پاٹ شریف

مخدوم علی گوہر مفتی و عالم

المتوفی ۱۹۷۲ء مدفن پاٹ شریف

حکیم مخدوم مراد صدیقی سہوانی

مدفن سہون شریف

پروفیسر شفیع محمد

المتوفی ۱۹۸۳ء عالم فاضل مدفن پاٹ شریف
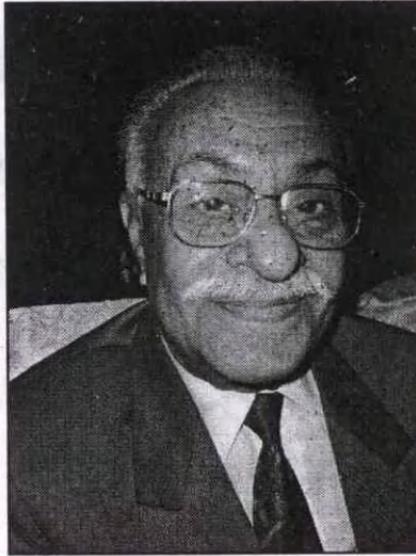
ڈاکٹر حبیب اللہ صدیقی

ماہر تعلیم، صاحب قلم سابق سیکریٹری سندھی ادبی بورڈ

مخدوم عبدالغفار صدیقی

ماہر تعلیم، سابق چیف کوآرڈینیٹر مسجد اسکولس سابق سیکریٹری سندھی ادبی بورڈ
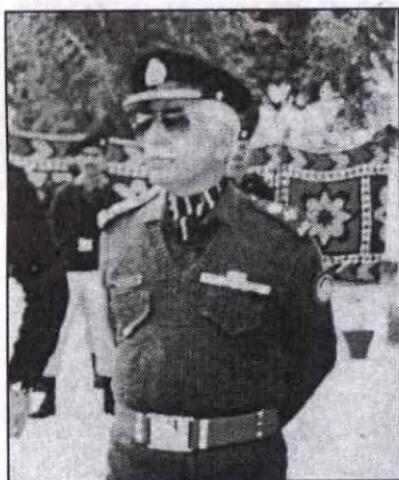
شہید عبدالغنی صدیقی

مشیر وزیر اعظم پاکستان، محترمہ بینظیر بھٹو

ای ڈی آئی جی پولیس، المتوفی ۱۹۹۴ء

ڈاکٹر پروفیسر عبدالشکور صدیقی

ڈائریکٹر جناح اسپتال

لائف میمبر یورپین پیتھالاجی کاؤنسل

جسٹس عبدالوحید صدیقی
فیڈرل شریعت کورٹ آف پاکستان اسلام آباد

مخدوم عبدالجبار
خلیفہ ارشد سید صبغت اللہ شاہ
المعروف پیر ایرانی

جناب عبداللطیف صدیقی
ڈائریکٹر بیورو آف کئریکیولم
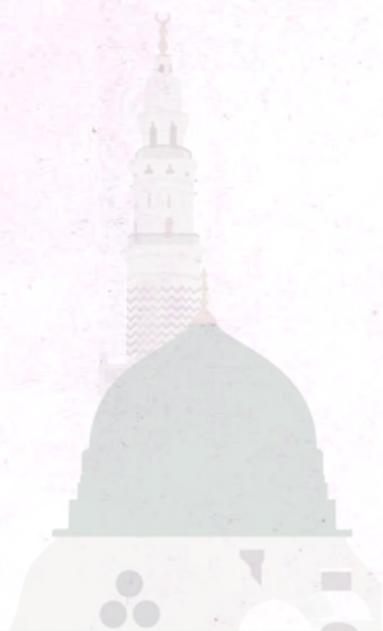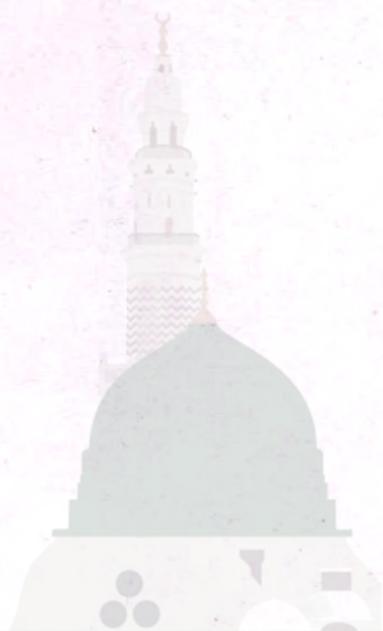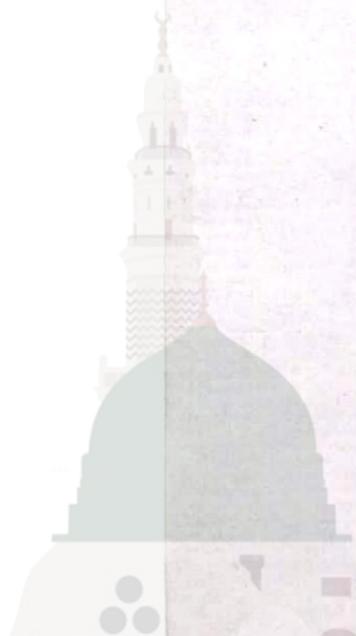
دسویں صدی ہجری میں اہلِ سندھ کے احمد آباد اور گجرات کے دیگر شہروں کے ساتھ علمی ادبی اور تجارتی روابط اتنے پائدار تھے کہ ان کے آثار آج تک نمایاں ہیں۔ سندھ سے ملحقہ ان ہندستانی علائقوں سے علمی تعلقات کی ابتدا میں تو پاٹ (سندھ) کے علمی خانوادے کے کچھ افراد کا احمد آباد (گجرات) اور برار ایرج پور میں علم وعرفان کی تشفی اور جستجو میں سفر کا اندیا ملتا ہے، لیکن حضرت مسیح الاولیاء کا حضرت مخدوم عباس ہنگورجائی کی وفات 998ھ کے بعد مستقلاً برہانپور میں مقیم ہوجانے سے وہاں پر سندھی علماء کا ایک محلّہ آباد ہونے لگا۔ کیونکہ آپ کے بعد چند دیگر متعلقین بھی گاھے بہ گاھے آکر وہاں آباد ہوتے گئے۔ جن کا تعلق نہ صرف آپ کے وطن عزیز پاٹ شریف سے تھا، بلکہ ٹھٹھہ، بوبک، بکھر وغیرہ کے علماء بھی اس سلسلے میں پیش پیش رہے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ علائقہ سندھیوں کا محلّہ سندھی پورہ کے نام سے مشہور ہوگیا۔

اعجاز احمد منگی